اے طائرِ لاہُوتی! اُس رزق سے موت اچھّی
جِس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(اقبالؒ)



مصنّف

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

صدرِ پاکستان

محمد ایوب خان

سیاسی سوانح حیات

ترقی پذیر ممالک کے باشندے دوستوں کی اعانت کے ضرور متمنی ہیں
لیکن ایسی اعانت — جو باہمی عزت و وقار کی بنیاد پر استوار ہو

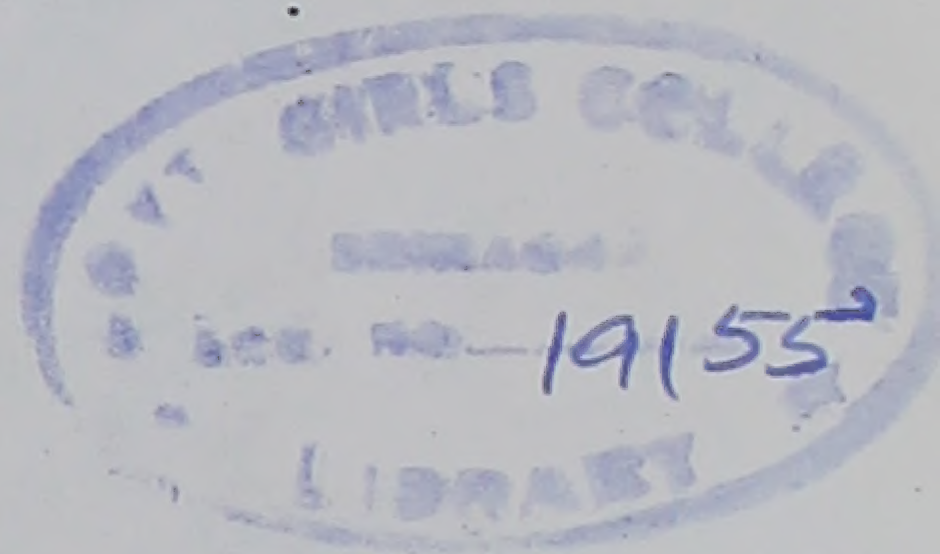
وہ دوستی چاہتے ہیں — کسی کی بالادستی تسلیم کرنا نہیں چاہتے

★

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

کراچی — لاہور — ڈھاکہ

ترجمہ : غلام عباس
اشاعت و تقسیم : آکسفورڈ یونیورسٹی پریس



پرنٹرز : سید محمود شاہ ، محمود پرنٹنگ پریس
۵۶/این گلبرگ ۲ ، لاہور۔
کاغذ : آدم جی آفسٹ پیپر

فہرست مضامین

دیباچہ

باب

۱- بچپن سے جوانی تک ۱

۲- فوجی زندگی کا ابتدائی دور ۱۵

۳- فوجی زندگی سنہ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء ۳۷

۴- کمانڈر ان چیف ۵۷

۵- سیاسیات سنہ ۱۹۴۸ء—۱۹۵۸ء ۸۱

۶- انقلاب ۱۱۶

۷- مارشل لا ۱۲۸

۸- بنیادی اقدامات ۱۳۲

۹- خارجہ پالسی—۱ ۱۸۸

۱۰- خارجہ پالسی—۲ ۲۵۶

۱۱- آئین اور نظریۂ حیات ۳۰۵

۱۲- صدارتی انتخابات ۳۷۱

ضمیمے

۱- جموں و کشمیر: وزیر اعظم انڈیا کے تاروں سے اقتباسات ۳۹۴

۲- صدر مملکت کا ہنگامی فرمان ، ۷-اکتوبر ۱۹۵۸ء ۳۹۶

۳- مارشل لا کا اعلان ۴۰۱

۴- بنیادی جمہوریت کا ڈھانچا ۴۰۲

۵- اصلاحی کمیشن ۴۰۳

۶- صدر کا منشور ۱۹۶۵ء ۴۰۵

۷- ۱۹۶۵ء کے الیکشن کا گوشوارہ ۴۱۰

۸- سوانحی اشارات ۴۱۲

اشاریہ ۴۱۵

فہرست تصاویر

مقابل صفحہ

مصنف

۱- مصنف کے والد رسالدار میجر میر داد خاں ۱۶

۲- مصنف سینڈھرسٹ سے فارغ ہونے پر سیکنڈ لیفٹننٹ ۱۹۲۹ء ۱۷

۳- حیدر آباد دکن میں برطانوی ریزیڈنٹ کے پرائیویٹ سکرٹری کی حیثیت میں ۱۹۳۱ء ۳۲

۴- (الف) موضع ریحانہ کا دور سے ایک منظر
(ب) موضع ریحانہ—آبائی مکان کی چھت نظر آ رہی ہے ۳۳

۵- ریحانہ میں مصنف کے آبائی مکان کے دو منظر ۴۸

۶- ریحانہ کی مسجد جہاں مصنف نے قرآن شریف پڑھا ۴۹

۷- ریحانہ میں مصنف کا موجودہ مکان ۶۴

۸- ریحانہ میں والدہ مرحومہ کے ساتھ - سنہ ۱۹۶۳ء ۶۵

۹- قائد اعظم کے ساتھ جی-او-سی مشرقی پاکستان کی حیثیت میں، ڈھاکہ . ۲-مارچ سنہ ۱۹۴۸ء ۹۶

۱۰- ۲۷-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو کیبنٹ کی پہلی نشست کی صدارت ۹۷

۱۱- مری میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ، ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰ء ۱۱۲

۱۲- مسٹر و مسز آئزن ہاور اور صدر کینیڈی کے ساتھ، مے فلاور ہوٹل واشنگٹن میں، اپنی طرف سے دی ہوئی دعوت میں، ۱۳-جولائی سنہ ۱۹۶۱ء ۱۱۳

۱۳- (الف) شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ راولپنڈی میں ملاقات، ۲۴-مئی سنہ ۱۹۶۴ء
(ب) ہز میجسٹی اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ فرمانروائے افغانستان کے ساتھ کابل میں، یکم جولائی سنہ ۱۹۶۴ء ۱۹۲

۱۴- (الف) مسٹر جومو کینیاٹا، وزیر اعظم کینیا کے ساتھ لندن میں، ۶-جولائی سنہ ۱۹۶۴ء
(ب) صدر جمال گرسل اور ہز امپیریل میجسٹی شہنشاہ ایران کے ساتھ اکابر کی کانفرنس میں، استنبول- ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء ۱۹۳

۱۵- (الف) صدر انڈونیشیا ڈاکٹر سوئیکارنو کے ساتھ راولپنڈی میں ،
۱۹-ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء
(ب) چیئرمین ماؤزے تونگ کے ساتھ نیشنل پیپلز کونسل
ہال میں، ۴-مارچ ۱۹۶۵ء ۲۰۸
۱۶- (الف) ہز امپیریل میجسٹی شہنشاہ ایران کے ساتھ مہر آباد کے
ہوائی اڈے پر یکم جولائی سنہ ۱۹۶۴ء
(ب) صدر ایوب نے عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعلیٰ ،
مسٹر چو این لائی کو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر
خوش آمدید کہا - راولپنڈی ۲-جون سنہ ۱۹۶۵ء ۲۰۹
۱۷- راولپنڈی میں ''یوم دوشک'' پر سابق فوجیوں سے ملاقات ،
۱۳-اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء ۲۷۲
۱۸- اسلام آباد کا ایک منظر ۲۷۳
۱۹- (الف) سلہٹ میں فینچو گنج کے کیمیائی کھاد کے کارخانے کا
دورہ - ۴-فروری سنہ ۱۹۶۲ء
(ب) کرنافلی کے کثیر المقاصد منصوبے کا دورہ - ۳۱-مارچ
سنہ ۱۹۶۲ء ۲۸۸
۲۰- (الف) کوئٹہ کے قریب سراخا بند کا افتتاح کیا جسے فوجی
انجنیئروں نے بنایا ہے ، ۱۴-دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء
(ب) کراچی میں نیشنل آئل ریفائنری کا افتتاح کیا ،
۲۱-فروری سنہ ۱۹۶۳ء ۲۸۹
۲۱- راولپنڈی میں قومی اسمبلی سے خطاب ۱۲-جون سنہ ۱۹۶۵ء ۳۳۶
۲۲- (الف) قاہرہ میں جمال ناصر صدر جمہوریہ متحدہ عرب کے ساتھ ،
۵-نومبر سنہ ۱۹۶۰ء
(ب) واشنگٹن میں صدر جانسن کےساتھ - ۱۴-دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء ۳۳۷
۲۳- جلالہ الملک المعظم فیصل والیٔ سعودی عرب کے ساتھ راولپنڈی
میں - ۲۱-اپریل سنہ ۱۹۶۶ء ۳۵۲
۲۴- اپنے پوتے پوتی کے ساتھ مری میں - ۱۱-جون سنہ ۱۹۶۱ء ۳۵۳

دیباچہ

اس کتاب کو ایک زبانی تصنیف کہنا چاہئے - جب میں نے اس کا خاکہ اور موضوعات طے کر لئے تو چند دوستوں سے کہا کہ مختلف ابواب کے نفس موضوع پر سوال نامے تیار کریں - سوال و جواب کی یہ نشستیں جون سنہ ۱۹۶۴ء میں شروع ہوئیں اور سال کے آخر تک جاری رہیں - ان نشستوں کی ٹیپ ریکارڈنگ تقریباً تیس گھنٹوں کی تھی - جب ان کا مسودہ بنایا گیا تو وہ نو سو سے بھی زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا تھا - یہ مسودہ مجھے سنہ ۱۹۶۵ء کی کسی تاریخ کو ملا - اس وقت سے میں وقتاً فوقتاً اس کا اعادہ اور اس میں ترمیمات کرتا رہا ہوں -

عام دستور یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے اپنی داستان حیات لکھے- ان پابندیوں سے قطع نظر جو ذمہ داری کے احساس کی بنا پر عائد ہوتی ہیں، اس بات کا برابر اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ذرا سا بھی کامیابی کا ذکر آیا تو اسے ہوا باندھنے سے تعبیر کیا جائے گا - اس لئے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم نے سیاسی استحکام یا اقتصادی ترقی کے سلسلے میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہو، اس کی داد ان لوگوں کو پہنچتی ہے جو مختلف اصلاحات کو بروئے کار لانے میں میرے ساتھ تھے - اگر میں نے کچھ نئے خیالات پیش کئے تو ان کی نوک پلک سنوارنا اور ان کو عمل میں لانا حکومت میں میرے رفقائے کار اور سروسوں کے قابل اور مخلص لوگوں ہی کا کام تھا - قوم پچھلی دہائی کے دوران جس سماجی اور اقتصادی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی اس سے نکلنے اور ترقی و خوشحالی کی موجودہ منزل تک پہنچنے میں جس چیز نے سب سے زیادہ مدد دی وہ پاکستان کے عوام کی تائید اور تعاون تھا -

یہ کتاب سنہ ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب تک کے واقعات پر مشتمل ہے ، البتہ کہیں کہیں خصوصاً خارجہ پالسی والے باب میں، بعد کے واقعات کا حوالہ بھی دیا گیا ہے - میں نے مسودے پر نظر ثانی کے وقت اپنی تحریری یادداشتوں اور دوسری دستاویزوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے ، لیکن بیشتر واقعات اور مکالمات حافظے ہی کی مدد سے لکھے گئے ہیں - ممکن ہے مجھ سے تاریخوں یا تفصیلات کے بیان میں کچھ سہو ہوئے ہوں ، لیکن ان سے نفس مضمون اور دلائل کی صحت میں کچھ فرق نہیں پڑے گا -

جس وقت میں نے اس کام کا ارادہ کیا تھا تو مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اس میں کتنا وقت لگے گا اور کیا کیا دشواریاں پیش آئیں گی - مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ جن لوگوں کو میں نے سوال پوچھنے کے لئے منتخب کیا ہے وہ اس پر اتنے مصر ہو جائیں گے - بہرحال یہ کام بڑا خوش گوار اور مفید ثابت ہوا - میں نے حتی الامکان بے لاگ طور پر گزشتہ حالات کا جائزہ لینے اور ان اہم واقعات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو پاکستان کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے ہیں - یہ تاریخ ابھی مرتب ہو رہی ہے ، لیکن میرا خیال ہے کہ اب اس نے ایک مثبت رخ اختیار کر لیا ہے اور ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو واقعات کا ایک مربوط خاکہ نظر آسکتا ہے - مجھے آمید ہے کہ اس سر گزشت سے یہ واضح ہو جائے گا کہ وہ کیا حالات تھے جو میرے خیالات کی تحریک و تشکیل کا باعث ہوئے اور صدر پاکستان بننے کے بعد سے میں نے جن باتوں کے لئے سعی و کاوش کی ہے انہیں بھی بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا -

میری کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے بیان میں صاف گوئی اور حقیقت پسندی سے کام لوں اور توجہ کو شخصیات کی بجائے مسائل و واقعات پر مرکوز رکھوں - بعض جگہ مجھے ان لوگوں کے بارے میں جو انقلاب سے پہلے ملک کے کرتا دھرتا رہے تھے ، اپنے خیالات و تاثرات ظاہر کرنے پڑے ہیں ، لیکن میں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سیاسی حالات کے بارے میں اپنی توضیحات کی تصدیق

کے لئے کہا ہے، کسی کی دل آزاری مقصود نہیں اور مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھا جائے گا۔

یہ ایک جد و جہد کی داستان ہے — ایسی جد و جہد کی جس کا مقصد تھا نئے خیالات کو قبول کرانا ۔ جو کوئی بھی نئے خیالات پیش کرے اسے نکتہ چینی اور مخالفت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مجھے بھی ان دونوں باتوں سے بخوبی سابقہ پڑ چکا ہے، لیکن میں نے ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی میں جو تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کی ضرورت اور صحت پر میرا یقین آج بھی ویسا ھی واثق، والہانہ اور غیر متزلزل ہے جیسا کہ تھا ۔ ہم نے طویل غیر ملکی تسلط کے بعد آزادی حاصل کی ہے اور یہ تسلط اپنے پیچھے فرسودہ افکار و عادات کا ایک ورثہ چھوڑ گیا ہے ۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان افکار و عادات کو کس طرح بدلا جائے اور موجودہ حقائق کا کس طرح براہ راست اور گہرا ادراک حاصل کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے بہت سے میدانوں میں ترقی کی ہے ، لیکن میں نے ناکامیوں کے اعتراف میں کبھی تامل نہیں کیا ہے ۔ ترقی کی راہ بڑی طویل اور پرُ پیچ ہے ۔ اس میں قدم قدم پر آزمائشوں سے گذرنا اور ٹھوکریں کھانی پڑتی ھیں ۔

میں نے ایک پاکستانی ، ایک مسلمان اور ایک ایشیائی کی حیثیت سے مسائل پر نظر ڈالی ہے۔ پاکستان میری جان ، میری زندگی ہے۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی کی جھلک دیکھ کر میرے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور اسی سے مجھے راحت ملتی ہے ۔ اسی طرح ان کی آنکھوں میں فکر و اضطراب کے آثار مجھے بیقرار کر دیتے ھیں ۔ بارھا میں کھڑکی کے شیشوں پر آھٹ سن کر نیند سے چونک پڑا ھوں اور یہ دیکھنے کے لئے لپکا ھوں کہ شاید یہ آواز مینہ کی بوندوں کی ھو جس کا شدت سے انتظار تھا ۔ کوئی سوکھا ھوا کھیت دیکھ پاتا ھوں تو محسوس ھوتا ہے جیسے میں خود اندر سے جھلس گیا ھوں ۔ پاکستان کی مٹی میری آنکھوں کا نور ہے ، یہ مٹی میری ہے اور میں اس کا ھوں ۔

میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کی خدمت کے لئے وقف

کر دیا ہے - کسی قسم کے دباؤ یا ناکامی نے لمحہ بھر کے لئے بھی میری ہمّت کو پست نہیں کیا - پاکستان کو اخلاقی ، سماجی ، ذہنی اور سیاسی لحاظ سے اپنی امتیازی حیثیت کو قائم اور مسلّم کرنا ہے اور میری تمام کوششیں اسی مقصد کے حصول کے لئے وقف ہے - ہم دوسروں کے تجربوں سے سبق تو لے سکتے ہیں ، لیکن ہمیں اپنے مسائل خود ہی حل کرنے ہوں گے اور اپنی نجات کا راستہ خود ہی ڈھونڈنا ہوگا - میں نے ہمیشہ حقیقت پسندی اور اعتدال کے ساتھ اور حالات کی مجبوریوں پر نظر رکھتے ہوئے ، ممکن باتوں کو عمل میں لانے کی سعی کی ہے ، اور قوم کے سامنے کسی مسئلے کو پیش کرتے وقت جذباتیت کو راہ نہیں دی - ہم لوگ ڈرامائی اور سنسنی پیدا کرنے والے انداز سے بہت متاثر ہوتے ہیں ، جس سے میں ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں - ہم لوگ اکثر غلطی سے جذبات ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں - چاہئے یہ کہ زندگی کو عقل و شعور کی آنکھوں سے دیکھنے کی عادت ڈالیں ، تا کہ عظمت رفتہ کی یادیں ہماری نظر کو دھندلا نہ سکیں اور ہماری تمام تر توجہ زمانۂ حال اور اس کی پیچیدگیوں پر مرکوز رہے - مستقبل اور اس کے انعامات کے لئے مصروف عمل ہونا شرط ہے - ہم پر اس وقت یہ لازم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک مسئلے سے نمٹتے اور ایک کے بعد ایک مشکل کو حل کرتے چلے جائیں - ہمارے لئے دم لینے یا آرام کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے -

اندرونی طور پر ہمارا سب سے اہم مسئلہ یہ رہا ہے کہ سیاسی ادارے اور حکومت کے لئے پائیدار نظام قائم کریں - ان اداروں اور نظام کو ہمیں خود اپنی فکر ، اپنے مزاج اور اپنی ضرورتوں کے مطابق وضع کرنا تھا - یہ کام آسان نہ تھا - ابتدائی برسوں میں طرز فکر تمام تر ذاتی تھا اور مسائل کو شاذ ہی وسیع تر قومی پس منظر میں دیکھا جاتا تھا - اس سے ترقی لازماً رک گئی - ہمیں جو سیاسی نظام ورثے میں ملا تھا وہ ہمارے حالات سے مطابقت نہ رکھتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظام کو غلط طور پر استعمال کیا گیا اور محدود مفادات کے لئے ناجائز طور پر کام میں لایا گیا -

اس کو بدلنے کے لئے ایک انقلاب کی ضرورت تھی جو کوئی ایسا نظام رائج کرے، جس میں قوم کی روایات کا عکس ہو اور جو عوام کی توقعات کو پورا کر سکے۔

میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ یہ نیا نظام سو فیصد مقبول عام ہوا ہے، لیکن اس نے جڑ پکڑ لی ہے اور عوام نے اس کے فوائد کو تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں ابھی عوام میں ایک مضبوط قومی احساس پیدا کرنا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ذاتی اور علاقائی اغراض سے بلند ہو کر ملکی مسائل کو حل کرنے کے لئے زیادہ پختہ و فہمیدہ طریق عمل اختیار کرنا ہوگا۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا واحد مقصد یہ رہا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے مذہب اور نظریۂ حیات کی روشنی میں متحد ہو جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظریۂ حیات کبھی نہ بدلنے والے چند اصولوں پر مبنی ہے: خدا کی وحدت، انسانی مساوات و اخوت، زندگی کے اعلیٰ مدارج ترقی کا حصول اور اسلام کے بنیادی اصول و ضوابط کی پابندی۔ ہمارے معاشرے میں طرح طرح کے تفرقے پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بنیادی تفرقہ وہ ہے جو جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو قدامت پسند گروہوں سے جدا کرتا ہے۔ ان دونوں فرقوں میں نئے سرے سے مفاہمت اور مواصلت پیدا کرنا ہماری ایک لازمی ضرورت ہے۔ یہ مقصد اسلامی اصول و عقائد کی صحیح ترجمانی اور مسائل حاضرہ پر ان کے اطلاق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا ان کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی چلی جائے گی۔ انجام کار روایتی گروہ، جدید تعلیم یافتہ طبقے سے بالکل جدا ہو جائیں گے اور مؤخر الذکر طبقہ اسلام سے بیگانہ ہو کر رہ جائے گا۔

واقعات عالم پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ایک ایشیائی کی حیثیت سے مسائل پر نظر ڈالی ہے۔ ہمیں ایشیائی قومیت کے اندر ہی رہ کر اپنے لئے مستقل طور پر ایک پُر وقار اور مضبوط مقام حاصل کرنا ہے۔ یہی ہمارے قومی مفادات کا تقاضا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا کے اس حصے میں امن اور استحکام کے لئے بدستور کوشاں

ہیں - ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں (بدقسمتی سے سوائے ہندوستان کے)، اور ساتھ ہی ہم نے مغربی طاقتوں خصوصاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے بھی اپنا روایتی ربط و ضبط قائم رکھا ہے - اس امر میں ہمارے قومی مفادات بھی اسی قدر ہمارے پیش نظر رہے ہیں جس قدر کہ اپنے سیاسی اور اقتصادی وسائل کے محدود ہونے کا احساس - ہم دل سے امن کے خواہاں ہیں کیونکہ صرف امن ہی سے ہمیں وہ مہلت مل سکے گی جو ہماری ترقی کے لئے ضروری ہے - ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم بڑی طاقتوں کی باہمی آویزشوں سے الگ تھلگ رہیں - یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم ہر ایک سے ایمان داری اور راست بازی کے ساتھ پیش آئیں -

سنہ ۱۹۶۵ء کے بعد کئی پرُ آشوب واقعات رونما ہوئے ہیں - میں نے اس کتاب میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے، کیونکہ ان میں سے بعض واقعات اتنے قریبی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ابھی ان پر ٹھنڈے دل سے اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا - مجھے امید ہے کہ میں کسی آئندہ موقع پر ان کا ذکر کر سکوں گا -

مجھے اس کتاب کی تیاری میں مختلف اصحاب سے مدد ملی ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں - میں حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ اور کیبنیٹ ڈویژن کا بھی احسان مند ہوں کہ انھوں نے اپنی مہربانی سے اس کتاب کی بعض تفصیلات کو مکمل کرنے کے لئے سرکاری دستاویزات سے رجوع کرنے کی اجازت دی -

راول پنڈی

۲۸- فروری سنہ ۱۹۶۷ء   فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں



اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

خُدا نے آجتک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا



اِنتساب

اُن وطن پرستوں کے نام!
جنہوں نے پاکستان کو دورِ حاضر کی ایک ترقی پذیر مملکت بنانے کیلئے دِن رات جِدّوجہد کی
اور
اُن جانفروشوں کے نام!
جنہوں نے پاکستان کی حفاظت کیلئے بہادری کے جوہر دکھائے

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خُدا رحمت کُند این عاشقانِ پاک طینت را

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

پہلا باب

محمد ایوب خان

بچپن سے جوانی تک

اکثر اوقات لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اپنے سوانح حیات قلم بند کروں ۔ بھلا عین ہنگامہ حیات کے درمیان یہ کیسے ممکن ہوا کرتا ہے؟ پھر اشاعت کے لئے جو چیز لکھی جاتی ہے اس میں کچھ نہ کچھ نمود و نمائش کا شائبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور یہ بات میری طبیعت کے خلاف ہے ۔ میں نے زندگی بھر اپنے فرائض کے تقاضے سے جو کچھ بھی کیا وہ خاموشی و کم گوئی کے ساتھ کیا اور اپنے تجربے و مشاہدے کی باقاعدہ یاد داشت بھی نہیں رکھی ۔

حکومت کے ساتھ مجھے سنہ ۱۹۵۱ء سے گہرا تعلق رہا ہے ، جبکہ میں پاکستانی افواج کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا تھا ۔ اور اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد سے تو میں ہی حکومت کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوں ۔ اس عرصے میں بہت سی باتیں واقع ہوئیں ۔ اچھی بھی اور بری بھی ۔ شاید ان کو تحریر میں لانا مفید ہوتا ۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ماضی کا جائزہ لینے کے لئے وقت کہاں سے آئے ۔ قدرت نے یہ مسئلہ یوں حل کر دیا کہ جون سنہ ۱۹۶۴ء میں جب میرا آپریشن ہوا تو مجھے صحت کی بحالی کے لئے مجبوراً کچھ دن مری میں آرام کرنا پڑا ۔

میری زندگی ہمیشہ مصروف ، باعمل اور واقعات و مشاغل سے پر رہی ہے ۔ بے عملی کا ایک مختصر وقفہ مجھے اس وقت یاد آتا ہے ، یعنی وہ ایک گھنٹہ جو میں نے ایک شام کاکس بازار کے مہمان خانے کے احاطے میں اکیلے بیٹھ کر گزارا تھا ۔ میں چپ چاپ

بیٹھا اپنے ارد گرد کی خاموشی کو اپنے میں جذب کرتا رہا - دور سمندر کی بے خروش موجیں خلیج بنگال کے ساحل کی نرم ریت پر دھیرے دھیرے بل کھا رہی تھیں - لمحہ بھر کے لئے زندگی کے ہنگامے جیسے تھم سے گئے اور میں سمندر کی خاموشی میں ڈوب گیا اس مختصر سے تجربے کے ماسوا مجھے زندگی میں ہمیشہ فرائض کے مسلسل اور شدید تقاضوں کا سامنا رہا ہے -

میں ۱۴ مئی سنہ ۱۹۰۷ء کو ریحانہ نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا - یہ رمضان کے مہینے کا آخری دن تھا اور گھر کے لوگ عیدالفطر کی تیاریوں میں مصروف تھے - میرے والد کے چار بچے پہلی بیوی سے تھے جو فوت ہو چکی تھیں - میں ان کی دوسری بیوی سے پہلی اولاد تھا -

بچپن کی جو باتیں میرے ذہن پر نقش ہیں ان میں ایک پرندے کی یاد بھی ہے جو ہر روز صبح سویرے آ کر چہچہایا کرتا تھا - یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ مدرسے جانے کا وقت آ گیا - اب بستر سے اٹھا دیا جائے گا اور جلد جلد منہ ہاتھ دھو کر خچر کی پیٹھ پر چار میل کا سفر طے کرنا ہوگا - اب بھی جب کبھی اس پرندے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے -

ریحانہ مغربی پاکستان میں راولپنڈی سے کوئی پچاس میل شمال کی طرف ایک چھوٹا سا خوش منظر گاؤں ہے - اس کے ارد گرد اونچی نیچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے اور کچھ دور پر ہمالیہ کی ڈھلانیں دکھائی دیتی ہیں جو صنوبر کے پیڑوں سے ڈھکی ہوئی ہیں - میرے آبا و اجداد افغانستان سے آ کر اسی علاقے میں بس گئے تھے -

میری والدہ ایک سیدھی سادی خاتون تھیں جنھوں نے اپنی ساری عمر گاؤں ہی میں گزاری تھی - وہ مرتے دم تک ہمارے چھوٹے سے آبائی گھر ہی میں رہیں اور مقدور بھر گاؤں والوں کی خدمت کرتی رہیں - وہ بڑے مضبوط ارادے کی خاتون تھیں - ان کے ہوش و حواس آخری وقت تک بجا رہے -

مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی پیدائش اچھی طرح یاد ہے - میری عمر اس وقت کوئی دو ڈھائی برس کی تھی - پہلی مرتبہ جب میں نے اس بچے کو اپنی ماں کے پہلو میں لیٹے دیکھا تو بے اختیار چھڑی اٹھا لی

اور اسے مارنا چاہا ۔ لیکن مجھے فوراً وہاں سے ہٹا دیا گیا ۔ اپنی ماں کے پہلو میں کسی اور بچے کو سوتے دیکھنا میرے لئے بڑی اذیت کی بات تھی ۔ مجھے اس احساس کو اپنے دل سے نکالنے میں بڑا وقت لگا ۔ یہ واقعہ میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے ۔

میں اپنی والدہ سے بہت مانوس تھا ۔ لیکن جس شخص نے میری سیرت میرے خیالات اور زندگی کے بارے میں میرے نقطۂ نظر پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ میرے والد مرحوم تھے ۔ وہ مشہور رسالے ''ہوڈسن ہارس،، میں رسالدار میجر تھے ۔ جسمانی لحاظ سے وہ بڑے طاقتور انسان تھے ۔ گاؤں والے ان سے ڈرتے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ لیکن میرے ذہن میں ان کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک انتہائی شریف پاکباز اور شفیق دوست کی ہے ۔ وہ ذی احساس ہمدرد اور روا دار آدمی تھے ۔ ان کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ بڑی ذہنی آسودگی حاصل ہوتی تھی ۔

ان کے اندر مسلم قومیت کا ایک مبہم مگر گہرا احساس اور بڑا قومی جذبہ تھا ۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ سنہ ۱۹۱۹ء یا سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک عالم صاحب مانسہرہ سے ان سے ملنے آئے اور کہنے لگے ''ہندوستان دارالحرب ہے اس کے حکمراں کافر ہیں ۔ اس لئے ہم کو اس ملک سے ہجرت کر جانا چاہئے ۔،،

میرے والد نے کہا ''مولوی صاحب میری یہ بڑی آرزو ہے کہ میں اسلام کے جھنڈے کے نیچے جان دوں ۔ لیکن وہ جھنڈا ہے کہاں؟ آج کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں جو آزاد ہو ۔ سب مغربی طاقتوں کی ہوس ملک گیری کا شکار ہیں ۔،،

میرے والد صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے ۔ نماز کبھی قضا نہ ہونے دیتے اور خاصی باقاعدگی سے تہجد بھی پڑھا کرتے تھے ۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ آدھی رات کو میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ ان کا بلند و بالا پیکر میری چارپائی کے پاس کھڑا ہے اور سر دعا میں جھکا ہوا ہے ۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے ہی لئے مصروف دعا ہیں لیکن میں نے بستر پر جنبش تک نہ کی تاکہ ان کا دھیان نہ ہٹے ۔

مجھے اپنے خاندانی حالات زیادہ‌تر اپنے والد ہی سے معلوم ہوئے۔ ہمارا تعلق ترین قبیلے سے ہے جو ہزارہ اور کیمبل پور اضلاع کے بعض حصوں پر حکمراں تھا اور مدتوں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف بر سر پیکار رہا۔ اس قبیلے کے لوگ پشین سے آئے تھے جو اب بلوچستان میں ہے اور ابتدا میں افغانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔

اپنے بزرگوں میں سے ایک شخص کے حالات زندگی مجھے بہت محو حیرت کرتے تھے۔ اس شخص کا نام سردار محمد خان ترین تھا۔ یہ شجاعت اور بلند ہمتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہ سردار نجیب اللہ خان ترین کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ریاست کا حکمراں بن کر کل ڈھیری میں مقیم ہو گیا تھا۔ اسے مقامی قبائل گوجر، دلازاک، جدون، اور اتمان زئی کے ہاتھوں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں مگر اس نے ان بغاوتوں کو کچل کر انھیں زیر کر لیا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سالوں میں سکھوں نے کئی مرتبہ اس پر چڑھائی کی مگر اس نے کمال شجاعت سے ان کا مقابلہ کیا۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں ہری سنگھ نلوہ جو کشمیر کا گورنر تھا، ترین سردار کو نیچا دکھانے کے لئے ہزارہ پر چڑھ آیا، مگر اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو طیش آیا اور اس نے خود ایک بھاری فوج لے کر ہزارہ پر چڑھائی کر دی۔ سردار محمد خان گرفتار ہو کر لاہور میں لایا گیا۔ ہری سنگھ نے اسے پچاس ہزار روپے میں خرید لیا اور ضلع راول پنڈی کے مقام روات میں لے گیا۔ ہری سنگھ چاہتا تھا کہ سردار اپنے علاقے میں سکھوں کی فرماں روائی قبول کر لے مگر اس نے منظور نہ کیا۔ آخر اسے ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ وہاں اسے نمکین روٹی کھانے کو دی جاتی مگر پینے کو پانی نہ دیا جاتا۔ سردار نے بھوک پیاس سے جان دے دی مگر سکھوں کی اطاعت قبول نہ کی۔

کچھ عرصے بعد جب انگریزوں نے ضلع ہزارہ پر قبضہ کرنا چاہا تو ہمارے قبیلے کے لوگوں نے ان کا بھی سخت مقابلہ کیا۔ خاندان کے سردار اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور الہ آباد کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ میں نے سنہ ۱۹۲۶ء میں ان کی قبریں

دیکھیں - میں نے سنا کہ سردار قبیلہ کو تو توپ کے دھانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا تھا اور باقیوں کو سخت اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔

میرے والد کا کنبہ وسیع تھا اور پنشن اور زمینوں کی آمدنی محدود، لیکن انھوں نے اپنے جی میں ٹھان رکھی تھی کہ مجھے اچھی تعلیم دلوائی جائے - اس کے علاوہ انھیں اس کا بھی بڑا خیال تھا کہ میں اسلامی اصول و عقائد سے بے بہرہ نہ رہوں - وہ مجھے حافظ قرآن بنانا چاہتے تھے - اس مقصد کے لئے گاؤں کے مولوی صاحب کو منتخب کیا گیا - پہلے روز جب مجھے قرآن شریف پڑھنے مسجد میں بھیجا گیا تو گھر میں بہت چہل پہل رہی - میری عمر اس وقت چار سال چار مہینے اور چار دن کی تھی - مٹھائی بانٹی گئی اور مجھے مولوی صاحب کے سپرد کیا گیا - لیکن یہ انتظام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا - میں مولوی صاحب کی نگرانی میں دو تین مہینے میں قرآن کی جس قدر سورتیں حفظ کر سکا ان کا بھی تلفظ صحیح نہ تھا - مولوی صاحب مجھ سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے کیونکہ وہ مجھے جو کچھ پڑھاتے تھے میں ان سے اس کے معنی پوچھا کرتا تھا -

ایک دفعہ ایک ایسے ہی موقع پر انھوں نے مجھے چانٹا رسید کر دیا - جواب میں میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا - میری یہ حرکت کچھ اچھی تو نہ تھی لیکن اس طرح مولوی صاحب سے میرا استادی شاگردی کا رشتہ، جس کو قائم ہوئے کچھ زیادہ دن نہ ہوئے تھے، اچانک ٹوٹ گیا -

اس کے بعد مجھے ایک اور گاؤں میں بھیجا گیا جو دو میل کے فاصلے پر تھا - اس گاؤں کا نام کوکا تھا - وہاں کے مولوی صاحب بڑے بزرگ آدمی تھے - میں ان کا بہت ادب کیا کرتا تھا - مگر ساتھ ہی ان سے ڈرا بھی بہت کرتا تھا - میں نے کچھ عرصہ ان سے قرآن شریف پڑھا اور اتنا کچھ پڑھ لیا جتنا کہ میری عمر کا بچہ پڑھ سکتا تھا - لیکن اس عرصے میں میرے والد اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ یہ اور چاہے جو کچھ بن جائے حافظ قرآن نہیں بن سکتا -

اب میرے گھر والوں کی رائے ہوئی کہ مجھے کسی باقاعدہ اسکول میں بھیجنا چاہئے - چنانچہ مجھے ایک اسکول میں داخل کر

دیا گیا جو ہمارے گھر سے چار میل کے فاصلے پر سرائے صالح میں تھا۔ اب ہر روز تڑکے تڑکے جگایا جانا اور خچر پر سوار کرایا جانا میرا معمول بن گیا جو خاصا کٹھن تھا - میری والدہ ہر روز میرا قاعدہ اور قلم دوات اور کچھ کھانے کی چیزیں جنھیں وہ میرا ''راشن،، کہا کرتیں ایک تھیلے میں رکھ دیتیں اور میں روانہ ہو جاتا -

وہ سڑک جو بل کھاتی ہوئی ہمارے گھر سے اسکول تک جاتی تھی بڑی خوبصورت تھی - لیکن خچر کی اٹکھیلیاں مجھے اتنا موقع ہی نہ دیتیں کہ میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں یا پہاڑیوں سے لپٹے ہوئے نرم بادلوں کے نظارے سے لطف اٹھا سکتا - میں سہ پہر کو تین بجے کے قریب بھوکا تھکا ہارا گھر واپس آیا کرتا - خوش قسمتی سے میری نانی نے میرے والد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے ہری پور کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا جائے اور میں نانی اماں کے ساتھ درویش میں رہا کروں جہاں سے یہ اسکول قریب ہی تھا -

میں پڑھنے میں کچھ تیز نہیں تھا - اور نہ لکھنے پڑھنے میں میرا جی کچھ زیادہ لگتا تھا - مجھے کھلی ہوا کی زندگی بے حد پسند تھی - میرے ایک رشتے دار باز اور کتے پالا کرتے تھے - مجھے اور کیا چاہئے تھا - میں اسکول سے کھسک جاتا اور ان کے بازوں کی دیکھ بھال کیا کرتا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں چھٹی جماعت کے امتحان میں فیل ہو گیا - اس وقت میری عمر گیارہ برس کی تھی - جب والد کو علم ہوا کہ میں کس طرح وقت گنواتا رہا ہوں تو انھوں نے میری خوب مرمت کی - اس کے بعد پڑھنے لکھنے میں دھیان دیتے ہی بنی اور خاصی آسانی سے پڑھنے میں دل لگ گیا - میں نے اسکول کی تعلیم سیکنڈ ڈویژن میں اچھے نمبر حاصل کر کے پوری کر لی - مجھے اس کے لئے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی - میں حساب یا جیومیٹری میں تو زیادہ ہوشیار نہیں تھا البتہ الجبرا میری سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آتا تھا اور جغرافیہ انگریزی فارسی اور اردو پڑھنے میں مجھے لطف آتا تھا -

اس اسکول میں کھیلوں کا کوئی انتظام نہیں تھا لیکن میرے لئے

کبڈی گلی ڈنڈا اور گولیوں کے کھیل بھی خاصی دل چسپی رکھتے تھے - بعد میں میں نے ھاکی کھیلنا بھی سیکھ لیا -

گھوڑے کی سواری تو گویا میری گھٹی میں پڑی تھی - ھر صبح خچر کی سواری نے ضروری مشق بھی بہم پہنچا دی - اس زمانے میں فوج کا محکمہ زمینداروں سے کم عمر بچھیرے خریدا کرتا تھا اور میرے والد کے پاس بھی ان کی خاصی تعداد موجود تھی - میری عمر کوئی آٹھ یا نو سال کی ھوگی کہ ایک دن میں نے والد کی اجازت کے بغیر اصطبل سے پولو کا ایک ٹٹو نکالا اور اس پر سوار ھو کر اپنی بہن سے ملنے چل کھڑا ھوا جو قریب ھی کے ایک گاؤں میں رھتی تھی - ھمارے علاقے میں پہاڑیوں کے دامن کی زمین بڑی سنگلاخ ھوتی ھے - میں واپسی پر ایک نشیب سے اتر رھا تھا کہ اچانک جھاڑی سے ایک پرندہ زور سے پر پھڑپھڑا کر اڑا - اس سے گھوڑا بدک کر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ھو گیا - میں نیچے آ رھا اور میرا بایاں پاؤں رکاب میں پھنس کے رہ گیا - گھوڑا بھاگا اور میں اس کے ساتھ ساتھ کافی دور تک خاردار جھاڑیوں میں گھسٹتا رھا - اس کو میری خوش قسمتی کہئے کہ رکاب کا کانپ آپ سے آپ سیدھا ھو گیا - رکاب باھر نکل آئی اور ساتھ ھی میرا پاؤں بھی آزاد ھو گیا - میں گھنٹوں زمین پر بے ہوش پڑا رھا -

ادھر گھوڑا جب سوار کے بغیر گھر پہنچا اور اس کی ایک رکاب بھی غائب پائی گئی تو سب کو بے حد فکر ھوئی - اور لوگ میری تلاش میں نکلے - آخر مجھے جھاڑیوں میں سے ڈھونڈ نکالا گیا - اگر میں چند منٹ اور یونہی گھسٹتا رھتا تو ھرگز زندہ نہ بچتا - میری ھڈی پسلی تو کوئی نہیں ٹوٹی ھاں پیٹھ پر بری طرح خراشیں آگئی تھیں جس کی وجہ سے مجھے چھ مہینے تک سینے کے بل سونا پڑا -

مجھے اسکول کی زندگی کافی پرلطف معلوم ھوئی - یہ اسکول سکھوں نے جاری کر رکھا تھا - اس میں جتنے استاد تھے ماسٹر سجان سنگھ کو چھوڑ کر باقی سب بے حد شفیق تھے اور ھر ایک سے بڑی روا داری برتتے تھے - ماسٹر سجان سنگھ بڑے ظالم آدمی تھے - مانیٹر سمیت ساری جماعت کی پٹائی کر دینا ان کے لئے معمولی بات تھی

اور مجھے کئی بار مانیٹر بننے کا شرف حاصل ہو چکا تھا ۔ جماعت میں جب کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو سب سے پہلے مانیٹر ہی کی شامت آتی تھی ۔

مجھے یاد ہے ایک دن جب کہ خوب بارش ہوئی تھی ماسٹر صاحب اسکول تشریف نہیں لائے ۔ لڑکے کہنے لگے خدا کرے وہ مر گئے ہوں ، اور انھوں نے یہ کام میرے سپرد کیا کہ میں جا کر ماسٹر صاحب کے نہ آنے کا سبب معلوم کروں ۔ جب میں ان کے گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ ملبے کی ڈھیریوں کے درمیان زندہ سلامت کھڑے ان کا معائنہ کر رہے ہیں ، مگر کسی قدر بدحواس ہیں ۔ وجہ یہ تھی کہ بارش سے ان کے مکان کی چھت گر پڑی تھی ۔ میں نے عرض کیا ''سب لڑکے آپ کے اسکول نہ آنے سے سخت فکرمند ہو رہے ہیں ۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو ہم سب آ کر آپ کا مکان بنانے میں مدد دیں ۔،، انھوں نے بڑے اکھڑ لہجے میں ہماری پیشکش کو نامنظور کر دیا اور کہا ، بس تم واپس اسکول جاؤ ۔ چنانچہ میں فوراً واپس پہنچا کہ اپنے ساتھیوں کو یہ خوش خبری سناؤں ۔ ماسٹر صاحب دو ہفتے اسکول سے غیر حاضر رہے اور ہم نے یہ زمانہ بڑے سکھ چین سے گزارا ۔

سکھ بڑی کشادہ دل قوم ہے ۔ مجھے ان کی مذہبی رسوم اور ان کے پنجابی گیت بڑے دل چسپ معلوم ہوتے تھے ۔ ایک گیت جو مجھے بہت پسند تھا اس کا ایک بول مجھے ابھی تک یاد ہے :

سو رنگ تماشے تکدے اکھیاں نئیں رجیاں

''زندگی ایک رنگا رنگ تماشا ہے ۔ آنکھیں طرح طرح کے نظارے دیکھتی ہیں مگر سیر نہیں ہوتیں ۔،،

میں نے اسکول میں ایک بہت اہم سبق سیکھا ۔ وہ یہ کہ ہمیں انسان کو پرکھنے میں یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ اس کی بود و باش کہاں کی ہے ، اس کا رنگ و روپ کیسا ہے اور وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے ۔ میں نے زندگی بھر کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دی ۔ میرا یہ ایمان ہے کہ انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی ذاتی قابلیت سے کرنا چاہئے ۔ اس کے بہت عرصے بعد ایک مرتبہ مجھے خود

اپنے بھائی کے خلاف جو فوج میں میجر تھا اور جس سے ایک سنگین بے قاعدگی سرزد ہوئی تھی یہ فیصلہ دینا پڑا کہ وہ یا تو استعفیٰ دیدے یا پھر فوجی عدالت میں پیش ہو۔ اس نے استعفیٰ دیدیا۔

میں ابھی اسکول ہی میں تھا کہ والد صاحب مجھ سے پوچھنے لگے ''تم علی گڑھ جانا پسند کرو گے؟،، مجھے اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ علی گڑھ کیا جگہ ہے اور کہاں واقع ہے؟ والد نے مجھے بتلایا کہ وہاں مسلمانوں کی بڑی مشہور درس گاہ ہے۔ اس کا ماحول بڑا اسلامی ہے۔ اسے مسلمانوں نے بڑی محنت اور صرفے سے قائم کیا ہے۔ وہ مجھے علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے تاکہ میرے دل میں اسلامی جذبہ پیدا ہو۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں میں نے میٹرک پاس کیا۔ انہوں نے مجھے علی گڑھ جانے کا حکم دے دیا۔ انہیں اس بارے میں اتنی جلدی تھی کہ یونیورسٹی کھلنے سے ایک مہینے پہلے ہی مجھے وہاں بھیج دیا۔

میں ایک ملازم کو ساتھ لے کر علی گڑھ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ چار ہوسٹل پاس پاس تھے جن کو منٹو سرکل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ خالی پڑے تھے اور خاصی دور بڑے الگ تھلگ واقع تھے۔ یہ جگہ بالکل ویران تھی۔ دو چار چوکیداروں کے سوا وہاں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بس ہم تھے یا گیدڑ، آوارہ کتے اور جنگلی جانور۔ ہم نے ایک چوکیدار سے پوچھا کہ کیا ہمیں کہیں سے دو چارپائیاں مل سکتی ہیں۔ اس نے ایک کوٹھڑی کھولی تو اس میں چارپائیاں ہی چارپائیاں بھری تھیں مگر کسی میں بھی ادوائن نہ تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ جب لڑکے گھروں کو جانے لگتے ہیں تو وہ اسباب باندھنے کے لئے چارپائیوں سے ادوائن نکال لیتے ہیں۔ غرض ہم ان بے ادوائن کی چارپائیوں ہی پر سوئے، اس طرح کہ ہمارا دھڑ تو چارپائی پر تھا اور ٹانگیں زمین پر لٹک رہی تھیں۔

ہوسٹل میں ہم دونوں تقریباً تنہا تھے۔ ہمیں کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے کافی دور چل کر جانا پڑتا تھا۔ میرے ملازم نے رائے دی کہ چونکہ یونیورسٹی ابھی مہینہ بھر تک بند رہے گی

اس لئے گھر لوٹ چلنا مناسب ہوگا - جی تو میرا بھی یہی چاہتا تھا لیکن والد صاحب کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی - بھلا میں انہیں کیسے یقین دلا سکوں گا کہ میں علی گڑھ سے بھاگ نہیں آیا ہوں - میں نے ملازم سے کہا ''نا بھائی میں واپس نہیں جا سکتا۔،، چنانچہ یونیورسٹی کے کھلنے تک میں وہیں رہا -

جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے دل میں یہاں کے لوگوں اور یونیورسٹی کی محبت گھر کرتی گئی - یونیورسٹی کئی لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی - یہاں ہندوستان کے کونے کونے نیز ایران اور افریقی ممالک سے بھی لڑکے پڑھنے آتے تھے - وہ مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے - پھر ان کی بولیاں اور زبانیں بھی جدا جدا ہوتی تھیں مگر ان سب کو علی گڑھ کے ماحول سے خود کو مانوس کرنا پڑتا تھا - ان میں سے بعض کو یہاں کی زندگی بڑی کٹھن معلوم ہوتی تھی اور وہ بھاگ جاتے تھے - لیکن جو رہ جاتے ، ان میں آپس میں مساوات بھائی بندی اور رفاقت کا گہرا احساس پیدا ہو جاتا تھا - ان میں بعض ایسے بھی تھے جو کسی صورت یونیورسٹی کو چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہتے تھے - جیسے اسلم صاحب - یہ خود تو دسویں جماعت میں تھے اور ان کا صاحب زادہ نویں میں پڑھتا تھا - وہ ہر سال باقاعدہ امتحان میں بیٹھتے تھے - جس زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ نو مرتبہ فیل ہو چکے تھے - وہ کہا کرتے ''ان سب طالب علموں میں فقط میں ہی ایسا ہوں کہ بغیر کسی ذاتی غرض کے امتحان میں شریک ہوتا ہوں۔،،

یہ جگہ اپنے اندر ایک خاص دلآویزی رکھتی تھی - مجھے اپنی ایک خامی کی وجہ سے یہاں شروع شروع میں خاصی پریشانی رہی - بات یہ تھی کہ میرا اُردو کا تلفظ اور لب و لہجہ دوسرے لڑکوں سے کسی قدر مختلف تھا اور میں اکثر مذکر و مونث کو گڈ مڈ کر دیا کرتا تھا - لڑکے اس پر ہنستے مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ ہنسی کی کیا بات ہے - بعض اوقات میں آزردہ بھی ہو جاتا - رفتہ رفتہ میں نے اپنے تلفظ کی خاصی اصلاح کر لی - ادھر وہ لوگ بھی میرے لب و لہجہ سے مانوس ہو گئے -

یونیورسٹی میں قواعد کی پابندی اور باھمی سلوک کی ذمہ داری زیادہ تر طلباء کے اپنے ھی ھاتھ میں تھی - آستادوں اور چھوٹی جماعتوں کے طالب علموں کے درمیان حقیقی رابطہ بہت کم تھا - آستاد صاحبان مہربان تھے اور ہر طرح مدد دیتے تھے - مگر ان کی توجہ زیادہ تر پڑھانے ھی پر صرف ھوتی تھی - روزمرہ کے کام جن میں کھانے پینے کا انتظام ، لباس اور لڑکوں کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ شامل تھا ، ان کی دیکھ بھال آونچی جماعتوں کے طلباء کے سپرد تھی اور یہ اس امر میں بہت سخت گیر تھے-اگر کوئی معیار یا روایات کے خلاف کوئی حرکت کرتا تو اس سے سخت باز پرس کرتے تھے -

یونیورسٹی کی زندگی میں ھنسی دل لگی کا عنصر بھی خاصا شامل تھا - ایک بڑی مقبول شرارت ''فاختہ آڑانا،، ھوا کرتی تھی - اس سے مراد یہ تھی کہ آدھی رات کو اچانک آپ کی چارپائی الٹ دی گئی اور رنگ یا غلاظت میں لت پت پڑے ھیں- میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن میری باری بھی آنے والی ھے اور میں اس کے خیال سے ڈرتا رھتا تھا - میری نیند بڑی ھلکی ھے - ایک رات میں نے کچھ یونہی سی آھٹ سنی تو میری آنکھ کھل گئی - دیکھتا کیا ھوں کہ چار پانچ لڑکے بالٹیاں اٹھائے میری چارپائی کے پاس کھڑے ھیں - میں یکبارگی ان میں سے ایک پر جھپٹ پڑا اور اسے تان کر گھونسا مارا - دوسرے لڑکے کو میں نے ایک لات لگائی - وہ لوگ اس کے لئے تیار ھو کر نہ آئے تھے - اس لئے وہ میرا غصہ دھیما کرنے کے لئے بولے ''ارے بھئی تم تو ھمارے ھی ساتھیوں میں ھو ، پھر یہ لڑنا بھڑنا کیسا؟،،

میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں نے علمی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا کچھ سیکھا ، لیکن یہ ضرور جانتا ھوں کہ میں نے وھاں دوسروں کے ساتھ مل جل کر رھنا سیکھ لیا - دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنا سیکھ گیا - علی گڑھ یونیورسٹی کی حیثیت میرے لئے ھمیشہ ایک مقدس زیارت گاہ کی سی رھی ھے -

زندگی میں آگے چل کر ایک موقع ایسا آیا کہ میں یونیورسٹی کی کسی قدر خدمت کر سکا - یہ سنہ ۱۹۳۱ء کی بات ھے جب میں

حیدر آباد میں انگریز ریزیڈنٹ کا ایڈی کانگ تھا - سر راس مسعود علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے - وہ نظام سے یونیورسٹی کے لئے عطیہ لینے حیدر آباد آئے - نظام برطانیہ کے اس قدر زیر اثر تھے کہ ریزیڈنٹ کی اجازت کے بغیر کسی کام کی جرأت نہ کرتے تھے - راس مسعود ریزیڈنٹ سے ملنے آئے مگر اس کا رویہ ہمدردانہ نہ پایا - کچھ عرصے کے بعد وہ پھر آئے - اب کے مجھے ان سے ملاقات کا موقع مل گیا - یونیورسٹی کے لئے ان کے دل میں جو درد تھا اس سے میں بہت متاثر ہوا - ادھر ریزیڈنٹ سر راس مسعود سے اب کچھ جزبز سا ہونے لگا تھا - میں نے موقع پا کر اس سے کہا ''آپ شاید یہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ شخص پیچھے پڑ گیا ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے دل میں یونیورسٹی کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے - اس یونیورسٹی کو اس کے دادا نے قائم کیا تھا - پھر اس کے والد نے بھی ساری عمر وہیں گزار دی تھی - نظام اپنا روپیہ ضائع ہی کریں گے کیوں نہ انہیں ایک اچھے مقصد کے لئے کچھ خرچ کرنے کا موقع دیا جائے -،،

آخر میں ریزیڈنٹ مان گیا اور سر راس کو نظام سے مطلوبہ چندہ مل گیا - اس واقعے سے سر راس مسعود کے ساتھ میرے خاصے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے - میں اکثر ان سے ملنے جایا کرتا - وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن ہمیشہ التفات سے پیش آتے - ایک دفعہ میں نے انہیں لکھا کہ مسلمانوں میں سپاہ گری کا اعلیٰ جوہر موجود ہے - یونیورسٹی کو چاہئے کہ وہ طلباء کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹریننگ کور میں شامل ہونے کی ترغیب دے تاکہ فوج کے لئے موزوں نوجوان مہیا کئے جا سکیں -

علی گڑھ میں میرے قیام کے آخری دنوں میں ایک کمیشن یونیورسٹی آیا - اس کے سربراہ جنرل سکین تھے جو فوج کے ایڈجوٹنٹ جنرل تھے - ان کے ساتھ دو تین ہندوستانی افسر بھی تھے - ان لوگوں کو ایسے نوجوانوں کی تلاش تھی جنہیں فوج میں بطور افسر بھرتی کیا جا سکے - اس زمانے میں ملک میں اس بات پر کافی ہیجان تھا کہ ہندوستانیوں کو فوج میں مناسب نمائندگی نہیں

دی جاتی - جنرل سکین اور ان کے مشیروں نے اسٹریچی ہال میں ایک عام دربار کیا - یہ سنہ ۱۹۲۶ء کے ابتدائی زمانے کی بات ہے - میں اس وقت یونیورسٹی کی ٹریننگ کور کا ایک ممبر تھا - جنرل سکین نے مجھ سے پوچھا ''کیا تم فوج میں جانا پسند کرو گے؟،، میں نے کہا ''ضرور پسند کروں گا،، پوچھنے لگے ''کیوں؟،، اس پر میں نے اپنے خاندانی حالات بیان کئے اور اپنے والد کی فوجی خدمات کا ذکر کیا - کہنے لگے ''تم عرضی بھیجو،، - اس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے اور پھر صوبے کے گورنر نے میرا انٹرویو لیا - آخری امتحان اور انٹرویو شملہ میں لئے گئے جو گرمیوں میں فوج کا صدر دفتر ہوا کرتا تھا -

میجر ڈین نے جو انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل تھے مجھے سینڈھرسٹ کے امتحان کے لئے تیار کیا - یہ صورت ایک عجیب اتفاق سے پیدا ہوئی - ایک دن جب میں کلاس روم سے باہر نکل رہا تھا تو میجر ڈین نے مجھے غلام گردش میں روک لیا اور چلا کر کہا ''تم ابھی تک یہیں ہو - میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ فوراً چلے جاؤ؟،، میں بھونچکا رہ گیا - میں نے کہا ''آپ نے مجھ سے ایسا کبھی نہیں کہا تھا - آخر میں کیوں چلا جاؤں ، میں نے کیا قصور کیا ہے؟،،

اب میجر ڈین کی باری بھونچکا ہونے کی تھی - انہوں نے چار پانچ طالب علموں سے میری شناخت کرائی اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا - واقعہ یوں تھا کہ کسی اور لڑکے کو جس کی صورت مجھ سے ملتی جلتی تھی یونیورسٹی سے نکالا گیا تھا -

میجر ڈین بہت سٹ پٹائے - وہ چاہتے تھے کہ کوئی موقع ملے تو اپنی اس حرکت کی تلافی کریں - ایک دن جب ہم دینیات کا درس لے رہے تھے تو وہ جماعت میں داخل ہو کر میرے پاس آ کھڑے ہوئے - ہمارے مولوی صاحب کی توند بہت نکلی ہوئی تھی اور ڈاڑھی بھی بڑی تھی جس سے وہ بالکل ''سانٹا کلاز،، معلوم ہوتے تھے - وہ ہمیں بس واجبی ہی سا پڑھایا کرتے تھے- میجر ڈین ان سے کہنے لگے ''مولانا صاحب! مہربانی کر کے ذرا اپنا لیکچر بند کیجئے-،، پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولے ''اس دن جو مجھ سے وہ بے وقوفی کی بات ہو گئی تھی میں اس کی تم سے معافی چاہتا ہوں-،،

میجر ڈین نے مجھے سینڈ ہرسٹ کے امتحان کے لئے تیار کرنے کا ذمہ لیا - وہ ہرروز اپنا دو تین گھنٹے کا وقت مجھ پر صرف کرتے - یہ سلسلہ تین چار مہینے تک جاری رہا - وہ میرے کام میں نہایت دل چسپی لیتے تھے - اس وقت تک میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا تھا - چنانچہ وہ یا تو میرے کمرے میں آ جایا کرتے یا مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاتے -

آخر جون سنہ ۱۹۲۶ء میں مجھے اطلاع ملی کہ مجھ کو سینڈ ہرسٹ میں داخلے کے لئے چن لیا گیا ہے - قدرتی طور پر میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا - ساتھ ہی اس بات پر بھی میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب مجھے بی-اے کا امتحان نہیں دینا پڑے گا -

اپنے ذاتی جذبات اور فوج میں اپنی دل چسپی سے قطع نظر میں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ بہت کم ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کو فوج میں کمیشن دیا گیا ہے - میں جانتا تھا کہ جب ہمیں آزادی ملے گی تو ہمیں اس کی حفاظت کرنا بھی لازم ہوگا - اور اس طرح میری سینڈ ہرسٹ کی فوجی تربیت سے میرا ملک پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گا -

سینڈ ہرسٹ جانے کا فیصلہ میں نے خود کیا تھا - والد صاحب کی رائے یہ تھی کہ پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں اور پھر اپنے لئے پیشے کا انتخاب کروں - ایک اور بات جس سے وہ پریشان تھے یہ تھی کہ اس تعلیم کا خرچ بہت زیادہ تھا - مجھے سینڈ ہرسٹ کے کورس کے لئے کوئی پچیس ہزار روپے کی ضرورت تھی - میرے والد کو زمینوں سے کافی آمدنی ہوتی تھی لیکن ان کی کئی اولادیں تھیں جن کو تعلیم دلانا ضروری تھا - اس لئے اتنی بڑی رقم صرف مجھ پر صرف کر دینا آسان بات نہ تھی - انھوں نے اس مسئلے کا وہ حل سوچا جو وہی سوچ سکتے تھے - کہنے لگے ''میں اپنی ساری زمینیں اور جائداد بیچ ڈالوں گا تاکہ تمھاری آرزو پوری ہو جائے -'' خوش قسمتی سے میں سینڈ ہرسٹ میں بہت کامیاب رہا - میں نے کئی وظیفے حاصل کئے - چنانچہ اس قربانی کی ضرورت ہی نہ پڑی -

دوسرا باب

فوجی زندگی کا ابتدائی دور

میں جولائی سنہ ۱۹۲۶ء میں انگلستان روانہ ہوا - مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب میں سینڈھرسٹ جانے کے لئے بمبئی سے جہاز ایس-ایس-راول پنڈی میں سوار ہوا تو میرے جوش و خروش کی حد نہ تھی - یہ مون سون کا زمانہ تھا - جیسے ہی جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا موسم طوفانی ہو گیا - بہت سے مسافروں کو متلی ہونے لگی میں بھی ان ہی لوگوں میں تھا - میں نے اپنا بستر اٹھایا اور عرشے پر پہنچ گیا اور تین دن اور تین راتیں وہیں گزاریں یہاں تک کہ ہم عدن پہنچ گئے - اس کے بعد ہر بات میں بڑے ڈرامائی انداز سے تبدیلی ہو گئی - موسم اچھا ہو گیا ، سمندر میں سکون آ گیا اور ہم کو سفر میں مزا آنے لگا -

جب ہم سینڈھرسٹ پہنچے تو کالج ابھی کھلا نہیں تھا - ہمیں دس روز تک ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رہنا پڑا - جس کا نام ڈیوک آف یارک تھا - اس ہوٹل کا انتظام ایک بوڑھی خاتون کے ہاتھ میں تھا - ان خاتون کی انتہائی کوشش تھی کہ ہم لوگ یہاں قاعدے سے رہیں - چنانچہ وہ دن رات ہمیں نصیحتیں کیا کرتیں اور لمبے لمبے لکچر دیا کرتیں کہ ہم لوگوں کو کیا کیا باتیں کرنی چاہئیں اور کیا نہ کرنی چاہئیں - مجھے یاد ہے ہم نے سمجھ لیا تھا کہ ہمیں انگلستان میں بہت ہی احتیاط سے اور بہت ہی سنبھل کر رہنا ہوگا -

یہ تو مجھے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ سینڈھرسٹ کی زندگی آسان

نہ ہوگی ۔ لیکن یہ جس قدر سخت نکلی اس کا ہم میں سے کسی کو گمان نہ تھا ۔ پہلے پہل تو مجھے شک گزرا کہ میں اتنی محنت برداشت بھی کر سکوں گا یا نہیں ۔ لیکن جلد ھی میں نے خود کو یہاں کے حالات کے مطابق ڈھال لیا ۔

میری جسمانی صحت اعلیٰ درجے کی تھی ۔ اس پر سینڈھرسٹ کی محنت مشقت کی زندگی نے مجھے اور بھی چاق و چوبند بنا دیا اور میں پندرہ میل کی دوڑ سے بھی لطف لینے لگا ۔ ھمارے قیام کے پہلے دو ہفتوں میں اوپر کے درجے کے کیڈٹوں نے ھمیں ھتھیاروں کے ساتھ قواعد کا نمونہ دکھایا ۔ ھم ان کی ھنر مندی اور چابک دستی پر ششدر رہ گئے ۔ لیکن ایک ھی مہینے کے اندر جب ھمارا ان سے مقابلہ ھوا تو ھم نے ان سے بازی جیت لی ۔

اگرچہ وھاں کی زندگی بڑی جفا کشی کی تھی لیکن کبھی کبھی اس میں خوش دلی کے موقعے بھی نکل آتے تھے ۔ میرا ایک اردلی تھا جس کا نام کنگ تھا ۔ وہ سر سے پیر تک انگلستان کا روایتی ”بوڑھا سپاھی،، تھا ۔ ایک دفعہ ھم رات کے نو بجے تک پریڈ کرتے رہے ۔ رات کا کھانا کھا کر میں وردی سمیت ھی بستر پر لیٹ گیا ۔ تھکا ھارا تھا ھی ، جلد نیند آ گئی ۔ صبح کو جب کنگ آیا تو اس نے مجھے باوردی گہری نیند سوتے ھوئے پایا ۔ اس پر وہ حیران ھو کر (اپنے فوجی روز مرہ میں) کہنے لگا ، مسٹر خان! یہ بلڈی افسری تم سے نہیں چل سکتی پھر اس نے مجھے بستر سے اٹھایا اور صبح کی پریڈ کے لئے تیار کرایا ۔

اس زمانے میں سینڈھرسٹ میں ھندوستانی کیڈٹوں کا اچھا خاصا جتھا جمع ھو گیا تھا ۔ ھم سب مل جل کر رھا کرتے تھے ۔ یہ تو ھم نے محسوس کر ھی لیا تھا کہ یہاں ھم کو گھٹیا درجے کی قوم سمجھا جاتا ھے ۔ انگریز دوسرے ملکوں کی طرح کھلم کھلا رنگ اور نسل کے امتیاز کو روا نہیں رکھتے لیکن دل میں اس کا اتنا ھی احساس رکھتے ھیں ۔ ان دنوں جب کسی محکوم قوم کا کوئی شخص وھاں جاتا تھا تو اس کو کم تر درجے کا انسان سمجھتے تھے ۔ مجھے یہ حقیقت بڑی تلخ معلوم ھوتی تھی خصوصاً انگلستان کی آزاد فضا



(۱) مصنّف کے والد رسالدار میجر میرداد خان



(۲) مصنف سینڈہرسٹ سے فارغ ہونے پر سیکنڈ لیفٹیننٹ

میں محکوم قوم کی یہ الم ناک کیفیت ہمیں بہت افسردہ کرتی تھی۔ برطانوی افسروں کے ساتھ میرے تعلقات عموماً تکلف کی حد میں رہے۔ میں فطری طور پر خاموش اور تنہائی پسند تھا۔ اس پر سینڈ ہرسٹ میں علیحدگی کا احساس جس کا سب کو تجربہ ہوتا تھا مجھے انگریزوں سے میل جول بڑھانے سے باز رکھتا تھا۔ ویسے اپنے ہم عمروں کے ساتھ ہم بہت خوش تھے۔ خوب ہنسی مذاق اور اچھل کود کرتے لیکن ہمارے درمیان ذہنی ربط کبھی پیدا نہیں ہوا۔

سینڈ ہرسٹ میں میں پہلا غیر ملکی کیڈٹ تھا جس کو ترقی دے کر کارپورل بنایا گیا اور دو فیتے دئے گئے۔ یہ ترقی جس طرح عمل میں آئی اس کا بیان دل چسپی سے خالی نہیں۔ کمپنی کے سارجنٹ میجر نے حسب معمول اپنے اکھڑ لہجے میں مجھ سے کہا ''مسٹر خان! تم ٹھیک ساڑھے دس بجے کمانڈنٹ کے دفتر میں حاضر ہو جاؤ۔''

کمانڈنٹ تھا میجر جنرل اور بے چارہ مسٹر خان تھا ایک معمولی کیڈٹ۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا کہ نہ جانے مجھ سے کیا قصور ہوا ہے اور اب مجھ سے کیا سلوک کیا جائے گا، کمانڈنٹ کے دفتر میں پہنچا۔ میرے سامنے ایک میز کے پاس میجر جنرل اپنا پورا رسمی لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ اسسٹنٹ کمانڈنٹ بھی تھا جو ایک پورا کرنل تھا اور میری کمپنی کا کمانڈر بھی۔ میں ان کے سامنے فوجی قاعدے سے تن کر کھڑا ہو گیا مگر دل میں دھکڑ پکڑ موجود تھی۔ آخر کمانڈنٹ نے بڑے گنبھیر لہجے میں مجھ سے یوں خطاب کیا۔

''جنٹل مین کیڈٹ ایوب خان! تم کو ایک بھاری ذمہ داری سونپی جا رہی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔ آج ہم نے اپنی پرانی روایت کو توڑ کر تم کو دو فیتے دینے اور کارپورل بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم یہ تجربے کے طور پر کر رہے ہیں تاکہ دیکھیں کہ غیر ملکی کیڈٹ اس ذمہ داری کے بھاری بوجھ کو اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ دل میں سوچتا تھا خدا جانے یہ ذمہ داری

نیا ہوگی - لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ذمہ داری جو اس قدر پر وقار انداز سے مجھے سونپی گئی ہے اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی کہ جہاں اور کیڈٹوں کی رائفلوں کا معائنہ ہر روز ہوا کرے گا وہاں میری رائفل پر یہ پابندی عائد نہ ہوگی - مجھے کسی پر کمان حاصل نہ تھی - مجھے محض ایک اعزازی کارپورل بنایا گیا تھا اور کسی برطانوی کیڈٹ کو میرے ماتحت نہیں رکھا گیا تھا - یہ تھا لب لباب اس بھاری ذمہ داری کا جس سے میری عزت افزائی کی گئی تھی - میں اپنے اور فرائض تو باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتا رہا لیکن رائفل کی طرف سے غفلت برتنے لگا - ادھر دوسرے کیڈٹوں نے ہر روز لگاتار اپنی رائفلوں کی نالیوں کو پالش کر کر کے شیشے کی طرح چمکا دیا تھا -

ایک دن وہ افسر جو ہمارے ہتھیاروں کا معائنہ کیا کرتا تھا اچانک آ دھمکا اور ہماری رائفلوں کا معائنہ کرنے لگا - اس نے بہت سے کیڈٹوں کی رائفلوں کو ناکارہ قرار دے دیا کیونکہ روز روز پالش کرنے اور رگڑنے سے ان کی نالیاں کافی گھس گئی تھیں - میری رائفل کچھ میلی تو ضرور تھی مگر کارآمد تھی -

سینڈہرسٹ میں ہمیں محنت تو بہت کرنی پڑی مگر ہمارا وقت دل چسپی سے کٹا - ہمیں بہت سی چھٹیاں ملتی تھیں - اور ہمارا ایک جتھا جس میں زیادہ تر ہندوستانی کیڈٹ تھے اکثر سیر و سیاحت کے لئے یورپ اور عام طور پر فرانس اور سوئٹزرلینڈ جایا کرتا تھا - میں نے اس سیر و سفر کو تعلیمی لحاظ سے بہت مفید پایا -

کیڈٹوں میں سے میری کسی سے گہری دوستی نہ تھی - یوں ناصر ، بھونسلے ، ناگر اور کئی اور لوگوں سے میری خوب جان پہچان تھی - چودھری جو بعد میں انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف بنے اسی فوجی دستے میں تھے جس میں میں تھا - وہ ایک اچھے اور محنتی کیڈٹ تھے - لیکن کسی وجہ سے ہندوستانی کیڈٹوں میں چنداں مقبول نہ تھے -

میں نے اپنے امتحانوں میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی - میں

ایک سو تیئیس کیڈٹوں کی جماعت میں ساٹھویں نمبر پر پاس ہوا۔ ہندوستانی کیڈٹوں میں میں سب سے اول رہا۔ ممکن ہے اس کا باعث یہ ہو کہ مجھے کارپورل کا اعزاز حاصل تھا۔ اور سینڈھرسٹ میں طالب علم کی قابلیت کا اندازہ اس کے سارے کام کو دیکھ کر نیز کمان کرنے کی صلاحیت سے لگایا جاتا تھا۔

امتحان کا نتیجہ نکلنے سے کوئی ایک مہینہ پہلے میں سوئٹزرلینڈ میں چھٹیاں گزار رہا تھا کہ مجھے والدہ صاحبہ کا ایک خط ملا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تمھارے والد صاحب انتقال کر گئے۔ اس خط سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس خبر کے مجھ تک پہنچنے سے تین مہینے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ انھوں نے ستمبر سنہ ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا تھا اور یہ خط مجھے دسمبر میں ملا تھا۔ یہ بڑا سخت واقعہ تھا۔ بعد میں مجھے اور تفصیلات بھی معلوم ہوئیں۔ انتقال سے کچھ عرصے پہلے والد صاحب کی بینائی موتیا بند سے قریب قریب جاتی رہی تھی اور وہ میرے نام اپنے خط دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے مجھے خط بھیجا کرتے تھے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے بیٹے کو جب تک وہ سینڈھرسٹ میں اپنی تعلیم پوری نہ کر لے اس کی اطلاع نہ دی جائے۔ مگر خط ہر ہفتے باقاعدگی سے لکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے یہ اطلاع ان کی وفات کے تین مہینے بعد ملی۔

والد صاحب کے فوت ہونے کا میرے دل کو سخت صدمہ ہوا۔ مجھے ان ذمہ داریوں کا احساس تھا جو خاندان کا سربراہ بن جانے سے اور خاص کر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہو گئی تھیں۔ میں انچارج افسر کے پاس پہنچا جو ہم میں سے بعض کیڈٹوں کے سرپرست کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس سے صلاح لی۔ اس نے انڈیا آفس سے پوچھا۔ انڈیا آفس نے دفتر جنگ سے مشورہ کیا دفتر جنگ نے اس امر کی تصدیق کی کہ میں اپنے امتحانوں میں کامیاب رہا ہوں اور مجھے کمیشن دیا جائے گا۔

مجھے چھ ہفتے کی رخصت دی گئی تاکہ میں وطن جا سکوں۔

لی ہوگی - لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ذمہ داری جو اس قدر پر وقار انداز سے مجھے سونپی گئی ہے اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی کہ جہاں اور کیڈٹوں کی رائفلوں کا معائنہ ہر روز ہوا کرے گا وہاں میری رائفل پر یہ پابندی عائد نہ ہوگی - مجھے کسی پر کمان حاصل نہ تھی - مجھے محض ایک اعزازی کارپورل بنایا گیا تھا اور کسی برطانوی کیڈٹ کو میرے ماتحت نہیں رکھا گیا تھا - یہ تھا لب لباب اس بھاری ذمہ داری کا جس سے میری عزت افزائی کی گئی تھی - میں اپنے اور فرائض تو باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتا رہا لیکن رائفل کی طرف سے غفلت برتنے لگا - ادھر دوسرے کیڈٹوں نے ہر روز لگاتار اپنی رائفلوں کی نالیوں کو پالش کر کر کے شیشے کی طرح چمکا دیا تھا -

ایک دن وہ افسر جو ہمارے ہتھیاروں کا معائنہ کیا کرتا تھا اچانک آ دھمکا اور ہماری رائفلوں کا معائنہ کرنے لگا - اس نے بہت سے کیڈٹوں کی رائفلوں کو ناکارہ قرار دے دیا کیونکہ روز روز پالش کرنے اور رگڑنے سے ان کی نالیاں کافی گھس گئی تھیں - میری رائفل کچھ میلی تو ضرور تھی مگر کارآمد تھی -

سینڈھرسٹ میں ہمیں محنت تو بہت کرنی پڑی مگر ہمارا وقت دلچسپی سے کٹا - ہمیں بہت سی چھٹیاں ملتی تھیں - اور ہمارا ایک جتھا جس میں زیادہ تر ہندوستانی کیڈٹ تھے اکثر سیر و سیاحت کے لئے یورپ اور عام طور پر فرانس اور سوئٹزرلینڈ جایا کرتا تھا - میں نے اس سیر و سفر کو تعلیمی لحاظ سے بہت مفید پایا -

کیڈٹوں میں سے میری کسی سے گہری دوستی نہ تھی - یوں ناصر، بھونسلے، ناگر اور کئی اور لوگوں سے میری خوب جان پہچان تھی - چودھری جو بعد میں انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف بنے اسی فوجی دستے میں تھے جس میں میں تھا - وہ ایک اچھے اور محنتی کیڈٹ تھے - لیکن کسی وجہ سے ہندوستانی کیڈٹوں میں چنداں مقبول نہ تھے -

میں نے اپنے امتحانوں میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی - میں

ایک سو تیئیس کیڈٹوں کی جماعت میں ساٹھویں نمبر پر پاس ہوا۔ ہندوستانی کیڈٹوں میں میں سب سے اول رہا۔ ممکن ہے اس کا باعث یہ ہو کہ مجھے کارپورل کا اعزاز حاصل تھا۔ اور سینڈھرسٹ میں طالب علم کی قابلیت کا اندازہ اس کے سارے کام کو دیکھ کر نیز کمان کرنے کی صلاحیت سے لگایا جاتا تھا۔

امتحان کا نتیجہ نکلنے سے کوئی ایک مہینہ پہلے میں سوئٹزر لینڈ میں چھٹیاں گزار رہا تھا کہ مجھے والدہ صاحبہ کا ایک خط ملا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تمھارے والد صاحب انتقال کر گئے۔ اس خط سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس خبر کے مجھ تک پہنچنے سے تین مہینے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ انھوں نے ستمبر سنہ ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا تھا اور یہ خط مجھے دسمبر میں ملا تھا۔ یہ بڑا سخت واقعہ تھا۔ بعد میں مجھے اور تفصیلات بھی معلوم ہوئیں۔ انتقال سے کچھ عرصے پہلے والد صاحب کی بینائی موتیا بند سے قریب قریب جاتی رہی تھی اور وہ میرے نام اپنے خط دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے مجھے خط بھیجا کرتے تھے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے بیٹے کو جب تک وہ سینڈھرسٹ میں اپنی تعلیم پوری نہ کر لے اس کی اطلاع نہ دی جائے۔ مگر خط ہر ہفتے باقاعدگی سے لکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے یہ اطلاع ان کی وفات کے تین مہینے بعد ملی۔

والد صاحب کے فوت ہونے کا میرے دل کو سخت صدمہ ہوا۔ مجھے ان ذمہ داریوں کا احساس تھا جو خاندان کا سربراہ بن جانے سے اور خاص کر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہو گئی تھیں۔ میں انچارج افسر کے پاس پہنچا جو ہم میں سے بعض کیڈٹوں کے سرپرست کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس سے صلاح لی۔ اس نے انڈیا آفس سے پوچھا۔ انڈیا آفس نے دفتر جنگ سے مشورہ کیا دفتر جنگ نے اس امر کی تصدیق کی کہ میں اپنے امتحانوں میں کامیاب رہا ہوں اور مجھے کمیشن دیا جائے گا۔

مجھے چھ ہفتے کی رخصت دی گئی تاکہ میں وطن جا سکوں۔ یہ

سنہ ۱۹۲۷ء کی سردیوں کا زمانہ تھا ۔ میں ''نیوریلیا،، نامی جہاز میں سوار ہوا ۔ مجھے عدن اور بمبئی کے درمیان کا سفر بخوبی یاد ہے ۔ سمندر ایک مصنوعی جھیل کی طرح ساکن اور خاموش تھا ۔ میں دن بھر مچھلیوں کا تماشا دیکھتا جو قسم قسم اور رنگ رنگ کی تھیں ۔ وہ ایک خاص ادا سے پانی سے اچھلتیں اور پھر ذرا بھی آواز پیدا کئے بغیر ڈبکی لگا جاتیں ۔ رات کو میں عرشے پر کھڑا سمندر پر نظریں دوڑایا کرتا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے جادو کے زور سے سمندر کو چمکا رکھا ہے ۔ رات کے سناٹے اور سمندر کی رنگا رنگ پنہائیوں کے درمیان والد صاحب کا غم برابر میرے دل پر ایک بھاری بوجھ کی طرح طاری رہتا ۔

جب میری چھٹی ختم ہوئی تو مجھے ایک برطانوی رجمنٹ میں بھیجا گیا جس کا نام رائل فیوزیلیئرز تھا اور جو انبالہ میں تعینات تھی یہ چھوٹے افسروں کے لئے ہندوستانی فوج میں شامل ہونے سے پہلے ایک آزمائشی دور تھا ۔ اور برطانوی افسروں کو اس میں شامل ہونے سے اس بات کی مہلت بھی مل جاتی تھی کہ ہندوستانی دستوں میں اپنے تقرر سے پہلے اردو سیکھ لیں ۔ رائل فیوزیلیئرز میں جو فوجی بھرتی کئے گئے تھے وہ زیادہ تر لندن اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے رہنے والے تھے ۔ تھے تو وہ شہری مگر بڑے قابل سپاہی تھے ۔ آب و ہوا کی خرابی اور علاقے کی دشواریوں کے باوجود ان کی قاعدے قانون کی پابندی اور ان کا طور طریقہ حد درجہ قابل تعریف تھا ۔ برطانوی افسر بڑے زندہ دل لوگ تھے اور میری ان سے خوب اچھی نبھی ۔ ان کے کمانڈنگ افسر بھی بڑے قابل تھے ۔ اور ان میں سے بعض سے میری بڑی دوستی ہو گئی ۔ جب میرا تقرر انڈین آرمی میں ہوا تو میرے کمانڈنگ افسر نے میرے متعلق رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص خواہ کسی فوج میں ہو بہت اچھا افسر ثابت ہوگا ۔

میری ملازمت کے شروع میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ۔ ہر سال ہر فوجی دستے کو بریگیڈ کمانڈر کی تجویز کردہ ایک مشق میں حصہ لینا پڑتا تھا جس سے دستہ کمانڈر کی قابلیت کا امتحان مقصود ہوتا تھا ۔ ہم اورنگ آباد میں تھے اور یہ میری ملازمت کا

غالباً تیسرا سال تھا - مجھے ''دشمن،، فوج کی کمان دی گئی - اس موقع پر دو مشقیں ہونے والی تھیں - میرے کمانڈنگ افسر کے ہاتھ میں ''ملکی،، فوج کی کمان تھی - میں نے دونوں مشقوں میں اسے گھیر لیا اور ایسا بے بس کر دیا کہ اس کی کوئی تدبیر نہ چل سکی - آخر میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں بریگیڈ کمانڈر نے ان مشقوں پر اور بٹالین کمانڈر کی کارروائی پر تبصرہ کیا - اس نے بتایا کہ کہاں کہاں حالات قابو سے باہر ہوئے اور کہاں کہاں صحیح کارروائی عمل میں لائی گئی- پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''دشمن فوج کے کمانڈر کا کام حقیقی معنوں میں قابل تعریف تھا-،،

اس کے بعد میرے کمانڈنگ افسر نے مجھے کبھی نہیں بخشا - میں جو کام بھی کرتا اسے اس میں نقص ہی دکھائی دیتے - بجائے اس کے کہ وہ کھلاڑیوں کی سی عالی ظرفی دکھا کر اس واقعے کو بھول جاتا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا اور کوئی دو برس تک مجھے چین نہ لینے دیا -

انڈین آرمی میں میری پہلی رجمنٹ ''پہلی چودھویں پنجاب،، تھی جو رنجیت سنگھ کے ایک دستے کو ترقی دے کر بنائی گئی تھی - سکھ اسے ''شیر دَل،، بٹالین کے نام سے پکارتے تھے - بعد میں ہم نے اس کا نام بدل کر ''شیر دِل،، رکھ دیا - برٹش انڈین آرمی کے اور بہت سے دستوں کی طرح اس کے بھی چار گروپ یا حصے تھے - پٹھان، پنجابی مسلمان، سکھ اور ڈوگرے - ان سب کی تعداد برابر تھی -

میرے ساتھیوں میں کئی انڈین افسر تھے - ایک مرحوم کرنل خورشید تھے جو پاکستان بننے کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پہلے گورنر مقرر ہوئے - ان کے علاوہ کرنل اے-ایس-بی شاہ اور ڈھلون بھی تھے جو بعد ازاں انڈین آرمی میں جرنیل کے عہدے تک پہنچ گئے -

مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ نچلے درجے کے انگریز افسر اور اونچے درجے کے ہندوستانی افسر ایک دوسرے سے پرخاش رکھتے ہیں - ادھر سیاسی طور پر ملک آہستہ آہستہ آزادی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا - چنانچہ دونوں گروہوں کے درمیان شک و [illegible] کا ہونا

قدرتی بات تھی - ہندوستانی افسر بدلتے ہوئے حالات سے گہری دلچسپی لے رہے تھے اور جب انڈین نیشنل کانگرس نے آزادی کے لئے اپنی جد و جہد سرگرمی کے ساتھ شروع کر دی تو ہم مسلمانوں نے سوچنا شروع کیا کہ ہمارا انجام کیا ہوگا؟ جہاں تک ہمارا تعلق تھا آزادی کا مطلب ہمارے لئے انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے نجات حاصل کرنا تھا -

اس سیاسی احساس کے باعث جو کشیدگی پیدا ہو گئی تھی وہ صرف افسروں تک ہی محدود تھی - عام فوجی جوانوں میں بڑا بھائی چارہ تھا - ان میں جھگڑا عموماً ترقی کے سوال پر پیدا ہوتا تھا - چنانچہ ٹھیک تقسیم کے وقت تک فوج میں بڑی یک جہتی رہی - یہاں تک کہ شروع شروع میں جو ہندو مسلم فساد ہوئے فوج کے عام سپاھیوں نے ان کا کوئی اثر نہیں لیا - البتہ جب یہ واضح ہو گیا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد دو آزاد ملک بنیں گے اور فوج کو تقسیم کیا جائے گا تو فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھے - تقسیم کے وقت جب اندھا دھند قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو عام سپاھیوں کے دل میں فرقہ وارانہ جذبات سخت مشتعل ہو گئے تھے اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں دونوں فرقوں میں کھلم کھلا جنگ نہ شروع ہو جائے مگر شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی -

انگریز اور ہندوستانی افسر ایک دوسرے سے جو بغض رکھتے تھے وہ کئی طریقوں سے ظاہر ہوتا تھا اور بعض اوقات معمولی معمولی باتوں پر دیکھنے میں آتا تھا، مثلاً کھانے پینے پر کیونکہ انگریز افسر ہمیں ہمارا من بھاتا کھانا نہیں دیتے تھے - خاص طور پر سالن جو صرف پیر جمعرات اور اتوار کے روز ہمیں ملا کرتا تھا - اسی طرح موسیقی پر جھگڑا تھا، کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ میس میں مغربی گانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی گانوں کے ریکارڈ بھی بجائے جائیں - ایک موقع پر کچھ ہندو اور سکھ افسروں نے بعض انگریز افسروں کا بائیکاٹ کرنے کے لئے ایک جلسہ کر ڈالا - میں نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑنا نہیں چاہئے۔

ان اختلافات کے باوجود انڈین آرمی بڑی تربیت یافتہ منظم اور

طاقت ور فوج تھی - جب ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑی تو یہ فوج بڑی تیزی سے بڑھنی اور پھیلنی شروع ہوئی - میں بنوں میں، جو شمال مغربی سرحد پر واقع ہے چند دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا تھا کہ جرمنی کے پولینڈ پر حملہ کرنے کی خبر آئی اور ہم نے جان لیا کہ بس اب عالمی جنگ چھڑنے ہی والی ہے - جلد ہی ہم سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے -

فوج میں تیزی سے اضافہ ہونے کی وجہ وہ ذمہ داریاں تھیں جو مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے تعلق سے اس پر عائد ہوتی تھیں - مجھے ایک علاقائی بٹالین تیار کرنے کے لئے نئی دھلی بھیجا گیا - اس کے بعد میں کوئٹہ کے سٹاف کالج میں داخل ہوا اور جب میں نے اپنا کورس ختم کر لیا تو مجھے آرمی ھیڈ کوارٹرز دھلی میں سٹاف آفیسر مقرر کیا گیا -

اس کے بعد میری تبدیلی ''۱۰- کور،، کے ھیڈ کوارٹرز میں ہوئی جو کلکتہ سے ذرا باہر بارک پور کے مقام پر واقع تھا - اس جگہ ہم گورنر ہاؤس کے دفتر میں بیٹھ کر ہندوستانیوں کو جاپانیوں کے حملے سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچتے - اس علاقے کی آب و ہوا گرم اور مرطوب تھی - جب میں نے ہندوستان کے اس حصے کو گھوم کر دیکھا تو یہ مجھے ذرا پسند نہ آیا اور مجھے اس سے وحشت سی ہونے لگی - عجیب بات یہ ہے کہ کئی سال بعد جب میں جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر ہو کر مشرقی پاکستان پہنچا تو اس علاقے نے میرے دل کو موہ لیا -

جن دنوں ''۱۰- کور،، جاپانیوں سے لڑنے کے لئے اراکان میں داخل ہوئی تو میں پہلی آسام رجمنٹ کا نائب کمانڈر مقرر ہوا تھا - اس میں ناگا لوگ بھی شامل تھے جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد بڑی سختیاں اٹھانی پڑیں - ہم برما پہنچے اور جیسے ہی دریائے چندوِن کو پار کر کے دریائے ایراودی کی طرف بڑھے ، جاپانیوں سے ہماری بڑی گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی - ایراودی کو عبور کرنے کے بعد ہم لڑتے بھڑتے مانڈلے پہنچ گئے - یہ جنگل میں بڑی تند و تیز دست بدست لڑائی تھی -

وہاں بارش لگاتار ہوتی رہتی تھی اور جب ہمارے خیمے بہت بھیگ جاتے تو ہم ان بھٹوں میں پناہ لیتے جو دشمن کی گولہ باری سے بچنے کے لئے زمین میں کھودے گئے تھے - لیکن وہاں ہمیں مچھروں سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا - ہمارا وقت یا تو دانوں اور خراشوں کی دیکھ بھال میں کٹتا تھا یا مچھروں کو پرے ہٹانے میں - راشن عموماً کافی ملتا تھا - ایک دن صبح کو تین ڈکوٹا ہوائی جہازوں نے آسٹریلیا سے آئی ہوئی یخ مرغیاں گرائیں - جنھیں سب نے بہت مزے لے لے کر کھایا - بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مرغیاں ایک برطانوی رجمنٹ کے لئے کرسمس کے تحفے کے طور پر بھیجی گئی تھیں - اس پر بڑی جواب طلبیاں ہوئیں مگر ہم کیا کر سکتے تھے -

جاپانی لگاتار ہم پر حملے کرتے تھے اور میں اکثر اپنے ارد گرد لاشوں کے انبار دیکھا کرتا تھا - ایک دن سہ پہر کو جب خوب گولہ باری ہو رہی تھی میں نے دیکھا کہ ایک شخص عجیب سا لباس پہنے میری طرف آرہا ہے - وہ ایک امریکی سپاہی تھا - وہ پندرہ روز کی رخصت پر جانے والا تھا اور اسے کسی ایسی جاپانی چیز کی تلاش تھی جسے وہ بطور یادگار اپنے ساتھ لے جائے ، گویا بغیر اس یادگار کو ساتھ لئے چھٹی پر جانا بیکار تھا - میری جیب میں جاپانیوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈا تھا جو میں نے اسے دے دیا - وہ ایسا خوش ہوا کہ اپنی جیپ ہمارے حوالے کر گیا تاکہ ہم اسے آمد و رفت کے کام میں لا سکیں - میں نے ان حالات کے تحت تقریباً اٹھارہ مہینے کام کیا - اس کے بعد ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں میرا تبادلہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ہو گیا -

وہاں مجھے پندرھویں پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین کی کمان دی گئی جو درۂ خیبر میں لنڈی کوتل کے مقام پر متعین تھی - جب میں باہر تھا تو میرے پیچھے میری پرانی چودھویں پنجاب کی بٹالین کو ملایا بھیجا گیا تھا اور اسے جاپانیوں نے گرفتار کر لیا تھا - جب میں نے یہ خبر سنی تو دم بخود رہ گیا - ہمارے کچھ افسر جو گرفتار ہو گئے تھے انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے - یہ فوج جاپانیوں کی تحریک سے بنی تھی -

جب جنگ ختم ہوئی تو مجھے اس رجمنٹ کے تربیتی مرکز میں بھیجا گیا جو فیروز پور میں تھا تاکہ میں اپنی پرانی بٹالین کو نئے سرے سے تیار کر سکوں ۔ وہاں ان سابق جنگی قیدیوں میں سے کچھ لوگ ہم میں شامل ہونے کے لئے واپس آگئے ۔ میں نے دیکھا کہ ابھی تک ان کی جسمانی اور دماغی حالت بہت بری تھی ۔ وہ ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے ۔ اور ان کے چہروں سے بدسلوکی کے آثار نمایاں تھے ۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بہت مکار اور شکی بن گئے ہیں ۔ جنگی قیدیوں کی حیثیت سے انہیں جو تجربہ حاصل ہوا تھا اس نے انہیں بہت چوکنا اور ہوشیار بنا دیا تھا اور وہ بات چیت میں بڑی احتیاط برتتے تھے ۔

یوں تو ہم سب کی طرح ان کے لئے بھی جنگ ختم ہو چکی تھی مگر اس وقت ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایک اور کشمکش جو اب کے ہماری اپنی آزادی کے لئے ہے ، اپنے آخری مرحلے پر پہنچنے کو ہے ۔ میں اس وقت ڈیرہ دون میں آرمی سلیکشن بورڈ کا صدر تھا ۔ ہمارا کام ایسے ہندوستانی افسروں کا انتخاب تھا جنہیں برٹش انڈین آرمی میں مستقل طور پر کمیشن دیا جا سکے ۔ چونکہ اس کے لئے قابلیت کا معیار بہت اونچا رکھا گیا تھا اس لئے بہت سے امیدواروں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا ۔ اس وقت ملک کی سیاسی فضا بہت مکدر ہو چکی تھی اور اس کا اثر فوج پر بھی پڑنا شروع ہو گیا تھا چنانچہ بعض ہندو اور سکھ افسروں کی طرف سے مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں جان بوجھ کر ان کے آدمیوں کو فیل کر دیتا ہوں تاکہ وہ فوج میں افسر نہ بننے پائیں ۔ در حقیقت صدر کی حیثیت سے بھی مجھے سلیکشن بورڈ کے دوسرے ممبروں کی طرح صرف ایک ہی ووٹ حاصل تھا اور میں اپنی مرضی سے کسی امیدوار کو پاس یا فیل نہیں کر سکتا تھا ۔ اس ناخوش گواری کے باوجود مجھے سلیکشن بورڈ میں اپنا کام بہت دلچسپ معلوم ہوا کیونکہ اس کے ذریعے مجھے لوگوں کو پرکھنے کا بہت عمدہ موقع اور تجربہ حاصل ہوا ۔

لیکن سلیکشن بورڈ میں میری ملازمت کا یہ مختصر سا زمانہ اس

عارضی سکون کی طرح تھا جو طوفان سے پہلے دیکھنے میں آتا ہے ۔ ملک میں ایک دم ہولناک فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے ۔ پنجاب میں حالات بڑی تیزی سے بگڑنے لگے ۔ ۳- جون سنہ ۱۹۴۷ء کو جب ملکی تقسیم کی تجویز کا اعلان کیا گیا تو صورت حال کسی قدر بہتر ہو گئی مگر پھر جلد ھی سکھوں نے پنجاب کی اصولی تقسیم کے خلاف زوردار تحریک شروع کر دی ۔ وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ سکھوں کے علاقوں سے مسلمانوں کو نکال دینے کے بعد وہ اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر سکیں گے ۔

۲۲ - جولائی کو منگل کے دن ملکی تقسیم کی کونسل کے اراکین نے فیصلہ کیا کہ یکم اگست سے ایک خاص فوجی کمان لوگوں کی حفاظت کے لئے بنائی جائے جس کے ماتحت سیال کوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاھور، امرتسر، گورداسپور، ھوشیارپور جالندھر، فیروزپور اور لدھیانہ ھوں ۔ پنجاب کے ان شہری ضلعوں کا رقبہ ۲۹ ھزار مربع میل سے اوپر تھا ۔ اس مقصد کے لئے میجر جنرل ریس کو فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا ۔ مجھے بتایا گیا کہ میں پاکستان کی طرف سے ایک مشیر کی حیثیت سے میجر جنرل ریس کے عملے میں شامل کر لیا گیا ھوں ۔ ھندوستان کی طرف سے اسی مقصد کے لئے بریگیڈیر ڈگمبر سنگھ مقرر کئے گئے تھے ۔ اس کے علاوہ کونسل نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ۱۵ ۔ اگست کے بعد میجر جنرل ریس ''اس علاقے میں ان دونوں نئی مملکتوں کی فوجوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کریں گے ۔''

ملکی تقسیم کی کونسل کو امید تھی کہ پنجاب میں اس بونڈری فورس (سرحدی فوج) کا قیام مفید ثابت ہوگا اور اس سے حالات پر قابو پایا جا سکے گا ۔ لیکن اسے اس تباھی اور غارت گری کی خبر نہ تھی جو سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی ۔ سکھوں کی تحریک نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اچانک نہایت تشدد آمیز اور خطرناک صورت اختیار کر لی ۔ انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کے ھتھیار بند مسلح دستے ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں گردش کرتے رہتے اور مسلمانوں پر حملے کر کر کے انھیں

پاکستان کی طرف بھگاتے رہتے۔ پہلی جھڑپ ۴۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو ضلع امرتسر کے مقام مجیٹھہ میں ہوئی۔ مسلمانوں کے دو گاؤوں کو گھیر لیا گیا اور جلا کر خاک کر دیا گیا۔ بہت سے آدمی مارے گئے۔ یہاں سے سکھوں کے دستے ترن تارن پہنچے اور وہاں بھی بے دریغ مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ ۱۴۔اگست کو مشرقی پنجاب اور خصوصاً امرتسر میں مسلمان پولس کے عملے کو نہتا کر دیا گیا۔ یہ گویا اشارہ تھا کھلی غارت گری اور مسلمانوں کے قتل عام کا۔

اس پر بونڈری فورس پر سخت نکتہ چینی کی گئی جو لازمی بات تھی۔ اور مجھ پر بھی بڑا الزام آیا لیکن میری حالت بڑی بے بسی کی تھی۔ میں ایک باہر کا آدمی تھا جس کا کام محض مشورہ دینا تھا۔ نہ تو میرا کوئی عملہ تھا اور نہ میں کسی پر حکم چلا سکتا تھا۔ اس سے بھی قطع نظر بونڈری فورس کے لئے اس قتل عام کو روکنا یوں بھی ممکن نہ تھا۔ سر فرانسس ٹکر نے اپنی کتاب ''وائل میموری سروز،، (جب تک یاد سلامت ہے) میں پنجاب بونڈری فورس کے بے اثر ہونے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔[1]

''اگست کے ابتدائی دنوں میں جنرل ریس سے انبالہ میں ہماری جو بات چیت ہوئی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جیسے ہی بونڈری کمیشن کے فیصلے کا اعلان ہوگا مشرقی پنجاب میں قیامت برپا ہو جائے گی۔ ۱۱۔اگست کو ہمیں معلوم ہوا کہ امرتسر میں پچھلے روز بڑا خون خرابا ہوا ہے۔ کلکتہ میں بھی اسی رات معمول سے زیادہ گڑ بڑ ہوئی اور پولس اور فوج دونوں کو گولی چلانی پڑی۔ ہم کلکتہ میں تو ہنگاموں کی روک تھام کر سکتے تھے، لیکن ہمیں پورا یقین تھا کہ امرتسر سے جو فتنہ اٹھے گا اس سے سارے شمال میں تباہی اور بربادی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور مقامی نظم و نسق درہم برہم تھا کیونکہ اسے فوج کی طرح، آنے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں کیا

۱۔ صفحہ ۴۰۲ — سنہ ۱۹۵۰ء کا اڈیشن

گیا تھا ۔ اس کی تنظیم پنجاب کی صورت حال کو نظر میں رکھ کر کی جاتی اور اسے زیادہ طاقتور بنایا جاتا تو بونڈری فورس کا کام بہت آسان ہو جاتا ۔ لیکن شہری حکام اور پولس کے فرقہ پرستانہ رویہ نے شروع ہی سے اس فوج کے کام کو ناممکن بنا دیا تھا ۔ انگریزوں نے پچھلے سو برس میں حکمرانی کی جو ساکھ قائم کی تھی وہ اس وقت سارے ہندوستان میں بری طرح ڈانواں ڈول ہو رہی تھی اور ملکی انتظام کچھ تھوڑی سی بچی کھچی ساکھ کے سہارے چل رہا تھا ۔ مشرق پنجاب میں اس کا رہا سہا اثر بھی ۱۵ ۔ اگست سے بہت پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔،،

بونڈری فورس کے متعلق پینڈرل مون کی کتاب ''ڈیوائڈ اینڈ کوئٹ،، (تقسیم کرو اور بھاگو) کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے :

''جب میں دھلی سے واپس بہاول پور پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ہر شخص بونڈری فورس کی تجویز سے بڑی آس لگائے ہوئے ہے ۔ لیکن مجھے ان سے اتفاق نہ تھا ۔ میرا خیال تھا کہ سکھ جب بھی موقع پائیں گے مسلمانوں پر دھاوا بول دیں گے ۔ اگر بونڈری فورس حقیقت میں طاقتور ہوئی تو وہ اس وقت تک صبر کریں گے جب تک کہ اسے ہٹا نہ لیا جائے اور اگر وہ کمزور ہوئی تو وہ اسے خاطر میں نہیں لائیں گے ۔ جب میں بہاول پور واپس آرہا تھا تو بونڈری فورس کے متعلق مجھے ایک نوجوان سکھ میجر کے خیالات سننے کا اتفاق ہوا جو کچھ دیر کے لئے میرے کمپارٹمنٹ میں میرا ہم سفر بن گیا تھا ۔ یہ سکھ اس فوج میں شامل ہونے والا تھا ۔ اس نے کہا ''مجھے ہرگز امید نہیں کہ یہ فوج امن قائم رکھ سکے گی ۔ میرا خیال ہے کہ فوج کا بہت بڑا حصہ فرقہ پرستی کا شکار ہو کر ناقابل اعتبار ثابت ہوگا ۔ مجھے اس امر میں بھی شبہ ہے کہ مشینی فوج برسات کے زمانے میں دیہاتی علاقوں میں کامیابی کے ساتھ کام کرسکے گی ۔ میں نے اس سکھ میجر کی رائے سے پورا پورا اتفاق کیا۔،،

جمعہ ۲۹ ۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو مشترکہ دفاعی کونسل کا اجلاس ہوا ۔ جس میں آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ بونڈری فورس کو توڑ دیا جائے ۔ اس جلسے کی کیفیت ایلن کیمبل جانسن اپنی

کتاب ''مشن ود ماؤنٹ بیٹن،، (ماؤنٹ بیٹن کی همراهی میں ایک مہم) کے اندر اس طرح بیان کرتے ہیں :

''ماؤنٹ بیٹن مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس کی صدارت کرنے کل لاهور پہنچے - اس میں جناح نے بھی ایک ممبر کی حیثیت سے شرکت کی جس کی کسی کو امید نہ تھی - بڑے بحث مباحثے کے بعد بونڈری فورس کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا - پیٹ ریز کے سر ایک انتہائی مشکل کام پڑا تھا - اس نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی کیا اس پر فریقین کی طرف سے شکریہ کے بمشکل چند هی لفظ سننے میں آئے - نہ تو دونوں طرف کی حکومتوں نے اور نہ اخبارات نے پورے دل سے بونڈری فورس کی حمایت کی - جس کی بناء پر اس فوج اور اس کے کمانڈر کے لئے ٹھہرنا محال ہو گیا - فوجی مستعد بھی تھے اور آزمودہ کار بھی لیکن فرقہ پرستی کا پلڑا فوجی نظم و ضبط کے پلڑے سے کہیں زیادہ بھاری ثابت ہوا-،،

میں نے ان مصنفوں کی کتابوں کے اقتباس یہ دکھانے کے لئے درج کئے هیں کہ بونڈری فورس کی تقدیر میں شروع هی سے ناکامی لکھی تھی - پیام رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا - یہ فوج صرف ان هی جگہوں پر پہنچ جا سکتی تھی جن پر حملہ ہوا ہو - لیکن جس وقت یہ وهاں پہنچتی تو اس وقت تک اس جگہ کو لوٹا جلایا جا چکا ہوتا اور اس کی مسلم آبادی موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہوتی - آخر میں یہ فوج صرف اس مطلب کے لئے رہ گئی کہ سڑکوں کو پناہ گیروں کے لئے صاف رکھے - یہ کام بڑی بڑی شاهراهوں اور ریل کی لائنوں پر گشت کے ذریعے انجام دیا گیا -

یہ میری زندگی کا سب سے الم ناک زمانہ تھا - میں نے اس سے زیادہ ہولناک اور وحشیانہ کارروائی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی - عورتوں اور بچوں کے اعضاء کاٹ دئے جاتے اور بے گناہ لوگوں کو سخت بے رحمی کے ساتھ قتل کیا جاتا - معلوم ہوتا تھا تمام انسانی صفات دنیا سے اٹھ گئی هیں اور تہذیب و تمدن کی شاندار عمارت دھڑام سے زمین پر آ رهی ہے - فطرت انسانی میں میرا ایمان ڈولنے لگا - میں اپنے آپ سے پوچھا کرتا ''اس دیوانگی کو کیوں کر روکا جا سکتا ہے-،،

میں بڑی مشکل سے امرتسر اور دوسرے مقامات سے متعدد مسلمانوں کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو سکا۔ امرتسر میں گرینڈ ٹرنک روڈ اور ریلوے لائن کے درمیان ایک بستی تھی جس میں زیادہ تر مسلمان رہتے تھے۔ اس بستی کو سکھوں نے گھیر رکھا تھا۔ انھوں نے دو منزلہ مکانوں پر مورچے بنائے ہوئے تھے جہاں سے وہ ہر اس آدمی کو گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے جو اس بستی سے نکلنا چاہتا۔ میں نے دو ٹرینوں کا بندوبست کیا اور کچھ فوجی مہیا کئے تاکہ وہ اس بستی کے لوگوں کی حفاظت کے لئے ساتھ جا سکیں مجھے ایک ریلوے انجنیئر سے اس کام میں بڑی مدد ملی۔ ہم نے شملہ ڈیرہ دون اور انبالہ سے بھی کئی خاندانوں کو نکالا۔ یہ کارروائی کوئی تین ہفتے تک جاری رہی۔ اسٹاف قادر بھی جو بعد ازاں لفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر پہنچے اس زمانہ میں وہاں موجود تھے اور انھوں نے بھی مسلمانوں کو نکالنے کے کام میں حصہ لیا تھا۔ میں نے وزیر اعظم کو پیغام بھیجا کہ ممکن ہے کہ مہاجرین کی تعداد دس لاکھ سے سے اوپر پہنچ جائے۔ میں نے مہاجر کیمپ تیار کرنے کے لئے ایک مرکزی دفتر بنانے کی درخواست کی۔ اس وقت کسی کو گمان تک نہ تھا کہ مہاجرین کی تعداد اسی یا نوے لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

تقسیم کے یہ ہولناک واقعات دیکھنے کے بعد میں وزیرستان واپس آیا۔ جہاں ایک بریگیڈ کی کمان میرے سپرد ہوئی۔ میں اس علاقے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے وہاں اپنے پچھلے تقرر کے موقع پر وزیرستان کے مقام میر علی میں قیام کیا تھا۔ اس وقت ایک ناتربیت یافتہ بٹالین میرے ماتحت تھی۔ ہمیں تقریباً بیس میل سڑک کا راستہ محفوظ کرنا پڑتا تھا تاکہ رزمک اور بنوں کے درمیان فوجی قافلے حفاظت سے آ جا سکیں۔ اس کا مطلب تھا پہاڑوں کی چوٹیوں پر فوجی پہرے بٹھانا تاکہ قبائلی ہمارے قافلوں پر فیر نہ کر سکیں۔ میں نے اپنے جوانوں کے سروں کے اوپر اوپر رائفلوں اور مشین گنوں سے گولیاں چلوا چلوا کر انھیں سخت جنگی مشق کروائی اور دو ہفتے کے اندر یہ ایسی تربیت یافتہ بٹالین بن گئی کہ اس سے اس کٹھن علاقے میں بخوبی خدمت لی جا سکتی تھی۔

مجھے یہ سوچ کر ہمیشہ بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں جو مختلف لڑائیاں لڑی جاتی تھیں وہ سب کی سب بڑی بے فائدہ تھیں ۔ ان سے سوائے بہت سا وقت اور بہت سی جانیں ضائع ہونے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا ۔ جب پاکستان قائم ہوا تو ہمارے کئی آرمی ڈویژن نیز سکاؤٹ اور لیوی سب کے سب سرحد پر مامور تھے ۔ وہاں ان کی موجودگی کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ وہ مستقل طور پر قبائلیوں کو اشتعال دلاتے رہیں ۔ اور ان کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں ۔ جب صورت حال یہ ہو تو وہاں کسی قسم کی ترقی کا امکان کیسے ہو سکتا تھا ۔

عقل مندی کی بات صرف ایک تھی وہ یہ کہ شمال مغربی سرحد سے فوجوں کو ہٹا لیا جائے اور آخر کار ہوا بھی یہی ۔ لفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کے ماتحت جو ایک نہایت قابل افسر تھے ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے اس مسئلے کی چھان بین کر کے تجویز پیش کی کہ وزیرستان سے فوجیں ہٹا لی جائیں ۔ یہ جرأت مندانہ اور عاقلانہ تجویز پاکستان بننے سے پہلے ہی پیش کر دی گئی تھی جسے پاکستان کی نئی حکومت نے منظور کر کے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔

فوج کے ایک بڑے حصے کی واپسی کا کام میرے سپرد کیا گیا ۔ اس علاقے میں سو سال سے زیادہ عرصے سے فوجیں رہتی چلی آ رہی تھیں ۔ چنانچہ ان کی واپسی کا کام مشکل ہی نہیں خطرناک بھی تھا ۔ فوجیں نکالنے سے چند روز پہلے ہمارے ایک گروہ پر قبائلیوں نے گولی چلا دی جس سے کئی آدمی مارے گئے ۔ مجھے بڑا طیش آیا اور میں نے جلد ہی بدلہ لینے کی ٹھان لی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے مشتعل قبائلیوں ہی سے نہیں، ایک گھبرائے ہوئے ڈویژنل کمانڈر اور پولیٹکل ایجنٹ سے بھی بھگتنا پڑا جس نے میری کارروائی کو خلاف قاعدہ قرار دیا ۔

میں قبائلیوں سے ملا اور ان پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ آئندہ کبھی ہمارے سپاہیوں کی جان نہ لیں کیونکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح نیک مسلمان ہیں اور اس طرح جانوں کا ضائع ہونا بے فائدہ ہے ۔ میں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ

لوگ پاکستان کے محافظ ہیں اور اب پاکستان قبائلیوں کا بھی ویسا ہی اپنا ملک ہے جیسا کہ ہمارا ہے - اس کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ ہم وزیرستان سے اپنی فوجیں نکال رہے ہیں لیکن اگر میرے کسی آدمی کو نقصان پہنچا یا اس پر گولی چلائی گئی تو میں پلٹ کر حملہ کر دوں گا - وہ جانتے تھے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں کر گزروں گا - چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جب ہماری فوجیں وزیرستان سے نکل رہی تھیں تو ان قبائلیوں اور ان کے سرداروں نے ہماری حفاظت کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہرہ دیا - انہوں نے مضبوط ناکوں پر سفید جھنڈے لہرا رکھے تھے - اس کام میں تمام بڑے بڑے ملک مددگار ہوئے اور اس طرح فوجوں کی واپسی کا کام بڑی باقاعدگی اور خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا -

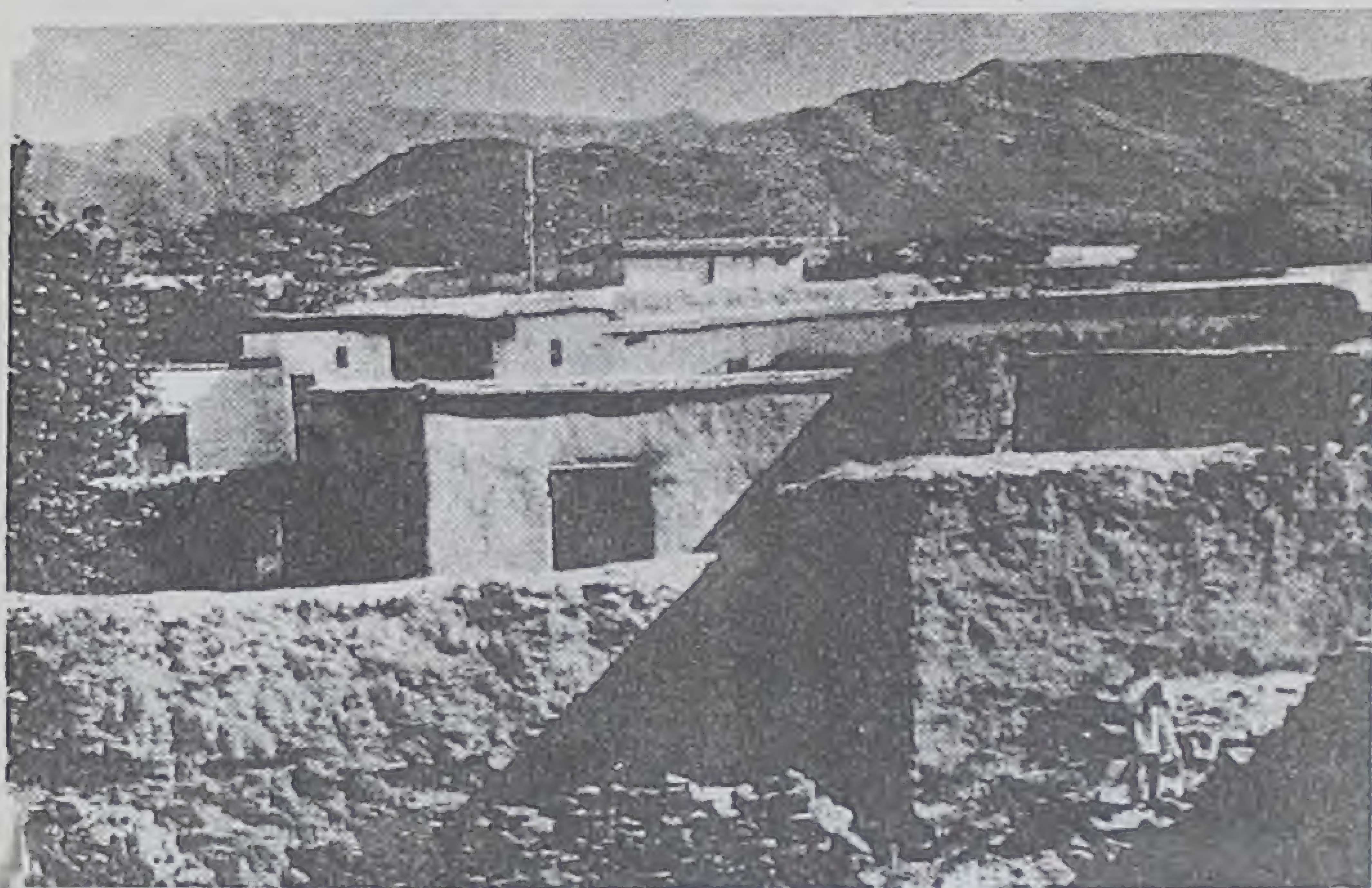
آج سرحد کے حالات بہت بدل گئے ہیں اور ہم نے وہاں بہت سے ترقی کے کام کئے ہیں - سینکڑوں سکول کھل گئے ہیں - میلوں لمبی سڑکیں بچھائی گئی ہیں - اسپتال اور کالج تعمیر کئے گئے ہیں - سب سے زیادہ ہمت بڑھانے والی بات یہ ہے کہ خود قبائلی ہم سے آئے دن اور زیادہ ترقی کے لئے کہتے رہتے ہیں - میری پالسی بالکل صاف ہے - ہم ان کے علاقوں میں اس وقت تک دخل نہیں دیں گے جب تک وہ خود ہم سے درخواست نہیں کریں گے اور جب وہ درخواست کریں تو ہم ان کے علاقوں کو ہر طرح سے ترقی دیں گے - مگر افراد کو نہ خریدیں گے - یہ اصول بہت مفید ثابت ہوا ہے اور اس سے شمال مغربی سرحد کی کایا پلٹ ہو گئی ہے -

لیکن سچ پوچھئے تو شمال مغربی سرحد کا مسئلہ دوسرے مسئلوں کے مقابلے میں جن کا پاکستان کی نئی حکومت کو سامنا کرنا تھا ایک معمولی مسئلہ تھا - ہمیں ایک لمبے اور کٹھن راستے پر سفر کرنا تھا اور شروع ہی سے ہولناک دشواریوں سے دوچار ہونا پڑ گیا تھا - ہمارے ملک میں بے گھر بے در مہاجروں کا سیلاب امنڈ پڑا تھا - پنجاب کے دریا جن پر ہمارے علاقے کی کھیتی باڑی کا دار و مدار تھا ان کے منبعے ہندوستان میں تھے - یہ دو ہی نہیں نئی اور بھی بڑے بڑے مسئلے تھے جن کو ہمیں حل کرنا تھا -



(۳) حیدرآباد دکن میں برطانوی ریذیڈنٹ کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت میں

(۴-ا) موضع ریحانہ کا دُور سے ایک منظر



(۴-ب) موضع ریحانہ (عقب میں آبائی مکان کی چھت نظر آرہی ہے۔)

میرے ذمے جو کام کیا گیا وہ یہ تھا کہ میں پاکستانی فوج کی تشکیل اور اس کی تربیت کے مسئلے کو حل کروں ۔ میرا اس کام سے کئی سال تک گہرا تعلق رہا ہے ۔ پہلے مشرق پاکستان میں جنرل آفیسر کمانڈنگ کی حیثیت سے ، پھر ایڈجوٹنٹ جنرل اور آخر میں پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے ۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے تجربات بیان کروں جو ان عہدوں پر رہ کر مجھے حاصل ہوئے ، میں مختصر طور پر بتا دینا چاھتا ہوں کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے فوراً بعد فوج کی کیا حالت تھی ۔

برطانوی ہند کی فوج میں ہم مسلمان افسروں کو قائد اعظم محمد علی جناح رح کی اس عظیم جد و جہد سے جو وہ قیام پاکستان کے لئے کر رہے تھے قدرتی طور پر بڑا لگاؤ تھا ۔ لیکن اس سیاسی کشمکش میں اور جو لوگ حصہ لے رہے تھے ان کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ علم نہ تھا ۔ فوجی تربیت نے ہمیں سکھایا تھا کہ فوجی افسروں کو سیاسیات سے الگ رہنا چاہئے ۔ چنانچہ ہم بیشتر سیاست دانوں سے ایسے ہی ناواقف تھے جیسے کہ وہ ہم سے تھے ۔

جب آزادی حاصل ہوئی تو ہم نے جانا کہ اب ہم مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہوگا ۔ چنانچہ قدرتی طور پر فوج کی تقسیم بھی ایک اہم مسئلہ بن گئی ۔ گو فوج کی تقسیم سے براہ راست میرا تعلق نہیں تھا لیکن شروع ہی سے یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ پاکستان کے پاس خود اپنی فوج ہونی چاہئے اور فوج بھی اعلیٰ درجے کی جو ہمارے ملک کا بچاؤ کر سکے ۔

جنرل کری آپا نے جو اس وقت فوج میں سینئیر انڈین افسر تھے مجھ سے کہا کہ تم اس امر میں میری حمایت کرو کہ فوج کو تقسیم نہ کیا جائے ۔ میں چاھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے ایک ہی فوج ہو ۔ مجھے امید ہے کہ تم میرا نقطہ نظر سمجھو گے اور اسے پسند کروگے ۔ میں نے ان سے کہا کہ دو آزاد ملکوں کے لئے ایک ہی فوج کا ہونا قیاس میں بھی نہیں آ سکتا ۔ فوج خود مختاری کی علامت اور لوگوں کی پشت پناہ ہوتی ہے ۔ لوگوں کے خیال اور ان کی مرضی سے باہر وہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتی ۔

ہمارے پاس خود اپنی فوج ہونی چاہئے جو ہماری پالسیوں پر عمل کرے اور ہماری آزادی کی محافظ ہو۔

اس پر مسلح افواج کی تقسیم کے لئے ایک کونسل بنائی گئی۔ ہماری طرف سے رضا، اکبر اور لطیف اس کونسل کے نمائندے مقرر ہوئے۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر اکبر ڈیرہ دون میں مجھ سے آ کر ملے اور کہا کہ دونوں فوجوں کے لئے ایک مشترکہ تربیتی ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ یہ سچ ہے کہ شروع شروع میں پاکستانی فوج کے پاس تربیتی سہولتوں کی کمی ہوگی اور شاید ہمیں درختوں کے سائے تلے کام کرنا پڑے۔ لیکن ہمیں ان کوتاہیوں کو صبر کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے اور اپنے ادارے فوراً شروع کر دینے چاہئیں۔ ہماری فوج الگ ہونی چاہئے اور فوج کے تربیتی ادارے اور دوسری سہولتیں بھی الگ ہونی چاہئیں جو فوج کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک مستقبل کا مسئلہ بالکل صاف تھا۔ دو قومیں وجود میں آئی تھیں اور لازمی تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خود اپنا آلۂ قوت موجود ہو۔ کوئی بھی آزاد ملک اپنے وسیلۂ قوت میں کسی دوسرے ملک کو شریک نہیں کر سکتا۔ اس وقت اس قسم کی خیال آرائی بھی کی جا رہی تھی کہ گو ہندوستان اور پاکستان الگ الگ ہو گئے ہیں مگر وہ آپس میں رواداری کے ساتھ مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ اس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ ہندوستانی لیڈر کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ مل جل کر رہنا تو ایک طرف انہوں نے تو پاکستان کے لئے الجھنوں پر الجھنیں پیدا کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

اس مشورے کے سوا مسلح افواج کی تقسیم سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن فوج کی تقسیم سے جو مسئلے پیدا ہوئے ان کو حل کرنا میرے ذمے ٹھہرا۔ یہ مسئلے کیا تھے؟ اول یہ کہ برٹش انڈین آرمی میں سرے سے بٹالین کے سائز کا کوئی پورا مسلم یونٹ تھا ہی نہیں حالانکہ ہندو اور گورکھا رجمنٹیں ہر طرح مکمل تھیں۔ جب جاپان سے لڑائی ختم ہوئی اور ملک تقسیم ہوا تو

ہمارے آدمی ہندوستان کے یونٹوں سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں پاکستان آنے شروع ہوئے - بعض صورتوں میں وہ نہتے ہوتے تھے اور بعض اوقات بمشکل جان بچا کر پہنچتے تھے - چنانچہ ہمیں ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں سے اپنی فوج اس طرح تیار کرنی پڑی جس طرح تصویری معمے کے مختلف ٹکڑوں سے تصویر تیار کی جاتی ہے - مگر اس میں کئی ٹکڑے غائب تھے - ہمارے پاس نا تربیت یافتہ ، نیم تربیت یافتہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ سبھی قسم کے لوگ تھے - یہ مختلف یونٹوں اور مختلف علاقوں سے آئے تھے - ہمیں ان سب کو ملا کر مختلف قسم کے لڑنے والے یا امدادی دستے ، رجمنٹیں اور ڈویژن اور کور بنانے تھے -

یہی نہیں- اتحادیوں نے ملایا پر چڑھائی کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کا صدر مقام ہندوستان تھا - چنانچہ بہت سی فوج کی طرح بہت سے فوجی سٹور اور ساز و سامان جنوبی ہند میں تھا - جس میں ہمارا حصہ بھی شامل تھا - تقسیم کے معاهدے کے تحت ہم فوجی سامان اور ہتھیاروں سے بھری ہوئی ایک سو ساٹھ ٹرینیں لے جانے کا حق رکھتے تھے لیکن اس میں سے بہت ہی تھوڑا حصہ پاکستان پہنچنے پایا اور گاڑیاں آئیں بھی تو ان کے ڈبوں میں اینٹ پتھر اور تباہ شدہ سامان بھرا ہوا تھا -

غرض ہماری وج کے پاس اسلحہ کی بڑی کمی تھی اور وہ سخت غیر منظم بھی تھی - پھر جلد ہی اسے مہاجرین کی حفاظت کے لئے جو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان آرہے تھے ، ان کے قافلوں کے ساتھ ساتھ جانا پڑا - پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے کشمیر کی لڑائی میں بھی حصہ لینا پڑا - اس تمام عرصے میں فوج کے پاس نہ تو کوئی منظم یونٹ تھا نہ کوئی ساز و سامان ، اورگولہ بارود بھی نہ ہونے کے برابر تھا - حالت اتنی خراب تھی کہ شروع کے چند برسوں میں ہر فوجی کو مشق کے لئے صرف پانچ کارتوس فی سال کی اجازت تھی -

ہماری حالت سچ مچ بڑی ناگفتہ بہ تھی - لیکن جب سے پاکستان وجود میں آیا تھا مجھے ایک بات کا پورا یقین ہوگیا تھا ، وہ یہ کہ

پاکستان کی بقا کے لئے ایک ایسی فوج کا قیام اشد ضروری ہے جس کو عمدہ تربیت ملی ہو اور جس کے پاس پورا جنگی سامان اور اعلیٰ قابلیت کے افسر موجود ہوں - چنانچہ میں نے اپنے ملک کے لئے اس قسم کی فوجی پناہ تیار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا - مجھے خوشی ہے کہ میں مخلص اشخاص کی مدد سے اس کوشش میں کامیاب ہو کر رہا - آج میں پورے وثوق کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ پاکستان اس فوج کے بغیر ان طوفانوں اور حملوں کی تاب ہرگز نہ لا سکتا جن سے اسے دوچار ہونا پڑا - پاکستان کے عوام کی پشت پر اس فوج کی موجودگی آج بھی اس بات کی ضمانت ہے کہ دشمن ہمیں دبا نہیں سکتا۔

ان حالات میں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے فوج کی تشکیل کرنا ، اسے تربیت دینا، اس کے لئے جنگی اسلحہ بہم پہنچانا، صحیح قسم کے سپاہی اور افسر تلاش کرنا، اعلیٰ درجے کا نظم و ضبط قائم رکھنا انتہائی دشوار کام تھا - لیکن ساتھ ہی یہ کام ہماری قوتوں اور صلاحیتوں کو بھی للکارتا اور آزمائش کا موقع دیتا تھا -

۱۴-اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو میرے لئے اور میری طرح اور بہت سے پاکستانیوں کے لئے ہر شے بدل گئی- ہمارے دلوں میں زندہ رہنے اور کام کرنے کی ایک نئی آمنگ پیدا ہو گئی - ہر شخص کے دل میں یہ لگن تھی کہ وہ اپنے مقدور بھر کام کرے - چونکہ میں اپنے آزاد ملک کے لئے جد و جہد کر رہا تھا اس لئے میری نظر میں نہ تو کوئی مشکل ایسی سخت تھی کہ آسان نہ ہو سکے اور نہ کوئی قربانی اتنی عظیم کہ اس سے دریغ کیا جائے - پاکستان کے قیام کے بعد میرے طریق زندگی اور میرے خیالات میں جو انقلاب آیا اس کے بیان میں مبالغے کی گنجائش ہی نہیں -

تیسرا باب

فوجی زندگی سنہ ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۰ء

جنوری سنہ ۱۹۴۸ء میں میں وزیرستان میں گردی' بریگیڈ کی کمان کر رہا تھا کہ مجھے جنرل آفیسر کمانڈنگ بن کر مشرق پاکستان جانے کا حکم ملا - میں اس وقت یہ نہیں کہ سکتا تھا کہ مجھے اس تبدیلی سے خوشی ہوئی ہے - مجھے اس علاقے کی آب و ہوا پسند نہیں آئی تھی - پھر کچھ ذاتی معاملے بھی تھے مثلاً اپنے گھر والوں کے لئے راول پنڈی میں رہنے سہنے کا انتظام کرنا ، تاکہ بچے تعلیم جاری رکھ سکیں - فوج اس معاملے میں کچھ مدد نہ کر سکی اور مجھے مجبوراً اپنے خاندان کو ایک عمارت کے بغلی حصے میں جو دراصل شاگرد پیشے کا کام دیتی تھی، ٹھہرانا پڑا - بعد میں میں نے اپنے سامان کے ایک دو سوٹ کیس ساتھ لئے اور مشرق پاکستان روانہ ہو گیا -

ملک کے لئے یہ سخت آزمائش کا دور تھا - اور جو خدمت میرے سپرد ہوئی تھی وہ بھی کچھ کم مشکل نہ تھی - میں نے تقریباً دو برس مشرق پاکستان میں گزارے -

مجھے اکثر صوبائی حکومت سے واسطہ پڑتا تھا جو نئی نئی بنی تھی اور جس کے عملے میں لائق آدمیوں کی بڑی کمی تھی - اس سے بھی زیادہ خرابی کی بات یہ تھی کہ یہ حکومت سیاسی اعتبار سے کمزور اور ناپائیدار تھی -

فوج سرے سے تھی ہی نہیں - آزادی کے وقت ہمارے پاس مشرق پاکستان میں لے دے کر صرف دو پیدل بٹالین تھے - ان میں سے ایک بٹالین کی تین مسلم کمپنیاں تھیں - چوتھی کمپنی ہندو تھی جس کا ہندوستان میں تبادلہ ہو گیا تھا - دوسری بٹالین میں سے ایک سکھ کمپنی اور ایک ڈوگرا کمپنی کو چھوڑ کر ہمیں دو مسلم کمپنیاں اور مل گئیں - ہیڈ کوارٹرز میں نہ میز تھی نہ کرسی، نہ لکھنے پڑھنے کا سامان، در حقیقت ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا - مشرق پاکستان کے نقشے تک نہ تھے - دھیرے دھیرے ہم نے خود کو منظم کرنا شروع کیا -

ہمارے رہنے سہنے کی جگہ بھی بہت خراب تھی - تیج گاؤں اور کرمی ٹولہ کے ائی میدانوں کے آس پاس کچھ پھونس کے جھونپڑے تھے جو دوسری نی جنگ میں نئے تھے - افسروں کے لئے بھی کوئی جگہ نہ تھی - ہ ں ے رہنے سہنے کے لئے جوں توں بندوبست کرنا پڑا - وہ ”باشوں،، (جھونپڑوں) میں رہتے تھے جو عموماً خستہ حالت میں ہوتے تھے اور جن کی چھتوں سے لگاتار پانی ٹپکتا رہتا تھا - چنانچہ ان لوگوں کو اکثر اپنی چارپائیاں سوکھی جگہوں میں سرکاتے رہنا پڑتا تھا - جب تیز شمال مغربی ہوائیں چلتیں تو ان جھونپڑوں کی چھتیں اڑ جاتیں اور سونے والے خود کو کھلے آسمان کے نیچے پاتے - صبح کو وہ اپنے اپنے جھونپڑے کی تلاش میں نکلتے اور اس کے انجر پنجر کو ادھر ادھر سے اکٹھا کر کے لاتے -

دھیرے دھیرے حالت سدھرنی شروع ہوئی - ایک بریگیڈ گروپ کے رہنے کے لئے ۔ک پختہ عمارت کا ڈول ڈالا گیا - فوج کے چند یونٹوں کا ڈھاکہ کے قریب رکھنا ضروری تھا تا کہ شہری حکام کو ضرورت کے وقت ان سے مدد مل سکے - کچھ اور جگہوں پر بھی تعمیر کے منصوبے بنائے گئے - مشکل یہ تھی کہ ایسی اونچی زمین کمیاب تھی جس میں برسات کے زمانے میں پانی نہ بھر آئے - سارے صوبے میں بڑی تلاش کے بعد مجھے دو علاقے کام کے نظر آئے جنھیں جنرل ہیڈ کوارٹرز نے منظور کر لیا - ہم نے ایک چھاؤنی ڈھاکے کے

قریب بنائی اور دوسری کومیلا کے قریب اونچی زمین پر - آج کل یہ دونوں جگہیں ترقی کر کے بہت خوش نما بن گئی ہیں -

حالات کا رخ سازگار نہیں تھا - ہماری سرحدوں کو ہر وقت ہندوستان کی طرف سے خطرہ رہتا تھا - پھر جلد ہی ہم اس کے ساتھ کشمیر کی لڑائی میں الجھ گئے - نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں مشرق پاکستان میں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لئے کسی قسم کی کمک ملنا دشوار ہو گیا -

صوبے کی حالت بڑی پست تھی - تقسیم سے پہلے اس کی بہتری کے لئے کوئی کام نہیں کیا گیا تھا - حالانکہ وہاں صنعتی اور تجارتی مرکز قائم کرنے کے ان گنت موقعے تھے - مسلمانوں کے پاس سرمایہ نہیں تھا اور پٹ سن کا نوے کروڑ روپے سالانہ کا کاروبار ہندو مارواڑیوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنے نفعے کی رقمیں ہندوستان منتقل کر دیتے تھے - جہاں تک مجھے معلوم ہے وہاں بس ایک ہی طویل پختہ سڑک تھی جو پبنہ ضلع میں کہیں تھی اور اس کی لمبائی تقریباً تیس میل تھی - سڑک کا ایک اور چھوٹا سا ٹکڑا جیسور سے شمال کو جاتا تھا - اور ایک بر' ےُ نا ی سڑک تھی جو ڈھاکہ کے گرد ہوائی میدانوں سے ہو ک اڑ نج کو جاتی تھی - ان کے علاوہ کوئی اور سڑک پورے م میں نہ تھی - دریائی راستے البتہ موجود تھے - لیکن ان کے ،رائع آمد و رفت بہت آہستہ اور ناتسلی بخش تھی - ایک عمدہ ریلوے ضرور موجود تھی لیکن پہلی جنگ کے دوران میں اس سے اتنا زیادہ کام لیا گیا تھا کہ گاڑیوں کے ڈبے ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہو چکے تھے ر ان کو تبدیل کرنے کی اشد ضرورت تھی -

مجھے اس خیال سے بڑا رنج ہوتا تھا کہ مشرق پاکستان کے خام مال سے کلکتہ تو اتنی ترقی پائے اور مشرق پاکستان کے کسی حصے میں ایک بھی کارخانہ یا فیکٹری نظر نہ آئے

اس کے قصور وار ہم ہی تھے ، کیونکہ حصول آزادی سے بہت پہلے اس صوبے کے مسلمان سیاسیات میں کافی بلند آہنگی دکھا چکے تھے اور اس صوبے نے فضل الحق ، سہروردی اور ناظم الدین جیسے

سیاست داں پیدا کئے تھے ، جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے حکومت سے گہرا تعلق رہا تھا ۔ پھر یہ سب اصحاب تقسیم سے پہلے بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے مگر وہ اپنے عوام کے لئے کچھ نہیں کر سکے تھے ۔ شاید یہ کام تھا ہی مشکل ۔

جب میں جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر ہو کر مشرق پاکستان گیا تو اس وقت وہاں خواجہ ناظم الدین صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے ۔ وہ بڑے نیک اور متقی آدمی تھے اور انھوں نے عمر کا ایک طویل حصہ سیاسی جد و جہد میں گزارا تھا ۔ مگر کسی معاملے کا فیصلہ کرنا ان کے لئے سخت اذیت ناک ہوتا تھا ۔ میں نے ان کے دفتر میں کئی بار ان سے ملاقات کی ۔ ان کا بارعب چہرہ فائلوں کے انبار کے پیچھے ناک تک چھپا ہوا نظر آتا ۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ وزیر اعلیٰ کا مسائل کو حل کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے ۔ وہ یہ کہ جس کسی فائل پر فیصلہ دینے کی ضرورت ہوتی وہ چپکے سے اسے دوسری فائلوں کے نیچے دبا دیتے اور وہ وہاں دبا پڑا رہتا ، یہاں تک کہ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ مسئلہ خود بخود حل ہوجاتا ۔

ان دنوں مجھے نور الامین اور حمید الحق چودھری سے بھی ملاقات کا موقع ملا ۔ چودھری اس وقت صوبائی حکومت میں وزیر خزانہ تھے ۔ نور الامین مجھے ذہین آدمی معلوم ہوئے ، جو حالات کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت اور کسی قدر اس بات کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے کہ حکومت کا انتظام کس طرح چلنا چاہئے ۔ حمید الحق کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہوشیار آدمی ہیں ۔ لیکن عام خیال یہ بھی تھا کہ وہ ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ باہر کا کوئی مسلمان ان کے صوبے میں آ کر کوئی صنعتی کارخانہ قائم کرے ۔ اور پھر وہاں صنعتی کارخانہ قائم کرنا آسان کام بھی نہ تھا کیونکہ نہ بجلی تھی نہ رسل و رسائل کے ذرائع ، یہاں تک کہ زمین کا ملنا بھی دشوار تھا ۔ میرے کان میں اکثر یہ بات پڑا کرتی تھی کہ حمید الحق ان مسلمانوں کو ہر طرح بد دل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو باہر سے آ کر ان کے صوبے میں سرمایہ لگانا

چاهتے هوں - ان مسلمانوں میں سے کچھ تو واپس هندوستان چلے گئے اور کچھ کراچی آ گئے -

میں نے دیکھا کہ باهر والوں کے خلاف ایک ذهنی دیوار کھڑی کی جا رهی هے - اس کا نتیجه یه هوا که مشرق پاکستان میں صنعت کاروں اور سرمائے کا آنا رک گیا - مغربی پاکستان میں صورت اس کے بالکل برعکس تھی - وهاں هندوستان سے جو لوگ آئے انهیں کسی قسم کی جذباتی یا سیاسی مخالفت سے دوچار هونا نهیں پڑا - آزادی کے بعد یوپی، بمبئی اور هندوستان کے دوسرے شهروں سے مسلمان بھاری تعداد میں هجرت کر کے مغربی پاکستان آئے ، اور یهاں انهوں نے صنعت و حرفت کے قیام میں بڑا نمایاں حصه لیا - اسی طرح مسلح افواج اور سول سروسوں میں بھی بهت سے مهاجرین شامل تھے -

آزادی کے وقت اعلیٰ سول سروسز میں مشرق پاکستان کا لے دے کر ایک افسر تھا ، اس لئے یه ضروری تھا که مغربی پاکستان سے یا مهاجرین میں سے افسروں کو چن چن کر صوبے کے اعلیٰ انتظامی عهدوں پر مقرر کیا جائے - لیکن مشرق پاکستان کے تعلیم یافته طبقوں میں یه بات صوبے کے معاملات میں دخل اندازی تصور کی گئی صوبے کے نئے متوسط طبقے میں اپنے مغربی پاکستان کے هم وطنوں کے خلاف عناد پیدا هونے لگا - انهوں نے دیکھا که وه بڑے بڑے عهدوں کو حاصل کرنے میں اور خصوصاً تجارتی میدانوں میں پیچھے رهے جا رهے هیں -

صوبے کے رهنماؤں کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا - ان کے سامنے دو راستے تھے - ایک تو یه که وه ایمانداری سے کام لے کر صورت حال کا مقابله کرتے ، اپنی خامیوں کو دیکھتے اور ان کو دور کرنے کے لئے تعلیمی اور ٹیکنیکل اداروں کی مدد لیتے اور ایک ایسا سماجی اور اقتصادی محاذ بناتے جهاں صوبے کے نوجوانوں کو اپنی قابلیت کے بل پر ملک کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا لیکن اس کے لئے سنجیده غور و فکر اور سخت محنت کی ضرورت تھی اور وهاں ان دونوں باتوں کی سخت کمی تھی -

دوسرا راستہ یہ تھا کہ سیاسی دباؤ ڈالا جائے اور سارا الزام مغربی پاکستان کے سر تھوپ دیا جائے - مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں نے اس دوسرے راستے کو زیادہ آسان اور مقبول عام پایا - نتیجہ یہ ہوا کہ صوبے کی سیاسی زندگی نے ایک شورش کا سا رنگ اختیار کر لیا، جس سے میں فکر مند اور اداس ہو گیا - میں نے دیکھا کہ صوبے کے بعض چرب زبان لیڈر عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اپنا آلو سیدھا کرنے کی سوچ رہے ہیں -

اسی زمانے میں میری سہروردی صاحب سے ایک بڑی نتیجہ خیز ملاقات ہوئی، جس سے ان کے دل و دماغ کی کیفیت مجھ پر روشن ہو گئی - کرزن ہال میں کوئی تقریب تھی، میں بھی وہاں موجود تھا - کسی نے سہروردی صاحب سے میرا تعارف کرایا - یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی - انھوں نے اپنے مخصوص بلند آہنگ لہجے میں مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''جنرل! حکومت نے مجھے صوبہ بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے - لیکن وہ نہیں جانتی کہ میں آنکھ جھپکتے میں ناظم الدین کو ختم کر سکتا ہوں -،،

میں نے کہا ''مسٹر سہروردی آپ مشرقی پاکستان کو اس کے حال ہی پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے اس کی مشکلات پہلے ہی کچھ کم نہیں کہ آپ ان میں اور اضافہ کریں -،،

اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کہا میں اسے دہرا نہیں سکتا کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں - لیکن اس سے مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ وہ مشرقی پاکستان کی صورت حال سے کس طرح فائدہ اٹھانے کی سوچ رہے تھے - چونکہ وہ سیاست میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے - اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صوبے میں سیاسی دباؤ کی جو تحریک پھیلائی جا رہی ہے، اس کا زور جلد کم نہیں ہوگا -

مشرقی پاکستان میں کئی لوگ میرے دوست بن گئے جن سے میں بڑی بے تکلفی سے بات چیت کیا کرتا - میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فرداً فرداً یہ سب لوگ میری رائے سے اتفاق کرتے تھے کہ صوبائی حکومت کوئی تعمیری کام نہیں کر رہی ہے اور ساری قوتیں سیاسی میدانوں میں لگائی جا رہی ہیں -

مشرق پاکستان کے نوجوانوں کو فوج کے لئے ٹریننگ دینے کا کام براہ راست میرے ذمے تھا ۔ میں نے دیکھا کہ صوبے میں اعلیٰ درجے کے تعلیمی اور تربیتی اداروں کی یکسر کمی ہے ۔ مجھے اس خیال سے پریشانی ہوتی تھی کہ اتنی بڑی آبادی میں سے مطلوبہ معیار کے اتنے کم لوگ نکلتے ہیں ۔ میں نے صوبائی حکومت سے اس معاملے پر بات چیت کی ۔ میں نے اس سے پر زور درخواست کی کہ صوبے میں اچھے اچھے اسکول کھولے جائیں جہاں ذہین نوجوانوں کو اپنے دل و دماغ، جسم اور کردار کی مناسب تربیت مل سکے ۔ میں نے اس سلسلے میں خواجہ ناظم الدین سے بھی بار بار درخواست کی اور نور الامین سے بھی میری لمبی لمبی بحثیں ہوئیں ۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات میرے مدعا کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر یا تو وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا ہی نہیں چاہتے یا ایسا قدم اٹھانا ان کی طاقت سے باہر ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ان کو ڈر کس بات کا تھا ۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ پبلک اسکول کے قیام سے عوام جو اثر لیں گے وہ ان کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوگا ۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا اکرم خاں کے اخبار آزاد میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں اسکول کھولنے کی تجویز پر حکومت کی مذمت کی گئی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ اسکول غریبوں کے خرچ پر امیروں کے بچوں کے لئے کھولے جا رہے تھے ۔

مشرق پاکستان میں تقریباً چار کروڑ مسلمان بستے تھے ۔ اتنے چھوٹے سے رقبے میں مسلمانوں کی اتنی زیادہ آبادی دنیا کے کسی اور حصے میں نہ تھی ۔ مگر پھر بھی یہاں اس قابلیت اور صلاحیت کے پیدا کرنے میں، جس کی ایک آزاد ملک کے انتظام کے لئے ضرورت تھی، کوئی کوشش نہیں کی جا رہی تھی ۔ میں برابر تعلیمی اور تربیتی اداروں کے قیام کی ضرورت پر زور دیتا رہا ۔ مگر بعض سیاست داں سمجھتے تھے کہ وہ عوام میں بے اعتمادی اور شک و شبہ پھیلا کر بہتر اور فوری نتائج حاصل کر سکتے ہیں ۔

مجھے اس بات پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ اس خطے میں ایسے افراد کی کمی کیوں ہے جو رہبری اور رہنمائی کی صفات رکھتے ہوں ۔

آرمی سلیکشن بورڈ ہر چھٹے مہینے مشرقی پاکستان جایا کرتا۔ شروع شروع میں اس بورڈ کو پہلی یا دوسری ٹرم کے لئے چار یا پانچ لڑکے ایسے مل جاتے جنھیں آرمی ملٹری کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ لیکن یہ لڑکے زیادہ تر مہاجر خاندانوں کے ہوتے تھے۔ جب یہ ذریعہ ختم ہو گیا تو مقامی لڑکوں کو چنا جانے لگا۔ اگر سلیکشن بورڈ کو ایک یا دو ایسے لڑکے مل جاتے جنھیں گوارا کیا جا سکتا تھا، تو یہ اس کی بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی تھی۔ میں بورڈ کو مشورہ دیا کرتا کہ ان کو بہر صورت چن لو کیونکہ کوئی شخص نہیں مانے گا کہ بورڈ نے یہ انتخاب انصاف کے ساتھ اور رو رعایت کے بغیر کیا ہے۔ یا یہ کہ قواعد و ضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا۔ تعلیم کے سارے نظام میں کوئی بات بنیادی طور پر غلط تھی۔ ضرورت تھی کہ نئی پود پر توجہ کی جائے اور اسے مناسب تعلیم دلوا کر پروان چڑھایا جائے۔

مشرقی پاکستان کے لیڈروں کی طرف سے مجھے کبھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا: ''جاؤ اپنی حکومت سے کہو کہ وہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے ورنہ تم پیچھے رہ جاؤ گے۔ جاؤ اپنے معاملے کی پیروی کرو۔ اگر مغربی پاکستان کے لوگ تمہارے مفاد کے خلاف کوئی کام کر رہے ہیں تو تم ان سے لڑو جھگڑو۔ مرکزی حکومت سے اپنے حقوق کے لئے جنگ کرو۔ تم یہ سب کچھ کرو مگر ساتھ ہی اس بات پر بھی اڑ جاؤ کہ تمہارے نوجوان مردوں اور عورتوں کو مناسب تعلیم و تربیت دلائی جائے تاکہ وہ بھی دوسرے شہریوں کے ساتھ مساوی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھا سکیں۔ تم اپنی حجت کو زیادہ طول نہ دو جھگڑے کو حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ۔ آخر انسان انسان سب ایک ہیں۔ اگر تمہارے مغربی پاکستان کے بھائی اس بات پر افسردہ ہونا اور غم کھانا شروع کر دیں کہ تم ہر وقت ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہو، ان پر سیاسی دباؤ ڈالتے ہو، تو تمہاری وجہ سے ملک کے اتحاد کو کتنا عظیم نقصان پہنچے گا۔ خدا کے لئے اپنے جھگڑوں اور اپنی حجتوں کو مناسب حدود میں رکھو۔''

میں یہ بات کبھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکا کہ مشرق پاکستان میں سیاسی دباؤ کی جو تحریک پھیلائی جا رہی تھی وہ چھوٹی چھوٹی باتوں، مثلاً ذاتی شکایتوں اور رنجشوں کا نتیجہ تھی یا وہ کسی گہرے مرض کی علامت تھی - مشرق پاکستان میں مغربی پاکستان کے جو افسر کام کر رہے تھے میں ان کے برتاؤ کے بارے میں اکثر نکتہ چینی سنا کرتا - ان پر الزام لگایا جاتا کہ وہ عوام سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، وہ شدت پسند ہیں اور ان کا انداز مربیانہ ہوتا ہے - میں نے اکثر ان افسروں کو کام کرتے ہوئے دیکھا - میری رائے میں وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے اور دل سے صوبے کی بھلائی چاہتے تھے - یہ اور بات تھی کہ ان کی عادتیں اور طور طریقے مختلف تھے، جن سے مشرق پاکستان والوں کو بہت جلد غلط فہمی ہو جاتی تھی - یہ عام بات تھی کہ کوئی مغربی پاکستان والا ایک سادہ سے سوال کے جواب میں ''اونہہ،، کہہ دے اور یہ نہ جانے کہ اس سے کوئی ناشائستہ حرکت ہوئی ہے -

میرے ایک پرانے دوست راجہ غضنفر علی خان مرحوم برسوں ایران میں ہمارے سفیر رہے - اہل ایران بڑے خلیق اور شائستہ لوگ ہیں - راجہ صاحب نے یقیناً ان کی روایت اور تہذیب کا بڑا اثر قبول کیا ہوگا - جب وہ پاکستان واپس آئے تو میں نے ان سے پوچھا : ''کہئے راجہ صاحب مزاج کیسا ہے؟،، کہنے لگے : ''بھئی میں وطن واپس آیا ہوں - میں کسی قدر گرم جوشی کی توقع رکھتا ہوں - لیکن یہاں جس کسی سے ملتا ہوں اور کوئی بات پوچھتا ہوں تو بس ایک روکھی پھیکی ''اونہہ،، کے سوا کچھ جواب نہیں ملتا -،، میں نے کہا : ''راجہ صاحب معلوم ہوتا ہے آپ میں کسی قدر غیریت آ گئی ہے - ہم تو ایسی باتوں کا برا نہیں مانتے -،،

چنانچہ ممکن ہے کہ مغربی پاکستان والوں کے اخلاق و اطوار مشرق پاکستان والوں کو کھٹکتے ہوں - مجھے موسیقی سے زیادہ شغف نہیں - لیکن رفتہ رفتہ میں بنگالی گانوں کو پسند کرنے لگا - وہ گانے مجھے بہت لبھاتے تھے - ایک دفعہ میں نے ایک دوست سے کہا ''تمہاری موسیقی جتنی میٹھی ہے کاش تم اس سے آدھے ہی میٹھے ہوتے -،،

میں نے دیکھا کہ اگر ایک بار کوئی کسی مشرقی پاکستانی سے واقفیت پیدا کر لے تو وہ بھی اسے دل سے پسند کرنے لگتا ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان کچھ زیادہ سماجی میل جول نہیں تھا۔ مغربی پاکستان والا وہاں خود کو اکیلا محسوس کر کے اپنے ہی آدمیوں کا گروہ بنانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ میں مغربی پاکستانیوں سے کہا کرتا ''تم ان سے کیوں نہیں ملتے؟ تم ان کو اپنے گھر پر بلاؤ اور زیادہ نہیں تو چائے کی ایک پیالی ہی سے ان کی تواضع کردو۔ جب تم انسان انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ملوگے تو تم میں یگانگت اور میل ملاپ آپ ہی آپ پیدا ہو جائے گا۔''

مغربی پاکستان والے بھی کچھ فرشتے یا اخلاص مندی کا نمونہ نہ تھے۔ ان میں سے زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ جنھیں یہ احساس تھا کہ مغربی پاکستان کی نسبتاً زیادہ بہ آسائش زندگی چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہ متوسط طبقے سے تھے اور اہل و عیال رکھتے تھے۔ دونوں صوبوں میں آنا جانا بھی مشکل اور گراں تھا۔ وہ مشرقی پاکستان والوں کی عام نااہلی پر چڑتے رہتے تھے اور اس بات کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ انہیں مشرقی پاکستان میں نوکری کرنا پسند نہیں۔ غرض عجیب صورت ۔ تھی۔ ایک طرف تو ڈھاکہ کے لوگ عموماً یہ سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے افسر ان پر حکومت جمانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف مغربی پاکستان والے اس افسری کو اپنے لئے عذاب سمجھتے

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے کسی سے مذاق سے کہا تھا۔ ''تم میرے خلاف تحریک شروع کر کے مجھے یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتے۔ یقین جانو میں اپنی بریت میں ایک لفظ تک نہ کہوں گا۔''

سچ یہ ہے کہ ان دنوں مغربی پاکستان کے لوگ سخت مجبوری کے تحت مشرقی پاکستان جایا کرتے تھے۔ ان دنوں وہاں تعلیم، رہائش اور صحت و صفائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا لیکن اب یہ حالت نہیں۔ آج کل وہاں فوج اور شہری محکموں میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور عام لوگوں کی حالت بھی اچھی ہے اور اب تو

ان لوگوں کے دلوں میں بھی جو مجبوراً وہاں گئے تھے، مشرق پاکستان کی الفت پیدا ہو گئی ہے اور بہت سے لوگ جو وہاں ملازمت کر آئے ہیں مشرقی پاکستان کو اس طرح یاد کرتے ہیں جیسے کوئی گھر کو یاد کرتا ہے -

اب میں پھر اس زمانے کی فوجی زندگی کا ذکر کرتا ہوں - میں ان دنوں بہت مصروف رہا - میں ہر ضلعے اور سب ڈویژن میں گھومتا پھرتا رہا اور جن راستوں سے حملے کا خطرہ تھا ان کی شناخت کر کے صوبے کے بچاؤ کا منصوبہ تیار کرتا رہا -

مجھے صوبے کے اندرونی نظم و ضبط کے بارے میں بھی بڑی فکر تھی - پولس والوں کی شکایتوں پر کچھ دھیان نہیں دیا جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر بڑے پیمانے پر ہنگامے شروع ہو گئے تو ان کی روک تھام کے لئے میرے پاس کافی فوج نہ ہوگی - پولس کی جمعیت میں تقریباً ساٹھ ہزار آدمی تھے - اس میں بھانت بھانت کے آدمی شامل تھے - بعض مغربی بنگال کی پولس سروس سے آ گئے تھے - وہ قاعدے قانون کی زیادہ پابندی نہیں کرتے تھے - یہی حال سینئیر افسروں کا تھا - سیاست دانوں نے سول مسلح تنظیم کی ضروریات کے بارے میں فوری طور پر کچھ فیصلہ نہیں کیا تھا ، اور یہ اس کا نتیجہ تھا کہ صوبے بھر میں سخت بے اطمینانی اور بدنظمی پھیل گئی تھی -

مواد اندر ھی اندر پک رہا تھا جو آخر ۱۳-جولائی ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں پھوٹ پڑا - میں ذاکر حسین کے ساتھ جو اس وقت انسپکٹر جنرل پولس تھے، دورے پر تھا - ہم میمن سنگھ کے ایک ریسٹ ھاؤس میں مقیم تھے کہ ڈھاکہ سے ٹیلی فون پر مجھے اطلاع ملی کہ پولس نے گورنمنٹ ھاؤس اور وزیر اعلیٰ کے مکان کو گھیر رکھا ھے - کچھ پولس والے سول سکریٹریٹ کے سامنے بھی دیکھے گئے - انھوں نے پولس لائنز کے اسلحہ خانے سے اسلحہ اور گولہ بارود حاصل کر لیا تھا اور باقاعدہ مورچے بنا لئے تھے -

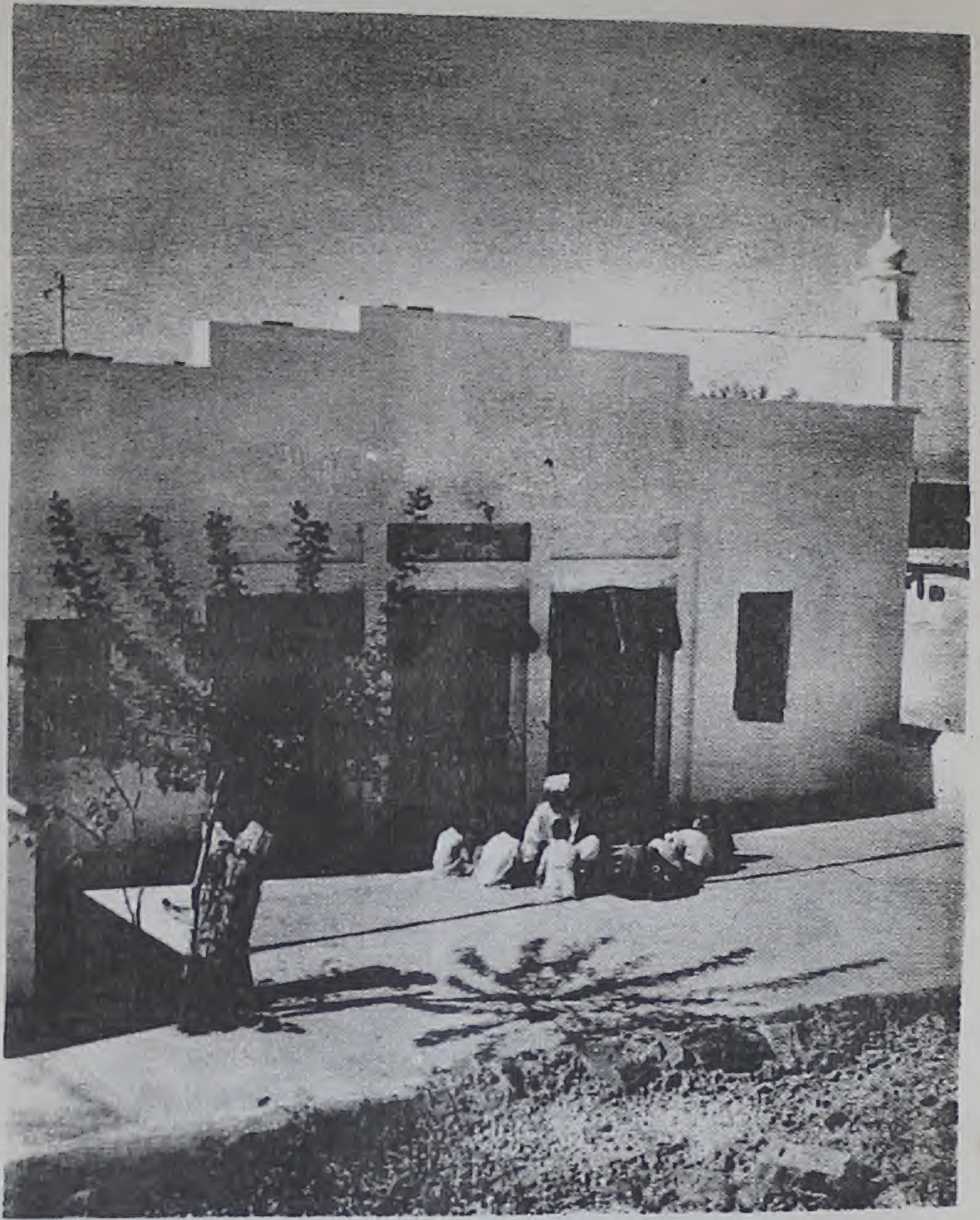
میرے لئے یہ بڑی الجھن کی بات تھی - ایک طرف تو مجھے پولس کے افسر اعلیٰ کو جس کا میں مہمان تھا مطمئن کرنا تھا ، دوسری طرف اس کے باغی سپاھیوں سے نمٹنا تھا - میں نے بٹالین کمانڈر سے

کہا کہ انہیں تنبیہہ کرو اور کوئی اندھا دھند کارروائی نہ کرنے دو ۔ کئی گھنٹے بحث مباحثہ ہوتا رہا مگر وہ اپنی لائنوں میں واپس جانے پر آمادہ نہ ہوئے ۔

اس کے بعد بٹالین کمانڈر نے ٹیلی فون پر مجھے بتلایا کہ باغی سپاھی مصالحت پر آمادہ نہیں ھیں ۔ جب ان سے کوئی اپیل کی جاتی ھے تو وہ فوج کو گالیاں دینے لگتے ھیں ۔ چنانچہ ہمارے لئے اب عملی قدم اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا ۔ میں نے بٹالین کمانڈر سے کہا کہ کم سے کم فوج کے ساتھ باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کرو ۔

پولس نے جو دفاعی مورچے بنا رکھے تھے وہ شہر کے بیچوں بیچ تھے ۔ اس لئے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں عوام گولیوں کی زد میں آ کر زخمی نہ ہو جائیں ۔ ہمارے پاس حملے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا ۔ یہ کام ۳/۸ پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی کے سپرد کیا گیا ۔ اسے پولس کے مورچے تک پہنچنے کے لئے کھلے میدان میں کوئی تین سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا ۔ اس نے تیزی سے پیش قدمی کی اور مورچے پر قبضہ کر لیا ۔ ایک یا دو آدمی جن میں اس فساد کا سرغنہ بھی تھا مارے گئے اور دس بارہ آدمی زخمی ہوئے ۔ ہنگامہ فرو ہو گیا ۔ صورت حال پر قابو پا لیا گیا اور باقی صوبے میں بھی گڑ بڑ کا خطرہ نہ رہا ۔

اسی طرح ایک اور موقعے پر مجھے سول حکام کی مدد کرنی پڑی ۔ مجھے خواجہ ناظم الدین نے بلوایا اور مجھ سے کہا کہ وہ اسمبلی میں صرف چار ممبروں کی مشکوک اکثریت رکھتے ھیں ۔ انہیں فکر ھے کہ کہیں ان ممبروں کو توڑ نہ لیا جائے کیونکہ فضل الحق نے طلبا کو اکسا رکھا ھے اور وہ ان کے حامیوں کو ڈرا دھمکا رھے ھیں ۔ خواجہ صاحب چاھتے تھے کہ میں طلبا کو اسمبلی ہال پر دھاوا بولنے سے باز رکھوں ۔ مجھے اس معاملے میں دخل دینے سے انکار کر دینا چاھئے تھا، کیونکہ دراصل یہ کام پولس کا تھا، لیکن مجھے یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ اگر حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا تو ممکن ھے دور دور تک فتنہ و فساد اور غنڈہ گردی پھیل



(٦) ریحانہ کی مسجد، جہاں مصنف نے قرآن شریف پڑھا

(۵) ریحانہ میں مصنّف کے آبائی مکان کے دو منظر

جائے - چنانچہ میں نے میجر پیرزادہ کے ماتحت ایک انفنٹری کمپنی کو اسمبلی ہال کے پاس تعینات کر دیا تاکہ ضرورت پڑے تو وہ پولس کی مدد کر سکے -

اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا اور وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر شروع کی جس کے متعلق انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ''بے حد اہم،، ہے - باہر طلبا چیخ چیخ کر دیوانے ہو رہے تھے - فضل الحق اپنے آدمیوں سے کام لینا خوب جانتے تھے - وہ تھوڑی دیر کے بعد اسمبلی ہال سے برآمد ہوتے اور طلبا کے کان میں ایک نیا نعرہ پھونک کر پھر اندر چلے جاتے اور طلبا اس تازہ نعرے سے آسمان سر پر اٹھا لیتے - یہ کارروائی شام کے پانچ بجے تک ہوتی رہی - اسی وقت مجھے یہ پیغام ملا کہ طلبا فوج کے بہت قریب پہنچتے جا رہے ہیں اور ان سے جھڑپ ہو جانے کا خطرہ ہے -

یہ سردیوں کے دن تھے اور اندھیرا ہونا شروع ہو گیا تھا - مجھے فکر تھی کہ اگر طلبا فوج کی طرف بڑھے تو وہ ضرور ان پر گولی چلا دے گی ، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ صورت پیش آئے - چنانچہ میں نے اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر لیا - میں نے وہاں اس قدر ابتری دیکھی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی - اندر وزیر اعلیٰ ایک غصے میں بھرے ہوئے اور لڑنے مرنے پر تیار مجمعے کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کر رہے تھے اور باہر طلبا کو کھلی چھٹی تھی کہ جو ان کے جی میں آئے کریں -

اس وقت سپرنٹنڈنٹ پولس عبید اللہ ڈیوٹی پر تھے - میں نے ان سے کہا کہ تم کچھ کارروائی کر کے لڑکوں کو پیچھے کیوں نہیں ہٹاتے؟ انھوں نے کہا ''جناب اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں ابھی کارروائی کرنے کو تیار ہوں لیکن میں ان سیاست دانوں کے لئے کوئی کام کرنے کو تیار نہیں -،، مجھے سخت حیرت ہوئی - میں نے پوچھا ''کیوں؟،، انھوں نے بیان کیا ''یہ لوگ آج طلبا کو منتشر کرنے کا حکم دیں گے اور کل اس بات کی تحقیقات کرائیں گے کہ ایسا کیوں ہوا ، اور سارا الزام مجھ پر ڈال دیں گے اور خود کبھی اس کی ذمہ داری نہیں لیں گے - میں تحریری حکم چاہتا ہوں -،،

ظاہر ہے کہ پولس کا نظم و ضبط بڑی پست حالت میں تھا۔ میں اسمبلی میں گیا اور وزیر اعلیٰ سے مل کر انہیں بتایا کہ اندھیرا ہوتا جا رہا ہے اور طلبا فوج کے بہت قریب تر آچکے ہیں۔ انہوں نے پوچھا ''مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' میں نے مشورہ دیا ''اجلاس برخاست کر دیجئے اور گھر چلے جائیے۔'' گھبرا کر بولے: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے - میں اپنی اس اہم تقریر کو ادھ بیچ میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

شاید انہوں نے میرے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ لی تھی - اسی لئے انہوں نے فیصلہ کیا: ''اچھی بات ہے - مجھے پانچ منٹ کی مہلت دو۔''

وہ اجلاس میں گئے اور کسی سے کچھ کہ سن کر واپس آ گئے - کہنے لگے ''میں گھر جانے کو تیار ہوں لیکن یہاں سے نکلوں کیسے؟'' میں نے میجر پیرزادہ سے کہا کہ وہ وزیر اعلیٰ کی کار اسمبلی کے پچھواڑے لے آئیں - پھر میں نے اور پیرزادہ نے جیسے تیسے وزیر اعلیٰ کو باورچی خانے کے راستے اسمبلی ہال سے نکالا۔ جب ہم اس کام سے نمٹ چکے تو میں نے طلبا سے کہا ''سونے کی چڑیا تو اڑ گئی!'' طلبا نے زور زور سے قہقہے لگائے اور وہاں کی فضا جو لمحہ بھر پہلے بڑی گنبھیر اور خطرے سے پر معلوم ہوتی تھی، ہنسی مذاق اور خوش دلی میں بدل گئی۔

فضل الہی، محمد علی بوگرا کے ساتھ جو اس وقت مخالف پارٹی میں شامل تھے، اسمبلی ہال سے باہر آئے، انہوں نے طالب علموں کو پھر اکسانا چاہا - میں نے محمد علی کے شانے پر تھپکی دی اور کہا ''کیا آپ کو کسی گولی کی جستجو ہے؟'' انہوں نے پلٹ کر جواب دیا ''آپ کا برتاؤ بڑا ناشائستہ ہے۔'' میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر سے ہنگامہ شروع ہو جائے اس لئے میں نے ان سے زور دے کر کہا کہ آپ گھر چلے جائیں۔

محمد علی کے پاس پانچ ووٹ تھے - وہ فوراً وزیر اعلیٰ کے پاس پہنچے اور ان کو دھمکی دی کہ میں اپنی حمایت سے پھر جاؤں گا۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے مجھے بلوایا - پہلے صورت حال کو سنبھالنے پر

میرا شکریہ ادا کیا ۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ نے محمد علی کو ناراض کر دیا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجھے حکومت سے ہاتھ دھوے پڑیں گے ۔ میں نے کہا آپ انہیں بلوائیے تاکہ میں ان پر صورت حال واضح کر دوں ۔ جب محمد علی آئے تو میں نے انہیں گلے سے لگا لیا اور کہا ''میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا آپ کو اسے سچ نہیں سمجھ لینا چاہئے تھا۔،،

میں اس معاملے سے سخت بیزار ہو چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ان کی آپس کی چپقلش میں خود کو زیادہ الجھاؤں ۔ غرض محمد علی کا غصہ اتر گیا اور ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوئے ۔

ان ہی دنوں مجھے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز قائم کر سکوں ۔ ڈھاکہ میں اس کے لئے کوئی موزوں جگہ نہیں تھی ۔ مجھے ہائی کورٹ کی عمارت نظر آئی ، لیکن ہائی کورٹ کے حکام سے یہ کہنا آسان بات نہ تھی کہ اس عمارت کا کچھ حصہ ہمیں دے دیں ۔ تاہم چیف جسٹس مسٹر محمد اکرم بڑے معقول آدمی تھے ۔ ان کے بعض جج صاحبان خیموں میں بیٹھا کرتے تھے ، لیکن انھوں نے کمال مہربانی سے ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق جگہ دے دی ۔

مجھے یاد ہے ایک دن میں ایک معائنے کے بعد ہائی کورٹ واپس آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ فضل الحق طلبا سے کہ رہے ہیں ''تم سب زمین پر لمبے لیٹ جاؤ تاکہ عدالت کا کام نہ چل سکے۔،، میں نے اپنی کار سے سر باہر نکالا اور پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔

فضل الحق نے مجھے دیکھ لیا اور وہ دل میں سمجھ گئے کہ یہ کوئی خطرناک قدم اٹھا بیٹھے گا ۔ چنانچہ انھوں نے چپکے سے طلبا کو وہاں سے چلے جانے کی ہدایت کر دی ۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس زمانے میں زندگی ہنگاموں اور دل چسپیوں سے خالی نہ تھی ۔

صوبے سے رخصت ہونے سے پہلے میں وہاں ایک خاصی اچھی انصار

فوج بنانے میں کامیاب ہو گیا - اس کام میں مجھے عزیز احمد سے بہت مدد ملی جو اس زمانے میں وہاں چیف سکرٹری تھے - انہیں احساس ہوا کہ ایسی فوج سے عوام میں نظم و ضبط پیدا ہوگا اور انہوں نے صوبائی حکومت کو اس کے لئے ذرائع مہیا کرنے پر آمادہ کر لیا - ایسٹ بنگال رجمنٹ بھی میرے ہی زمانے میں وجود میں آئی - یہ پہلا موقع تھا کہ اس صوبے کے لوگ ایک جنگ جو یونٹ میں بھرتی کئے گئے -

علاوہ ازیں میں نے ایسٹ پاکستان رائفلز کے نام سے پولس کی ایک جمعیت بھی قائم کی اور ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جس سے پولس کے تمام افسروں کو جنگی تعلیم مل سکے - اس سے پولس کو بے حد فائدہ پہنچا اور ان میں بے حد خود اعتمادی اور سربلندی کا احساس پیدا ہو گیا -

میں نومبر سنہ ۱۹۴۹ء کے ختم پر بڑی افسردہ دلی کے ساتھ مشرقی پاکستان سے رخصت ہوا - رفتہ رفتہ میں یہاں کے لوگوں کا بڑا گرویدہ ہو گیا تھا اور اس علاقے کے مسائل کو بھی کسی قدر سمجھنے لگا تھا جس سے آگے چل کر مجھے بہت فائدہ پہنچا -

مشرقی پاکستان سے مجھے دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء میں جنرل ہیڈ کوارٹرز میں بلایا گیا اور ایڈجوٹنٹ جنرل مقرر کیا گیا - اس وقت جنرل گریسی کمانڈر ان چیف تھے اور جنرل راس میکے ان کے چیف آف سٹاف - ایڈجوٹنٹ جنرل کی برانچ عملے کی دیکھ ریکھ افسروں اور جوانوں کی بھرتی، طبی سہولتوں، تنخواہوں، پنشنوں اور فوجی نظم و ضبط کی دیکھ بھال کرتی تھی -

پہلے پہل مجھے جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان میں آزاد کشمیر کی فوج کا مسئلہ بھی شامل تھا - کشمیر میں جنگ بندی کی وجہ سے لڑائی ختم ہو چکی تھی اور اس امر کی ضرورت تھی کہ آزاد فوج کو باقاعدہ حیثیت میں لایا جائے اور ان میں فوجی ضابطہ پیدا کیا جائے - اس فوج میں مختلف فوجی قابلیتوں کے کوئی پچاس ہزار مسلح جوان تھے - مگر ان پر کوئی فوجی قاعدہ قانون عائد نہ ہوتا تھا - اس

مسئلے پر جنرل هیڈ کوارٹرز اور حکومت آزاد کشمیر کے درمیان عرصے تک خط و کتابت هوتی رهی تھی -
شاہ نام کے کوئی صاحب تھے جو آزاد کشمیر گورنمنٹ کے سربراہ تھے اور ریاستی فوج سے بھی کچھ تعلق رکھتے تھے - یه صاحب بہرے تھے اور اپنے ساتھ ایک بڑا سا سننے کا آله اٹھائے پھرتے تھے - ان کو اصرار تھا کہ آزاد فوج پر برٹش آرمی ایکٹ عائد کیا جائے - وہ اپنے اس دعوے کی حمایت میں یه دلیل پیش کرتے تھے که برطانیه نے جب کبھی ریاستی فوج کو اپنے کسی کام کے لئے استعمال کیا تو اس پر انڈین فوجی قانون نہیں بلکه برٹش فوجی قانون نافذ کیا گیا -
میں نے جب یه بات سنی تو مجھے بڑا غصه آیا اور میں نے ان شاہ صاحب سے بات کرنے کی ٹھان لی - میں نے انھیں بتایا که انگریز چلے گئے هیں اور اپنے ساتھ اپنا قاعدہ قانون بھی لیتے گئے هیں - اب همارے پاس صرف ایک ضابطه هے اور وہ هے پاکستان آرمی ایکٹ - اگر آزاد فوج بھی اس ایکٹ کے تحت آ جائے تو اس کا نظم و ضبط بہتر هو جائے گا -
میں نے دیکھا که جب شاہ صاحب کوئی بات سننا نه چاهتے تو چپکے سے اپنے سننے کے آلے کو کان سے پرے سرکا دیتے - میں نے ان کے ساتھ بہت مغز زنی کی، مگر ان کی طرف سے کچھ جواب نه پایا - جب میں ان سے پوچھتا که کیا آپ کو میری بات منظور هے تو وہ ایسی صورت بنا لیتے جیسے کچھ سنا هی نہیں - لیکن آخر کار آزاد فوج نے یه بات منظور کر لی که اس پر پاکستان آرمی کا ضابطه نافذ کیا جائے -
گریسی بڑے نیک آدمی تھے - وہ دوسروں کے جذبات کا بڑا خیال رکھتے تھے - انھوں نے مجھے بہت آزادی دے رکھی تھی - راس میکے بڑے باریک بیں سٹاف افسر تھے - ان کا فوجی ریکارڈ بڑا شان دار تھا - مجھے سٹاف کے معاملات میں ان کے مشوروں سے بڑی مدد ملتی تھی - وہ بڑے ٹھوس، سنجیدہ اور مستقل مزاج افسر تھے - همارے پاس تنخواہ یا پنشن کا کوئی ضابطه نہیں تھا اور فوجیوں کو طویل اور

قابل تعریف سروس کے صلے میں جو وظائف یا رقوم ملا کرتی تھیں گورنمنٹ نے انھیں بند کر دیا تھا - نہ اعزازی کمیشن دیا جا سکتا تھا اور نہ کسی قسم کا نقد انعام - میں نے اس سلسلے میں وزارت خزانہ سے ایک طویل اور سخت جنگ شروع کی - پھر بھی مجھے ان میں سے بعض مسائل کو حل کرنے میں تقریباً سات برس لگ گئے- میں وزارت خزانہ میں کوئی تجویز لے کر جاتا اور درخواست کرتا کہ خدا کے لئے ہاں کہو یا نہیں مگر کچھ کہو ضرور - اس کی مثال ایسی تھی جیسے کوئی شخص ایک پُر اسرار خاموشی کی دیوار کے ساتھ اپنا سر دے مارے - اور پھر چوٹی کے لوگوں تک جو اپنی اپنی خاموش دیواریں تعمیر کرنے میں مصروف نظر آتے تھے، رسائی بھی ہمیشہ آسان نہ ہوتی تھی - چنانچہ کچھ چھوٹی چھوٹی دیواروں مثلاً نائب مشیر مالیات تک پہنچ جانا بھی غنیمت تھا - معلوم ہوتا تھا کہ سارے معاملے اسی سطح کے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیئے گئے تھے - اور یہ حضرات تھے کہ نہ تو ان پر کوئی دلیل یا حجت کارگر ہوتی بھی اور نہ انھیں وقت کے تقاضوں کا کچھ احساس تھا -

مجھے امید تھی کہ چودھری محمد علی جو اس وقت حکومت پاکستان کے سکرٹری جنرل تھے، ہماری مشکلات کو دور کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے، کیونکہ وہ فوج کے معاملات کو کچھ کچھ سمجھتے تھے اور آزادی سے پہلے ملٹری فنانس کے فنانشل ایڈوائیزر بھی رہ چکے تھے - ان سے میری براہ راست بات چیت تو زیادہ نہیں ہوئی لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انھوں نے ہمارے مسائل کو حل کرنے میں ذرہ بھر بھی ہماری مدد نہیں کی -

سچ یہ ہے کہ پاکستان آرمی میں بڑی بے اطمینانی پائی جاتی تھی- ہم جنرل ہیڈ کوارٹرز میں اکثر سوچا کرتے کہ اگر خدا نخواستہ ہم پر کوئی بُرا وقت آ پڑے تو ہمیں کیسی بے بسی کا سامنا کرنا پڑے - میں کراچی کے ارباب حکومت کو بار بار یاد دلاتا رہتا کہ یہ صورت حال صحت مندانہ نہیں ہے - جس شخص سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایک دن اپنے وطن کی خاطر اپنی جان عزیز

قربان کر دے اس کی کفالت اور خاطر جمعی کا کچھ نہ کچھ انتظام تو ہونا چاہئے ۔ اور کچھ نہیں تو اس کی ملازمت کی شرطیں ہی طے ہو جانی چاہئیں ۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا وہ پورے دل کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام نہیں دے سکے گا ۔

علاوہ ازیں فوج کے مستقبل کے بارے میں بھی حکومت کی پالسی کا صاف صاف فیصلہ ہو جانا اشد ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنی تنظیم شروع نہیں کر سکتے تھے ۔ ہمارے حصے میں زمانہ' جنگ کی فوج آئی تھی جس میں اعلیٰ درجے کے لڑنے والے جوان تو موجود تھے مگر ان کی فوجی تربیت ناقص تھی ۔ بہت سے افسروں کو مختصر مدت کے ایمرجنسی کمیشن کے تحت بھرتی کیا گیا تھا ۔ ان کی ٹریننگ اچھی نہیں ہوئی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ امن کے زمانے میں فوج کے فرائض کیا ہوتے ہیں ۔

ہمارے پاس کوئی مکمل مسلم یونٹ نہیں تھا ۔ انگریز مسلمانوں کو بہت خطرناک سمجھتے تھے اور انہیں ہمیشہ مختلف یونٹوں میں بکھیر دیا کرتے تھے ۔ آزادی کے بعد ہم نے ان آدمیوں کو مناسب یونٹوں میں یکجا کر دیا تھا ۔ لیکن چونکہ یہ لوگ ایک دوسرے سے ناواقف تھے اس لئے ان میں فوجی یگانگت پیدا نہ ہو سکی بلکہ فوجی نظم و ضبط میں نقص پیدا ہو گیا ۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس نقص کو رفع کرنے کے لئے کچھ سخت طریقے اختیار کئے ۔ تمام فوج میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی کہ میں فوجیوں کو جسمانی سزا دینے سے بھی نہیں چوکتا ۔ اس کا اثر اچھا ہوا ۔ افسروں میں جو بے راہ روی پھیلی ہوئی تھی اس کی روک تھام کے لئے اور بھی سخت کارروائی کی ضرورت تھی ۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں کمانڈر ان چیف کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکوں گا ۔ چنانچہ میں نے اس کارروائی کو کسی اور مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھنے کا فیصلہ کیا ۔

میں نے ایک آفیسرز ٹریننگ سکول جاری کیا اور ملٹری اکیڈمی کے کام کی دیکھ بھال بھی کی ۔ فوج کے مستقبل کا دار و مدار اس امر پر تھا کہ ہم ٹھوس تربیتی ادارے قائم کریں اور یہ ایسے باقاعدہ

افسر پیدا کریں جن کو فوجی نظم و ضبط کا پورا پورا احساس ہو اور جو زمانۂ امن کی ضرورتوں کے مطابق کام کی لگن رکھتے ہوں۔

میں نے ایڈجوٹنٹ جنرل کی حیثیت سے کوئی سال بھر کام کیا۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا کیونکہ یہاں میں فوجی تنظیم کے بنیادی مسائل سے دوچار ہوا۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت کے کام کو بھی براہ راست دیکھنے کا موقع ملا کم از کم مالیاتی شعبے میں۔ ان تمام کوتاہیوں اور مشکلوں کے باوجود مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل تھا کہ ہمارے پاس ایک جواں سال فوج اور اعلیٰ درجے کا انسانی جوہر موجود ہے۔ خدا نے ہمیں اس امر کا نہایت شاندار موقع بخشا تھا کہ ہم اپنے وطن کی خدمت کے لئے اپنی ایک فوج تیار کریں اور ایسا ہی ہم نے کر دکھایا۔

چوتھا باب

کمانڈر ان چیف

اس بات پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ جب جنرل گریسی کی ملازمت کی معیاد ختم ہوگی تو ان کی جگہ کسی پاکستانی کے کمانڈر ان چیف بنائے جانے کا کس حد تک امکان ہے۔ گریسی شاید اپنے عہدے پر قائم رہنا پسند کرتے۔ لیکن عام خیال یہی تھا کہ پاکستانی فوج کی کمان کسی پاکستانی ہی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جب اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم نے پاکستانی فوجوں کو کشمیر بھیجنا چاہا تھا تو گریسی نے لارڈ مونٹ بیٹن کی منظوری کے بغیر، جو سپریم کمانڈر تھے ایسا حکم جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آکن لیک بیچ میں پڑ گئے اور ان کے کہنے سننے سے قائد اعظم اپنے فیصلے میں تبدیلی کرنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اس کارروائی سے گریسی لوگوں کی نظروں سے گر گئے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نئے کمانڈر ان چیف کے تقرر سے بہت دن پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں راول پنڈی آئے تھے۔ اور ڈویژنل کمانڈروں کی کانفرنس ہوئی تھی، جس میں شرکت کے لئے میں مشرق پاکستان سے آیا تھا۔ وزیر اعظم نے تمام اونچے درجے کے پاکستانی افسروں کو بلوایا تھا اور سرکٹ ہاؤس میں ان سے خطاب کیا تھا۔ اپنی تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ اب کے پاکستانی فوج کا کمانڈر ان چیف کسی پاکستانی کو بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ لیکن ابھی کسی شخص کو منتخب نہیں کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ

یہ عہدہ سب سے سینیئر افسر کو نہ دیا جائے - وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اگر یہ عہدہ اس سے کم تر درجے کے افسر کو دیا جائے تو سینئیر افسروں پر اس کا اثر کیا ہوگا -

انھوں نے کئی افسروں سے یہ بات پوچھی اور آخر میں مجھ سے مخاطب ہوئے - میں سرے پر بیٹھا تھا - انھوں نے کہا :

''جنرل ایوب - آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں ؟،،

میں نے کہا : ''جناب نہایت ادب سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ یہ سوال اٹھایا ہی نہیں جانا چاہئے تھا - ہماری فوجی تعلیم بڑی سادہ اور صاف ہے - فوجی افسروں کی حیثیت سے ہم اپنی انتہائی قابلیت کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ اپنے سے اونچے افسروں پر چھوڑ دیتے ہیں - وہ جو فیصلہ بھی کریں خواہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند، اسے ماننا ہمارا فرض ہے - اور اگر کوئی اسے ماننے کو تیار نہ ہو تو اسے فوج سے تشریف لے جانا چاہئے -،،

میرا خیال ہے کہ جنرل رضا اور بعض دوسرے لوگ چوٹی کے افسر گنے جاتے تھے اور وہ اس سلسلے میں دوڑ دھوپ بھی کر رہے تھے - علاوہ ازیں جنرل افتخار کا بھی بڑا چرچا تھا - بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز ان کی پشت پر ہیں - وہ بہت اچھے افسر تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ اور جنرل شیر خان، جنگ شاہی میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے - جنرل افتخار کے ساتھ لوگوں کی کم بنتی تھی اور پھر انھیں غصہ بھی جلد آ جایا کرتا تھا - میں نہیں کہ سکتا کہ انھیں کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے کس حد تک کامیابی حاصل ہوتی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا -

جس وقت ، میں ایڈجوٹنٹ جنرل کی حیثیت سے راول پنڈی پہنچا تو اس زمانے میں نئے کمانڈر ان چیف کے بارے میں بڑی افواہیں گرم تھیں - ایک دو مرتبہ میری بیوی نے بھی مجھ سے پوچھا کہ کس شخص کے کمانڈر ان چیف بننے کا امکان ہے - میں نے جواب دیا : ''سچ پوچھو تو مجھے کچھ علم نہیں لیکن میں اتنا جانتا

ھوں کہ جو شخص بھی مقرر ھو ، میرے کام کا بوجھ جوں کا توں رھے گا -،،

اس کے بعد لوگوں نے براہ راست مجھ سے پوچھنا شروع کیا - میں نے سوچا کہ اس قسم کی گپ شپ سے جان چھڑانے کا عمدہ طریقہ یہ ھے کہ چھٹی لے لی جائے - چنانچہ میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر دو مہینے کے لئے چھانگلا گلی کی سرد پہاڑیوں پر چلا گیا -

ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء کی ایک رات کو وزارت دفاع کے ایک افسر نے ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ آپ نئے کمانڈر ان چیف چن لئے گئے ھیں - مجھے ان عظیم ذمہ داریوں کا گہرا احساس تھا جو مجھ پر عائد ھونے والی تھیں - میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ مجھے ھمت اور قابلیت عطا فرمائے تاکہ میں خود کو اس کا اھل ثابت کر سکوں -

یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو ملک کے لئے خاصی اھلیت رکھتا تھا - تقریباً دو سو سال کے بعد اس بر صغیر میں ایک مسلم فوج کا کمان دار اعلیٰ ایک مسلمان مقرر ھوا تھا - میں جانتا تھا کہ اس ملک میں جس قسم کی بھی روایات اور جس قسم کے بھی معیار قائم ھو چکے ھیں ابھی مدتوں فوج ان کے زیر اثر رھے گی - میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں فوجی کام اور لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں اعلیٰ ترین مثال قائم کروں گا - مجھے ایک نوخیز فوج کی تنظیم کا کام سپرد ھونے والا تھا - میرے لئے یہ آزمائش اور خدمت گزاری کا ایک عظیم موقع تھا -

میری کوشش سب سے پہلے یہ ھوگی کہ مسلح افواج کے اراکین میں خودداری کا احساس پیدا ھو - وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ھونے اور ذاتی قابلیت کی بنا پر پرکھے جانے کا سبق سیکھیں - مجھے جلد ھی معلوم ھو گیا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا میں نے سمجھ رکھا تھا -

جنرل گریسی نے اس اعلان کو بڑے اچھے سبھاؤ سے سنا - مجھے پہلے ڈپٹی کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا تاکہ میں کام سے واقفیت حاصل کر لوں - میں ایک مختصر دورے پر جرمنی اور انگلستان بھی

گیا تاکہ وہاں کے فوجی اداروں کا معائنہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کر سکوں ۔

۱۷- جنوری سنہ ۱۹۵۱ء کو میں نے کمانڈر ان چیف کا عہدہ سنبھالا ۔ جنرل گریسی جب رخصت ہو رہے تھے تو انھوں نے مجھے کچھ زیادہ ہدایات نہیں دیں ۔ اس قسم کے عہدے کا چارج لینے دینے میں ہوتا ہی کیا ہے ۔ نئے آدمی کو اپنا کام نئے سرے سے خود ہی شروع کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن انھوں نے کسی قدر مبہم طور پر مجھ سے فوج میں ایک ''نوجوان ترک پارٹی،، کی موجودگی کا ذکر کیا ۔ میں نے وضاحت چاہی تو انھوں نے کچھ زیادہ تشریح نہ کی، بس اتنا کہا کہ اس میں اکبر خان جیسے کچھ لوگ شامل ہیں ۔ اس کے دو یا تین مہینے کے بعد ہی اکبر کی سازش کا انکشاف ہوا، جسے بعد میں ''سازش راول پنڈی،، کے نام سے یاد کیا گیا ۔

اس سازش کا حال مجھے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی زبانی معلوم ہوا ۔ وہ اس وقت انتخابی دورے میں مصروف تھے ۔ انھوں نے مجھے اور سکندر مرزا کو سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن پر ملاقات کے لئے بلوایا ۔ مجھے لاہور سے اور اسکندر مرزا کو کراچی سے ۔ میں اسکندر مرزا سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا ۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کچھ مضطرب سے ہیں ۔ یہ غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ طبعاً بڑے متحمل مزاج تھے ۔ ان کے چہرے سے کبھی بدمزاجی ظاہر نہیں ہوئی تھی ۔ انھوں نے اسکندر مرزا کے بارے میں پوچھا ''یہ کم بخت کہاں رہ گیا؟ اب تک کیوں نہیں آیا؟،،

اسکندر مرزا لنچ کے وقت پہنچے ۔ وزیر اعظم نے ہم دونوں کو کھانے پر مدعو کیا ۔ اس دوران میں ادھر آدھر کی باتیں کرتے رہے جب کھانا کھا چکے تو انھوں نے کرسی سے ٹیک لگا کر ہم سے کہا : ''صاحبان میں آپ لوگوں کو ایک بری خبر سنانے والا ہوں ۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بعض فوجی افسروں نے حکومت کا تختہ آلٹنے کا منصوبہ بنایا ہے اور بہت جلد اس پر عمل ہونے والا ہے ۔،،

میں نے ان سے مزید تفصیل کی درخواست کی ۔ انھوں نے وہ پوری رپورٹ مجھے دے دی جو چندریگر صاحب نے انھیں بھیجی تھی ۔

چندریگر اس زمانے میں شمال مغربی صوبہ سرحد کے گورنر تھے - میں نے مشورہ دیا کہ ہمیں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے واقعات کی چھان بین کر لینی چاہئے -

میں اور اسکندر گورنر سے ملاقات کے لئے پشاور پہنچے - ہم اس پولس افسر سے بھی ملنا چاہتے تھے جس نے گورنر کو یہ رپورٹ بھیجی تھی اور مخبر سے بھی - میں نے گورنر سے بات چیت کی - اس کے بعد کیانی سے ملا - یہی وہ پولس افسر تھے جنھوں نے رپورٹ دی تھی - کیانی مخبر کا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے - لیکن آخر کار ہم نے مخبر کو پکڑ بلوایا - ادھر تو میں کیانی سے سوالات کر رہا تھا اور ادھر اسکندر مرزا مخبر سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے - جلد ہی ہم پر عیاں ہو گیا کہ سچ مچ بغاوت کا منصوبہ بنایا گیا ہے - سازشیوں میں ایک شخص بریگیڈیئر صدیق خان بھی تھا ، جو کبھی میرے یونٹ میں کام کر چکا تھا ، اور اب بنوں میں ایک بریگیڈ کی کمان کر رہا تھا - وہ کسی قدر غیر مستقل مزاج، جذباتی اور بے دھڑک قسم کا آدمی تھا - میں نے اس کو لانے کے لئے ہوائی جہاز بھیجا - جب وہ آیا تو میں نے اس سے کہا ''صدیق تم مجھے سچ سچ بتا دو، نہیں تو میں تمہیں آلٹا لٹکا دوں گا۔،،

صدیق نے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ رپورٹ بالکل جھوٹی ہے -

ہم نے صدیق کو واپس بنوں جانے کی اجازت دے دی - اس نے وہاں پہنچ کر کرنل ارباب کو تھل کے مقام پر ٹیلی فون کیا - کرنل ارباب بھی جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا، سازشیوں میں سے تھا - صدیق نے اسے بتایا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے - اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ حکومت کا تختہ آلٹنے کے لئے زبردست سازش کی جا رہی تھی -

اس وقت تک ہمیں کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں - چنانچہ ہم نے واپس آ کر وزیر اعظم کو ان سے مطلع کر دیا - انھوں نے فوری کارروائی کا فیصلہ کیا - قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولس کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا - اور وہ تمام فوجی افسر اور شہری جن کا اس سازش سے تعلق تھا، راتوں رات اپنے اپنے ٹھکانوں سے گرفتار کر

لئے گئے۔ میرا خیال تھا کہ یہ مقدمہ فوجی عدالت میں پیش ہونا چاہئے ۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اس میں بعض شہری بھی شامل تھے ۔ چنانچہ وزیر اعظم نے فیصلہ کیا کہ ایک سپیشل سول ٹریبونل مقرر کیا جائے اور مقدمے کی کارروائی بند کمرے میں ہو۔ تاکہ سرکاری راز افشا نہ ہونے پائیں ۔

مقدمے کی کارروائی حیدر آباد جیل میں ہوئی ۔ ملزمین نے مقدمے کی پیروی کے لئے سہروردی کو اپنا وکیل مقرر کیا ۔ سہروردی نے بڑی عجیب طبیعت پائی تھی ۔ وہ نائٹ کلبوں کی رنگیلی زندگی پر جان دیتے تھے مگر ساتھ ھی وہ بلا کے باھمت اور مستعد بھی تھے ۔ اس مقدمے کے سلسلے میں جو فوجی افسر گواہ کے طور پر پیش ہوئے، سہروردی نے ان پر بڑے مزے لے لے کر چوٹیں کیں ۔ میں نے دیکھا کہ وہ جرح کرتے وقت اپنی حد سے بہت بڑھ جاتے تھے لیکن عدالت خاموشی سے سنتی رھتی ۔ مجھے بھی سوائے خاموشی کے چارہ نہ تھا ۔

سازشیوں پر جرم ثابت ھوا اور ان کو سزائیں دی گئیں ۔ اس کے چند سال بعد سہروردی اور ان کے حامیوں نے حکومت پر زور ڈالا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے ۔ حکومت اس کی مجاز تھی، اور میں اس پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا ۔ لیکن جو بات میں کبھی معاف نہ کر سکا، وہ فوجی افسروں پر سہروردی کی بلا وجہ درشت اور متانت سے گری ہوئی جرح تھی ۔

اس کے بعد ہم دونوں کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے ۔ کابینہ کے ایک اجلاس میں جب سازش کا موضوع زیر بحث آیا تو سہروردی نے اس پر کچھ خیال آرائی کی ۔ اس پر میں نے ان کو آڑے ھاتھوں لیا ۔ میں نے کہا کہ آپ نے دوران مقدمہ میں فوج کے وقار کو جس طرح نقصان پہنچایا، وہ پاکستان کے مفاد کے منافی تھا ۔ انھوں نے کچھ جواب نہ دیا ۔ بعد میں جب وہ وزیر اعظم مقرر کئے جا رہے تھے تو میں بھی اتفاق سے کراچی ھی میں تھا ۔ اسکندر مرزا نے مجھے بلوایا اور کہا ''ہم مسٹر سہروردی کو وزیر اعظم بنانے والے ھیں ۔ اور اس حیثیت سے وہ تمہارے وزیر دفاع بھی ہوں گے ۔ وہ چاہتے ھیں

که تم سے صلح صفائی ہو جائے - میری رائے میں تم دونوں کی ملاقات ہونی چاہئے-،،

سہروردی ایوان صدارت میں آئے - میں نے ان سے کہا کہ میرے بارے میں آپ کے جو خیالات ہیں میں انہیں بخوبی جانتا ہوں، اور آپ کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں یقیناً آپ بھی ان سے واقف ہوں گے - لیکن کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے میں آپ کے ہر اس حکم کو بجا لاؤں گا جو قانونی طور پر جائز اور درست ہوگا - اس کے ساتھ ہی میں بھی یہ آمید رکھوں گا کہ فوج کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے گی - سہروردی نے یہ سمجھوتہ منظور کر لیا - اس پر ہم دونوں نے مصافحہ کیا -

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سہروردی نے فوج کے اندرونی معاملات میں کبھی دخل نہ دیا اور جب کبھی میں کسی مسئلے پر بات چیت کرنے ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے میری بات کان دھر کر سنی اور جلد فیصلہ صادر کیا .

راول پنڈی سازش کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں - بے اطمینانی اور بے اعتباری کی زمین میں یہ پودا پھلا پھولا تھا - اس کے پروان چڑھنے کی کئی وجہیں تھیں -

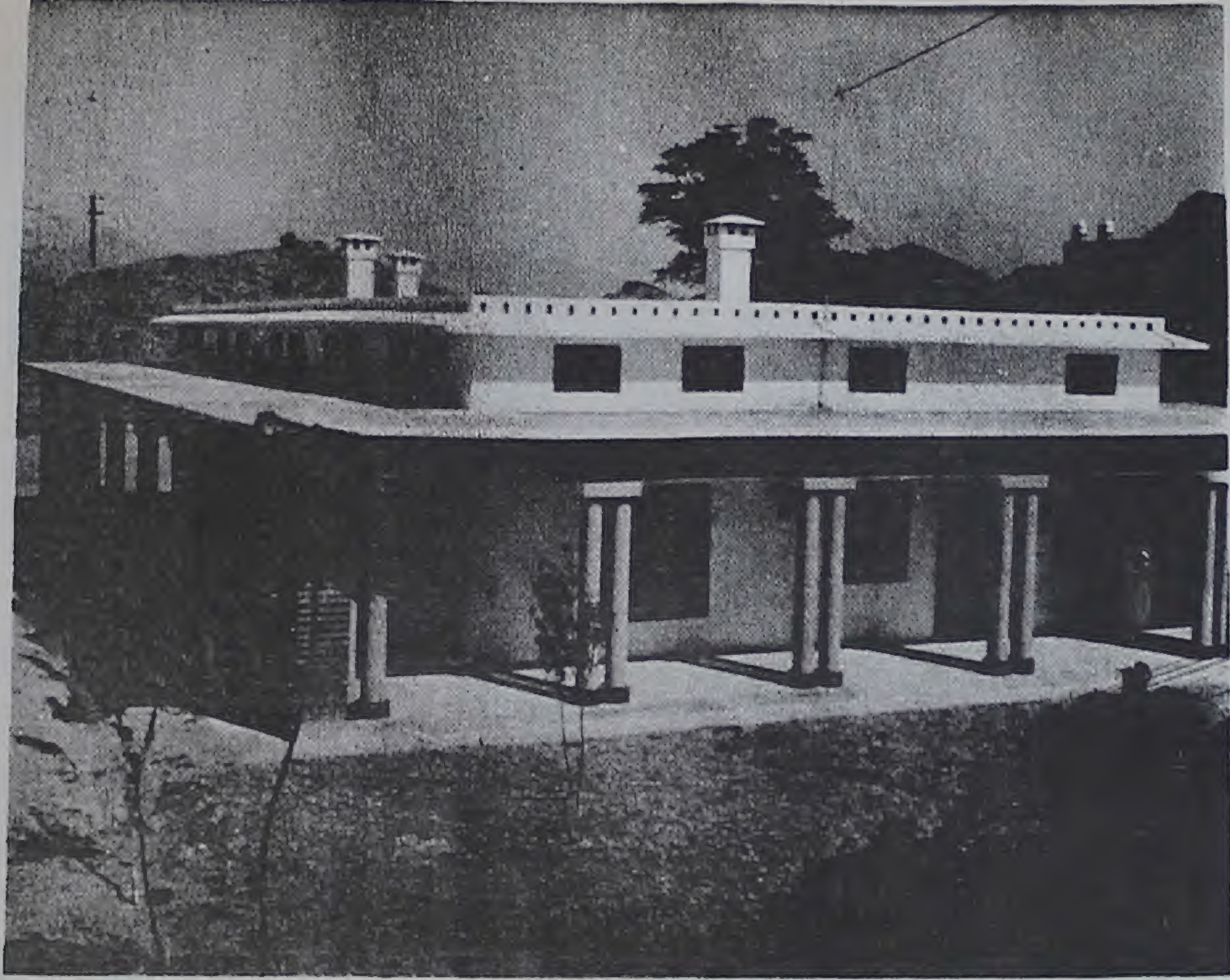
اس زمانے میں نچلے افسروں کو جلد جلد اونچے اونچے فوجی مناصب دئے جا رہے تھے جس کی وجہ سے تمام افسروں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی اور ان کی توقعات حد سے متجاوز ہو گئی تھیں - ہر افسر یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ کمانڈر ان چیف نہ بنا تو کچھ بات نہ ہوئی - کچھ عجیب صورت حال تھی - اچھے خاصے ہوشیار اور سمجھدار لوگ، بریگیڈیر اور جنرل تک ہر ایک کے سامنے اپنی قسمت کا رونا لے بیٹھتے - ہر شخص اپنی دانست میں گویا نپولین تھا مگر قسمت کا مارا ہوا - میں اپنے دل میں کہا کرتا کہ اگر آزادی نہ ملتی تو میں بریگیڈیر بننا بھی اپنی بڑی خوش قسمتی خیال کرتا - آزادی کے بعد بھی اگر میں میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوتا تو خود کو ایک بہت کامیاب انسان تصور کرتا - عام طور پر ایک فوجی افسر کی توقع یہ ہوتی تھی کہ اسے یونٹ کی کمان مل

جائے گی، لفٹیننٹ کرنل بنا دیا جائے گا اور اسی عہدے پر وہ سروس سے ریٹائر ھو جائے گا - مگر اب جو یوں بڑے بڑے عہدے آسانی سے دستیاب ھونے لگے تو ان کی قدر گر گئی اور لوگوں کی ھوس کی انتہا نہ رھی -

ادھر کشمیر میں لڑائی ھو رھی تھی - اس کی ابتدا ایک بے قاعدہ جنگ کے طور پر ھوئی تھی - سپاھی اور افسر خود ھی جو کارروائی چاھتے تھے وہ کرتے تھے - ھیڈ کوارٹرز سے انھیں بہت کم ھدایت ملتی تھی - چھوٹے چھوٹے افسروں نے بڑی ذمہ داری کے کام سنبھال رکھے تھے -

لیکن میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ھماری گورنمنٹ اپنے فرائض مناسب طریق پر انجام دینے میں ناکام رھی تھی - جب اکبر خان کے کاغذات پر قبضہ کیا گیا تو ان میں ھمیں ایک مقالہ ملا جس میں اس نے وزیر اعظم اور حکومت کے تمام لوگوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ ناقابل ھیں اور فیصلہ دینے کی اھلیت نہیں رکھتے - اکبر خان کا مقصد ایک بہتر نظام حکومت قائم کرنا تھا - وہ ایک بہادر افسر تھا - فوج میں اس کا بڑا مان تھا - لیکن اس کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے - اس کی بات میں بڑی تاثیر تھی - لوگ آسانی سے اس کے ھم خیال ھو جاتے تھے اور اس نے اس جال میں بہت لوگوں کو پھانس رکھا تھا -

اگرچہ مجھے یہ گمان تو کبھی نہ گزرا تھا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی فکر میں ھے، تاھم اس کی طرف سے میرے دل میں کچھ کھٹکا ضرور رھنے لگا تھا - مجھے اس کی ترقی کی حد سے بڑھی ھوئی خواھش، اس کے خاندانی حالات اور اس کے سیاسی جھکاؤ کا علم تھا - جب مجھے کمانڈر ان چیف بننے کے بعد بعض افسروں کو جن میں اکبر خان بھی شامل تھا، میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دینے کی ضرورت پڑی تو مجھے اس امر پر خاصا سوچ بچار کرنا پڑا کہ اس کے سپرد کیا کام کیا جائے - آخر میں نے اس کو چیف آف جنرل سٹاف بنا کر جنرل ھیڈ کوارٹرز میں رکھنے کا فیصلہ کیا - اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے رھے اور فوجی دستوں پر



(۷) ریحانہ میں مصنف کا موجودہ مکان



رکانہ میں والدہ مرحومہ کے ساتھ
۱۹۶۳ء

براہ راست گمان نہ کر سکے ۔ میں نے دیکھا کہ وہ چیف آف جنرل سٹاف کی حیثیت سے اپنے فرائض ٹھیک طور پر انجام نہیں دیتا ۔ اور اپنا بہت سا وقت آزاد کشمیر میں سدھنوں اور دوسرے لوگوں سے ملنے میں گزار دیتا ہے ۔ میں نے دو ایک کام اس کے سپرد کئے جنہیں وہ وقت پر پورا نہ کر سکا ۔ میں نے اس سے کہا کہ تم سوکھا راشن مثلاً کیمیاوی غذائیں مہیا کرنے کا انتظام کرو ۔ یہ چیزیں ہمارے ان آدمیوں کے لئے ضروری تھیں جو دشمن کے علاقے میں کام کر رہے تھے ۔ اکبر خان مجھ سے ملنے سے کتراتا رہا ۔ میں نے دل میں کہا ''یہ شخص یا تو ناقابل ہے، یا اس کا جی کام میں نہیں لگتا، یا پھر اس کا دماغ کسی اور طرف لگا ہوا ہے۔،، اس طرح میرے دل نے گویا خطرے کی گواھی دے دی تھی ۔[۱]

سازش کے اس قضیے نے مجھے اور فوج کے تمام صحیح الدماغ لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔ اس سے فوج کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا ۔ لوگ بجا طور پر یہ پوچھ سکتے تھے کہ یہ ہمیں کس قسم کی سپر حاصل ہے ۔ فوج کو وفاداری ، فرض شناسی، حبِ وطن اور سول حکام کی پوری پوری اطاعت کی ایک عظیم الشان روایت ترکے میں ملی تھی ۔ اس بات کا تو کسی کو گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ ملک کی حالت بڑی نازک تھی، ہمارے استحکام کا یہ زبردست ھتھیار ایسا غیر مستحکم ثابت ہوگا ۔ یہ خیال کر کے میرے رونگٹے کھڑے ھو جاتے ھیں کہ اگر یہ سازش کامیاب ھو جاتی تو ملک اور فوج کا کیا حشر ھوتا ۔

اس سازش کی کامیابی کی دو ھی صورتیں ھو سکتی تھیں ۔ ایک تو یہ کہ فوجوں کے درمیان کسی قسم کی جھڑپ ھوئے بغیر سازشیوں کو فوری اور مکمل کامیابی حاصل ھو جاتی ۔ کیونکہ ان لوگوں نے مجھے اور مجھ جیسے دوسرے وفادار اونچے فوجی افسروں کو کسی قسم کی جوابی کارروائی کرنے سے پہلے ھی حراست میں لے لیا ھوتا ۔

۱۔ اکبر خان کا مقدمہ خصوصی عدالت میں پیش ھوا اور انہیں سزا ھوئی ۔ رھائی کے بعد وہ ایک عام شہری کی زندگی گزار رہے ھیں ۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فوج اس تبدیلی کو قبول کر لیتی یا نہ کرتی، لیکن ہر حالت میں کچھ مدت کے لئے ہر طرف افراتفری پھیل جاتی - اور پھر اکبر خان اور ان کے چیلے چانٹے، بشرطیکہ وہ ہوشیاری سے اپنی جگہوں پر جمے رہتے، رفتہ رفتہ صورت حال پر قابو پا لیتے -

دوسری طرف اس بات کا بھی امکان تھا کہ ہم میں سے کسی کے کان میں اس سازش کی بھنک پڑ جاتی اور ہم فوجوں کو حرکت میں لا کر پیش بندی کے طور پر ان سازشیوں کے خلاف کارروائی کر بیٹھتے - نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستانی فوج کے مختلف یونٹوں میں جھڑپیں شروع ہو جاتیں - اگر یہ صورت پیش آتی تو ہندوستانی فوج یقیناً ہم پر چڑھ آتی - دراصل یہی وہ بات تھی جس سے میں ڈرتا تھا - میں جلد ھی اس صدمے سے سنبھل گیا اور فوج کے وقار، اس کی لیاقت اور خود اعتمادی کو بحال کرنے میں کوشاں ہو گیا - میرا دل کہتا تھا کہ جیسے ھی یہ مقصد پورا ہو جائے گا، پاکستانیوں کی نظروں میں فوج کی وقعت پھر بحال ہو جائے گی -

ہم نے افسروں کے چال چلن اور پچھلے حالات کا بغور مطالعہ کیا، اور مشتبہ لوگوں کو الگ کر دیا گیا - ہم نے فوجی نظم و ضبط کو زیادہ سخت کر دیا، تربیتی مشقیں وسیع پیمانے پر شروع کرا دیں، اور میں خود مختلف یونٹوں کا معائنہ کرنے کے لئے مسلسل دورے کرتا رہا - میں جانتا تھا کہ فوج کے جسم سے ناسور کو نکال دیا گیا ھے لیکن ابھی زخم کے بھرنے میں کچھ وقت لگے گا -

شاید یہ بات عجیب سی معلوم ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ میں اس دن رات کی محنت سے خوش تھا، کیونکہ اس طرح خود کو کام میں مصروف رکھ کر مجھے یہ سوچنے کی مہلت ھی نہ ملتی تھی کہ پاکستان کے سیاسی اور انتظامی حالات کیسے اندوہ ناک ہوتے جا رہے ھیں - کراچی سازشوں کا گھر بنا ہوا تھا - یہ خدا کی بڑی مہربانی تھی کہ ھمارا ھیڈ کوارٹر راول پنڈی میں تھا - جب کبھی میں کراچی کے دورے سے واپس آتا، تو بڑا افسردہ اور دل برداشتہ ہوتا اور سوچتا کہ ھمارے ملک کو کیا ہو گیا ھے - لوگ

دیانت داری سے اپنا کام کیوں نہیں کرتے ۔ ان میں یگانگت کا جذبہ کیوں پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ لڑائی جھگڑے، یہ تفرقے، یہ کینہ، یہ عناد کس لئے ہے ۔ لوگ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے کیوں درپے ہیں ۔ جب میں کراچی سے واپس آتا تو تین چار دن تک میری حالت درست نہ ہوتی ۔ میں اپنے آپ سے کہا کرتا ”کراچی وہاں ہے اور ہم یہاں ۔ ہمیں تو بس فوج کا انتظام ٹھیک رکھنا چاہئے ۔“ مجھے فرار کی صرف یہی صورت نظر آتی تھی کہ خود بھی محنت مشقت کروں اور سپاہیوں سے بھی محنت مشقت کراؤں ۔

مجھے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے آئے دن کسی نہ کسی اہم معاملے پر مشورے کے لئے کراچی جانا پڑتا ۔ میں اسکندر مرزا سے جو اس وقت ڈیفنس سکرٹری تھے، پوچھا کرتا کہ کیا آپ اس مسئلے پر خود وزیر اعظم سے بات کرنا پسند کریں گے ۔ مگر وہ ہمیشہ مجھی کو ان کے پاس بھیج دیتے ۔ یہ ایک ناگوار سا ضابطہ بن گیا ۔ پہلے میں وزیر اعظم سے فیصلہ لوں پھر اس پر عمل درآمد کرانے کے لئے ڈیفنس سکرٹری سے بات چیت کروں ۔ کبھی کبھی اسکندر مرزا خود بھی کسی فیصلے کی توثیق کے لئے وزیر اعظم سے ملتے ۔ ایک دفعہ وزیر اعظم سے اپنی ملاقات میں، میں نے کہا کہ اگر ہماری بات چیت کے موقع پر ڈیفنس سکرٹری بھی موجود ہوا کریں تو بڑی آسانی پیدا ہو جائے ۔

مسٹر لیاقت علی خان نے کہا: ”تم چاہو تو انہیں ساتھ لا سکتے ہو ۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ میں انہیں پسند نہیں کرتا ۔“ اس کے بعد میں اور اسکندر مرزا ایک ساتھ وزیر اعظم کے پاس جایا کرتے ۔ رفتہ رفتہ ان کے تعلقات بہتر ہو گئے ۔

میں تھوڑے ہی عرصے میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کا بڑا گرویدہ ہو گیا ۔ وہ بڑے دلاور اور جری انسان تھے ۔ کوئی بات انہیں پریشان نہ کر سکتی تھی ۔ انہوں نے قائد اعظم کے ایک وفادار نائب کی حیثیت سے کام کیا تھا ۔ اور وہ ہمیشہ خود پیچھے رہ کر کام کرنے سے خوش ہوتے تھے ۔ وہ اب خود کو بے مونس و غم خوار محسوس کرتے تھے ۔ اور اس قسم کی پوزیشن میں انسان ایسا

محسوس کرنے ہی لگتا ہے ۔ کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا کہ وہ روز بروز مجھ پر زیادہ بھروسا کرنے لگے ہیں ۔ جب کبھی وہ مجھ سے کسی امر میں مشورہ کرتے، تو میں انہیں بے لاگ اور سچی رائے دیتا ۔ میں نے دیکھا کہ ان پر چودھری محمد علی کا بڑا اثر ہے ۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں جب ہندوستانیوں نے ہماری سرحدوں پر بہت ساری فوجیں جمع کر دیں تو مسٹر لیاقت علی خان کے دل میں جنگ کا بڑا ولولہ اٹھا ۔ انہوں نے کہا ''میں ان روز روز کی دھمکیوں سے تنگ آ چکا ہوں ۔ بہتر ہے کہ ہم لڑ بھڑ کر فیصلہ کر لیں ۔،،

میں نے گزارش کی کہ آپ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان لوگوں کی رائے بھی تو معلوم کر لیجئے جن کا پیشہ لڑنا ہے ۔ جو بات وہ نہیں جانتے تھے اور جو میں ان کو بتلانا نہیں چاہتا تھا یہ تھی کہ اس وقت ہندوستانی فوج کے مقابلے کے لئے ہمارے پاس لے دے کر کل تیرہ ٹینک تھے جن کے انجنوں کی عمر صرف چالیس پچاس گھنٹے رہ گئی تھی ۔ اس وقت ملک کی صورت حال یہ تھی کہ ہمارے سیاست داں ہی نہیں خود ہمارے سپاہی بھی دشمن سے دو دو ھاتھ کر لینے کے لئے سخت بے چین تھے ۔ ان سب کو روکنا میرا کام تھا اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہا ۔ وزیر اعظم بڑے ہوش مند اور معاملہ فہم آدمی تھے ۔ وہ ہر بات کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے، اور کبھی کوئی کام جلدی میں نہیں کرتے تھے ۔

آخر، آخر میں ان پر کئی طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تھی ۔ سیاسیات پر مقامی رنگ چڑھ چکا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم مہاجر گروپ پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ پنجاب میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی ۔ جس کی وجہ نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی آپس کی چپقلشیں تھیں ۔ مسٹر لیاقت علی خان نے یقیناً دل میں سوچا ہوگا کہ دولتانہ کا ساتھ دینا زیادہ سودمند ثابت ہوگا ۔

مسلم لیگ کے معاملات بڑے الجھے ہوئے تھے ۔ مسلم لیگ ھائی کمان اور ورکنگ کمیٹی کی باگ ڈور گنتی کے چند لوگوں کے

ہاتھ میں تھی اور پارٹی کا کوئی تنظیمی ڈھانچہ نہیں تھا ۔ صوبوں میں جھگڑے بڑھ رہے تھے اور مشرق پاکستان کے مطالبات زور پکڑتے جا رہے تھے ۔ ادھر لیاقت علی خان کی طرف سے صورت حال پر قابو پانے میں ڈھیل ہوتی جا رہی تھی ۔ ان کی بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی ۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاغذات کو پڑھتے وقت ایک خاص زاویے پر رکھا کرتے تھے ۔ ان کے ارد گرد جو لوگ تھے وہ بھی ویسے ہی سست قدم اور قوت فیصلہ سے محروم تھے ۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کسی امر کا بھی دل جمعی کے ساتھ فیصلہ کر سکے ۔

میں یہاں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پارٹی میں اس سے قبل ہی پھوٹ پڑنی شروع ہو گئی تھی ، بلکہ اس کی ابتدا قائداعظم کے زمانے ہی سے ہو گئی تھی جب چودھری خلیق الزماں ایسے لوگ ان کے اختیار کو جھٹلانے لگے تھے ۔

راول پنڈی سازش کے مقدمے کے کچھ ہی مہینے بعد وزیر اعظم ایک عام جلسے میں تقریر کر رہے تھے کہ انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ۔ یہ واقعہ ۱۶-اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء کو راول پنڈی میں پیش آیا ۔ یہ بات آج تک نہ کھل سکی کہ اس جرم کا اصلی مقصد کیا تھا ۔

میں اس وقت لندن کے ایک شفاخانے میں پیچش کا علاج کرا رہا تھا ۔ پانچ چھ سال سے میرا درجۂ حرارت کم رہنے لگا تھا ۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں میں نے اپنڈیسائٹس کا آپریشن کرایا تھا ۔ اس کے بعد سے میرے نظام ہضم میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی ۔ مجھے یاد ہے جب حبیب ابراہیم رحمت اللہ نے جو اس وقت لندن میں ہمارے ہائی کمشنر تھے، ہسپتال میں ٹیلی فون کر کے مجھے اس الم ناک واقعے کی اطلاع دی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرا کوئی بھاری ذاتی نقصان ہو گیا ہو ۔ وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں مسٹر لیاقت علی خان کی بے حد عزت اور وقعت تھی ۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی وفات سے ملک کو زبردست نقصان پہنچا ہے ۔

یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی کہ ان کے حلقے میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو ان کی جگہ کو پُر کر سکے ۔ سارے ملک میں حالات تیزی سے بگڑنے شروع ہو گئے تھے اور ہمارے ملک کی تاریخ میں دکھوں اور مصیبتوں کا وہ دور شروع ہو گیا جو کئی سال تک قائم رہا ۔

جب میں پاکستان واپس آیا تو مجھے کراچی میں نئی کابینہ کے اراکین سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ میں نے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین ، چودھری محمد علی، مشتاق احمد گورمانی اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کی ۔ ان میں سے کسی نے نہ تو مسٹر لیاقت علی خان کا نام ہی لیا اور نہ ان کے منہ سے اس واقعہ پر افسوس یا دردمندی کے دو بول ہی نکلے ۔ گورنر جنرل غلام محمد بھی اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے تھے کہ ایک قاتل کی سنگدلانہ حرکت نے ملک کو ایک نہایت قابل اور ممتاز وزیر اعظم سے محروم کر دیا ہے ۔ میں نے دل میں کہا کہ انسان کیسا بے حس، بے درد اور خود غرض واقع ہوا ہے ۔ ان حضرات میں سے ہر ایک نے خود کو کسی نہ کسی طرح ترقی کے بام بلند پر پہنچا دیا تھا ۔ وزیر اعظم کی موت نے گویا ان کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھول دی تھیں ۔ اس بات سے دل میں حد درجہ کراہت اور نفرت پیدا ہوتی تھی ۔

بات تو بے شک تلخ ہے، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو کہ وہ واحد ہستی جو ان سب کو قابو میں رکھ سکتی تھی دنیا سے اٹھ گئی ہے ، اور اب ایک سیاسی دنگل کھل گیا ہے جس میں ہر ایک کو زور آزمائی کی کھلی چھٹی ہے ۔ وزیر اعظم کی موت سے ملک بھر رنجیدہ تھا ۔ ہر طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں اور لوگ بعض وزیروں اور دوسرے بڑے لوگوں پر الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے اس قتل کی سازش کی تھی ۔ میرے دل میں لمحہ بھر کے لئے بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کا اس قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ بیگم لیاقت علی خان کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ حکومت نے قتل کی تحقیقات کرانے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری کوشش نہیں کی ۔ اس سلسلے میں

سکاٹ لینڈ یارڈ کا جو ماہر بلوایا گیا تھا میں نے اس کی رپورٹ دیکھی ہے - اسے کوئی ایسا ثبوت نہ مل سکا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس قتل میں سوائے ایک فرد کے کسی اور کا بھی ہاتھ تھا - اگر اس میں کسی قسم کی سازش کو دخل ہوتا تو وہ اب تک ظاہر ہو چکی ہوتی - ایسی باتیں دیر تک چھپی نہیں رہ سکتیں -

اس وقت مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ لیاقت علی خان ملک کے سچے اور سر گرم رہنما ثابت ہوں گے - مجھے آمید تھی کہ وہ سب سازشوں کو کچل کر رکھ دیں گے - لیکن بدقسمتی سے وہ قوم کو سیدھا اور روشن راستہ دکھانے سے پہلے ہی چل بسے -

یہ دونوں افسوس ناک واقعات یعنی راول پنڈی کی سازش اور وزیر اعظم کا قتل میرے کمانڈر ان چیف کا عہدہ سنبھالنے کے چند ہی مہینوں کے اندر پیش آئے - سازش کا انکشاف ہوتے ہی میں نے فوج کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کچھ سکیمیں شروع کر دیں - وزیر اعظم کی وفات کے بعد ملک میں جو سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا، اس کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں فوج کی تعمیر میں ذرا بھی غفلت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ فوج ہی ملک کو متحد اور دشمن کے حملے سے محفوظ رکھ سکتی ہے -

ہندوستان ان واقعات کو دیکھ کر بڑا مطمئن تھا - بعد ازاں مجھے شیخ عبداللہ سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں پنڈت نہرو نے ان سے کہا تھا کہ بس دو سال کے اندر اندر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے - پنڈت نہرو اسی مفروضے کو سامنے رکھ کر کہ عنقریب پاکستان کا وجود سیاسی اعتبار سے باقی نہیں رہے گا، شیخ عبداللہ سے کچھ سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے -

آزادی کے وقت ہمارے حصے میں جو روایات آئی تھیں یا جنہیں ہم نے آزادی کے بعد قائم کیا تھا، ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں - عوام میں وہ پہلا سا جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا - ان کو طرح طرح کے مسائل نے گھیر رکھا تھا جنہیں حل کرنے کی فکر کسی کو بھی نہیں معلوم ہوتی تھی - سب سیاسی سوانگ

رچائے ہوئے تھے - حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا ۔ جس پر لوگوں نے دباؤ ڈال کر سیاسی فائدے نہ اٹھائے ہوں - ان باتوں کو دیکھ دیکھ کر میرا عزم اور بھی پختہ ہو گیا کہ فوج کو سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے - فوج کے بڑے بڑے افسر ملک کے سیاسی حالات سے بے خبر نہ تھے مگر میں انہیں کبھی سیاسی معاملات پر بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا ۔

فوج کے لئے شروع شروع میں، میں نے جو کام کئے ان میں سے ایک پلاننگ بورڈ کا قیام بھی تھا - جنرل یحییٰ جو اس وقت ڈپٹی چیف آف جنرل سٹاف تھے، اس کے پہلے چیئرمین بنائے گئے - میں خاص خاص مسائل کی جانچ پڑتال کا کام اس بورڈ کے سپرد کیا کرتا۔ اس کام میں ہم سب کو انتہائی محنت کرنی پڑتی اور ابھی ایک کام ختم ہونے نہ پاتا کہ دوسرا ہمارے سامنے آ جاتا ۔

ہمارا اصل ہتھیار آدمی تھے - یہی بات میں اپنے ساتھیوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا تھا ۔ اس ہتھیار کو پوری طرح کارآمد بنانے اور تیز رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے تمام مسئلوں کو حل اور مشکلوں کو، خواہ وہ ذاتی ہوں یا پیشہ ورانہ، دور کر دیں - سپاہی کی ملازمت کی شرطیں ٹھوس ہونی چاہئیں اور اس کا دل بڑھانے کے لئے مناسب ترغیبات مہیا ہونی چاہئیں - اس کے بچوں کی تعلیم، اس کی طبی نگہداشت، اس کی خوراک، اس کا لباس اور اس کی رہائش ان سب باتوں کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے - اسے ان فکروں سے جتنا زیادہ چھٹکارا ملے گا اتنا ہی زیادہ اس کا دل اپنے کام میں لگے گا ۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا مالی مسائل کو حل کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا - مگر ہم نے کھیتی باڑی کے فارم اور ڈیری فارم کھولنے کا کام فوراً شروع کر دیا - مویشیوں کی نسل بڑھانے کے طریقوں کو بھی بہتر بنایا، گھوڑوں کی پرورش کے کئی مرکز کھولے گئے، اس کا بھی بندوبست کیا گیا کہ فوج کے ہر آدمی کو مناسب اور توانائی بخش غذا مل سکے - نئے طبی مرکز اور ہسپتال قائم کئے گئے اور ان کے لئے تربیت یافتہ اور قابل ڈاکٹر اور نرسیں

مہیا کی گئیں ۔ سابق فوجیوں اور ان کے لواحقوں کی دیکھ بھال کا بندوبست جنگ کے بعد کے تعمیری فنڈ کی آمدنی کے ذریعے کیا گیا، جو ملکی تقسیم سے پہلے قائم کیا گیا تھا ۔ سنہ ۱۹۶۴ء تک تقریباً چھبیس لاکھ روپیہ فی سال سابق فوجیوں اور ان کے لواحقوں کی تعلیم اور دیکھ بھال پر خرچ کیا جا رہا تھا ۔

صحیح قسم کے نوجوانوں کو فوجی ملازمت کی ترغیب دلانے کے لئے کئی کیڈٹ کالج اور اکادمیاں قائم کی گئیں ۔ ان اداروں کی مدد کے لئے پبلک سکولوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا ۔ ان تمام اصلاحوں سے بھرتی کے کام پر فوری اور اچھا اثر پڑا ۔ اور ساتھ ہی فوجیوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے ۔

میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ فوج کو مناسب طریقے پر تربیت دی جائے ۔ ہم اپنے جوانوں سے جو کام لیتے تھے اس میں محض ضابطے کی پابندی اور کوری مشقت کو زیادہ دخل تھا، فائدہ بہت کم حاصل ہوتا تھا ۔ اکثر اوقات انہیں کچھ معلوم نہ ہونے پاتا تھا کہ اس مشقت کا مقصد کیا ہے ۔ وہ تو بس حکم کے بندے تھے، جو کچھ ان سے کہا جاتا بے چون و چرا کرنے لگتے ۔ ظاہر ہے کہ ان کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھانے کا یہ کوئی موزوں طریقہ نہ تھا ۔

ہماری فوجی تنظیم اور نظم و نسق دوسری عالمی جنگ کے تصورات پر مبنی تھا ۔ ان میں جھمیلا بہت تھا اور متروک بھی ہو چکے تھے ۔ فوج کو اتنا وطن کے دفاع کے لئے تیار نہیں کیا جاتا تھا جتنا کہ مقبوضات کی حفاظت کے لئے ۔ یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے ۔ کیونکہ پرانی انڈین آرمی کا اولیں مقصد یہ تھا کہ وہ برطانیہ کے سمندر پار کے مفادات کی توسیع و حفاظت کے لئے برطانوی افواج کو مدد دے ۔

تقسیم کے وقت پیدل فوج کے چھ ڈویژن ، ایک بکتر بند بریگیڈ اور چند تربیتی اور دوسرے مستقل ادارے ہمارے حصے میں آئے تھے۔ کاغذ پر تو یہ گنتی کافی موثر معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن حقیقت میں جو کچھ ہمیں ملا، وہ کٹے چھٹے دستے اور جمعیتیں تھیں ، جن کے پاس ضروری ساز و سامان کی خطرناک حد تک کمی تھی ۔ ہندوستان

نے ہمارے حصے کا اسلحہ، ساز و سامان اور رسد ہمیں دینے سے انکار کر کے ہماری مشکلوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

جنگ کے بعد دنیا بھر کی افواج نے نئے ہتھیاروں اور نئی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر اور بڑی چھان بین کے بعد اپنی تنظیموں کی اصلاح کی تھی۔ ہمیں چونکہ آزادی کے بعد دوسرے فوری مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لئے ہم اس طرف جلد دھیان نہیں دے سکے تھے۔ پرانے تصورات کی پیروی کے علاوہ ہمارے ہاں ٹریننگ اور نقل و حمل کے وسائل بڑے ناقص تھے۔ فوج کے لازمی شعبہ جات کی خامیوں کو دور کرنے، اسے دے ساز و سامان سے آراستہ کرنے اور اس کو متوازن بنانے کے لئے زائد خرچ کی ضرورت تھی جس کا بار ملک نہیں اٹھا سکتا تھا۔

میں نے پہلے مختلف یونٹوں کی تنظیم و ترتیب پر نظر ڈالی تاکہ انھیں زیادہ متوازن اور متحرک بنایا جائے اور ان کے فائر کے زور کو بڑھایا جائے۔ جہاں کہیں بھی ممکن ہوا نفری کم کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے سکولوں، تربیتی مرکزوں، رسد گاہوں اور وسائل نقل و حمل کے طریق عمل میں بھی ترمیم کی۔ اس کام میں پلاننگ بورڈ خاص طور پر بہت مفید ثابت ہوا۔ بورڈ کے ارکان مختلف مسئلوں کی چھان بین کرتے اور اپنی سفارشات براہ راست میرے پاس لے آتے اور دفتری کارروائیوں میں وقت ضائع نہ ہوتا۔

فوج کی نئی تنظیم کے سلسلے میں پہلی لازمی بات یہ تھی کہ جنگی قواعد سیکھنے سے زیادہ فن جنگ کو سمجھنے پر زور دیا جائے۔ ضروری بات یہ ہے کہ اصول جنگ کو اعلیٰ جنگی چالوں اور حکمتوں کے لئے برتنے کی استعداد پیدا ہو۔

فوجی تنظیم کا جو طریقہ ہمیں ورثے میں ملا تھا، اس میں کوئی نئی بات سوچنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ وفاداری کا مطلب اندھا دھند فرماں برداری سمجھ لیا گیا تھا۔ نہ کسی بات پر سوچ بچار کی ضرورت تھی، نہ نکتہ چینی کی۔ تربیت دینے اور ترقی عطا کرنے کا سارا سلسلہ بس اس مقصد کے لئے تھا کہ ایک ہی طرح کے آدمی پیدا ہوتے چلے جائیں۔ کوئی نئی یا انوکھی بات کسی سطح پر بھی

ظاہر ہی نہ ہونے پاتی تھی - اس پر طرہ یہ کہ ہم اپنی فوجی تعلیم ، نظریوں اور اصولوں کے لئے مطلقاً غیر ملکوں پر تکیہ کر رہے تھے - ہمارے تربیتی طریقوں کا حال اسی بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے آدمی جو فطری طور پر شکاری ہیں اور شکار کا پیچھا کرنا خوب جانتے ہیں- وہ چھ مہینے فوج میں گزارنے کے بعد اپنی ساری چستی و چالاکی کھو بیٹھتے - ان کی ہشیاری، پھرتیلا پن اور مہارت ختم ہو جاتی - وہ کسے جکڑے ، سکے کی طرح ڈھلے اور رکتے جھجکتے نظر آتے -

ظاہر ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں ان کی قدرتی صلاحیتوں کو ختم کر رہے تھے - چنانچہ اس معاملے میں نئے سرے سے غور و فکر اور یکسر تبدیلیاں کرنے کی ضرورت تھی -

ہمارے افسروں میں ولولہ تھا اور ذہانت بھی - مگر ان میں افہام و تفہیم کے جذبے کی سخت کمی تھی - نتیجہ یہ کہ افسر اور عام سپاہی کا رشتہ بس حکم دینے اور حکم ماننے کے اصول پر قائم رہتا تھا - مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں کہ قابل افسروں کو دوسرے پیشوں کے ساتھ عارضی طور پر وابستہ کیا جا سکے جن سے ان کے تجربات میں ایک نئی جہت اور نظر میں وسعت پیدا ہو - میں جانتا تھا کہ ہم فوج کی تنظیم نو کے سلسلے میں جو منصوبے بھی سوچیں ان کا فوجی کارروائیوں کی آئندہ نوعیت، ہمارے جغرافیائی حالات اور لوگوں کی سیرت و مزاج سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے - اس کے ساتھ ہی ساتھ ان منصوبوں کو اصولی اعتبار سے بھی ٹھوس ہونا چاہئے - علاوہ ازیں تمام نئے نظریے اور نئے ادارے ہماری مالی استطاعت کے مطابق ہوں، اور ہمارا مقصد یہ ہو کہ کم سے کم خرچ میں مطلوبہ توازن، فائر کی طاقت میں اضافہ اور معرکہ آرائی کی مہارت حاصل کی جائے -

تنظیم نو کے سلسلے میں اس بات کی گہری چھان بین کی گئی کہ فوجی کارروائیوں اور جنگی حکمت عملی کی نوعیت کیا ہوگی - فوجی تنظیم اور حکمت عملی میں نئے پہلو پیدا کرنے اور نئے عنصر داخل کرنے کے لئے جامع تحقیقات مرتب کی گئیں - ان میں سے ہر ایک نئے عنصر کی میدان میں بڑے کٹھن اور ہو بہو اصلی حالات پیدا

کر کے جانچ کی گئی - ہر ایک اصلاح کو عملی طور پر جانچ کر اور اصلی آزمائشوں سے گزار کر آخری شکل دی گئی۔

برطانوی فوج کی پشت پر بڑے بڑے اسلحہ خانے اور گولہ بارود کے مخزن ہوا کرتے تھے - ہمیں اپنے محدود ذرائع ہی سے کام لینے کا گر سیکھنا تھا - انفنٹری ڈویژن کو اور زیادہ متحرک اور موثر بنا دیا گیا ، اگرچہ اس کا بنیادی ڈھانچہ جوں کا توں رہا - جس کا سبب روایتی ہتھیاروں پر ہمارا انحصار تھا - ڈویژن کی فائر کی طاقت، اس صورت میں کہ تمام اسلحہ معمولی رفتار سے فیر کر رہے ہوں ، بقدر نو ٹن دھات فی منٹ بڑھا دی گئی - انتظامی عملے میں بعض بچتیں کی گئیں - اور غیر ضروری ساز و سامان کو کم کر کے اور بوجھ لادنے کے کفایتی طریقے اختیار کرکے فوجی نقل و حمل کو زیادہ آسان بنا دیا گیا - ان تبدیلیوں سے انفنٹری کی مار تیز ہو گئی اور بار کم ہو گیا - اس کے لئے ہمیں سال ہا سال محنت کرنی پڑی - لیکن مجھے اپنا اس وقت کا جوش و خروش ابھی تک یاد ہے جب میں نے گل مواز کے زیر کمان نئے تجرباتی بریگیڈ کا مشاہدہ کیا تھا - اسی تجربے سے ہمارے یونٹوں کی آئندہ تنظیم متعین ہوئی - بنیادی نظریہ یہ تھا کہ کسی قطعۂ زمین کی حفاظت یا اس پر حملہ کرتے وقت انسانی جانوں کو نہیں بلکہ فائر کی طاقت کو کام میں لایا جائے۔ گویا وسیع پیمانے پر بظاہر ایک بے قاعدہ سی جنگ -

ہمارے تربیتی مرکزوں کا ڈھانچہ بالکل فرسودہ ہو چکا تھا ، اور دوسری عالم گیر جنگ کے بعد لڑائی کے جو نئے نئے فنی طریقے اور اصول وضع کئے گئے تھے، ان کو کام میں نہیں لایا گیا تھا - سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہر جداگانہ تربیتی مرکز اس طرز سے بنایا گیا تھا کہ وہ فوج کی جملہ ضروریات کی کفالت کر سکے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی پیداوار میں یکساں معیار قائم نہ رہ سکا ، اور تربیت میں یک جہتی پیدا نہ ہو سکی - تربیتی مرکز کے کمانڈروں کو ایسے امور کی نگرانی سونپی جاتی تھی جن کا خود انہیں بہت کم علم ہوتا تھا - اور چھوٹے چھوٹے مرکزوں کے سلسلے کی موجودگی کا نتیجہ لازمی طور پر یہ تھا کہ اخراجات بڑھ جائیں - میں نے تربیتی

کام کو ایک مرکز پر لانے کا فیصلہ کیا ۔ چھوٹے چھوٹے مرکزوں کو مشترک مضامین اور مشترک ضرورتوں کی بنیاد پر زیادہ باکفایت گروہوں میں ضم کر دیا گیا ۔ جہاں کسی پیشہ ورانہ کام کے لئے اعلیٰ فنی مہارت اور زیادہ کوشش درکار ہوئی تو اس کی ٹریننگ کی ذمہ داری اس عملے کے سپرد کی گئی جو اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا ۔

یہیں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مختلف رجمنٹوں کو یکساں روایات، یکساں طبقے اور یکساں بھرتی کے علاقے کی بنا پر یکجا کر دیا جائے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلوچ رجمنٹ، آٹھویں پنجاب رجمنٹ اور بہاول پور رجمنٹ مل کر نئی بلوچ رجمنٹ بن گئی ۔ نئی فرنٹیئر فورس رجمنٹ نے فرنٹیئر فورس رائفلز ، پٹھان رجمنٹ اور پرانی فرنٹیئر فورس رجمنٹ کو اپنے میں ضم کر لیا اور پہلی، چودھویں، پندرھویں اور سولہویں پنجاب رجمنٹیں، نئی پنجاب رجمنٹ بن گئیں ۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ کو جس کی پچھلے دنوں نئی تنظیم کی گئی تھی، اپنے موجودہ نام اور موجودہ صورت ھی پر برقرار رکھا گیا ۔ میں جانتا تھا کہ اس کارروائی پر بڑا شور مچے گا۔ پرانی رجمنٹیں جو اپنا نام و نشان کھو بیٹھی تھیں قدرتی طور پر بہت ناخوش ھوں گی ۔ آھستہ آھستہ اور بڑے صبر کے ساتھ ھم پرانے افسروں کو نئے خیالات کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ھو گئے ۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب ان کے دلوں سے ابتدائی شکوک دور ھو گئے تو انھوں نے ھمارے ساتھ بڑے اعلیٰ طور پر تعاون کیا ۔ اور نتائج ھماری آمیدوں سے کہیں بڑھ کر رھے ۔ اس کا سہرا ان افسروں اور جوانوں کے سر ھے جنھوں نے رسم و رواج، روایات اور لباس جیسے نازک معاملوں پر دلی تعاون اور ھم آھنگی کے جذبے کا اظہار کیا ۔

اس دوران میں ٹریننگ کے پورے نظام میں زبردست تبدیلی ھو رھی تھی، نصاب بدلے جا رھے تھے اور اداروں کو نئے ساز و سامان سے لیس کیا جا رھا تھا تاکہ بہتر اور جلد تر نتائج برآمد ھوں ۔ ٹریننگ کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کو الگ الگ تصور کیا جاتا رھا تھا ۔ ھم نے پیشہ ورانہ تربیت اور فوجی تربیت کو ملا کر ایک

کر دیا - لوگوں میں عام طور پر یہ بھلا دیا جاتا تھا کہ عملی تربیت اور معلومات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ آدمی فی الحقیقت فوج کے ساتھ رہ کر کام نہ کرے اور فوجی مشینری کا خود ایک پرزہ نہ بن جائے - محض نظریاتی مطالعہ اور علیحدہ رہ کر سبق پڑھنے سے کام نہیں چل سکتا - ہم نے رفتہ رفتہ یہ بات پیدا کر دی کہ نصابی تعلیم اور فوج کے ساتھ رہ کر عملی کام کرنے پر یکساں زور رہے - تمام کمانڈروں کو اوپر سے لے کر نچلے درجے تک اپنے اپنے ماتحتوں کو ٹریننگ دینے کی ذمہ داری دے دی گئی -

ہمارے تربیتی نظام میں ایک اور مشکل یہ تھی کہ ہر نوجوان افسر اپنے خاص موضوع کی خصوصی تعلیم تو حاصل کرتا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ اسے ہر درجے کی کمان کی تربیت بھی مل جائے - ہر نئی ترقی پر اسے ایک بار پھر اسکول جانا پڑتا تھا - اس طرح یونٹ اچھا خاصا عبوری کیمپ یا پڑاؤ بن جاتا تھا - افسر کو فوج میں اپنی ڈیوٹی سے محروم رہنا پڑتا تھا، حالانکہ یہ ڈیوٹی اس کی ٹریننگ کا سب سے لازمی جزو تھی -

تقسیم کے وقت فوج کو حمل و نقل کے وسائل برائے نام ہی حاصل تھے -

بہرحال ہم نے حمل و نقل کی بابت اپنے اصول و نظریات اور نتیجۃً اپنی سہولتوں کو ان قیاسات کے مطابق ڈھال لیا کہ ملک کو کس قسم کی جنگ کا اور کتنی مدت تک سامنا ہو سکتا ہے - ہم نے اپنے دیسی وسائل پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے کی سوچ لی اور ان امور میں جو دفاع اور تجارت دونوں میں مشترک تھے - نئے امکانات کا جائزہ لے کر ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا - فوجی ضرورت کے سامان کی معیار بندی پر بھی زور دیا گیا - اور حسب ضرورت اشیا کی ساخت و معیار کی صراحت میں مناسب ترمیم بھی کر لی گئی، تاکہ دیسی ذرائع اور دیسی کاریگری سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے - فوج کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر نقل و حمل کے اداروں اور ڈپوؤں کی تنظیم و قیام میں بھی ترمیم و اصلاح کی گئی -

فوج کی نئی تنظیم کا یہ سارا کام دفاع کے بعض بنیادی اصولوں کو نظر میں رکھ کر انجام دیا گیا تھا - ہمارا اولیں مقصد ہندوستان کے کسی امکانی حملے کے خلاف پاکستان کا تحفظ تھا - ہم جانتے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ ہر لحاظ سے ایک قومی جنگ ہوگی - ہندوستان کا مقصد اپنی حدود اور اثر و اقتدار کو پھیلانا ہے - اس سلسلے میں وہ پاکستان کو اپنا پہلا دشمن تصور کرتا ہے - ہمارا جنگی مقصد ہندوستان کو فتح کرنا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس سے علیحدگی کے اصول ہی کی نفی ہو جاتی ہے - ہمارا مقصد ہندوستان کو صرف یہ محسوس کرانا ہے کہ ہمارے خلاف دشمنی کا رویہ رکھنے سے اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا -

ہندوستان کی فوجی طاقت ہمیشہ ہم سے زیادہ ہی ہوگی - ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس کی مزاحمت کے لئے ایک ایسی فوج تیار کرلیں جو حملہ کرنے اور حملہ روکنے کی خاطر خواہ طاقت رکھتی ہو، اور اس قابل ہو کہ ہندوستانی فوج کے حملے کو ناکام بنا سکے - ہندوستان ہمارے خلاف بغیر کسی اعلان کے فوج کشی کر سکتا ہے - چنانچہ ہمارے پاس ایک ایسی فوج تیار رہنی چاہئے جو فی الفور میدان میں نکل آئے - ہمارے حالات مقبوضاتی فوج رکھنے کے لئے کسی طرح موزوں نہیں - ایسی فوج کو بھرتی کرنے اور سدھانے کے لئے بہت وقت چاہئے -

ایک طویل اور مشکل جد و جہد کے بعد جن میں کئی سال لگ گئے، آخر ہم ایک پھرتیلی اور کارگر فوج بنانے میں کامیاب ہو گئے جو ہر خطرے کا مقابلہ کر سکے - ہم نے جو نئے جنگی نظریات وضع کئے اور اپنے افسروں اور جوانوں کو نئے سرے سے جو تعلیم و تربیت دی اسی کی بدولت آج پاکستانی فوج کو یہ عظمت اور امتیاز حاصل ہے کہ یہ اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد والے غنیم کے دانت کھٹے کر سکتی ہے - اس دوران میں کئی سیاسی واقعات پیش آئے، کئی تغیر و تبدل ہوئے، مگر ان سب کے باوجود فوج نے اپنی وطن دوستی کی روایات کو برقرار رکھا - اور وہ رفتہ رفتہ ملک و قوم کے استحکام کا ایک مضبوط وسیلہ بن گئی - میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی

ھی رہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی - امن اور جنگ دونوں حالتوں میں ایک تند و تیز اور بھروسے والا ہتھیار!

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں نے بری فوج کی تعمیر کے دوران میں دوسری سروسوں یعنی پاکستان نیوی اور پاکستان ایئر فورس کو نظر انداز کر دیا - ان کی موجودہ پر شوکت تعمیر میں بھی میرا بہت کچھ دخل رہا ہے - اور ھوائی فوج کی ترقی تو میرا خاص مقصد ھی تھی - کیونکہ دوسرے بری ممالک کی طرح پاکستان کا دفاع بھی دراصل بری و ھوائی فوج کے اشتراک عمل ھی پر مبنی ہے -

پانچواں باب

سیاسیات سنہ ۱۹۴۸—۱۹۵۸ء

ہم نے آزادی حاصل کرنے کے لئے خون کا ایک دریا پار کیا تھا۔ مذہبی جنون اور نفرت کی آندھی ان گنت لوگوں کو گھر سے بے گھر کر کے سوکھے پتوں کی طرح اڑائے لئے پھری۔ یہ لوگ فرقہ وارانہ قہر و غضب کے ہاتھوں برباد اور پامال ہوئے تھے۔ لاکھوں مرد عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتر چکے تھے، اور سارا بر صغیر خونیں خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جس چیز نے ہماری آس بندھائے رکھی، وہ اپنے مستقبل پر ہمارے عوام کا بے پایاں یقین اور اس نصب العین کے لئے بے پناہ خلوص تھا، جس کے تحت ہم نے اپنے لئے ایک وطن حاصل کیا تھا۔

ہندوستان کا رویہ شروع ہی سے دشمنی کا تھا اور اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ پاکستان کو وجود میں آتے ہی اپاہج کر کے رکھ دیا جائے۔ اس نے مالیات میں ہمارے حصے سے ہمیں محروم رکھا، اور اس تمام قول و قرار سے پھر گیا جو رسد اور ساز و سامان میں ہمارے حصے کی بابت اس نے بظاہر بڑے صدق دل سے کیا تھا۔

اس کے بعد ہندوستان نے ہمیں کشمیر کی لڑائی میں الجھا دیا۔ جنگ بندی کے اعلان کے بعد ہمیں ایک بڑے کٹھن علاقے میں تقریباً پانسو میل لمبے محاذ کی رکھوالی کرنی پڑی۔ ہندوستان برابر جارحانہ انداز اختیار کئے رہا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمیں اپنے

محدود ذرائع پر انتہائی دباو ڈال کر ایک ایسی فوج کو تیار کرنا اور پوری طرح لیس رکھنا پڑی جو ھندوستان کو اس کے ارادوں سے باز رکھ سکے ۔

ادھر سیاسی محاذ پر ھماری کیفیت یہ تھی کہ ھمارا کوئی باقاعدہ آئین ھی نہیں تھا ۔ ھم قانون آزادیٔ ھند سنہ ۱۹۴۷ء کے تحت کام کر رھے تھے ، اور چونکہ پاکستان مسلم لیگ کو مرکزی دستور ساز مجلس میں اکثریت حاصل تھی ، اس لئے حکومت کسی نہ کسی طرح چل رھی تھی ۔ قائد اعظم جن کی جان فشانی اور لگاتار کوشش کے طفیل پاکستان وجود میں آیا تھا ، ملک کا کوئی آئین بنانے سے پہلے ھی سنہ ۱۹۴۸ء میں وفات پا گئے تھے ۔ جو قانون وہ تیار کرتے اسے ضرور عوام کی حمایت حاصل ھوتی

ان کے جانشین مسٹر لیاقت علی خان کسی ناقابل فہم وجہ سے آئین سازی کے کام سے ھٹ کر صوبوں کے عام انتخابات کی طرف متوجہ ھو گئے ۔ حالانکہ انھیں پہلے مرکز میں اپنی پارٹی کی پوزیشن کو مضبوط کر لینا چاھئے تھا ۔ ممکن ھے عوام نے اولیں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو جس نظر سے دیکھا تھا اس سے وہ بد دل ھو گئے ھوں ۔ میرے خیال میں انھیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ جب تک انھیں صوبوں میں اکثریت حاصل نہ ھوگی وہ مرکز میں اکثریت قائم نہ کر سکیں گے

پنجاب کی سیاسی صورت حال نے مسٹر لیاقت علی خان کی پوزیشن کو خاصا کمزور کر دیا تھا ۔ انھوں نے نواب ممدوٹ کے مقابلے میں میاں ممتاز دولتانہ کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا جو اس وقت وزیر اعلیٰ تھے ۔ نواب ممدوٹ کے خلاف بعض بے قاعدگیوں کی بنا پر "پروڈا" کے تحت مقدمہ دائر کیا گیا تھا ۔ اخبارات نے اس بات کو بڑا اچھالا اور مسٹر لیاقت علی خان کے خلاف ایک دشمنانہ فضا قائم ھو گئی ۔ ان کے مخالفین نے اخبارات کی حمایت کے بل پر ان کی بیگم پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ، حالانکہ میں جانتا ھوں کہ بیگم صاحبہ بڑی اچھی خاتون ھیں ۔ وہ عورتوں کی فلاح و بہبود کے کام میں مصروف تھیں اور انھیں مردوں کے

مساوی حقوق دلانا چاہتی تھیں تاکہ پاکستان کی خواتین معاشرے میں مردوں کے دوش بدوش اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں - ان پر جو حملے کئے گئے ان کا مقصد محض وزیر اعظم کو پریشان کرنا تھا -

مسٹر لیاقت علی خان کے بعد ملک کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی وہ حکومت کے اہل ثابت نہ ہوئے - وہ نہ تو ملکی مسائل کو سمجھتے تھے اور نہ ان کو حل کرنے کی جرأت ہی ان میں تھی- ایک کے بعد ایک آتا گیا اور ایک ایسا نظام حکومت رائج کرنے کی کوشش میں جو ناقابل عمل تھا، ملک کے معاملات کو اور زیادہ الجھاتا گیا اور ملک تیزی سے تنزل کی طرف جانے لگا -

دھیرے دھیرے ملک کے کاروبار پر مرکزی حکومت کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی - مرکزی حکومت کو دو مشکلوں سے نمٹنا پڑ رہا تھا - ایک طرف تو پارلیمنٹ کے ممبر اس پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے، دوسری طرف صوبائی حکومتوں کی قوت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور انھوں نے مرکز کے ہاتھ باندھ رکھے تھے - ہر صوبہ اپنا اپنا راگ الاپ رہا تھا - مرکزی حکومت بے بس تھی اور کوئی سے دو صوبوں کا گٹھ جوڑ مرکزی اقتدار کو بہ آسانی نیچا دکھا سکتا تھا -

لیاقت علی خان کی وفات سے لے کر سنہ ۱۹۵۸ء تک کا زمانہ بڑا اندوہناک تھا - مرکزی حکومت اور صوبوں میں سرپھٹول تو ہو ہی رہی تھی ، خود مرکزی حکومت کے اندر بھی جوڑ توڑ اور چپقلشوں کا سلسلہ جاری تھا - ایک سول ملازم نے جو آزادی کے وقت وزیر مالیات بن گیا تھا ، خود کو گورنر جنرل کے عہدے تک پہنچا دیا - دوسرا راتوں رات سکرٹری یعنی ایک سول ملازم سے وزیر مالیات بن گیا - بس نام کی تختیوں پر عہدے بدل کر لکھ دینے کی دیر تھی اور وہ وزیر بنے رکھے تھے - سیاست داں قدرتی طور پر مستقل سروسوں کی مدد کے محتاج تھے، ادھر سروسوں میں جو افراد زیادہ زور آور تھے، خود ان کے دل میں سیاسی اقتدار کی ہوس موج مارنے لگی تھی - ہر شخص کا اپنا ایک خاص جتھا نظر آتا تھا - ان سب کا

واحد مقصد اپنا آلو سیدھا کرنا تھا خواہ اس کارروائی میں ملک ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے۔

ایک بحران سنہ ۱۹۵۳ء میں آیا جب گورنر جنرل غلام محمد نے اقتصادی بدحالی، قحط کی سی صورت اور پنجاب کے فسادات کو بہانہ بنا کر خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی بحالی کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دستور ساز مجلس میں مجھے اکثریت حاصل ہے اور بقول بعض ملکۂ انگلستان سے بھی مدد کی التجا کی، مگر کچھ پیش نہ چلی۔ ادھر گورنر جنرل نے محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اور خواجہ صاحب کی کابینہ کے متعدد ساتھیوں نے، حرص و ہوس میں آ کر نہ سہی، مگر بغیر چوں و چرا نئی کابینہ میں عہدے قبول کر لئے۔

محمد علی بوگرا نے غلام محمد کے منظور نظر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جب ان کے قدم ذرا جمے تو انھوں نے خود کو گورنر جنرل کے بندھنوں سے آزاد کرنا چاہا۔ آدھر فضل الرحمٰن، ہاشم گذدر اور عبدالستار پیرزادہ کے سے لوگ ان کے کان بھر رہے تھے کہ یاد رکھو اگر تم نے احتیاط نہ کی تو تمھارا بھی وہی حشر ہوگا جو تمھارے پیش رو کا ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں اس کا بس ایک ہی علاج تھا۔ وہ یہ کہ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ سنہ ۱۹۴۷ء میں ترمیم کر کے گورنر جنرل کے اختیارات محدود کر دئے جائیں۔

مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں اتفاق سے اس زمانے میں کراچی ہی میں تھا اور وزیر اعظم سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی کوٹھی پر بہت سے لوگ آ جا رہے ہیں۔ چنانچہ مجھے وزیر اعظم سے بات کرنی مشکل ہو گئی۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس سے پہلے ان سے کسی مسئلے پر گفتگو کرنا آسان ہوتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ کسی نہایت اہم معاملے پر گفت و شنید کے دوران وہ اچانک اپنے مخاطب کا قلم یا کوئی اور چیز اٹھا لیتے اور پوچھتے ”یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟“ اس

معاملے میں ان کی عادت بالکل ایک بچے کی سی تھی - لیکن اس دن ان کی کوٹھی پر لوگوں کی بھاگ دوڑ دیکھ کر میں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ معاملہ کیا ہے - میں اب ان لوگوں کو بخوبی جان گیا تھا - میں نے سوچا کہ یہ بھاگ دوڑ وہ کسی نیک مقصد سے تو کرنے سے رہے - ضرور کچھ دال میں کالا ہے - وزیر اعظم نے مجھے چپکے سے بتایا کہ ان کے ساتھی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں جس سے گورنر جنرل کے اختیارات محدود ہو جائیں -

آدھی رات کو ایک قرارداد چھاپی گئی اور قومی اسمبلی کے ممبروں کے خانوں میں رکھ دی گئی - صبح کو مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اسمبلی کا اجلاس دستور ساز مجلس کی حیثیت سے شروع ہو گیا - جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعات ۹، ۱۰، ۱۰-الف، ۱۰-ب اور ۱۷ منسوخ کر دی گئیں - یہ وہی دفعات تھیں جن کے تحت گورنر جنرل نے اپنے اختیارات کو کام میں لا کر ناظم الدین کی کابینہ کو برطرف کیا تھا - یہ قرارداد دس منٹ کے اندر اندر پیش بھی ہو گئی اور منظور بھی کر لی گئی - گورنر جنرل اس زمانے میں علالت کے بعد ایبٹ آباد میں آرام کر رہے تھے -

میں نے ایک مرتبہ مولوی تمیز الدین خان مرحوم سے جو اس وقت مرکزی اسمبلی کے سپیکر تھے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا: ''آپ سیاسی اخلاق کا ذکر کرتے ہیں لیکن آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ آپ نے گورنر جنرل کو اطلاع دئے بغیر آئین میں تبدیلی کر لی - حالانکہ وہ ملک سے باہر نہیں گئے تھے، ملک کے اندر ہی تھے - اور مجھے گمان ہے کہ ان کا تقرر اسمبلی کی اکثریت کی حمایت ہی سے عمل میں آیا ہوگا - اگر آپ ان کو نہیں چاہتے تھے تو انہیں الگ کر دینا چاہئے تھا - مگر اس کے لئے اخلاقی جرأت کی ضرورت تھی جو آپ میں نہیں تھی - اس کے بجائے آپ نے حیلہ سازی سے کام لیا - اس تبدیلی کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ایک فرد کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا بلکہ اقتدار کے مرکز ہی کو مٹا دیا گیا -،،

مولوی تمیز الدین نے جواب دیا: ''ایسی باتیں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں۔''

میں نے کہا: ''قتل بھی تو ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں لیکن اس دلیل سے ان کو قابل معافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

غلام محمد اس قسم کے آدمی نہیں تھے کہ ایسے معاملوں کو ٹھنڈے پیٹوں گوارا کر لیتے۔ ان میں خواہ اور باتوں کی کمی ہو مگر جرأت کی کمی ہرگز نہ تھی۔ وہ ہر ایک سے خواہ کوئی بھی ہو، لڑ سکتے تھے، دلیرانہ مقابلہ کر سکتے تھے۔ کسی قسم کا ڈر یا خوف ان کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ بہت بیمار رہنے لگے تھے اور ان کی گفتگو بالکل ناقابل فہم ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا ہوگا ''اچھا تو تم نے مجھ سے یہ سلوک کیا! میں نے بھی اس کا بدلہ نہ لیا ہو تو سہی۔''

اس کے بعد جلد ہی میں، وزیر اعظم محمد علی بوگرا، سر ظفراللہ خان اور چودھری محمد علی کے ساتھ امریکہ چلا گیا۔ وزیر اعظم کو گورنر جنرل کا پیغام ملا کہ فوراً واپس آؤ۔ میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ خیریت نہیں ہے۔ بڑے میاں جنگ پر کمر بستہ ہیں اور وزیر اعظم کو برطرف کرنے والے ہیں۔ وزیر اعظم بھی پریشان تھے۔ انھوں نے کینیڈا کا دورہ منسوخ کر دیا۔ ہم نے جلد سے جلد واپس جانے کی ٹھان لی۔ جب ہم لندن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس روز کوئی ہوائی جہاز مشرق کی طرف نہیں جائے گا۔ ناچار ہمیں کراچی کے لئے ایک ہوائی جہاز چارٹر کرنا پڑا۔

لندن ایئر پورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلی فون پر بلوایا۔ لیکن ان کی بات میری سمجھ میں مطلق نہیں آئی۔ میں نے ٹیلی فون اسکندر مرزا کو دے دیا۔ ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ گورنر جنرل مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ انھیں دوسروں سے غرض نہ تھی۔ وزیر اعظم کو اس بات کی بڑی تشویش تھی کہ واپسی پر ان کا حشر کیا ہوگا۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ وطن واپس چلنے پر تیار کر لیا۔ وہ بار بار مجھ سے یہی سوال کرتے ''کیا تم اس بات کی ضمانت دے سکتے ہو

کہ واپس پہنچنے پر مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا؟،، میں بھلا کیا ضمانت دے سکتا تھا، لیکن میں نے انہیں تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔ وہ بولے ''فرض کرو تمہیں بھی گرفتار کر لیا گیا تو—؟،،

میں نے کہا ''فکر کی بات نہیں—ع

''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو،،

راستے میں میں نے اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی سے کہا کہ کراچی پہنچتے ہی وزیر اعظم کو گورنر جنرل کے پاس لے جانا سخت خلاف مصلحت ہوگا ۔ ایسا آمنا سامنا بدمزگی کا موجب ہو سکتا ہے ۔ آخر یہ طے پایا کہ ہم میں سے کچھ کو گورنر جنرل کی کوٹھی پر جانا چاہئے اور انہیں سمجھانا بجھانا چاہئے کہ وہ دور اندیشی سے کام لیں اور وزیر اعظم کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا سمجھوتہ کر لیں ۔ وزیر اعظم اپنے بنگلے پر جائیں اور ہمارے اشارے کے منتظر رہیں ۔

محمد علی بوگرا نے ظاہر میں تو بڑی جرأت کا اظہار کیا مگر میرا خیال ہے کہ وہ دل میں بڑے خائف تھے ۔ انھوں نے لندن سے پیغام بھیجا تھا کہ کراچی پہنچنے پر ان کے لئے فوجی حفاظت کا انتظام کیا جائے ۔

اِدھر میں خود سخت مضطرب تھا ۔ میں گورنر جنرل کے مزاج سے خوب واقف تھا ۔ مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ خدا معلوم وہ غصے میں کیا کر بیٹھیں ۔ یہ ملک کی عزت کا معاملہ تھا ۔ اگر کوئی سخت اقدام کیا جاتا تو اس سے ملک کی سخت بدنامی ہوتی ۔ عقل مندی کی بات یہ تھی کہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم میں کسی نہ کسی طرح صلح صفائی کرا دی جائے ۔

اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی اور میں، ہم تینوں تو گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے اور وزیر اعظم چند آدمیوں کے ہمراہ اپنے بنگلے کو روانہ ہوئے ۔

گورنر جنرل اوپر کی منزل پر اپنی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے تھے ۔ ان کے خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا اور پیٹھ میں بڑی سخت

تکلیف تھی - جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک تختے پر چاروں شانے چت لیٹنے پر مجبور تھے - وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے، اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی - لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں - چودھری محمد علی نے جرأت کر کے کچھ کہا، اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی - اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ بولے، ان پر بھی بوچھاڑ پڑی - ہم ان کی خدمت میں یہ گذارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ محمد علی کو ایک موقع اور دیں - اس کے جواب میں انھوں نے غصے میں غرا کر کہا ''جاؤ - جاؤ دور ہو جاؤ،، ان کی زبان سے بار بار ''نہیں نہیں،، کے الفاظ نکلتے - وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے -

ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خواب گاہ سے نکلے - آگے آگے اسکندر مرزا، ان کے پیچھے چودھری محمد علی اور سب سے پیچھے میں - میں کمرے سے باہر قدم رکھنے ھی کو تھا کہ اس نرس نے جو ان کی خدمت پر مامور تھی، میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا - میں پلٹا - دیکھتا کیا ھوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دوچار ھوں - یہی ھمارے بیمار اور بوڑھے گورنر جنرل جو لمحہ بھر پہلے غصے سے دیوانے ھو رہے تھے، اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا اور وہ قہقہے لگا رہے تھے - میں نے دل میں کہا ''آپ بھی بڑے حضرت ھیں،، - انھوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لئے مجھے اشارہ کیا - ''مسہری پر بیٹھ جاؤ -،،

اس کے بعد انھوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں - ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ ''میں غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جنرل ایوب خان کو سونپتا ھوں اور انھیں حکم دیتا ھوں کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کریں -،، میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور دل میں کہا ''خدا آپ سے سمجھے - پچھلے آٹھ برس تو آپ کو ھوش نہ آیا اور اب آپ چاہتے ھیں کہ میں تین مہینے میں دستور بنا کے پیش کردوں -،،

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیشکش کو

قبول کر لیا ہے - لمحہ بھر کے لئے میں ان تاریخی دستاویزوں اپنے ہاتھ میں تھامے رہا -

جیسے ہی میں نے ان کاغذوں پر نظر ڈالی میرا تن بدن پکار اٹھا کہ ''نہیں ، ہر گز نہیں -،، میں نے کہا : ''آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں - اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچے گا - میں فوج کی تعمیر میں مصروف ہوں - ہمارا ایک دشمن ہے ہندوستان جس کو رام کرنا بڑا دشوار ہے - ہم ہزار چاہیں کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے مگر وہ دشمن سمجھنے پر تلا ہوا ہے - میں اپنے پیشے میں رہ کر ملک کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں - میرا خیال ہے کہ میں کچھ مفید کام سر انجام دے سکتا ہوں - آپ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کوئی ایسی بات کر گزرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ آگے چل کر سوائے ملک کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہوگا -،،

اس کے جواب میں انہوں نے مجھ پر گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی - لیکن انہیں احساس ہو گیا کہ میں اس جلد بازی کے کام میں ان کا ساتھ نہیں دوں گا

اِدھر مجھ پر تو یہ گزر رہی تھی اور اُدھر محمد علی بوگرا اپنے مشیروں سے صلاح مشورہ کر رہے تھے - ان کے مشیر ان سے کہہ رہے تھے کہ گورنر جنرل تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا - ہمیں محمد علی بوگرا کو گورنر جنرل کی ملاقات پر رضامند کرنے میں خاصی دقت پیش آئی - آخرکار گورنر جنرل اور وزیر اعظم میں کچھ سمجھوتہ ہو گیا - ان دونوں میں ایک قسم کی صلح کرا دی گئی اور اس طرح ایک سخت مصیبت وقتی طور پر ٹل گئی -

جب میں نے غلام محمد کی پیش کش کو نامنظور کیا تھا تو خدا کی مدد میرے شامل حال تھی - اگر میں اس ترغیب میں آگیا ہوتا تو ممکن ہے آج پاکستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی - ایک بات تو یقینی ہے کہ ہماری فوج صحیح معنوں میں فوج کہلانے کی مستحق نہ ہوتی ، اور ہم اس نازک دور میں ملک کے استحکام کے اس واحد ذریعے سے محروم ہو جاتے -

ملک کا ابھی تک کوئی آئین نہیں بن سکا تھا - اولیں بنیادی

اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ جسے لیاقت علی خان نے تیار کیا تھا نامقبول ثابت ہو چکی تھی ۔ ناظم الدین کو دوسری رپورٹ تیار کرانے میں اور سولہ مہینے لگ گئے ۔ اس رپورٹ کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی کا ہو چکا تھا ۔ محمد علی بوگرا دو سال سے زیادہ عرصے تک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ۔ پھر بھی نئے آئین کے بنیادی اصولوں کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا ۔ حالانکہ آزادی حاصل ہوئے سات برس ہو چکے تھے ۔

ادھر دستور ساز اسمبلی کو جو اپنا وقار کھو چکی تھی توڑ دینے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا ۔ قریب قریب اس زمانے میں سہروردی نے جن کی سربراہی میں متحدہ محاذ کو مشرقی پاکستان میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی ایک بیان زیوریق سے جاری کیا جس میں گورنر جنرل کو مشورہ دیا گیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیں، کیونکہ وہ مطلقاً غیر نمائندہ بن گئی ہے یعنی کم از کم جہاں تک مشرقی پاکستان کے ممبروں کا تعلق ہے ۔ انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ موجودہ صوبائی قانون ساز مجالس میں سے تازہ انتخابات کرائے جائیں ۔

آخر ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء کو دستور ساز مجلس کو توڑ دیا گیا اور گورنر جنرل نے مجھ سے کہا کہ تم بھی محمد علی کی نئی وزارتی کابینہ میں شامل ہو جاؤ ۔ مجھے یہ بات بادلِ ناخواستہ منظور کر لینی پڑی لیکن میں نے گورنر جنرل پر واضح کر دیا کہ مجھے سب سے زیادہ دل چسپی فوج کے کام سے ہے ۔ ایک بات جس نے مجھے اس پیش کش کو قبول کر لینے پر آمادہ کیا، یہ تھی کہ میں سیاست دانوں اور مسلح افواج کے درمیان ایک ٹکر روک کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا تھا ۔ اس وقت حکومت میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کا کوئی لیڈر نہیں تھا اور سارے سیاست دانوں کی نظریں بار بار فوج کی طرف اٹھتی تھیں ۔ وہ چاہتے تھے کہ فوج میں اپنے اپنے حمایتیوں کے گروہ پیدا کر لیں ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے کابینہ کے سامنے اپنا پروگرام پیش کیا ۔ یہ ایک دستاویز تھی جس کا مضمون میں نے پہلے سے تیار کر لیا تھا ۔ اس کا ذکر میں تفصیل کے ساتھ آگے چل کر کروں گا ۔

نئی دستور ساز اسمبلی جون سنه ۱۹۵۵ء میں بنائی گئی - سہروردی، محمد علی بوگرا کے ماتحت دسمبر سنه ۱۹۵۴ء میں کابینہ میں شامل ہو چکے تھے - وہ وحدت مغربی پاکستان کے بڑے سرگرم حامی تھے - دراصل انھیں نے ''ون یونٹ،، کا مسودۂ قانون تیار کیا تھا ، اور انھیں کو اسے اسمبلی میں پیش کرنا تھا - اس بل کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور ریاستوں اور سرحدی علاقوں کو ملا کر مغربی پاکستان کا ایک متحدہ صوبہ بنا دیا جائے - یہ مختلف صوبے جو زبان یا نسل کی بنیاد پر قائم تھے، خود غرض سیاست دانوں کی سیاسی چال بازیوں کے لئے بڑا اچھا اکھاڑا بنے ہوئے تھے - یہ لوگ صرف اپنے ذاتی فائدے کو دیکھتے، انھیں اس سے غرض نہ تھی کہ ان کی کارروائی سے ان علاقوں کے لوگوں کو کس قدر اقتصادی اور سیاسی نقصان پہنچ رہا ہے - ون یونٹ بل کا مقصد ان سب باتوں کو ختم کرنا اور سارے مغربی پاکستان کو یکساں طور پر پھلنے پھولنے کا موقع دینا تھا - لیکن جب اگست سنه ۱۹۵۵ء میں چودھری محمد علی متحدہ محاذ کی حمایت سے وزیر اعظم مقرر ہو گئے تو ون یونٹ کی تجویز کی طرف سہروردی صاحب کا رویہ کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا، اور انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس مسودۂ قانون کو عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے تقسیم کرایا جائے - سہروردی سیاسی چال بازی میں پیچھے رہ کر وزیر اعظم بننے کا موقع کھو بیٹھے تھے - گورنر جنرل جو انھیں کابینہ میں لائے تھے، بیمار ہو کر رخصت پر چلے گئے تھے اور ان کی جگہ اسکندر مرزا قائم مقام گورنر جنرل بن گئے تھے - انھوں نے سہروردی کا زور توڑنے کے لئے فضل الحق کے ساتھ رشتہ استوار کرنا چاہا - وہ یہ بھول گئے کہ پچھلے سال انھوں نے فضل الحق کو غدار قرار دیا تھا - غرض صورت حال عجیب سے عجیب تر ہوتی چلی جا رہی تھی -

چودھری محمد علی نے جیسے تیسے آئین تیار کر لیا - جو ۲۳ مارچ سنه ۱۹۵۶ء کو نافذ کیا گیا - یہ بڑی مایوس کن دستاویز تھی، وزیر اعظم نے جو اس امر کے سخت متمنی تھے کہ انھیں تاریخ میں آئین کے مصنف کی حیثیت سے یاد کیا جائے، اپنی

کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کے نظریوں کو اس آئین میں سمو لیا تھا ۔ آئین کیا تھا چوں چوں کا مربہ تھا ۔ اس میں ایسے مستعار نظریے شامل تھے جو ایک دوسرے کی کاٹ کرتے تھے اور جن سے ملک میں پہلے ھی بڑی ابتری اور گڑ بڑ پھیل چکی تھی ۔ اس آئین نے اقتدار کو صدر، وزیر اعظم اور اس کی کابینہ، اور صوبوں میں تقسیم کر کے اس کی مرکزیت ھی کو نیست و نابود کر دیا تھا اور کسی کو صاحب اختیار نہیں رھنے دیا تھا ۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس شخص نے آئین بنایا، وھی اس کا پہلا شکار بنا ۔ اس زمانے میں ایک دفعہ میں نے انہیں بڑی بے بسی کی حالت میں ان کے دفتر میں دیکھا ۔ چونکہ وہ وزارت دفاع کا قلمدان بھی خود ھی سنبھالے ھوئے تھے اس لئے مجھے ایک دفاعی مسئلے کے سلسلے میں ان سے ملنے کے لئے جانا پڑا ۔ انھوں نے مجھ سے کہا ''میری جماعت نے مجھے چھوڑ دیا ھے ۔ بس اب معاملہ ختم ھے۔،، میں نے ان کی ھمت بندھانے کے لئے چند الفاظ کہے مگر ان کی تشفی نہ ھوئی ۔ ''نہیں نہیں ۔ یہ معاملہ بہت سنجیدہ صورت اختیار کر گیا ھے ۔ تم یہ کام کیوں نہیں سنبھال لیتے اور مجھے اس سے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتے؟،، میں نے کہا ''دیکھئے ان باتوں کا ذکر مجھ سے نہیں اپنے صدر سے کیجئے اور اس الجھن سے نکلنے کا کوئی مناسب طریقہ سوچئے۔،،

اسکندر مرزا جو سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت اتفاق رائے سے جمہوریۂ پاکستان کے پہلے صدر منتخب ھو گئے تھے ، اس وقت تک ملکی معاملات کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ وہ بڑے زیرک تھے اور جانتے تھے کہ اس آئین کے ذریعے کس طرح جوڑ توڑ اور سیاسی سودے بازی کی جا سکتی ھے ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اب کسی کو خبر ھی نہیں رھی کہ کس کا تعلق کس جماعت سے ھے ۔ یہ بس ایک لیبل اتار کر دوسرا چسپاں کر لینے کا معاملہ تھا ۔ جو شخص آج مسلم لیگی تھا وہ کل ری پبلی کن بن جاتا ۔ جو ماضی میں ''غدار،، کہلاتے تھے وہ آئندہ وزیر اعلیٰ بننے والے تھے ۔ غرض ایک کو دوسرے سے پہچاننا مشکل تھا ۔

ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی نے سہروردی کے لئے کرسی خالی کی، جنھوں نے اس وقت تک صدر اسکندر مرزا کو رام کر لیا تھا - اب سہروردی پھر سیاسی منظر پر ون یونٹ کے زبردست حامی کی حیثیت سے نمودار ہوئے - انھوں نے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مشرق پاکستان کو یقین دلایا کہ ان کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے ساتھ ہی ۹۸ فیصد صوبائی خود مختاری تو مل ہی چکی تھی - نیز یہ کہ صوبائی خود مختاری کا نعرہ، جس کی بدولت وہ برسر اقتدار آئے تھے، سوائے سیاسی بازی گری کے اور کچھ نہ تھا - ایک سال اور کچھ ہی دن بعد اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء میں سہروردی کی جگہ چندریگر نے لے لی - انھوں نے جیسے تیسے مصیبت کے آنسٹھ دن پورے کئے اور پھر ملک فیروز خاں نون کے لئے کرسی خالی کر دی -

مغربی پاکستان میں صدر مرزا، وزیر اعظم چودھری محمد علی اور گورنر گورمانی کی متحدہ کوششوں سے ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ مقرر ہوگئے تھے- یہ واقعہ در حقیقت ون یونٹ کی سکیم پر عمل درآمد ہونے سے کچھ ہی دن پہلے رونما ہوا - جنوری سنہ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخابات ہوئے - جن میں مسلم لیگ کو مجلس قانون ساز میں واضح اکثریت حاصل ہوئی - مسلم لیگ وزیر اعلیٰ کو ان کے عہدے سے ہٹا دینا چاہتی تھی - مگر صوبے کے گورنر نے یہ بات منظور نہ کی - اس پر کابینہ کے مسلم لیگی وزیروں نے استعفے دے دئے - ان کی جگہیں راتوں رات مسلم لیگ ہی میں سے ان کے حریفوں سے پُر کر دی گئیں -

ڈاکٹر خان صاحب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپریل سنہ ۱۹۵۶ء میں ری پبلی کن پارٹی کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی - اس میں وہ لوگ شامل تھے جو مسلم لیگ سے نکل گئے تھے - اس وقت ان پارٹیوں کی حالت بڑی نا گفتہ بہ تھی - ان میں نہ تو کسی قسم کا نظم و ضبط تھا اور نہ کوئی استواری - لوگ کھلے بندوں دھمکیاں دیتے اور دباؤ ڈالتے - ممبر جب چاہتے ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہو جاتے - یہاں تک کہ دونوں

جماعتوں پر اسمبلی کے ممبروں کو اغوا کرنے، اور ان سے تشدد کا برتاؤ کرنے کے الزام بھی لگائے جاتے۔

مغربی پاکستان کی سیاسیات کے اہم مسائل میں ری پبلی کن پارٹی کا مسلک جداگالہ انتخابات کے حق میں تھا اور ون یونٹ کی سکیم کی حمایت میں بھی۔ تاہم ڈاکٹر خان صاحب، اسکندر مرزا اور سہروردی کے دباؤ سے، جو مرکز اور مشرقی پاکستان میں اس وقت کے سیاسی توازن کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، انتخابات کے بارے میں اپنے وعدے سے پھر گئے۔ ادھر مسلم لیگ ری پبلی کن گورنمنٹ کو نکال باہر کرنے کی کوشش میں نیشنل عوامی پارٹی سے مل گئی۔ اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ ون یونٹ کو توڑنا چاہتی ہے۔

ری پبلی کن پارٹی کے کئی ممبر اپنی پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ سے آملے اور مسلم لیگ ایک مرتبہ پھر اکثریت والی پارٹی بن گئی۔ اس پر اسکندر مرزا نے مغربی پاکستان میں دفعہ ۱۹۳ نافذ کر دی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وزارت کو برطرف کر دیا جائے اور حکومت کی باگ ڈور گورنر کو سونپ دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دو مہینے کے بعد گورنر کی حکومت ختم ہوئی تو وہی ری پبلی کن پارٹی جو اسمبلی کے اجلاس میں شکست کھا چکی تھی پھر برسر اقتدار آگئی۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ سردار عبدالرشید کو سربراہ مقرر کیا گیا۔ اب ری پبلی کن پارٹی نے بھی، نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے، وہی ون یونٹ کو توڑنے کا وعدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز میں عوامی لیگ اور ری پبلی کن کا گٹھ جوڑ ٹوٹ گیا۔ اور مغربی پاکستان میں سردار عبدالرشید کو وزیر اعلیٰ اور ری پبلی کن پارٹی کے سربراہ دونوں عہدوں سے الگ ہو جانا پڑا، کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی نے پھر اپنی حمایت واپس لے لی تھی اور وہ اصلاحات کے ایک مبہم پروگرام کی بنیاد پر مخالف مسلم لیگ پارٹی کی حامی بن گئی تھی۔ رشید کی جگہ مظفر علی قزلباش نے لے لی۔ یہ مغربی پاکستان میں ری پبلی کن پارٹی کے تیسرے وزیر اعلیٰ تھے۔

مشرقی پاکستان میں ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۵۸ء کو ایک بہت نازک

صورتِ حال پیدا ہو گئی، کیونکہ فضل الحق نے عطاءالرحمٰن خان کی کابینہ کو برطرف کر دیا - اس کے کچھ دیر بعد اسی رات کو اسکندر مرزا نے خود فضل الحق کو برطرف کر دیا - عطاءالرحمٰن کی جگہ ابو حسین سرکار نے لے لی - لیکن ابھی انہیں اپنا عہدہ سنبھالے بارہ گھنٹے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ انہیں برطرف کر دیا گیا، اور عطاءالرحمٰن کی کابینہ پھر برسر اقتدار آ گئی - نیشنل عوامی پارٹی نے جس طرح مغربی پاکستان میں پہلے ایک وزارت کی حمایت اور پھر اسی کی مخالفت کر کے تفرقہ انگیزی کا کردار ادا کیا تھا وہی کردار اس نے مشرقی پاکستان میں بھی ادا کیا - ۱۹-جون کو جب اس نے عوامی لیگ کی حمایت سے منہ موڑ لیا تو عوامی لیگ کی وزارت شکست کھا گئی اور متحدہ محاذ کی وزارت نے اقتدار سنبھال لیا - مگر اسی روز نیشنل عوامی پارٹی نے اپنی حمایت کا رخ عوامی لیگ کی طرف پھیر کر متحدہ محاذ کی وزارت کو نیچا دکھا دیا - غرض صورت حال ایسی ابتر ہو گئی کہ صدر کو، بتاریخ ۲۴-جون صوبے میں دفعہ ۱۹۳ نافذ کرنی پڑی - دو مہینے کے بعد عطاءالرحمٰن خان پھر وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے - صوبائی اسمبلی نے سپیکر کو ''غیر صحت مند دماغ والا شخص،، قرار دے دیا - اس پر ۲۱-ستمبر کو اسمبلی کے اجلاس میں دنگا فساد شروع ہو گیا جس کے سبب ڈپٹی سپیکر شاھد علی کو اپنی جان سے ھاتھ دھونے پڑے -

سنہ ۱۹۵۸ء کے وسط میں ملک ایک سخت اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آ گیا - اندھا دھند خرچ اس زمانے کا عام دستور نظر آتا تھا - ہم جتنا غیر ملکی زرمبادلہ کما رہے تھے اس سے زیادہ، تین سے لے کر چار کروڑ روپے ماھانہ کے حساب سے گنوا رہے تھے - زر مبادلہ کی محفوظ رقوم گھٹتے گھٹتے بیالیس کروڑ روپے رہ گئی تھیں - ان میں سے تقریباً چودہ کروڑ بھنائے یا منتقل بھی نہیں کئے جا سکتے تھے - دس مہینے اور یہی حالت رہتی تو ھمارے سکے کی کوئی قیمت ھی نہ رہتی - اور ممکن تھا کہ ھمارا روپے پیسے اور بنکاری کا نظام بالکل چوپٹ ہو جاتا -

ادھر تو ملک میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی اور ادھر سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کے چرچے ہو رہے تھے - یہ انتخابات

نومبر سنہ ۱۹۵۷ء میں ہونے والے تھے مگر بعد میں انھیں سنہ ۱۹۵۸ء تک ملتوی کر دیا گیا تھا - صدر نے آئین کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا ، اور جس شخص کا ملکی سیاست سے ذرا بھی تعلق تھا، اسے بے نقاب کر کے اس کی ساکھ مٹی میں ملا دی تھی - میں نہیں سمجھتا کہ وہ کبھی انتخابات ہونے دیتے - وہ تو بس کسی بہانے کی تلاش میں تھے جس کی آڑ لے کر آئین ہی کو منسوخ کر دیں - حقیقت میں وہ اس کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے -

ادھر سیاست داں، خاص طور پر وہ لوگ جن پر سیاسی زندگی کے دروازے بند کر دئے گئے تھے، عام انتخابات سے طرح طرح کی آمیدیں وابستہ کرنے لگے تھے - انھیں یہ ترغیب ہوئی کہ وہ بظاہر سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لئے مگر درپردہ اپنے مخالفوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ملک گیر مہم شروع کریں - اس کام میں سب سے آگے آگے خان عبدالقیوم خان تھے جو ملک کے دورے کر کر کے اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو خانہ جنگی کی تلقین کر رہے تھے - وہ لوگوں سے کھلم کھلا کہتے کہ اگر میری پارٹی کو انتخابات میں کامیابی نہ ہوئی تو خون کی ندیاں بہ جائیں گی - ان کو دو بڑے فصیح البیان رفیق مل گئے تھے - ان میں ایک تو میرے بھائی سردار بہادر خان تھے اور دوسرے راجہ غضنفر علی خان -

خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ تیار کرنے شروع کئے اور کوئی ساٹھ ہزار جوان بھرتی کر لئے - یہ لوگ وردیاں اور فولادی خود پہنے، رائفلیں اٹھائے، سر بازار پریڈ کرتے - ۲۰-ستمبر کو حکومت نے فوجی وردیوں کا پہننا اور فوجی یا فوج سے ملتے جلتے ادارے قائم کرنا، خواہ وہ افراد کی طرف سے ہوں یا جماعتوں کی طرف سے، ممنوع قرار دے دیا - وزیر اعظم فیروز خان نون نے ۲۳-ستمبر کو اعلان کیا کہ اگر ہر سیاسی جماعت کے پاس اپنی پرائیویٹ فوج ہوئی تو ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات مطلق نہ ہو سکیں گے - قیوم خان ٹس سے مس نہ ہوئے - وہ اسی روز کراچی پہنچے اور ان کے ہزاروں حمایتیوں نے حکومت کے امتناعی



(۹) قائدِ اعظمؒ کے ساتھ جی۔ او۔ سی مشرقی پاکستان کی حیثیت میں
ڈھاکہ ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء سنہ ء



(۱۰) ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء
کو کیبنٹ کی پہلی نشست
کی صدارت۔

احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کی - ۲۸ ستمبر کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی کہ ''اگر ضرورت پڑی تو غیر آئینی طریقوں سے حکومت کو برطرف کیا جائے گا،،

ملک کی صورت حال اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو گئی جب خان قلات نے عام ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلات کو پاکستان سے الگ کرنے کے لئے سازشیں شروع کر دیں - اس زمانے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ خان قلات کو اس امر میں خود اسکندر مرزا کی طرف سے شہ مل رہی ہے جو اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں - ٦-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو خان قلات کو گرفتار کر لیا گیا - اور ان کے تمام اعزازات ، مراعات اور اختیارات چھین لئے گئے -

اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ قیوم خان اور ان جیسے کچھ اور سیاست دانوں نے مسلح افواج کے بعض اراکین سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا تھا - وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے تاکہ سینئیر افسروں کو گمراہ کیا جائے - اور اپنے اقتدار کی ہوس میں فوجی افسروں کے گروہوں کی حمایت حاصل کی جائے -

ایک فوجی کی حیثیت سے مجھ پر یہ بات بخوبی عیاں ہو گئی تھی کہ انتخابات میں دوبدو جنگ کا نقشہ سامنے آئے گا اور ملک بھر میں فساد پھوٹ پڑیں گے - سول حکام جو سیاست دانوں کے آگے پہلے ھی بے دست و پا ہو چکے ھیں، صورت حال پر قابو نہ پا سکیں گے - فوج خواہ پسند کرے یا ناپسند، اسے دخل دینا ھی پڑے گا ، کیونکہ آخر ملک میں نظم و ضبط تو قائم رکھنا ھی ہوگا -

گرد و پیش جو حالات پیدا ہو گئے تھے فوج ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی - نہ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ فوجی افسر اور جوان زندگی کے ہرشعبے میں جو سیاسی جوڑ توڑ، چال بازی، بے ایمانی اور بدنظمی دیکھتے تھے اس سے کوئی اثر قبول نہ کریں گے- ان کے عزیز و اقارب بھی تھے، وہ اخبار بھی پڑھتے تھے اور بعض اپنے اپنے تعلقات کا سلسلہ بھی رکھتے تھے - چونکہ فوج محب وطن

تھی اور ایک قومی فوج تھی اس لئے لازمی بات تھی کہ وہ عوام کے خیالات کا ساتھ دے ۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے فوجی افسر اور جوان بڑے مایوس اور دل شکستہ ہیں ۔ ان سے اکثر کہا جاتا کہ ”اے فوج کے لوگو! خود کو نمک حلال ثابت کرو ۔ ملک کا یہ حشر ہو رہا ہے اور تم مزے اڑا رہے ہو۔“ کچھ مجھی کو نہیں، ہر وردی پوش کو یہی الزام دیا جاتا تھا ۔ بڑے بڑے معزز لوگ مجھ سے ملنے آتے اور کہتے ”تم چاہو تو ملک کی حالت سنبھال سکتے ہو ۔ مگر تم جوکھوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔“ میرے بعض دوستوں نے اور بھی منہ پھٹ ہو کر یہی بات مجھ سے کہی ۔ میں نے کہا ”بھلا میں کیا کر سکتا ہوں ۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر تو نہیں آتی ۔ تم تو میری انہیں باتوں پر نکتہ چینی کر سکتے ہو جن کا میں ذمہ دار ہوں۔“

جوں جوں حالات خراب ہوتے گئے، زیادہ سے زیادہ لوگ میرے پاس آئے اور اسی لہجے میں گفتگو کرنے لگے ۔ مجھے ان کی آنکھوں میں بڑی مایوسی جھلکتی نظر آتی تھی ۔ میں جہاں کہیں جاتا ــــــ اور میں اکثر دورے پر رہا کرتا، کبھی ایک چھاؤنی کا معائنہ کرنے کے لئے کبھی دوسری کا ــــ اور جب کبھی لوگ جمع ہوتے، مجھے ان میں وہی حرماں زدگی دکھائی دیتی ۔ پست ہمتی کا احساس عوام میں تیزی سے سرایت کرتا جاتا تھا اور انہوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا تھا کہ ”کاش کوئی اللہ کا بندہ آئے، اور ملک کو بچائے۔“ ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ فوج کی طرف تھا ۔ کیونکہ فوج ھی اس خلا کو بھر سکتی تھی ۔ فوج ھی وہ واحد منظم ادارہ تھی جو مشکل کے وقت ان کی سپر بن سکتی تھی، ان کو سہارا دے سکتی تھی، تاکہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں ، اور ان مصیبتوں سے نجات حاصل کر سکیں جن میں وہ گھرے ہوئے تھے ۔ حالات میں کوئی بہتری کی صورت نظر نہ آتی تھی، مگر میں تمنا کیا کرتا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو ہی جائے ۔ ایسی صورت میں میں پہلا آدمی ہوتا جو اس کا خیر مقدم کرتا اور پوری طرح اس کی مدد کرتا ۔ میں آس لگائے رہا اور دعائیں مانگا کیا ۔

ایک اور بات جو مجھے پریشان کرتی، یہ تھی کہ اگر ایک دفعہ فوج سیاسیات میں پڑ گئی اور یہ اب یقینی ہوتا جا رہا تھا، تو پھر اس کو اس سے علیحدہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بیرونی دنیا اس کارروائی کو فوجی بغاوت ہی کے نام سے یاد کرے گی اور یہ فوجی بغاوت کئی ملکوں میں ہو چکی تھی۔ اس سے پاکستان کی نیک نامی پر حرف آنے کا اندیشہ تھا۔ ایک اعلیٰ درجے کی منظم، تربیت یافتہ اور قاعدے قانون کی پابند فوج کے لئے یہ بات حد درجہ ناخوشگوار ہوگی کہ وہ سیاسی طاقت کے حصول کا ایک آلہ بن جائے۔ ادھر نوبت یہ آ پہنچی تھی کہ فوج ہی حالات کی اصلاح کر سکتی اور انھیں معمول پر لا سکتی تھی۔

میرے لئے تو یہ ایسی بات تھی جیسے میں اپنے ہی پالے پوسے بچے کو ان جانی مصیبتوں میں جھونک دوں۔ میں صبر کی تلقین کرتا رہا۔ میرے دل میں ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا کہ شاید اسکندر مرزا اس ابتری میں کوئی ترتیب کی صورت پیدا کر سکیں جو انھیں کی آوردہ ہے۔ لیکن وہ خود اپنے کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اور لوگوں میں ان کی ساکھ جاتی رہی تھی۔ وہ جوڑ توڑ ہی کی فضا میں کام کرتے اور اسی میں پھل پھول سکتے تھے۔ اس زمانے میں میری ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ خود ہراساں اور پریشان ہیں۔ میں ان سے کہا کرتا کہ ملک کی بقا کے لئے آپ کو کوئی تعمیری قدم اٹھانا چاہئے۔

اس زمانے میں خود میرے ذہن پر بھی سخت بوجھ معلوم ہوتا تھا، کیونکہ میں نے ان دنوں ایک ڈائری سی لکھنی شروع کر دی تھی، جو میری عادت کے خلاف بات تھی۔ اس میں پہلی عبارت کی تاریخ ۲-مئی سنہ ۱۹۵۸ء ہے۔ اور آخری عبارت کی تاریخ ۲۵-ستمبر سنہ ۱۹۵۸ء۔ ان تحریروں کے اقتباسات سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس زمانے میں میرے ذہن کی کیفیت کیا تھی۔

۲- مئی سنہ ۱۹۵۸ء

جنرل ناتھن ٹوائنگ اور جنرل عمر بریڈلے کے ساتھ ''برننگ ٹری،، گاف کورس میں گاف کھیلا۔ جنرل بریڈلے کے غیر معمولی وقار اور

انکسار سے بہت متاثر ہوا - سڑسٹھ (٦٧) سال کی عمر میں بھی بڑے گٹھے ہوئے جسم کے آدمی ہیں - انھوں نے اسی (٨٠) ضربوں میں ایک بہت مشکل کورس پورا کیا - ٹوائننگ بھی اچھے کھلاڑی ہیں - کھیل کے دوران میں ٹوائننگ، بریڈلے سے پاکستان اور ہماری مسلح افواج کے بارے میں بڑی گرم جوشی سے گفتگو کرتے رہے - انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان کے بارے میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی پالسی میری سمجھ میں نہیں آئی - انھوں نے کہا کہ میں ٥-مئی کو تمھارے اعزاز میں ایک لنچ کا انتظام کر رہا ہوں - جس میں تمام سروسوں کے سربراہ شریک ہوں گے - ان سے تمھیں اپنے مسائل کے بارے میں غیر رسمی بات چیت کرنے کا موقع ملے گا - میں چاہتا ہوں کہ تم مقدور بھر صاف گوئی اور بے باکی سے گفتگو کرو -

٥-مئی

لنچ پر سروسوں کے سربراہوں سے ملاقات ہوئی - میں نے ان سے اپنے دفاعی مسائل نیز فوجی امداد سے متعلقہ مسائل کھول کر بیان کئے -

شام کو ایلن ڈلس سے ملاقات ہوئی - میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اپنے بھائی کو جو امریکہ کے امور خارجہ کے سکرٹری ہیں ہمارے مسائل سے آگاہ کر دیا تھا -

٦-مئی

کانگرس کی عمارت میں امور خارجہ کی کمیٹی سے خطاب کیا - اس تقریر میں میں نے مشرق وسطیٰ میں گڑ بڑ کی وجوہ پر روشنی ڈالی - نیز اس بات کی وضاحت کی کہ ہندوستان کو کسی قسم کی امداد دینا کتنا خطرناک ہے جب تک کہ وہ صلح جو رویے کی ضمانت نہ دے اور ہم سے منصفانہ اور باعزت بنیاد پر جھگڑے چکانے پر آمادہ نہ ہو میں نے اس واہمے کو بھی دور کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی جنگی تیاری چین کے خوف کی وجہ سے ہے اور یہ کہ وہ پاکستان کے خلاف کوئی جارحانہ ارادہ نہیں رکھتا - کمیٹی نے مجھ سے کچھ باتیں بہت کرید کرید کر پوچھیں -

اسی رات ایل پاسو (فورٹ بلیس) تک ہوائی جہاز سے سفر کیا - ہوائی جہازوں کو نشانہ بنانے والے گائڈڈ میزائلوں کا مظاہرہ دیکھا -

خوب تھا ۔ ظاہر ہے کہ اب اے۔اے۔آرٹلری بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان میزائلوں کو حاصل کیا جائے جو ہر اڑنے والی چیز کے خلاف، خواہ وہ کسی رفتار سے بھی پرواز کر رہی ہو سو فی صدی کارگر ہیں ۔

رات کو نیویارک روانہ ہوا ۔

۸- مئی

پرنس علی خان کے ہاں ٹھہرا ۔ انھوں نے کیبٹ لاج کو لنچ پر بلوایا تھا ۔ کیبٹ وہی شخص ہیں جو امریکہ کو ہندوستان کی امداد پر آمادہ کرنے کے ذمہ دار ہیں ۔ میری ان سے طویل بات چیت ہوئی ۔ میرا خیال ہے کہ آخر میں انھیں اپنی سفارشات کی معقولیت پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا ۔

۹- مئی

انگلستان روانہ ہوا ۔

۱۲- مئی

بیگم لیاقت علی خان سے ملنے ھیگ آیا ۔ ان کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی تھی ۔ مگر وہ ملک کی سیاسی صورت حال سے بڑی مضطرب نظر آتی تھیں ۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ملک میں دس سال تک ایک کڑا نظم و نسق نافذ رہے ۔

۱۴- مئی

امجد علی کے ساتھ شامل ہونے کے لئے برسلز پہنچا ۔ برسلز کا عالمی میلہ دیکھا ۔ روس والے ٹیکنیکل میدان میں زبردست ترقی کر رہے ہیں۔ چند سال کے اندر وہ کسی سے پیچھے نہ رہیں گے ۔

۱۸- مئی

کراچی پہنچا ۔ اخبارات میں گورمانی کے مقدمے کا فیصلہ دیکھا ۔ ججوں نے فیروز خان نون کے بارے میں بڑے افسوس ناک ریمارکس لکھے تھے ۔ اس سے ہمارے ملک کو عالمی سیاست میں ایک اور دھکا لگے گا ۔ اور ہمارے عوام کی ہمت اور پست ہو جائے گی ۔

۲۱- مئی

۲۰-مئی کو بذریعہ تیزگام کراچی سے پنڈی روانہ ہوا ۔ مجھے

۲۱- کی شام کو پنڈی پہنچنا تھا، مگر میں جہلم اُتر گیا اور اعظم سے ملاقات کی - انھوں نے ایک افواہ کا ذکر کیا جو ایبٹ آباد سے چلی تھی - وہ یہ کہ جنرل فلاں اور بریگیڈیر فلاں گرفتار کر لئے گئے ھیں - میں اس کو بےپرکی سمجھ کے ھنس دیا - اگر اس افواہ میں ذرا بھی سچائی ھوتی تو چیف آف سٹاف جس سے میں نے کراچی سے ٹیلی فون پر بات چیت کی تھی، اس کا ذکر ضرور مجھ سے کرتا - پنڈی میں میں نے کچھ اور افواھیں سنیں - میں نے ان کا ذکر اپنی بیوی سے کیا - انھوں نے کہا ''ھاں میں بھی طرح طرح کی باتیں سنتی رھی ھوں،، اُن کا انداز ھمیشه سے یہی ھے که کڑی سے کڑی مشکل پر بھی بے پناہ جرأت اور ضبط و تحمل کا ثبوت دیتی ھیں - اور اس بات کا خیال رکھتی ھیں که مجھے کسی قسم کی الجھن نه ھونے پائے -

میں سمجھتا ھوں که ایسی دانا اور دور اندیش رفیقۂ حیات کے بغیر میں زندگی میں وہ کچھ کبھی حاصل نه کر سکتا جو میں نے حاصل کیا ھے - گھریلو پریشانیوں سے آزادی اور ایک وسیع کنبے کو پروان چڑھانے سے بے فکری جو مجھے حاصل رھی، الله تعالیٰ کی سب سے بڑی دین ھے، جس کے بغیر انسان اپنی تعمیری صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لے سکتا - میری بیوی نے ان افواھوں کا خلاصه مجھ سے بیان کیا جو یه تھا که بہت سے سینیئر افسروں پر ھندوستان کے جاسوس ھونے کا الزام لگایا گیا ھے - میں نے سوچا که انسان اپنی خود غرضی یا محض حسد کی وجه سے دوسروں کو بدنام کرنے پر کیسا مستعد رھتا ھے - سخت تعجب ھوا که بعض لوگ کیسے کانوں کے کچے ھوتے ھیں - معلوم ھوتا تھا که وہ اپنے انتہائی وفا شعار خدمت گزاروں کے خلاف بھی ھر قسم کی بات باور کر لینے پر اُدھار کھائے بیٹھے رھتے ھیں - یقیناً یه ذھن کی ناپختگی یا کسی قسم کے زوال کی علامت ھے -

میں فطرتاً پُر اُمید واقع ھوا ھوں - لیکن ان افواھوں سے مجھے سخت صدمه ھوا اور میں اُداس ھو گیا - فرض کرو که ھم غنیم کے ساتھ جنگ میں مصروف ھوں، اور اس کا پله بھاری ھونا شروع ھو

جائے اور وہ ہماری فوج کے متعلق ایسی افواہیں محاذ کے پیچھے پھیلانا شروع کر دے تو اس کا نتیجہ کیا ہو؟ ظاہر ہے کہ تباہی — ہم ایک گولی بھی چلائے بغیر جنگ ہار جائیں ۔ کیسا خوفناک تصور ہے!

۲۲ مئی

جنرل موسیٰ سے ان افواہوں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ان افواہوں کو ایبٹ آباد میں بعض سیاست دانوں نے پھیلانا شروع کیا تھا ۔

انتخابات قریب آرہے ہیں ۔ سیاست داں ہر قسم کی چالاکی اور عیاری کے ساتھ بر سر اقتدار آنا چاہتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد ان کے پاس ملک کی فلاح و بہبود کا کوئی منصوبہ نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ وہ ملک میں اور زیادہ انتشار پھیلائیں ۔ ایسی صورت میں انھیں مجھ سے اور فوج سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک خیال کرتے ہیں ۔ محض اس لئے کہ میں اپنے فرض سے رو گردانی نہیں کرنا چاہتا ۔ ان کا ضمیر اس درجے مردہ ہو چکا ہے کہ وہ سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے فوج کو بھی تباہ کرنے سے نہ چوکیں گے، جو ان کی واحد سپر ہے ۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے جمہوریت کے لئے کام کیا ہے ۔ کیونکہ میرے خیال میں اگر ہم اس پر کاربند ہو سکیں تو اس سے بہتر اور کوئی طریق حکومت نہیں ۔ جب غلام محمد مرحوم نے مجھے اقتدار کی پیش کش کی تھی تو میں نے صاف انکار کر دیا تھا، کیونکہ اس وقت مجھے امید تھی کہ سیاست دانوں میں سے کوئی نہ کوئی اٹھے گا، جس میں وطن دوستی اور ایثار و قربانی کا جذبہ ہوگا، اور جو ملک کو ترقی کی راہ پر لگائے گا ۔ لیکن ان سب کو آزمایا جا چکا ہے ۔ اور وہ ان صفات سے خالی پائے گئے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اب ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں چلی گئی تو سوائے تباہی کے کچھ حاصل نہ ہوگا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں شاید ایک نسل تک حکومت کا ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو رفتہ رفتہ ملک کو جمہوریت کے لئے تیار کردے

اور ہمارے بعض بڑے بڑے مسائل کو حل کر دے - موجودہ آئین کے تحت تو سوائے نظم و ضبط کو ختم کرنے اور ملک کو نقصان پہنچانے کے اور کوئی اختیار کسی کے پاس معلوم نہیں ہوتا - کوئی سیاست داں بھلائی کا کام تو کیا کرے گا وہ اگر اپنی کرسی ہی پر جما رہے تو یہ اس کی بڑی خوش قسمتی ہوگی - اور اگر وہ کوئی کام کرنا بھی چاہے تو اس کے حمایتی جو سب کے سب غرض کے بندے ہیں، اسے ایسا کرنے ہی کب دیں گے!

ان افواہوں کی روک تھام کے لئے بعض اقدامات کئے گئے -

۲۷- مئی

اپنے امریکی دورے کے تاثرات کے بارے میں سٹیشن آفیسروں سے خطاب کیا اور پاکستان کے دفاع کی بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی -

یکم جون

معاملات کشمیر کی کانفرنس میں شریک ہوا جس کی صدارت وزیر اعظم نون نے کی - اس کانفرنس میں تین اور سابق وزیر اعظم بھی تھے - اگر چندے توقف کیا جاتا تو ان میں اور دو کا اضافہ ہو جاتا -

میرا خیال تھا کہ یہ سٹیج ایک دوسرے کے خلاف سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے - لیکن اس کے برخلاف وہ میری گفتگو غور و فکر سے سنتے رہے - انہوں نے پوچھا کہ کشمیر کے بارے میں اور ہندوستان کی طرف سے نہروں کا پانی بند کر دینے کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے - جذباتی طور پر تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہم ابھی جا کر ہندوستان پر دھاوا بول دیں - لیکن دانائی کا تقاضا کچھ اور ہے جس کی میں نے ان لوگوں سے وضاحت کی -

۶-جون

کور کمانڈروں اور ڈویژنل کمانڈروں سے ملاقات کی -

۷-جون

ہمارا نیا تجرباتی بریگیڈ قائم کیا گیا ہے - ہم اپنے یونٹوں کی آئندہ تنظیم کے بارے میں بڑے پُر جوش ہیں - طرح طرح کی نئی تجویزیں ذہن میں آرہی ہیں - لب لباب ان کا یہ ہے کہ ہم اپنے

فوجی اداروں کو اس نظریے کے تحت پروان چڑھائیں کہ حملے کے وقت یا کسی قطعۂ زمین کی حفاظت کے وقت انسانی جانوں کو نہیں بلکہ فائر کی طاقت کو کام میں لایا جائے ۔ اس کے نتائج بڑے مفید ہونے چاہئیں ۔ میں نے اس مسئلے پر تحقیقاتی کام شروع کرایا ہے کہ ہم اپنے بکتر بند ڈویژن اور موٹرائیزڈ انفنٹری کو کس طرح استعمال کریں ۔

۹- جون

ڈیفنس سکرٹری نے مجھے بتایا کہ آپ کے عہدے کی میعاد میں دو سال کی توسیع ہو گئی ہے ۔ اس کا اعلان دوپہر کو ہوگا ۔ یہ توسیع کس طرح عمل میں آئی اور اس کے بارے میں میرا رد عمل کیا تھا، اس کی کیفیت مندرجۂ ذیل سگنلوں سے معلوم ہوگی ۔

مسٹر فیروز خان نون وزیر اعظم کی طرف سے کمانڈر-ان چیف پاک آرمی کے نام تار مورخہ ۹-جون سنہ ۱۹۵۸ء :

''مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے دو برس تک اور ہماری افواج کے کمانڈر ان چیف کے عہدے پر رہنا منظور کر لیا ہے (وقفہ) آپ ابھی بہت کم عمر ہیں آپ کی عمر ابھی صرف اکیاون (۵۱) سال ہے لیکن تجربے اور قابلیت میں نہایت پختہ کار (وقفہ) پاکستان موجودہ حالات میں آپ کی خدمات سے محرومی کا نقصان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا اور مجھے یقین ہے کہ پہلے کی طرح ملک کا دفاع آپ کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا ۔ (ختم)،،

کمانڈر ان چیف کا جواب :

''میں اپنی ملازمت کی توسیع پر آپ کے تعریفی اور حوصلہ افزا پیغام کا شکر گزار ہوں (وقفہ) ذاتی طور پر مجھے سبکدوشی پر بھی ویسی ہی خوشی ہوتی جیسی اس عظیم‌الشان فوج کی خدمت کا مزید موقع ملنے پر ہوئی ہے جس کی تعمیر میری عمر بھر کی تمنا رہی ہے (وقفہ) بہر حال میں نے اکتیس (۳۱) برس تک اس کا نمک کھایا ہے اور میں نے جو کچھ حاصل کیا، اس کی بدولت اور وہ اسی کی ملکیت ہے (وقفہ) آپ مطمئن رہیں میری بہترین خدمات فوج اور اس کے ذریعے ملک کی خدمت کے لئے وقف رہیں گی ۔ (ختم)،،

۱۳-جون

بذریعہ ھوائی جہاز پشاور پہنچا - اور ایک امدادی بٹالین اور ایک مورٹر بٹالین کا معائنہ کیا - ان دونوں کی فائر کی طاقت خصوصاً ٹینکوں کو نشانہ بنانے کی طاقت بڑی زبردست ھے - مگر مجھے محسوس ھوا کہ ان کی بار برداری کا سلسلہ طویل ھے یعنی ڈیڑھ سو سے اوپر گاڑیاں - اس کے لئے کچھ نہیں تو تیس میل لمبی سڑک چاھئے- چھان بین کی جانی چاھئے کہ کہاں کہاں کمی کی جا سکتی ھے -

۱۴-جون

کچھ دن آرام کرنے وادیٔ کاغان گیا - رات شوگران میں گزاری - یہ ایک خوبصورت مقام ھے جس کے نظارے بے حد حسین ھیں - چہل قدمی کے لئے نکلا - بارہ سو فٹ کی بلندی تک چڑھا - زیادہ جوش نہیں دکھایا کیونکہ پہاڑوں پر یہ میرا پہلا دن تھا -

۱۵-جون

ناران پہنچا اور وھاں چار روز قیام کیا - کچھ وقت مچھلیاں پکڑنے میں گزارا- لیکن زیادہ تر وقت کتاب ''مین ہو، رولڈ انڈیا،، (وہ لوگ، جنھوں نے ھندوستان پر حکومت کی) پڑھنے میں گزارا -

جھیل سیف الملوک تک گیا - چار میل کا سفر اور ڈھائی ھزار فٹ کی بلندی طے کرنے میں مجھے دو گھنٹے اور پندرہ منٹ لگے - یہ سخت ترین چڑھائی تھی جو میں نے کبھی چڑھی، مگر اس کا گُر یہ ھے کہ انسان آھستہ آھستہ چلتا رھے - بلندی پر پہنچ کر میں نے جو عظیم الشان نظارہ دیکھا اس سے مجھے اپنی کلفت کا صلہ مل گیا -

۲۱-جون

کاغان سے لوٹا تو معلوم ھوا کہ غلام عباس نے بڑے جتھے لے کر جنگ بندی لائن کو توڑنے کی جو دھمکی دی ھے، اس سے نظم و ضبط کا بڑا سخت مسئلہ پیدا ھو گیا ھے - صدر کو جو ان دنوں نتھیا گلی میں آرام کر رھے ھیں، یہ اختیار دیا گیا ھے کہ وہ غلام عباس کو ملاقات کے لئے بلائیں اور اس کی بابت مناسب اقدام کی ھدایت کریں - یہ معلوم کر کے میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ انھوں نے یہ ھدایت کی ھے کہ جب تک عباس اور ان کے آدمی

جنگ بندی لائن پر ہی نہ پہنچ جائیں ، ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے ۔ اس کے بعد فوج بغیر طاقت استعمال کئے انہیں گرفتار کر لے ۔ میں نے اسی وقت صدر کو ٹیلی فون کر کے اس طفلانہ فیصلے کے خلاف احتجاج کیا ۔ میں نے مطالبہ کیا کہ اگر کوئی کارروائی کرنی ہے تو پاکستان یا آزاد کشمیر کے علاقے کے سول حکام کے ذریعے کی جائے ۔ اس پر کابینہ کا اجلاس ہوا اور میری سفارشات کو منظور کر لیا گیا ۔ میرے کام کی مشکل یہ ہے کہ مجھے فوج کے انتظام کے ساتھ ساتھ ملک کے تحفظ کے سلسلے میں بہت سی اور باتوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے ۔ اگر ہماری حکومت کے عملے میں بلند سیرت اور بااصول آدمی ہوں تو اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئے ۔

۲۴-جون

واہ کی اسلحہ ساز فیکٹری کے مستقبل کے بارے میں کابینہ کی سب کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی جو کراچی میں منعقد ہوا۔

۲۸- جون

صدر سے ملنے نتھیاگلی پہنچا ۔ نواب قزلباش وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان سے بھی ملاقات کی ۔ ان سے سرحدی پولس کے مستقبل کے بارے میں طویل گفتگو کی ۔ مشرق اور مغربی پاکستان میں ان لوگوں کی تعداد کوئی اٹھاون (۵۸) ہزار ہے یعنی تقریباً تین ڈویژنوں کے برابر ۔ میری تجویز یہ تھی کہ ان کی حیثیت سول فورس کی رہے ۔ مگر ان کے افسر فوج سے لئے جائیں ، جیسا کہ سکاؤٹوں کے معاملے میں ہوتا ہے ، تاکہ انہیں فوجی کارروائی کی تعلیم دی جا سکے ۔ اس طرح ان سے امن کے زمانے میں سول کام اور جنگ کے زمانے میں فوجی کام بہتر طریقے سے لیا جا سکے گا ۔ ملک کے اعلیٰ مفاد کو نظر میں رکھتے ہوئے یہی اس مسئلے کا حل ہونا چاہئے ۔ لیکن قزلباش ایک بار اس امر کو منظور کر کے اپنے وعدے سے پھر گئے ۔ چنانچہ مجھے ان سے کچھ باتیں صاف صاف کہنی پڑیں ۔ ان کو کوئی پچاس پولس افسروں کو ٹھکانے سے لگانے کا مسئلہ پریشان کر رہا تھا ، جو زائد از ضرورت قرار دیے جانے والے تھے ۔ چنانچہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں

ڈیفنس سکرٹری ، چیف سکرٹری اور جنرل ہیڈ کوارٹرز کا ایک نمائندہ شامل ہو - یہ کمیٹی اس معاملے کی چھان بین کرے - مشرق پاکستان کی حکومت کے ساتھ بھی مجھے اسی قسم کی مشکل پیش آرہی ہے - تاہم میں نے ٹھان رکھی ہے کہ انجام کار انہیں صحیح کارروائی کرنے پر مجبور کر دوں - پاکستان جنگ کی صورت میں اس نفری سے محروم رہنے کا نقصان نہیں اٹھا سکتا - ہو سکتا ہے کہ اس نفری کا وجود فیصلہ کن ثابت ہو -

۳۰-جون

میں کچھ دنوں سے بعض بہت دلچسپ کتابیں پڑھ رہا ہوں - ہندوستان کے حکمرانوں والی کتاب کے علاوہ میں نے گنتھر کی کتاب ''اندرون روس،، اور کپتان وائنز کے مضامین ''پیٹرن فور لمیٹڈ نیوکائیر وار،، (محدود ایٹمی جنگ کا خاکہ) اور ''رڈل آف دی شلائفن پاین،، پڑھا جو 'روسی' نامی جرنل میں شائع ہوا - ان مضامین نے ہمیں نئے سوچ بچار اور اپنے بعض تنظیمی نظریوں اور جنگی اصولوں کی بابت نئے سرے سے چھان بین پر آکسایا ہے -

مجھے عید اور دوسرے تہواروں پر تہنیت کے بہت سے پیغاموں کا جواب دینا پڑتا ہے جس سے میرا بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کی دل شکنی ہو - ان میں سے بعض پیغام بڑے ہی پُر خلوص ہوتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مجھ پر اندھا دھند بھروسا کرتے ہیں - مجھے اس سے بڑی شرمساری ہوتی ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ان لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے -

۴-جولائی

گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک اجلاس میں شرکت کی - جس میں صدر ، وزیر اعظم اور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مع اپنی کابینہ کے شریک تھے - وزیر اعلیٰ نے یہ اجلاس اس لئے منعقد کیا تھا کہ عباس نے اپنے والنٹیروں کے ساتھ جنگ بندی لائن کو توڑنے کا جو ارادہ کیا ہے، اس سے نمٹنے کا کوئی واضح طریقہ سوچا جائے -

نیز حکومت کو نیچا دکھانے کے لئے سیاسی پارٹیوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکات اور گروہ بندی کی بڑھتی ہوئی کشا کش پر بھی غور و خوض کیا جائے - میں عباس کی تحریک کے بارے میں حکومت کے فیصلوں سے خاص طور پر دل چسپی رکھتا تھا، کیونکہ آگے چل کر اس کا اثر فوج پر پڑنا ضروری تھا - فیصلہ کیا گیا کہ ہم عباس اور اس کے آدمیوں کی بابت مضبوطی سے کارروائی کریں - اور انھیں ملک میں گڑبڑ نہ پھیلانے دیں -

۱۳ جولائی

جوائنٹ چیفس کا ایک جلسہ طلب کیا - کئی اہم باتوں پر بحث ہوئی - ایڈمرل چودھری نے تحفظ پاکستان کے نظریے کے سوال کو پھر اٹھایا ، جس کے متعلق کابینہ کی ڈیفنس کمیٹی پہلے ہی فیصلہ دے چکی تھی ، اور وہ پچھلے اجلاسوں میں ہم سب سے اتفاق رائے کر چکے تھے - بڑی گرما گرم بحث ہوئی - اس کے بارے میں حکومت کو ایک مراسلہ بھیجا -

۱۴ جولائی

سوا چار بجے صبح کراچی سے صدر کے ساتھ ان کے وائی کاؤنٹ میں طہران کے رستے استنبول روانہ ہوا جہاں بغداد پیکٹ کی اسلامی مملکتوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہونے والی تھی ، ایرانی مسلح افواج کے چیف آف سٹاف جنرل ہدایت سے ملاقات کی تاکہ منصوبہ بندی کے مسائل کے بارے میں بعض شکوک رفع کئے جا سکیں - اسی ملاقات کے دوران میں ایک سٹاف افسر نے جنرل ہدایت کو بلایا اور کہا کہ خانقین سے ایرانی کمانڈر نے خبر بھیجی ہے کہ عراق میں فوجی انقلاب ہو گیا ہے - ایک کرنل نے جس کے حامی ناصر کے طرفدار اور کمیونسٹ عناصر ہیں، اقتدار سنبھال لیا ہے - بادشاہ کے چچا پرنس عبدالالہ کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان کی نعش کو بغداد کے بازاروں میں گھسیٹا گیا ہے - محل اور برطانوی سفارت خانے کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہے - عوام خوشیاں منا رہے ہیں اور ناصر کی تصویریں ہر جگہ نظر آرہی ہیں - بادشاہ اور نوری السعید کے بارے میں متضاد خبریں آئی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نوری بچ نکلے ہیں -

گو ان کا مکان جلا دیا گیا ہے ، اور بادشاہ کو قید کر لیا گیا ہے۔

یہ بڑی اہم اور افسوس ناک خبر تھی ۔ ہم لوگ غم زدہ دل کے ساتھ استنبول روانہ ہوئے ۔ جب ہم استنبول کے قریب پہنچنے والے تھے تو ہم سے کہا گیا کہ آپ انقرہ جا کر اتریں ۔ وہاں صدر ترکی اور مسٹر مندریس نے ہمارا استقبال کیا ۔ جلسہ سوگ کا رنگ لئے ہوئے تھا ۔ ترک بغداد کی خبروں سے بہت پریشان تھے ۔ انھوں نے بڑی حد تک ان خبروں کی تصدیق کی جو ہم نے طہران میں سنی تھیں ۔ بغداد میں ترکی کے سفیر کے پاس ایک ٹرانسمٹر تھا جس کے ذریعے اس نے اپنے ملک کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھا تھا ۔ لیکن اس کی اطلاعات بھی مبہم تھیں ، کیونکہ وہ اور اس کا عملہ شہر میں سخت گڑبڑ ہونے کی وجہ سے باہر نکل کر تفصیلات کی چھان بین نہیں کر سکا تھا ۔

صدر بایار کے ساتھ ڈنر کھایا ۔ یہ ایک غیر رسمی سی تقریب تھی جس میں شاہ ایران ، ہمارے صدر ، مندریس اور زورلو شریک تھے ۔ ڈنر کے بعد ایک اجلاس ہوا جس میں لبنان اور عراق کی صورت حال اور بغداد پیکٹ کے مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوئی ۔

شاہ ایران کو صورت حالات پر جو عبور حاصل تھا اور انھوں نے اس کا جو تجزیہ کیا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔

۱۵-جولائی

بارہ بجے دوپہر صدر ترکی کے محل میں جمع ہوئے ۔ عراق کی صورت حال کے باعث فضا بڑی الم ناک تھی ۔ اتنے میں خبر آئی کہ نوری السعید کو بھی قتل کر دیا گیا ہے اور ان کی نعش کو بغداد میں گھسیٹا جا رہا ہے ۔ افسوس ، یہ اس شخص کا انجام ہے جس نے ان لوگوں کی اتنی خدمت کی تھی ۔

۱۶-جولائی

تین اسلامی مملکتوں کے سربراہوں نے فیصلہ کیا کہ معاہدۂ بغداد کے اجلاس جو لندن میں ہونے والے تھے ، ملتوی کر دیے جائیں ۔ گو میرا یہ خیال تھا کہ ان کو منعقد ہونا چاہئے تاکہ بدلی ہوئی صورت حال پر غور کیا جا سکے ۔

۱۹ اور ۲۰ جولائی

ترک بعض علاقوں کے بارے میں بڑے حساس ہیں لیکن انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے جزیرہ نمائے گیلی پولی کا دورہ کرنے اور پہلی جنگ عظیم کے میدان کارزار کو دیکھنے کی اجازت دے دی۔ یہ سفر بڑا تھکا دینے والا تھا۔ خراب سڑک اور دو دن میں آٹھ سو میل! لیکن تھا بڑا دل چسپ اور سبق آموز۔ بعض جگہوں پر طرفین کی خندقوں کے نشان ابھی تک دکھائی دیتے تھے۔

یکم اگست (پاکستان میں واپسی پر)

اٹک فورٹ اور چراٹ میں مٹھا کی تنظیم کا معائنہ کیا۔ اس یونٹ کی ٹریننگ، جو جنگ میں انتہائی کارآمد ثابت ہوگا، بہت اچھی طرح ہو رہی ہے اور ہر شخص خاص کر نوجوان افسر بڑے پرُ جوش معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ وہاں ہمیشہ کے لئے بس جانا چاہتے ہیں۔

اس یونٹ میں یہ اہلیت پیدا کرنے کے لئے کہ وہ دشمن کے عقب میں دور دور تک کارروائی کر سکے، میں چند خاص نمونے کے ہوائی جہاز حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس میں چھ آدمی بیٹھتے ہیں اور جو محدود جگہ میں آتر چڑھ سکتا ہے۔

سہ پہر کو مردان پہنچا تاکہ نئی پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ افسروں سے ملاقات کر سکوں۔ جو (رجمنٹل) سنٹر کی سالانہ کانفرنس کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑے چاق و چوبند ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ اس توسیع شدہ رجمنٹ میں نئی روح پیدا ہو رہی ہے۔

۱۰ اگست

مری میں بارھویں ڈویژن کی مشق کا معائنہ کیا۔ پیشہ ورانہ علم کے عام معیار سے، میں خاصا متاثر ہوا۔ ہمارے افسر اب واقعی اپنے جوانوں کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۱ اگست

ایک سول افسر، کیڈٹ کور کی تنظیم کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت آزردہ تھا۔ اس نے سول انتظام کا بڑا تاریک نقشہ کھینچا، جو سیاسی گروہ بندی کے باعث روز بروز ابتر ہوتا جا

رہا تھا - اس کا خیال تھا کہ بہت سے سول ملازم خود اپنی مرضی سے اہل سیاست کا آلہ' کار بن جاتے ہیں -

۱۵-اگست

ایک انفنٹری کمپنی کا مظاہرہ دیکھنے لاہور پہنچا - اس کمپنی کو نئے جنگی نظریے کے تحت کوئی چار ہزار گز لمبے محاذ کی حفاظت کرنی تھی - ہم نے نئے نظریے کے تحت ایک بٹالین کی تنظیم پر بھی تبادلہ' خیال کیا -

قزلباش سے ان کے دفتر میں ملا - انھوں نے بہادری کے اعزاز حاصل کرنے والوں کو زمینیں دینا منظور کر لیا - نیز مویشیوں کی نسل بڑھانے کے لئے بھی -

۱۹-اگست

شنکیاری میں ''ریکے،، بٹالین کا معائنہ کرنے گیا - یہ بٹالین خوب ترقی کر رہی ہے - البتہ ہر پلاٹون کو ۱۰۶ ملی میٹر کی ٹینک شکن رائفلوں کی اور ضرورت ہے -

بعد ازاں کمانڈو اسکول کا معائنہ کیا - اس کی ترقی کی رفتار سے اطمینان ہوا -

۲۰-اگست

پی-ایم-اے کا معائنہ کیا - (پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول)

۲۳-اگست

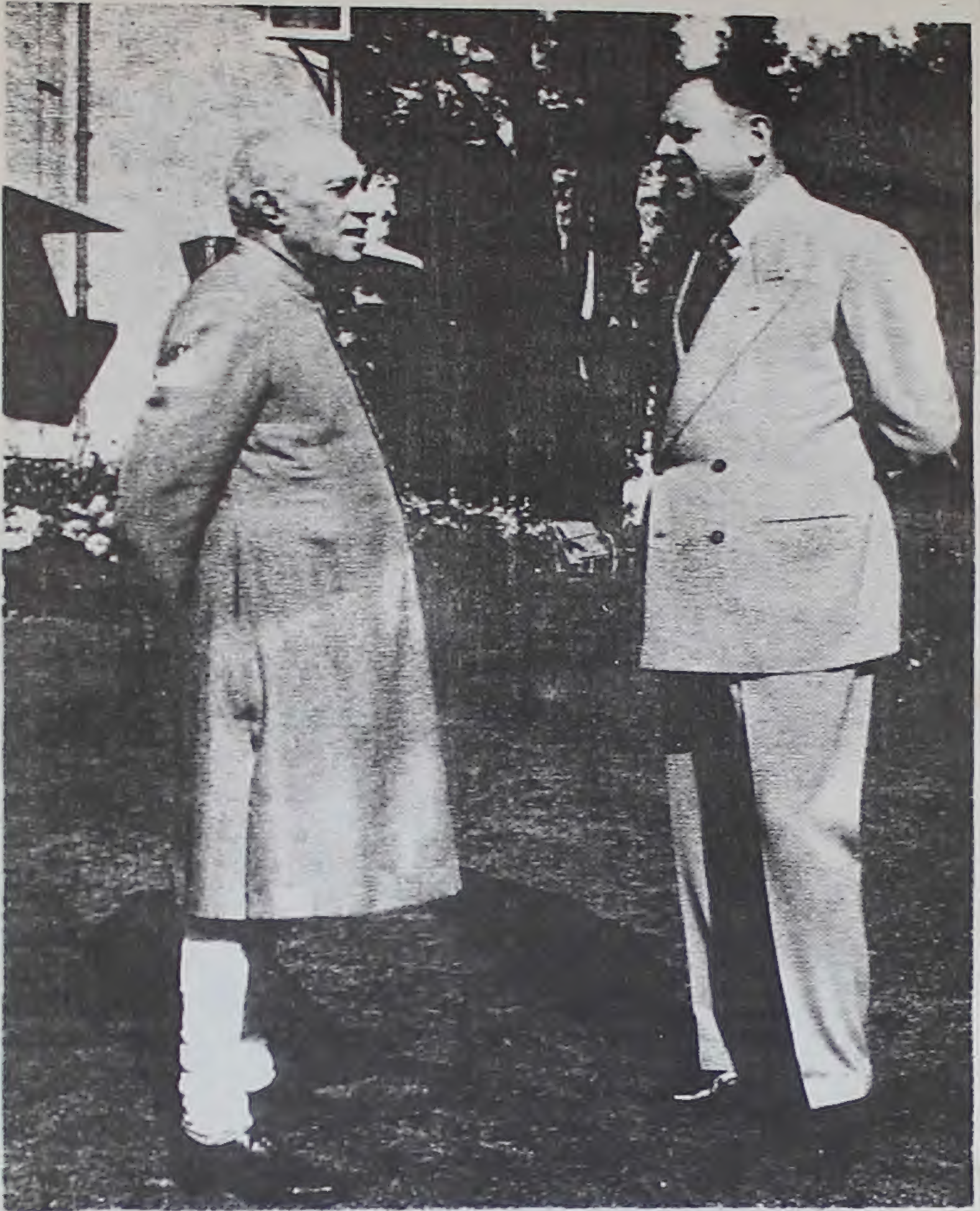
جہاز کے ذریعے نوشہرہ پہنچا اور ٹینکوں کے خلاف ایک بہت دل چسپ دفاعی مظاہرہ دیکھا جس میں حملہ آور ٹینکوں کی ایک پوری رجمنٹ کا مقابلہ کیا گیا - بلاشبہ یہ رائفل[۱] ٹینکوں کے خلاف بڑا زبردست ہتھیار ہے - لیکن اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے استعمال میں بڑی مہارت درکار ہے -

۲۶-اگست

فیلڈ مارشل مونٹ گمری کے بارے میں ایک پیغام ریڈیو پاکستان کے لئے ریکارڈ کرایا -

---

۱- ۱۰۶ ملی میٹر ریکوئل لیس رائفل



(۱۱) مری میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ

(۱۲) مسٹر ڈوسیٹ آئزن ہاور اور صدر کینیڈی کے ساتھ ... واشنگٹن ...

۲۸- اگست

سکرٹری وزارت دفاع نے مغربی پاکستان کے چیف سکرٹری اور جی ۔ایچ۔ کیو اور پولس کے نمائندوں کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کی، جس میں سرحدی پولس کو فوجی طرز میں تبدیل کرنے اور زائد از ضرورت پولس افسروں کو ٹھکانے سے لگانے کے مسئلے پر تبادلہ خیال کیا ۔ پولس والے قدرتی طور پر ہر قسم کے اعتراض کرنے اور روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ادھر سیاست داں بھی کوئی سخت فیصلہ کرنے سے جان چرا رہے ہیں ۔ وہ پولس والوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے ۔ کیونکہ ان سے آئندہ انتخابات میں انھیں بڑی مدد ملنے کی امید ہے ۔ میرا خیال ہے کہ پولس والے ہی اصل انتخاب جتانے والے باور کئے جاتے ہیں ۔ میری ہدایات یہ ہیں کہ بڑے تحمل کے ساتھ برابر دباؤ ڈالتے رہو تا وقتیکہ صحیح کارروائی عمل میں نہ آ جائے ۔ شاید اس میں کچھ وقت لگ جائے ، لیکن ملک کے استحکام کے لئے یہی ضروری ہے کہ اس جمعیت کو فوجی طرز کا بنا دینا چاہئے ۔

مجھے بڑی افسوس ناک اطلاعات مل رہی ہیں ۔ اقتصادی بدحالی کے بارے میں، بد انتظامی کے بارے میں، جو سیاسی دخل اندازی کا نتیجہ ہے؛ عوام کی دل شکستگی کے بارے میں، کیونکہ ان کا اعتماد صدر سمیت سب سیاسی رہنماؤں پر سے اٹھ گیا ہے ۔ عوام کا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی مخلص نہیں ۔ نہ کسی کا کوئی سیاسی مسلک ہے ، اور نہ کسی میں وطن پرستی کا جذبہ ہے کہ وہ کوئی سخت اقدام کر کے ملکی برائیوں کو دور کرے ۔ اور اب تو وہ خود مجھے اور فوج کو الزام دینے لگے ہیں کہ ہم اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہیں اور قوم کو ان ظالموں کے پنجرے سے چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے ہیں ۔ یہ خطرناک خیال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ لوگ فوج کے کام کی اصل نوعیت کو نہیں سمجھتے ۔ لیکن انسان تنگ آ جائیں تو ہر طریقے سے نجات پانے کی سوچنے لگتے ہیں ۔ خدا جانے ان لوگوں کو یہ احساس ہے یا نہیں کہ اگر میں خود کو سیاسیات سے الگ تھلگ نہ رکھتا ، تو آج ان کے پاس یہ فوج

کہاں ہوتی ۔ اور اگر اس قسم کی فوج نہ ہوتی تو وہ اب تک اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوتے ۔

۳- ستمبر

امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے ہندوستان کو بڑی بھاری اقتصادی امداد ملنے کی خبریں آ رہی ہیں ، جس سے بڑی پریشانی ہے۔ اس طرح ہندوستان اقتصادی فکروں سے آزاد ہو کر اپنا سارا زور فوجی تعمیر پر لگا دے گا اور ہمارے حالات کو اور بھی زیادہ مشکل بنا دے گا ۔

۶- ستمبر

کراچی پہنچا ۔ متروکہ جائداد کے مسائل پر وزارت بحالیات سے گفت و شنید کی ۔ علاوہ ازیں ڈیفنس سکرٹری کے ساتھ ڈائریکٹر جنرل ڈیفنس پرچیز کے چارٹر کے بارے میں بھی تبادلۂ خیال کیا ۔ میں نے ان پر زور دیا کہ سامان خریدنے اور پرانے سامان کو اٹھوانے میں عجلت کرنی چاہئے ۔

۱۳- ستمبر

او-ٹی-ایس[1] کی پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھی ۔

۱۴- ستمبر

فوجی اجتماع ، اور رنگروٹوں کے میلے میں شرکت کی ۔

۱۵- ستمبر

ساڑھے پانچ بجے صبح بذریعۂ ہوائی جہاز لاہور روانہ ہوا ۔ دسویں پنجاب کی سو سالہ تقریب میں شرکت کی ۔ لنچ کے بعد واپس آیا ۔

۱۸- ستمبر

شمالی علاقوں کو روانہ ہوا ۔ پولیٹکل ایجنٹ اور ریزیڈنٹ سے ملاقات کی ۔

۲۰- ستمبر

گوپس دریا میں کچھ دیر مچھلیاں پکڑیں ۔

۱- آفیسرز ٹریننگ سروس ۔

۲۱- ستمبر

گلگت واپس آیا -

۲۲- ستمبر

ہنزہ روانہ ہوا -

۲۳- ستمبر

قیام کیا - چیف آف سٹاف سے کراچی کی سیاسی ہلچل کی اطلاع ملی -

۲۴- ستمبر

گلگت واپس آیا - میر آف ناگر کے ساتھ لنچ کھایا - مسلم لیگ کی کارروائی کے بارے میں چیف آف سٹاف کا تفصیلی پیغام ملا -

میں نے چیف آف سٹاف کو بتایا کہ پیشگی منظوری کے بغیر کسی قسم کی بڑی کارروائی کا وعدہ نہ کیا جائے -

۲۵- ستمبر

صبح سوا دس بجے راول پنڈی واپس آیا -

چھٹا باب

انقلاب

نقارے پر چوٹ پڑ چکی تھی - وہ لمحہ جس کا مدت سے انتظار تھا آخرکار آ پہنچا تھا - اب ذمہ داری سے جان چرانا ممکن نہ رہا تھا - یہ ۴-۱ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کا دن تھا - اور جب میں اپنے ریلوے سیلون میں سوار ہوا ، تو میں جانتا تھا کہ اب یہ دور ختم ہونے کو ہے - میں کراچی جا رہا تھا - جہاں ایک سیاسی سوانگ ایک لمبے عرصے سے کھیلا جا رہا تھا اور اب اس کے ختم ہونے کا وقت آپہنچا تھا - اس سے چند روز پہلے صدر اسکندر مرزا نے مجھے بتایا تھا کہ صورت حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے اور میں نے اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے -

برسوں سے ہم سب لوگ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ ملک کے سیاسی رہنماؤں کو اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس ہوگا - ان میں وطن دوست بھی تھے ، اور لائق اور فائق لوگ بھی - کچھ ایسے تھے جنھیں قائد اعظم سے گہرا واسطہ رہا تھا ، اور دیکھ چکے تھے کہ انھوں نے پاکستان کی جد و جہد کی کس بصیرت، تدبر ، حوصلے اور عزم کے ساتھ رہنمائی کی تھی - اس کے بعد انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ لیاقت علی خان کیسے ٹھنڈے دل ، جرأت اور مضبوط ارادے کے ساتھ حکومت کے سفینے کو بھنور سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے - ان میں سے ہر ایک نے اقتدار کی رسی کو جھپٹ کر پکڑ لیا تھا اور ایک آن کے لئے اُجالے میں آ کر جوڑ توڑ اور نااہلی کے اندھیرے میں جا پڑا تھا -

میں ۵- اکتوبر کو کراچی پہنچا - یحییٰ ، حمید اور دو ایک اور افسر مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے - میں جنرل اسکندر مرزا سے ملنے گیا - وہ لان میں بیٹھے تھے - سوچ میں ڈوبے ہوئے ، چہرے سے ملال اور مایوسی ٹپکتی ہوئی - میں نے ان سے پوچھا - ''کیا آپ نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے؟''

''ہاں'' انھوں نے کہا -

''کیا آپ کے خیال میں یہ مطلقاً ضروری ہے؟''

''ہاں - یہ مطلقاً ضروری ہے-'' انھوں نے مضبوط ارادے کے ساتھ کہا -

میں اس کو بڑی بدقسمتی کی بات سمجھتا تھا کہ وقت کی نزاکت ہمیں ایسا سخت قدم اٹھانے پر مجبور کر دے اور پھر خود کو اس کارروائی میں شریک دیکھنا بھی تو کوئی خوش گوار بات نہ تھی - مگر اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا - ملک کو بچانے کا یہ آخری موقع تھا -

اس سے چند روز پہلے سات وزیر جن میں چار سرکاری وزیر تھے ، مرکزی کابینہ میں اپنے عہدے کا حلف اٹھا چکے تھے - ان کو ملا کر وزیروں کی کل تعداد چھبیس تک پہنچ گئی تھی - یہ قدم ری پبلی کن اور عوامی لیگ کی ملی جلی حکومت کو جس کے سربراہ ملک فیروز خان نون تھے ، سنبھالا دینے کے لئے اٹھایا گیا تھا ، کیونکہ وہ بری طرح ڈول رہی تھی - اس کے بعد عہدوں کی تقسیم پر بڑی تو تو میں میں ہوئی - ۷- اکتوبر کو دن کے ایک بجے عہدے از سر نو تقسیم کئے گئے - اس پر عوامی لیگ نے جھٹ استعفیٰ دے دیا - شام کو سات بجے عہدوں کی تازہ تقسیم کا اعلان کیا گیا - مگر اس وقت تک مرکزی اقتدار کی عمارت ڈھے چکی تھی - شام کو آٹھ بجے اسکندر مرزا نے بڑے ڈرامائی انداز میں آئین کو منسوخ کر دیا - سارے پاکستان میں مارشل لا کا اعلان کر دیا - مرکزی اور صوبائی حکومتوں ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کو منسوخ کر دیا اور مجھے مارشل لا کا منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا -

اس گھڑی کے بعد کی کارروائیوں میں جذباتی باتوں کا کچھ دخل نہ رہا - جب ایک کام کرنا ہی ہے تو اسے اچھی طرح سے کیا جائے۔ ایک سیدھا سادہ طریق کار سوچا گیا اور اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا - میں نے جنرل اسکندر مرزا کو مشورہ دیا ''بہتر ہوگا کہ آپ اپنے وزیراعظم کو اس صورت حال کی اطلاع دے دیں۔،، لیکن ان کا خیال تھا کہ اس کی ضرورت نہیں ، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کارروائی قانونی طور پر بالکل صحیح ہے -

میں نے کہا - ''میں آپ سے دو باتیں تحریری صورت میں چاہتا ہوں - ایک تو یہ کہ آپ مارشل لا کا انتظام میرے سپرد کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ آپ وزیر اعظم کو خط لکھیں کہ یہ فیصلہ آپ نے کیا ہے - آپ نے حکومت کو برطرف کیا ہے ، آئین کو منسوخ کیا ہے ، مارشل لا کا اعلان کیا ہے ، اور مجھے مارشل لا کا منتظم مقرر کیا ہے۔،،

انھوں نے ملک فیروز خاں نون کو خط تو بغیر حیل و حجت کے لکھ دیا ، مگر وہ مجھے مارشل لا کے انتظام کا تحریری اختیار دینے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے - میں چاہتا تھا کہ وہ وزیراعظم کو خط لکھ دیں - تاکہ اپنے اس فیصلے کی پوری ذمہ داری ان پر عائد ہو۔ وہ حکومت کے آئینی سربراہ کی حیثیت سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملک کا انتظام آئینی طور پر ممکن نہیں رہا -

میں نے کہا ''آخر آپ نے کوئی قدم تو اٹھایا ہی ہے - اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح قدم اٹھایا ہے - لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ تحریری صورت میں میرے پاس، موجود ہو۔،،

وہ ٹال مٹول کرنے لگے - لیکن آخرکار انھوں نے دو تین دن کے بعد یہ خط لکھ کر دینا منظور کر لیا -

انقلاب کے لئے بہت پہلے سے تیاریاں کرنی پڑتی ہیں ، لمبے چوڑے منصوبے بنائے جاتے ہیں ، خفیہ جلسے ہوتے ہیں ، اور ملک بھر میں فوج کی نقل و حرکت ہوتی ہے - ہمارے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی - اس کو ایک فوجی کارروائی کے طور پر انجام دیا گیا - بس اتنا ہوا کہ ایک بریگیڈ کو حرکت میں لایا گیا - دراصل عام

طور پر کراچی میں دو بریگیڈ—ایک انفنٹری اور ایک آرٹلری بریگیڈ تو متعین رہتے ہی ہیں - چنانچہ اگر مارشل لا جاری کر دینے کے بعد کچھ گڑ بڑ ہوتی تو اس پر قابو پانے کے لئے ہمارے پاس کافی فوج موجود تھی - لیکن ہم نے احتیاط کے طور پر ایک اور بریگیڈ کوئٹہ سے بلوا کر کراچی سے باہر جنگ شاہی میں ٹھہرا لیا - بس یہ تھی ہماری فوجی تیاری - فوج کو ہر قسم کی غیر متوقع صورت حال کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے - اس قسم کی کارروائی میں ناکامی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا - اگر کہیں مارشل لا کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ، خواہ لمحہ بھر کے لئے ہی سہی ، تو اس سے بڑی خطرناک صورت حال پیدا ہو جاتی - جنگ شاہی میں بریگیڈ کو ٹھہرانے میں اسی احتیاط کو مدنظر رکھا گیا تھا -

انقلاب کی رات کو ہم نے کمانڈرز ان چیف اور تمام مقامی کمانڈروں کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا - اور ان سے کہا تھا کہ ہر صورت میں امن امان قائم رکھیں - بس یہ تھی کل کارروائی - اس کے بعد ہم مارشل لا کے منتظمین کے درجہ بدرجہ تقرر میں مصروف ہو گئے - ان لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا گیا - رفتہ رفتہ سول حکام اور فوج کے درمیان رابطہ پیدا ہونا شروع ہو گیا -

ہم نے اس بات کا تو پورے طور پر اطمینان کر لیا تھا کہ یہ کارروائی کامیاب رہے گی - اب سوال یہ تھا کہ اس کارروائی کو کن حدود میں رکھا جائے - میرا اپنا خیال یہ تھا کہ اگر کہیں مزاحمت ہوئی بھی تو وہ برائے نام ہی ہوگی - اور ہم اس پر آسانی سے قابو پا لیں گے - چنانچہ طاقت کے استعمال کا موقع ہی نہیں آئے گا - لوگ ملک کے حالات سے بہت بیزار ہو چکے ہیں اور تبدیلی کے سخت خواہش مند ہیں - اور پھر ان کے دل میں فوج کا بے حد احترام بھی ہے -

اس دوران میں یہ ذکر بھی آیا کہ یہاں بھی مارشل لا کا وہی ضابطہ نافذ کیا جائے جو سنہ ۱۹۵۳ء میں لاہور میں پہلے مارشل لا کے موقع پر جاری کیا گیا تھا ، اور جس کی رو سے ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی جو ملک میں نظم و ضبط کی بربادی کے

ذمہ دار تھے - انقلاب کے موقع پر ہم نے سب سے پہلے اس قاعدے پر عمل کرنے کی ٹھانی تھی - اس سے ہمیں ان سیاست دانوں کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار مل جاتا جو ملک کو تباہی کے غار پر پہنچانے کا باعث ہوئے تھے - لیکن میں نے کہا : ''ہمیں یہ خیال ترک کر دینا چاہئے-'' میں چاہتا تھا کہ لوگ جلد اپنی اپنی جگہ پر جم جائیں اور ملک کی تعمیر نو اور معاشرے کی بحالی کے کاموں میں مصروف ہو جائیں - ان کا بخار جلد سے جلد اتر جائے - مارشل لا ایسی آسانی سے جاری ہو گیا جیسے کوئی بجلی کا بٹن دبا دے - حالات آپ سے آپ سدھرنے شروع ہو گئے - اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے لوگ بنیادی طور پر بڑے باشعور تھے اور ہماری سول ملازمتوں میں اچھے لوگ موجود تھے - ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے مارشل لا کو لوگوں کی پچھلی حرکتوں پر سزا دینے کا ذریعہ نہیں بنایا - اگر ایسا کیا جاتا تو ہمارے اقدام کی تعمیری نوعیت کے خلاف ہوتا -

ملک کو ترقی کرنے اور خود کو ایک پنپتی اور بڑھتی ہوئی طاقت میں ڈھالنے کے لئے، صحیح قسم کی جد و جہد کی ضرورت تھی - ہمارے پاس کام کے آدمی ویسے ہی کم تھے ، ان کو تعمیری کاموں میں لگانے کی بجائے ملک میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کرنا اور لوگوں کو جبر کا نشانہ بنانا بے فائدہ تھا - عقل کی بات یہ تھی کہ اپنے آدمیوں سے اچھے کام لئے جائیں - میرے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ اگر مارشل لا سے کوئی فائدہ اٹھانا ہے تو یہی کہ حکومت کی مشینری کو پھر سے استوار کر دیا جائے تاکہ وہ اپنا کام شروع کر دے -

مارشل لا جاری ہونے کے بعد اگلی صبح کو میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مرکزی حکومت کے تمام سیکرٹریوں کی ایک میٹنگ بلوائی - میں نے ان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا کام کیا ہوگا - میں نے پالسی کا ایک خاکہ بھی ان کے سامنے پیش کیا - میں نے دیکھا کہ ان میں سے دو ایک سیکرٹری کچھ روٹھے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں- میں نے ان کی مزاج پرسی

کی - اس کے بعد جلد ہی سب راضی خوشی کام کرنے لگے - ہم نے سیکرٹریوں کی ایک کونسل بنائی جو دو مہینے تک کام کرتی رہی -

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مارشل لا والے دن کچھ فوجوں کو بعض اہم مقامات پر پہنچنا تھا کہ اگر کوئی شورش ہو تو اس سے نمٹ سکیں لیکن دو ایک یونٹوں کو بڑے متضاد احکام ملے - خیال کیا جاتا تھا کہ یہ احکام ڈیفنس سیکرٹری کی طرف سے ایک بریگیڈ کے کمانڈر کو دیے گئے تھے - اس کے بعد فوج کے لوگ شک و شبہ میں مبتلا رہنے لگے - وہ ایک دوسرے کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے ، کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ شک و شبہ کے یہ بیج کون بو رہا ہے -

میرے خیال میں وہ آخرکار اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسکندر مرزا ٹھنڈے پڑ چکے ہیں - ہمیں اطلاع ملی کہ ان کی بیوی ہر وقت ان سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے اور بار بار کہتی ہے کہ تم نے سخت غلطی کی - خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا ، اب تمھیں چاہئے کہ ایوب خان کو ختم کر دو - اسکندر مرزا نے انٹیلی جنس بیورو اور دوسرے ذرائع سے بعض اہم مقامات پر فوجوں کی ترتیب کا نقشہ معلوم کرنے کی کوشش کی - انھوں نے کراچی کے ارد گرد حرکت میں آئی ہوئی فوج کی ترتیب بھی معلوم کرنے کی کوشش کی -

مارشل لا کے بعد قدرتی طور پر میں مشرق پاکستان جانا چاہتا تھا، جہاں پاکستان کی ایک بہت بڑی اکثریت آباد ہے- لیکن اسکندر مرزا میرے اس ارادے سے کچھ ناخوش سے دکھائی دئیے - انھوں نے مجھے خبردار کیا ''بہت ہوشیار رہنا - کیونکہ بہت سے لوگ تمھارے خون کے پیاسے ہیں-،، میں نے کہا : ''میں تو موت سے بہت آنکھ مچولی کھیلتا رہا ہوں - میری زندگی ہی یہ ہے-،،

ڈھاکہ میں ایک بڑا بھاری عام جلسہ ہوا جس میں میں نے تقریر کی - میرا خیال ہے کہ اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ ڈرے سہمے سے رہنے لگے - لیکن میں نے خود انھیں پہلے سے بتا دیا تھا : ''دیکھئے اب حالات بدل گئے ہیں - ملک میں انقلاب ہو گیا ہے - آپ خود اس انقلاب کے نقیب ھیں - آپ نے ملک کا انتظام میرے

سپرد کیا ہے - لیکن یہ انقلاب کوئی ایسی تبدیلی نہیں جو چلتے چلاتے ہو جایا کرتی ہے - اب تو ملک میں حقیقی اور بنیادی تبدیلیاں کی جائیں گی - یہ میری پالسی ہے - آپ خائف نہ ہوں - اب یہ میری ذمہ داری ہے - یہ بوجھ مجھی کو اٹھانا ہے - میں نے ملک میں بعض بنیادی اصلاحات کو عمل میں لانے کی ٹھان لی ہے - اس لئے مہربانی کر کے آپ کسی جوڑ توڑ میں حصہ نہ لیں - اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہونی چاہئے - کیونکہ میں نے آپ کے اقتدار کو برقرار رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے - اور میں مقدور بھر آپ کا وفادار رہوں گا۔،،

انھوں نے کہا ،،بس تو پھر ٹھیک ہے۔،،

میں نے کہا ،،بہت خوب!،،

لیکن ہمیں برابر اطلاعیں ملتی رہیں کہ ان کی بیوی ہمیشہ ان کے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ ایوب خان کے خلاف جلد کچھ کرو۔

جب میں مشرقی پاکستان سے واپس آیا اور ماری پور ایر پورٹ پر اترا تو میجر شیر بہادر میرے پاس آئے - اور کہنے لگے کہ آپ کے جانے کے بعد پاکستان ایئر فورس کے ایئر کموڈور رب کو صدر جنرل اسکندر مرزا نے ٹیلی فون کیا تھا اور پوچھا تھا ،،کیا تم اس ملک کے وفادار ہو؟،،

رب نے کہا - ،،ہاں میں وفادار ہوں۔،،

،،کیا میرے بھی بہ حیثیت صدر وفادار ہو؟،،

رب نے کہا ،،ہاں میں وفادار ہوں۔،،

،،کیا تم میرے احکام کی تعمیل کروگے خواہ اس میں تمھاری جان خطرے میں پڑ جائے؟،،

اس کے جواب میں رب نے کہا ،،جناب پہلے مجھے احکام معلوم ہونے چاہئیں۔،،

اسکندر مرزا نے کہا ،،میں چاہتا ہوں کہ تم جا کر تین جنرلوں کو گرفتار کر لو - ان کے نام ہیں جنرل یحیٰی ، جنرل شیر بہادر اور جنرل حمید۔،،

اس پر ایئر کموڈور رب جھجکے اور طرح دیتے ہوئے کہا ،،جناب

کیا میں حاضر ہو جاؤں؟ کیا آپ مجھے تحریری حکم دے دیں گے؟،،
میں نے جنرل شیر بہادر سے کہا ''اس کا کچھ خیال نہ کرو۔،، میں نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھے ۔ گو میں جانتا تھا کہ اسکندر مرزا سے ایسی احمقانہ بات کچھ بعید نہیں ۔ یہ بات اس لئے احمقانہ تھی کہ اس سے فوراً سروسوں میں ٹھن جاتی اور پھر خدا جانے کیا پیش آتا ۔ اسکندر مرزا نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ فوج اور اس کے سربراہوں کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو فوج سب سے پہلے خود انہیں کا کام تمام کر دے گی ۔ چنانچہ میں ان کے پاس گیا اور کہا ''آپ کا ارادہ کیا ہے؟،، میں نے سنا ہے کہ آپ فوجی افسروں کی گرفتاری کے احکام دیتے رہے ہیں۔،،
انہوں نے تردید کرنے کی کوشش کی: ''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے ۔ اس میں ذرہ بھر سچ نہیں۔،،
میں نے انہیں تنبیہ کی۔ ''دیکھئے یہ عیاری اور چالبازی ختم کیجئے ۔ ہوشیار رہئے ۔ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں ، حالانکہ اس کی کچھ ضرورت نہیں ۔ ہم سب آپ کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں ۔ پھر آپ ایسی شرارتیں کیوں کر رہے ہیں؟،،
ادھر فوج کے قانونی مشیروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ آئین منسوخ ہو چکا ہے ، مارشل لا جاری کیا جا چکا ہے ، اور مارشل لا کا منتظم اعلیٰ مقرر ہو چکا ہے ، اس لئے صدر کا عہدہ محض فاضل ہو کر رہ گیا ہے ۔ یہ ان کے خیال کے مطابق اس معاملے کی قانونی حیثیت تھی ۔ میں نے کہا: ''دیکھو تم لوگ میرے لئے اور الجھنیں پیدا نہ کرو ۔ تم مجھے کیوں تنگ کرتے ہو ۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔،،
جب اس معاملے پر بحث ہو رہی تھی تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ چیف جسٹس منیر بھی وہاں موجود تھے ۔ وہ انقلاب سے پہلے اسکندر مرزا کو بعض امور میں مشورہ دیتے رہے تھے ۔ میں نے انہیں بلایا ۔ ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ میں اسکندر مرزا سے بھی ملوں ۔ میں نے کرنل قاضی سے کہا کہ اپنا نقطۂ نظر بیان کرو ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ نئے نظام میں صدر کی کوئی جگہ ہی باقی نہیں

رهی - منیر کو اس سے اتفاق نہ تھا - میں نے قاضی سے کہا:
''میں منیر سے متفق ہوں - بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' اس کے بعد میں نے اُسے رخصت کر دیا -

مجھے اُمید تھی کہ اسکندر مرزا نئی صورت حال کو قبول کر لیں گے - ہم میں ہمیشہ بڑی دوستی رہی تھی - میں نے دل میں کہا کہ جب تک وہ صریحاً کوئی غلط بات نہیں کرتے ، ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنا بے وفائی کے مصداق ہوگا - اس کے کچھ دن بعد میرے ملٹری کمانڈر میرے پاس آئے اور کہنے لگے:
''اب یہ شخص ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔''

میں نے پوچھا ''وہ کیسے؟''

اس کے جواب میں ان لوگوں نے کچھ واقعات سنائے کہ اسکندر مرزا نے فلاں فلاں آدمیوں کو ٹیلی فون کر کے ان سے کچھ سودا بازی کرنی چاہی تھی -

ادھر لوگوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ جب تک اسکندر مرزا موجود ہیں ، یوں ہی جوڑ توڑ ہوتے رہیں گے اور کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے گا - میرے رفقاء کار نے کہا: ''تمھاری مشکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ تم ایک دوست کے پاس جا کر اس سے یہ کہنا نہیں چاہتے کہ تم سخت بے وفا ثابت ہوئے ہو - لیکن یہ معاملہ تمھاری ذاتی دوستی سے کہیں بالا ہے - ہم بڑے خلوص سے تمھیں مشورہ دیتے ہیں بلکہ تم سے التجا کرتے ہیں کہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ اب ہمارا اور ان کا ساتھ ممکن نہیں -

میں نے کہا:- ''اچھی بات ہے مجھے سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت دو۔''

مجھے اُمید تھی کہ شاید اسکندر مرزا اب بھی سنبھل جائیں - اور شاید میرے رفقاء بھی اپنے خیال سے باز آ جائیں - مگر جنرل ہیڈ کوارٹرز اور فوجی فسروں کا شور و غوغا بڑھتا ہی جا رہا تھا - ان سب نے مجھ سے کہا: ''آپ جو کام بھی کرنا چاہیں گے یہ شخص اس کو ملیا میٹ کر دیگا - ہمیں ڈر ہے کہ عوام کو ہماری پالسیوں پر کچھ اعتماد نہیں رہے گا - ملک میں امن چین

نہیں ہوگا۔ اصلاح کی جو کوشش بھی کی جائے گی۔ اس کا نتیجہ صفر ہوگا۔''

آخرکار میں نے کہا: ''تمھاری یہی مرضی ہے تو میں جا کر اسکندر مرزا کو بتا دیتا ہوں۔''

انھوں نے کہا: ''نہیں۔ آپ نہ جائیں۔ ہم خود آپ کی طرف سے انھیں بتا دیں گے۔''

اس پر تین جنرل ان کے پاس پہنچے۔ جنرل برکی، جنرل اعظم، اور جنرل خالد شیخ۔ انھوں نے میری طرف سے مرزا سے کہا: ''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنے طور طریقوں میں سمجھ داری سے کام نہیں لیا۔ ادھر یہ بات بھی بالکل واضح ہو گئی ہے کہ لوگ آپ کو پسند نہیں کرتے۔ اور آپ کی ذات کے روادار نہیں ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ پاکستان کے مفاد کا معاملہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ وقت کا تقاضا پورا کریں گے۔''

غرض اسکندر مرزا کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اقتدار سے دست بردار ہونا منظور کر لیا۔

آسٹریلیا کے ہائی کمشنر میجر جنرل کاتھورن نے جو اسکندر مرزا کے پرانے دوست تھے، مجھ سے پوچھا کہ اسکندر مرزا کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ وہ انگلستان جانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے وہاں مکان تلاش کیا جا رہا ہے۔ اور ان کے لندن جانے کے لئے موزوں ہوائی جہاز کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔

چار پانچ روز تک ہمیں کوئی ہوائی جہاز نہ مل سکا۔ ہمیں خدشہ ہوا کہ اگر وہ کراچی میں رہے تو لوگ شاید بھڑک اٹھیں اور صورت حال خراب ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے ان سے کہا کہ آپ کوئٹہ چلے جائیں۔ وہ مان گئے اور ہم نے ہوائی جہاز کے ذریعے انھیں وہاں بھجوا دیا۔ کاتھورن نے کہا: ''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''آپ جب چاہیں شوق سے مل سکتے ہیں اور چاہیں تو ان کے ہمراہ بھی جا سکتے ہیں۔ وہ کوئی قیدی تھوڑا ہی ہیں۔''

میرا خیال ہے کہ وہ ان سے ملنے کراچی ایئر پورٹ پر گئے تھے۔

آخرکار جب اسکندر مرزا انگلستان روانہ ہونے لگے تو انہیں ماری پور کے ہوائی اڈے پر کچھ گھنٹے انتظار کرنا پڑا - ان کے بہت سے دوست ان سے ملنے گئے اور انہیں الوداع کہی -

مجھے یہ فیصلہ کر کے بہت دکھ ہوا تھا اور میرا دل اسکندر مرزا کے لئے بھی کڑھا تھا - کیسی بدقسمتی کی بات ھے کہ انہوں نے کسی کے ساتھ بھی وفا نہیں کی - بعض لوگوں کا خیال ھے کہ میرا اسکندر مرزا پر اعتماد کرنا بے محل تھا - لوگوں کو اکثر حیرانی ہوتی ھے کہ مجھے یہ احساس کیوں نہیں ہوا کہ وہ ایسے آدمی نہیں تھے جو انقلاب کے مقاصد کو سرانجام دے سکتے - لیکن جب تک وہ وزارت دفاع کے سیکرٹری رھے وہ فیصلے کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے تھے اور جہاں ان کے ذاتی مفاد پر زد نہیں پڑتی تھی وہ بڑی تیزی اور ہوشیاری سے کام کرتے تھے - چنانچہ مجھے ان کی ذات سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہماری حمایت کے ساتھ ملک کے لئے ایک مفید سربراہ ثابت ہوں گے ، کچھ زیادہ بے جا بھی نہ تھا - آخر ان کا تجربہ دوسرے سیاست دانوں سے کہیں زیادہ وسیع تھا - سارے سیاست دان آزمائے جا چکے تھے اور محض خام نکلے - سول کے لوگوں میں ان کے علاوہ اور تھا ھی کون -

یہی وجہ تھی کہ میں اسکندر مرزا پر اعتماد کئے گیا حالانکہ اور سب ان سے ناامید ہو چکے تھے - لیکن یہ میری طبیعت کی افتاد ھے - میں زندگی میں بڑی بڑی مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن کسی کے ساتھ درشت یا غیر مہذب طریقے سے پیش نہیں آ سکتا - میں اسی وقت قدم اٹھاتا ہوں ، جب میرا صبر جواب دے چکتا ھے - یہی وجہ ھے کہ بعض اوقات ایسے معاملوں میں میرا اقدام بر وقت نہیں ہوتا -

اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ھے کہ اگر اسکندر مرزا سیدھی راہ چلنا بھی چاہتے تو وہ ان حالات کی تاب نہ لا سکتے جو اصلاحات جاری کرنے کے بعد پیدا ہوئے - میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اپنے عہدے پر رہنا کچھ مفید ثابت نہ ہوتا - وہ خود کو ان تبدیلیوں کے مطابق ڈھال نہ سکتے -

مارشل لا کے دوران میں ایک مرتبہ میں نے اخباری نمائندوں سے کہا تھا: ''میری کیفیت اس شخص کی سی ہے جو جلدی میں ہو ۔ کام بہت زیادہ ہیں اور وقت بہت تھوڑا۔'' میرا مقصد یہ نہ تھا کہ لوگ ہر بات میں مجھ پر انحصار کریں اور سارا اختیار میرے ہی ہاتھ میں ہو، بلکہ خود کام کریں ۔ وہ جتنی جلدی اپنے آپ کام کرنا سیکھ جائیں اتنا ہی بہتر ہوگا ۔ یہی وجہ تھی کہ میں جلد سے جلد مارشل لا کو ختم کرنا اور آئینی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا ۔ ملک کو بعض بڑی بڑی اصلاحات کی سخت ضرورت تھی ۔ مارشل لا تو بس ان اصلاحات کا نقطۂ آغاز تھا ۔ بلاشبہ اگر کوئی ان اصلاحات میں مزاحم ہوتا تو اس کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا کوئی موقع ہی نہیں آیا ۔

مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ لوگوں نے اپنی چھپی ہوئی دولت کا جس پر انھوں نے ٹیکس نہیں دیا تھا ، کس قدر عجلت سے اعلان کر دیا ۔ انھوں نے ایک ارب ستر کروڑ روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا ۔ میں نے ایک تاجر سے پوچھا ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اس نے جواب دیا: ''میں نے آپ کا ایک فوٹو دیکھا جس میں آپ اپنی انگلی سے یوں اشارہ کر رہے تھے ۔ اور آپ اپنے ہونٹ یوں سکیڑے ہوئے تھے ۔ میں نے دل میں کہا ، بابا یہ آدمی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا ۔ اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تو ہماری شامت آ جائے گی ۔ ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس کی بات مان ہی لو ۔ اور پھر ہمیں انکم ٹیکس بھی تو ۷۰ فی صد کے بجائے ۳۳ فی صد دینا تھا ۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ چلو سستے چھوٹے!''

آخر میں اس نے کہا :- ''آپ نے خود تو چھنگلی تک نہ اٹھائی ، مگر وہ فوٹو کام کر گیا۔''

ساتواں باب

مارشل لا

مارشل لا کے فوری مقاصد بھی تھے اور طویل المیعاد مقاصد بھی۔ ایک فوری مقصد نہ تھا کہ حکومت کے سول اور آئینی اداروں کو بحال کیا جائے۔ یہ ادارے غلط اور خود غرضانہ استعمال کے باعث ناکارہ اور بے جان ہو چکے تھے۔ ان کو مارشل لا کی نگرانی کی ضرورت تھی تا کہ وہ آئین کے تحت پھر سے اپنے اپنے اصلی کاموں میں مصروف ہو جائیں۔

اس زمانے میں فوج کو بعض اہم مقاموں پر متعین کیا گیا تھا، جہاں سے اس کو ضرورت کے وقت بلایا جا سکتا تھا۔ انقلاب کے ابتدائی دنوں میں جب لوگوں کو فوج کہیں نظر نہ آئی تو ان کو کچھ حیرانی سی ہوئی۔ لفظ 'انقلاب' کا مطلب ہے سول کی جگہ فوج کا یا کم از کم ایک 'خاص' اقتدار کا عمل دخل ہو جانا۔ یہ تبدیلی در حقیقت رونما تو ہو چکی تھی، مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا مظاہرہ ہو۔ لازم تھا کہ فوج کو پس منظر میں رکھا جائے، کیونکہ ملک کی عام زندگی میں فوج کا اصلی مقام وہی ہے۔ اگر فوج کا براہ راست سول انتظام میں دخل ہو جاتا تو اس سے سول اقتدار کی حالت اور پتلی ہو جاتی، اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ علاوہ ازیں فوج کو شہری زندگی سے واپس بلانے میں بھی بڑی دشواری پیش آتی۔ مجھے تو اس امر میں بھی شک نہیں کہ اگر فوج سول انتظام کے چلانے میں کچھ زیادہ مشغول ہو جاتی، یا اسے ملک کے اقتصادی، سماجی یا سیاسی معاملات میں کچھ زیادہ الجھ جاتی، تو اس کی اپنی افادیت غارت ہو جاتی۔

انقلاب کے طویل المیعاد مقاصد میں ایسی بڑی بڑی اصلاحات کا جاری کرنا شامل تھا ، جن کے ذریعے ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ابتری اور ناھمواری کو دور کیا جا سکے ۔ ان اصلاحات کی غایت ملک میں ایک مناسب آئین کا اجراء اور آئینی زندگی کی بحالی تھی ۔ ایک مرتبہ مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ اصلاحات کے ساتھ ساتھ ایک عارضی آئین کیوں نہیں جاری کر دیتے جو کام چلاؤ قسم کا ہو ۔ اس سے اس وقت تک کام لیا جائے جب تک کہ مستقل آئین نافذ نہیں ہو جاتا ۔ مگر میں نے اسے خطرناک تصور کیا ۔ مارشل لا بھی تو ایک قسم کا کام چلاؤ آئین ھی تھا ۔ اس کے اٹھ جانے سے پہلے ملک کے لئے ایک مستقل آئینی ڈھانچہ بن جانا ضروری تھا ۔ میں نے دل میں کہا ''جب ملک کو آئین ملے تو اسے ہر طرح مکمل ہونا چاھئے۔''

فوری اور کم مدت والے مقاصد کو حاصل کرنے میں مجھے چھ مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں لگا ۔ سول انتظام کا بنیادی ڈھانچہ مضبوط تھا ۔ اس کو بس آزادی و خود اعتمادی کے احساس اور خارجی اثرات سے یکسوئی کی ضرورت تھی ۔ سول اداروں نے قابل تعریف طور پر وقت کے تقاضے کو پورا کیا ۔ وہ تھوڑے ھی عرصے میں اپنے فرائض منصبی مستعدی سے بے کھٹکے انجام دینے لگے ۔ لیکن فوج میں یہ احساس پایا جانے لگا کہ ترقی کی رفتار زیادہ تیز نہیں ھے ۔ لوگ اتنی گرم جوشی نہیں دکھا رھے جتنی کہ انھیں دکھانی چاھئے تھی ۔ اور یہ خیال بھی کہ عوام میں مایوسی پیدا ہونی شروع ہو گئی ھے ۔

میں نے ان سے کہا : ''آپ لوگ ایک ایسے نظام کے عادی ھیں جس پر ملک اپنی پائی پائی خرچ کر دیتا ھے ۔ آپ کو اچھے سے اچھا ساز و سامان اور اسلحہ دئے جاتے ھیں تاکہ وقت آنے پر آپ سو فی صدی حسن و خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں ۔ اس لئے کہ ملک کی بقا اسی پر منحصر ھے ۔ مگر باوجود ان تمام سہولتوں، ساز و سامان اور اعلیٰ ٹریننگ کے آپ کی ہر مشق پر کتنی نکتہ چینی کی جاتی ھے ۔ آدمی کو ان باتوں میں صبر سے کام لینا

چاہئیے - آپ کی زندگی منظم زندگی ہے - ایک سول افسر کو اختیار ملے تو وہ بھی اپنا کام حسن و خوبی سے کرنے لگتا ہے - مگر اس کو ضابطے کی بندشوں کے اندر رہ کر کام کرنا پڑتا ہے ، اور پبلک کی نگاہیں ہر وقت اس پر رہتی ہیں - اب اگر کسی شخص کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہو تو کوئی افسر خواہ کتنا ہی چاہے فوراً اس کا مداوا نہیں کر سکتا کیونکہ اس کو ضابطے کی پابندیوں کا پورا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے - اس وقت سول انتظام ستر (۷۰) فی صدی عملے سے کام چلا رہا ہے - اس پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا - اور پھر بعض لوگوں کی شکایتیں بھی تو جھوٹی اور ناواجب ہوتی ہیں -،،

یہ سن کر فوجی افسر چپ تو ہو جاتے مگر ان کی تشفی نہ ہوتی - ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ سول کارروائی قانون کی حدود کے اندر رہ کر ہی کی جا سکتی ہے ، اور اس میں پبلک کی موافق اور مخالف دونوں قسم کی رائے کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے - میں ان کو بتاتا کہ دیکھو ہم نے انقلاب کے ابتدائی دنوں میں دو فوری قدم اٹھائے۔ ہم نے مارشل لا کی دو دفعات جاری کیں - ایک دفعہ کی رو سے کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا جرم قرار دیا گیا ، اور دوسری دفعہ کی رو سے بلیک مارکٹ کرنے والوں کو سخت سزا کا مستوجب ٹھہرایا گیا - نتیجہ یہ ہوا کہ مٹھائیاں ڈیڑھ روپے فی سیر کے بھاؤ بکنے لگیں - اور کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ بالکل بند ہو گئی - لیکن دو ہی ہفتے کے اندر سارا مال ختم ہو گیا ، اور کاروبار ٹھنڈا پڑ گیا - قیمتوں پر کنٹرول رکھنے کی بھی بڑی واہ واہ ہوئی ، اور ہر شخص نے کراکری اور کٹلری اور گھڑیاں دھڑا دھڑ سستے داموں خریدنی شروع کر دیں ، لیکن جب مال ختم ہو گیا تو اور کہاں سے آتا! تاجروں کو دوبارہ روپیہ لگانے کی ہمت نہ پڑی -

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ فوج کے بڑے افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی - اس میں مجھے ایک مقالہ پیش کیا گیا ، جس میں بتایا گیا تھا کہ ملک میں کس طرح ہر کام غلط طریقے پر ہو رہا ہے - کمانڈر ان چیف جنرل موسیٰ بھی اس میٹنگ میں شریک تھے

میں نے ان سے پوچھا : ''کیا آپ کے بھی وھی خیالات ھیں جو اس مضمون میں ظاھر کیے گئے ھیں ؟''

انھوں نے جواب دیا : ''ھاں ھم سب ایسا ھی سمجھتے ھیں۔''

میں نے کہا : ''آج جب یہ مضمون مجھے پڑھنے کو دیا گیا تو میں چائے پی رھا تھا - میں نے اسے پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ھوا کہ بس پاکستان کا خاتمہ ھونے والا ھے - اس کے بعد میں نے صبح کا اخبار پڑھا - اس میں کسی اطالوی نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ کل قیامت آنے والی ھے - قیامت آئی کہ نہ آئی اس کی تو مجھے خبر نہیں البتہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ھے وہ زندہ و پائندہ ھے - اور کوئی شخص بھی اس کی ترقی کو روک نہیں سکتا۔''

اس سے انھیں ذرا مایوسی ھوئی - لیکن میں فوجی افسروں کو بتانا چاھتا تھا کہ وہ معجزوں کی توقع نہ کریں - شروع شروع میں لوگوں نے جو جوش و خروش دکھایا تھا ، اس سے انھیں بڑی خوشی ھوئی تھی - لیکن جب اس جوش و خروش میں کمی آنے لگی تو اس سے انھیں تکلیف ھونے لگی - لوگ ھمیشہ فوری نتائج کے خواھاں ھوتے ھیں - جب پاکستان قائم ھوا تو انھوں نے سمجھا کہ بس اب زندگی کی ساری کلفتیں دور ھوگئیں - اسی طرح جب انقلاب آیا تو انھوں نے خیال کیا کہ بس راتوں رات کایا پلٹ ھو جائے گی - حالانکہ انقلاب ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا ، جو ملک میں رونما ھو رھے تھے - اس کا یہ مطلب تھوڑا ھی تھا کہ بس ساری گتھیاں سلجھ گئیں - اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ ھمیں ان گتھیوں کو مستعدی سے ، حقیقت پسندانہ طریق سے سلجھانے کا ایک اچھا موقع مل گیا - اس موقع سے فائدہ اٹھانا عوام کا کام تھا - انھیں ضرورت تھی تو بس محنت مشقت کی ، اخلاص کی ، صبر و تحمل کی - صبر و تحمل آسانی سے ھاتھ آنے والی چیز نہیں اور نہ بغیر کوشش کے محنت مشقت کی عادت پڑ سکتی ھے -

مجھے حیرت انگیز کامیابیوں کی نہ توقع تھی نہ طلب - عوام کے جوش و خروش کو بہ آسانی سنسنی پیدا کرنے والے طریقوں سے برقرار رکھا جا سکتا تھا - میرا خیال ھے کہ بعض لوگوں کو انقلابی

حکومت سے کچھ اسی قسم کی توقعات تھیں ، اور اگر میں عوام کو اس قسم کے تماشے دکھا کر خوش رکھنے کی ترغیب کا شکار ہو جاتا تو اس سے قومی جوش و خروش کا رخ غلط راہوں کی طرف پھر جاتا ۔ چنانچہ میں اس کے لئے پہلے سے تیار تھا کہ عوام کو کسی قدر بے اطمینانی ہوگی ، اور فوج میں بھی کچھ مایوسی پھیلے گی ۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ انقلاب کے حقیقی اور طویل المیعاد مقاصد کو نظر میں رکھتے ہوئے ، معتدل اور معقول طریق پر اپنا کام جاری رکھوں گا ۔

عوام کے اس رد عمل کا خیال رکھتے ہوئے میں نے اصلاحات جاری کرنے کے ٹائم ٹیبل کی ایک میعاد مقرر کر دی ۔ میں نے سوچا کہ مجھے تقریباً دو سال کے اندر اندر اپنا پورا پروگرام شروع کر دینا چاہئے ۔ اس وقت تک آئین کے اجراء کے لئے بھی زمین ہموار ہو جائے گی ۔ مجھے سب سے پہلے اصلاحات اراضی نافذ کرنے اور مہاجرین کے مسئلے کو حل کرنے کی فکر تھی ۔ اس کے بعد میرے مد نظر وہ اصلاحات تھیں جو تعلیم کے انتظام و انصرام سے تعلق رکھتی تھیں ۔ ملک کے قانونی نظام پر نظر ثانی کی ضرورت تھی ۔ اوقاف کو کسی قاعدے قانون کے تحت لانا بھی ضروری تھا ۔ علاوہ ازیں ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی کے سارے سانچے کو جمہوری اصولوں کے تحت از سر نو منظم کرنے کی ضرورت تھی ، تاکہ عوام تعمیری اور بامقصد طریق پر ملکی معاملات میں حصہ لے سکیں ۔

میں جانتا تھا کہ انقلاب کے مقاصد طاقت کے بل پر حاصل نہیں کئے جا سکتے ۔ بے شک ہمیں ان لوگوں کے خلاف جو بے راہ رو ہو جائیں ، تادیبی کارروائی کرنے کی ضرورت تھی ۔ لیکن ساتھ ہی عوام کو خود مختاری اور عقل مندی سے سوچنے اور کام کرنے کی آزادی بھی ہونی چاہئے تھی ۔ آپ لوگوں کے رویے کو جبر سے نہیں بدل سکتے ۔ جبر مقابلے کی دعوت دیتا ہے ، اور آپ آئے دن اور زیادہ سختی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تشدد اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ، اور طاقت کے استعمال کی مستقل اور مسلسل

طور پر ضرورت رهتی هے - سماجی طور طریقے صرف سمجھانے بجھانے اور تعلیم هی سے بدلے اور سدھارے جا سکتے هیں - هم نے مارشل لا کے ابتدائی مہینوں میں بعض معیار قائم کر دے اور لوگوں کو دکھا دیا کہ ملکی معاملات کو کس طرح انجام دینا چاهئے - لیکن عوام کو خود یہ سیکھنا ضروری هے کہ اپنے کاموں کو کس طرح انجام دیں -

اس زمانے میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ آپ سیاست دانوں سے، جن کے هاتھوں ملک کی یہ گت بنی هے، بہت نرمی برت رهے هیں - انھیں چند سال کے لئے سیاست سے علیحدہ کر دینا هی کافی نہیں هے - انھیں جب بھی موقع ملے گا وہ یہی هتھکنڈے پھر شروع کر دیں گے - لیکن حقیقت میں مجھے افراد سے نہیں نمٹنا تھا - عام دستور کے مطابق کچھ لوگوں کا صفایا کیا جا سکتا تھا - لیکن اس سے ان اصلی کمزوریوں یا ان سماجی اور سیاسی حالات کا خاتمہ نہ هو سکتا، جس کے یہ سیاست داں محض ایک علامت تھے - جب تک یہ حالات باقی رهیں گے، ان سیاست دانوں کی خالی کی هوئی جگہیں ان هی جیسے اور لوگوں سے پُر هوتی چلی جائیں گی -

افراد کے ساتھ سختی اور تشدد کا سلوک روا رکھنا صرف سختی اور تشدد کی مثالیں قائم کرنا هے - اس طرح سیاسی انتقام کا ایک ختم نہ هونے والا سلسلہ شروع هو جاتا هے - میرے سامنے مسائل تھے افراد نہ تھے - جب کبھی کسی ملک میں دهشت پسندی، خصوصاً سیاسی دهشت پسندی راہ پا لیتی هے تو پھر اسے لوگوں کی رگ و پے میں سے نکالا نہیں جا سکتا - یہ جم کر رہ جاتی هے - ایک مرتبہ یہ صورت رونما هو جائے تو تہذیب کی اوپری صیقل اتر جاتی هے اور انسان کی نہایت ابتدائی، حیوانی خصلتوں کو باهر نکلنے کا راستہ مل جاتا هے - سیاسی ظلم و ستم کے زخم کا نشان همیشہ باقی رهتا هے -

انقلاب کا رخ آسانی سے ایک بھول بھلیاں کی طرف پھر سکتا تھا جس میں نہ تو آگے بڑھا جا سکتا تھا اور نہ پیچھے لوٹا جا سکتا تھا - میں دنیا پر یہ ثابت کرنا نہیں چاهتا تھا کہ لو دیکھو میں کیسا

اچھا انتظام کر سکتا ہوں ۔ میں تو بس ایسے حالات پیدا کرنے اور ایسے ادارے قائم کرنے کا خواہاں تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ملک خود اپنا انتظام کتنی اچھی طرح کر سکے ۔ ۔ ۔ اس کے لئے لازمی تھا کہ عوام کو انقلاب کے مقاصد کا ہم خیال اور حامی بنایا جائے تا کہ ملک اپنے زور پر خود بخود آگے بڑھتا چلا جائے ۔ ضروری بات یہ تھی کہ عوام کو انقلاب کے فوائد کا احساس ، اور ان کے دلوں میں اپنے معاملات کو خود انجام دینے کا جذبہ پیدا ہو ۔

مارشل لا جاری ہونے کے بعد جلد ہی میں نے سول اور مارشل لا کے حکام کے باہمی رشتہ کو واضح کر دیا ۔ مقصد یہ تھا کہ ان میں آپس میں غلط فہمی نہ ہونے پائے ، اور دونوں طرف کے حکام ایک ہی طرح کے کام نہ کرنے لگیں جس سے گڑبڑ اور پست ہمتی پیدا ہو سکتی تھی ۔ میں نے یہ بھی جتا دیا کہ سول انتظام کے ذمہ دار صوبائی گورنر ہیں اور یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ ان کے افسر اپنے فرائض خلوص، دیانت داری اور تیزی سے انجام دے رہے ہیں یا نہیں ۔ میں نے انتظام کے بنیادی ڈھانچے کو جوں کا توں رہنے دیا ، ایک کابینہ منتخب کی ، اور مارشل لا نیز دونوں صوبوں کے عام ضوابط کے تحت ، اپنے پروگرام پر عمل درآمد شروع کرا دیا ۔

مارشل لا کا اولیں مقصد انتظام کی بحالی میں مدد دینا تھا تا کہ وہ ان نئے مسائل سے نمٹ سکے جو اصلاحات کے جاری ہونے سے پیدا ہوں ۔ اس مدد کی صورت یہ تھی کہ اگر عام قوانین میں کہیں خامی ہو تو اسے مارشل لا کی دفعات سے پورا کر دیا جائے ، اور انتظام کے معائنے یا شورش والے علاقوں میں گشت کرنے میں تعاون کیا جائے، خاص اور ہنگامی عدالتیں حسب ضرورت قائم کی جائیں عام اصول یہ بنایا گیا کہ مارشل لا کی خلاف ورزی اور خلاف حکومت اور سماج دشمن کارروائی والے مقدمات فوجی عدالتوں میں پیش کئے جائیں ۔ گورنروں اور مارشل لا کے منتظمین میں اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوا کریں تا کہ وہ آپس میں تبادلۂ خیال کر کے ایک دوسرے کی رہنمائی اور مدد کر سکیں ۔

انقلاب کے ابتدائی سال کئی لحاظ سے نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے - نئے نظام کو سارے ملک کے عوام کی بھرپور حمایت حاصل رہی - عوام کے جوش و خروش نے ہماری ہمتیں بندھائے رکھیں - ہم نے جو قدم بھی اٹھایا عوام نے بلا تأمل ہمارا ساتھ دیا - میں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغیر کسی تاخیر کے اپنے پورے اصلاحی پروگرام کو ملک میں جاری کر دیا -

ان دنوں ہماری کابینہ کے اجلاس اکثر ہوتے رہتے تھے - مجھے پہلا اجلاس بخوبی یاد ہے جو ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو ہوا تھا - جب جلسے کی کارروائی شروع ہوئی تو دوپہر کا وقت تھا - میں نے کابینہ کے اراکین کو تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ۷ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء سے پہلے ملک کی کیا حالت تھی - اس کے بعد میں نے ان مسائل کا خاکہ کھینچا جن سے ہم دوچار تھے - سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ملک کی اقتصادی زندگی کو مضبوط بنایا جائے - پہلے اقتصادی معاملات طے کرنے میں اقتصادی اور مالی امور کا کم اور سیاسی و مقامی امور کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا تھا -

دوسرا مسئلہ خوراک کی کمی کا تھا - ہمارے پاس نہ تو زمین کی کمی تھی ، اور نہ کام کرنے والوں کی - اس لئے ہم بہ آسانی خوراک کے معاملے میں خود کفیل بن سکتے تھے - ضرورت تھی تو بس صحیح سمت رہنمائی کی - ہم نے زرعی اصلاحات کا ایک کمیشن مقرر کر دیا تھا تاکہ زمین کی ملکیت اور کاشت کاری کے بارے میں منصفانہ طریقہ وضع کیا جا سکے - ملک کے تعلیمی نظام پر بھی توجہ دینے کی ضرورت تھی - ہمیں تعلیم کا ایک ایسا طریقہ رائج کرنا تھا ، جو لوگوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرے اور ساتھ ساتھ قابل اور کارآمد شہری بھی پیدا کرے - اس کے لئے ہمیں تعلیم کو زیادہ عملی صورت دینے اور ایسا طریق انتخاب سوچنے کی ضرورت تھی جس کے ذریعے طلبا خود کو اعلیٰ تعلیم پانے کا اہل ثابت کر سکیں -

وہ لوگ جو گھر سے بے گھر ہوئے ، اور جنہیں تقسیم کے وقت ہجرت کرنی پڑی ، ان کو آباد کرنے کا مسئلہ مدت سے جوں کا توں

پڑا تھا۔ ان مہاجرین کی تکلیف کو دیکھتے ہوئے نیز ملکی اقتصادیات کو نظر میں رکھتے ہوئے اس مسئلے کو جلد سے جلد حل کرنا لازمی تھا۔

میرا خیال تھا کہ سول سروسوں کا عملہ ضرورت سے زیادہ ھے اور ملازمین کو تنخواھیں کم دی جاتی ھیں ۔ وفاق اور صوبائی سروسوں کی از سر نو تنظیم کی ضرورت تھی ۔ اس کے لئے ایک ''پے اینڈ سروسز کمیشن،، اور ایک ''ری آرگنائیزیشن کمیشن،، مقرر کرنا ضروری معلوم ھوتا تھا ۔ جو ان معاملوں کی چھان بین کرے۔ جو سرکاری ملازم نااھل ھوں انھیں برطرف کر دیا جائے ۔ ممکن ھے یہ اقدام سخت تصور کیا جائے لیکن ملکی انتظام کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لئے ھمیں اس سے گریز کرنا لازم نہیں تھا۔

اس کے بعد میں نے کابینہ سے مارشل لا کی ماھیت بیان کی ۔ مارشل لا ظلم ڈھانے یا سزا دینے کا آلہ نہیں ۔ بلکہ یہ ایک انتظام ھے جس کے تحت حکومت کو ملک میں بنیادی اصلاحات کے لئے چند غیر معمولی اختیارات مل جاتے ھیں ۔ پاکستان کو مضبوط انتظام، محکم اقتصادیات اور ایک معقول معیار زندگی کی ضرورت ھے ۔ نئے نظام نے ان مقاصد کو حاصل کرنے کا تہیہ کر رکھا ھے ۔ عام تجارت اور کاروبار کو پھر سے استوار کرنے کی ضرورت ھے ۔ اور کاروباری حلقوں میں جو خوف و ھراس پایا جاتا ھے اس کو دور کر کے تاجرانہ اعتماد بحال کرنا ضروری ھے ۔

اس اجلاس میں مجھے بتایا گیا کہ متعدد تاجروں نے ھمارے معافی نامے کی میعاد کے اندر اندر اپنی ناجائز طور پر درآمد کی ھوئی اشیا ھمارے حوالے کر دی ھیں ۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں کچھ سزا نہ دی جائے ، اور ان کا مال محصول درآمد وصول کرنے کے بعد انھیں لوٹا دیا جائے ۔ بعض علاقوں میں مارشل لا کے حکام نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے اپنے انکم ٹیکس کے واجبات پندرہ روز کے اندر اندر ادا کر دیں ۔ مجھے بتایا گیا کہ ممکن ھے بعض لوگوں کو اس حکم کی تعمیل میں اپنی دکانیں وغیرہ بیچ دینی پڑیں ۔ میں نے خیال کیا کہ حکم واقعی سخت ھے اور ادائیگی کی میعاد تین مہینے کر دی ۔

پاکستانی باشندوں نے دوسرے ملکوں میں جو زر مبادلہ جمع کر رکھا تھا ، اس کو وطن میں لانے کے سوال پر بھی غور کیا گیا - میں ایک ایسا قاعدہ بنانا چاہتا تھا جس سے اس سرمائے کو قبضے میں لایا جا سکے - مختلف وزارتوں اور صوبائی حکومتوں میں کمیٹیاں بنائی تھیں جو نااھل اور رشوت خور افسروں کے معاملوں کی چھان بین کریں - میں ایسا انتظام بھی چاہتا تھا کہ اچھے اور قابل سرکاری ملازموں کو انعامات دیے جا سکیں - میں نے کابینہ کے اراکین کو مشورہ دیا کہ آپ سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے عوام سے لمبے چوڑے وعدے نہ کریں - لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ معجزوں کی توقع نہ رکھیں - معجزے اسی وقت رونما ہو سکتے ہیں کہ ملک کا بچہ بچہ کمر ہمت باندھ کر دن رات وطن کی خدمت میں لگ جائے -

مارشل لا کے تحت جو گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں ، ان کو حد سے زیادہ شہرت دی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ملک میں خوف و هراس پھیل رہا تھا - میں نے کہا ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ملک کے حالات معمول پر آ جائیں اور کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ معمولی خطا پر بھی سختی سے باز پرس کی جائے گی - ہمیں ایسا طریقہ سوچنا چاہئے جس سے ان تمام لوگوں کے معاملوں پر ، جنھیں مارشل لا کے تحت گرفتار کیا گیا نظر ثانی کی جا سکے -

کابینہ کے ان اجلاسوں میں جو بحث مباحثے ہوتے رہتے تھے میں ان کے متعلق کچھ باتیں بطور یادداشت لکھ لیا کرتا تھا - ذیل میں ان کے اقتباسات سے آپ کو ہماری مصروفیات کا اندازہ ہو سکے گا -

یکم نومبر

میں نے مالی معاملات پر اور زیادہ قابو رکھنے کی ضرورت پر زور دیا - صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی سرمایہ لگانے کی پالسی پر بحث ہوئی - فیصلہ کیا گیا کہ جب تک کارپوریشن گورنمنٹ سے پہلے سے منظوری نہ لے لے سرمایہ لگانے کے بارے میں کوئی معاهدہ نہ کرے - میں نے سنہ ۱۹۵۴ء کی دستاویز میں جو خیالات قلمبند

کئے تھے ان کو نظر میں رکھ کر خود مختار اداروں کے آئندہ سانچے پر غور کیا - سرکاری محکموں کا عام طریق کار سخت پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے - لال فیتے کی گرفت بہت زیادہ ہے - زراعتی اور صنعتی ترقی کی ضرورتوں کا تقاضا ہے کہ ایسے خاص ادارے قائم کئے جائیں جنھیں اپنے طریق کار خود وضع کرنے کا اختیار اور آزادی ہو - ان خود مختار اداروں کو خاص خاص کام سونپے جائیں - اور انھیں تکمیل تک پہنچانے کے لئے وسائل مہیا کئے جائیں نیز ان کے کام میں کم سے کم دخل دیا جائے - ترقی کی رفتار کو قائم رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے - ملک میں آئین کے جاری ہونے سے پہلے ان اداروں کا کام میں مصروف ہو جانا ضروری ہے - یہ اس بات کی ضمانت ہوگی کہ ترقی کے کام بغیر سیاسی رکاوٹوں کے جاری رہیں گے -

۶-نومبر

میں نے کابینہ میں ذکر کیا کہ ہمیں قائد اعظم کے مقبرے کی تعمیر کا کام شروع کر دینا چاہئے - میں نے مس فاطمہ جناح سے درخواست کی کہ آپ اس کمیٹی کی سرپرستی فرمائیں جو اس مقصد کے لئے قائم کی گئی ہے -

پچھلی حکومتیں لوگوں کو روزانہ اور ہفتہ وار اخبار نکالنے کی اجازت دینے میں کچھ تامل نہ کرتی تھیں - بعض دفعہ ایسے لوگوں کو اجازت دے دی جاتی تھی جن کے پاس اخبار چلانے کے لئے کافی سرمایہ نہ ہوتا تھا - نتیجہ یہ کہ وہ روزی کمانے کے لئے بلیک میل کرنے یعنی دھونس جما کر روپیہ اینٹھنے پر مائل ہوتے تھے - ہمارے اخبارات کو صحت مند اور ذمہ دار ہونا چاہئے -

ضرورت ہے کہ ہمارے سول اور ملٹری افسر ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کریں - نوجوان سول افسروں کو اپنی درس گاھوں سے تعلیم ختم کر چکنے کے بعد دو دو تین تین مہینے کے لئے فوج سے وابستہ کر دینا مفید ثابت ہو سکتا ہے - اس سے انھیں فوج کے طور طریقوں سے آگاہ ہونے کا موقع بھی مل سکے گا ، اور وہ فوجی نظم و ضبط سے بھی فائدہ اٹھا سکیں گے -

میں نے کابینہ میں کہا کہ ہمیں جموں اور کشمیر کے مسئلے کے بارے میں اپنی آئندہ پالسی کی وضاحت کر دینی چاہئے - ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس جھگڑے کے منصفانہ اور آبرومندانہ حل کے لئے کیا قدم اٹھایا جائے - یہ مسئلہ ایک مرتبہ وہاں کے عوام کی خواہش کے مطابق حل ہوگیا تو اس خطہ دنیا میں امن قائم رہ سکے گا -

لوگوں کو زرعی اصلاحات کے لئے تیار کرنا بھی ضروری ہوگا - ان اصلاحات سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہئے، کیونکہ یہ سائنٹیفک اور حقیقت پسندانہ ہوں گی - اور جن لوگوں پر ان کا اثر پڑے گا حکومت ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے گی -

میں نے اجلاس میں ذکر کیا کہ میں ۲۵-دسمبر کو قائد اعظم کی سال گرہ کے موقع پر ایک تقریر نشر کرنے والا ہوں - اس موقع پر میں لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاؤں گا - ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں - یہ بات ہر ایک پر واضح ہو جانی چاہئے کہ یہ حکومت کسی ذاتی فائدے کی غرض سے بر سر اقتدار نہیں آئی - اس کی کامیابیوں کا انحصار محنت مشقت پر ہوگا جو ہم سب اپنی اپنی جگہ اور ساتھ مل کر کریں گے - انفرادی طور پر ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور پاک بازی اختیار کریں - اجتماعی طور پر ہمیں یہ اصول سامنے رکھنا چاہئے کہ ہم سے کوئی بات ایسی سرزد نہ ہو جس سے ملک کو نقصان پہنچتا ہو - ہمیں اپنے ملک کی حفاظت صرف فوج اور اسلحہ کے ذریعے ہی نہیں کرنی ہے، بلکہ ان خیالات کو مٹانا بھی ہمارا فرض ہے جو پاکستان دشمنی پر مبنی ہوں -

مستقبل کے آئین کے بارے میں بھی مجھے کچھ باتیں عوام کے ذہن نشین کرنی ہیں - نئی حکومت اس بات کی خواہش مند ہے کہ ملک میں ایک پوری طرح نمائندہ حکومت قائم ہو جائے - اس کی بنیاد ایک ایسے جمہوری نظام پر ہو جس کو لوگ سمجھ سکیں اور چلا سکیں - ہمیں سیاسی نااستواری سے بھی بچنا چاہئے - جیسے

ھی یہ بڑے بڑے مسئلے حل ہو گئے ، اور اصلاحات جاری کر دی گئیں ، ملک کے لائق فائق لوگوں سے جو آئین سازی میں مہارت رکھتے ھیں ، درخواست کی جائے گی کہ وہ ملک کے لئے آئین بنائیں ۔ اس آئین میں عوام کی خواھشوں اور تمناؤں نیز ملک کے مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

ھمیں فوراً ایک تحریر تیار کرنی چاھئے جس میں ھماری خارجہ پالسی اور ھمارے مقاصد بیان کئے جائیں ۔ دوسرے ملکوں سے ھمارے تعلقات کا انحصار ھمارے دفاعی تقاضوں نیز ترقی کے سلسلے میں ھماری ضروریات پر ھوگا ۔ یہ لازماً ھمارے ملک کے جغرافیائی محل وقوع اور سیاسی تقاضوں پر بھی مبنی ھوں گے ۔ ھم اپنے دوستوں کا ھاتھ مضبوطی سے تھامے رھیں گے ۔ لیکن ساتھ ھی نئے دوست بھی تلاش کریں گے، خاص کر اپنے ھمسایوں میں ۔

۲۴- دسمبر

معاھدۂ بغداد کی آئندہ صورت کیا ھوگی ، میں نے اس کے بارے میں بے لاگ سوچ بچار کی درخواست کی ۔

۳۱- دسمبر

میں نے کابینہ میں ذکر کیا کہ پاکستان کی تمام زبانوں کے لئے رومن رسم خط اختیار کرنا اس لحاظ سے مفید ھوگا کہ اس سے ایک تو خواندگی بڑھے گی ، دوسرے ممکن ھے اس طرح سارے ملک کے لئے ایک مشترکہ زبان پیدا ھو جائے ۔ میں چاھتا تھا کہ میرے رفقاء اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں ۔

ملک میں متعدد وقف ھیں ۔ حکومت ان کا انتظام اپنے ھاتھ میں لے کر ان کی آمدنی کو عوام کی بھلائی کے کاموں پر خرچ کر سکتی ھے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی رقم کو بھی حکومت کے زیر انتظام ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ھے ۔

وفاقی دارالحکومت کے لئے موزوں جگہ تلاش کرنے کے لئے جو کمیشن مقرر کیا گیا ھے ، میں چاھتا ھوں کہ وہ جلد اپنا کام ختم کر لے ۔ دارالحکومت کو کراچی سے ھٹا لینا ضروری ھے ، کیونکہ اس جگہ کی ھوا مرطوب اور مضر صحت ھے ۔ علاوہ ازیں یہاں کاروبار

کا بھی بڑا زور ہے - جس سے سرکاری محکموں کو بد دیانتی کی ترغیب ہوتی ہے -

۱۰- جنوری سنہ ۱۹۵۹ء

بعض علاقوں سے اس امر کی برابر شکایتیں آ رہی ہیں کہ ان کی طرف پوری توجہ نہیں کی جا رہی - اس کا باعث یہ ہے کہ صوبائی انتظام کو مقامی انتظام سے علیحدہ نہیں کیا گیا - ہمیں شہری اداروں کو اور زیادہ انتظامی اختیارات دینے ہوں گے -

انتظامی اور سیاسی اصلاحات ہمارے آئندہ آئین میں مضمر اور اس کا جزو ہونی چاہئیں - ہمیں اس معاملے پر غور شروع کر دینا چاہئے - ہمیں پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ملک کی حکومت پارلیمانی نظام کے تحت بہتر رہے گی یا صدارتی نظام کے تحت - ملک کی مجلس قانون ساز کس قسم کی ہونی چاہئے اور کتنی بڑی ہونی چاہئے- ہرچند بالغ رائے دہی کا عالمی اصول منظور کیا جا چکا ہے ، تاہم ہمیں ایک ایسا نظام وضع کرنا ہوگا ، جس کے تحت عوام اپنے ووٹ دینے کے حق کو سمجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کر سکیں -

اور یوں دن پر دن گزرتے گئے - سول محکموں کو دوبارہ استوار کیا گیا - فوج واپس بارکوں میں چلی گئی - ایک ایک کر کے اصلاحات جاری کر دی گئیں - اور ہم ملک کے بنیادی سیاسی مسائل سے دست و گریباں ہو گئے -

آٹھواں باب

بنیادی اقدامات سنہ ۱۹۵۸-۱۹۶۰ء

سنہ ۱۹۵۴ء کی دستاویز[۱] میں، میں نے کہا تھا: ''جب تک ہم زرعی اصلاحات کو سائنسی طریق سے عمل میں نہ لائیں، ہمیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ صرف چند آدمیوں کے قبضے میں زمین کے وسیع رقبوں کے ہونے کا اب کوئی جواز نہیں رہا۔ اور نہ بغیر معاوضے کے اراضی کے حصول کا جواز ہے۔'' چنانچہ جب اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا جاری کیا گیا، تو میں جانتا تھا کہ مجھے ابتدا میں کیا کیا کام کرنے ہوں گے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مختلف اصلاحات کو جاری کرتے وقت مجھے کیا قدم اٹھانا ہوگا۔ میں نے اسکندر مرزا سے کہ دیا تھا کہ اب جبکہ انقلاب رونما ہو گیا ہے، چند بنیادی تبدیلیاں ضرور کی جائیں گی اور کسی کو انقلاب کی راہ میں روڑے اٹکانے کی اجازت نہ ہوگی۔

۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو میں نے ایک بیان جاری کیا جس میں میں نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے لوگ اس بات سے خائف ہیں کہ اگر مارشل لا جلد ہٹا لیا گیا تو وہی پرانا نظام واپس آ جائے گا، ہر قسم کی برائیاں اور خرابیاں پھر شروع ہو جائیں گی اور سب کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔ میں ان سب لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مارشل لا کو نہ تو ضرورت سے ایک منٹ زیادہ رہنے دیا

۱۔ دیکھیں گیارھواں باب۔

جائے گا اور نہ اس مقصد کی تکمیل سے ایک منٹ پہلے اٹھایا جائے گا جس کے لئے یہ نافذ کیا گیا ہے - اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس تمام سیاسی، سماجی، اقتصادی اور انتظامی ابتری کو دور کیا جائے جو اب سے پہلے پیدا کر دی گئی تھی - اگر ملک اس خستہ حالی سے پوری طرح پنپ نہ جائے تو کم از کم پنپنے کی صورت ضرور پیدا ہو جائے - اس کے علاوہ ہمیں بعض بڑی اصلاحات بھی کرنی ہیں - ان سب باتوں کے لئے مارشل لا کے سپر کی ضرورت ہوگی۔،،

میں نے اصلاحات کی ایک فہرست بنائی اور اپنے رفیقوں سے پوچھا کہ بتاؤ تمھارے خیال میں ان سب میں سے کونسی اصلاح سب سے مشکل ہوگی - سب نے یک زبان ہو کر کہا، زرعی اصلاحات - اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ اچھا سب سے پہلے زرعی اصلاحات سہی -

۱۸-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو زرعی اصلاحات کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا - ان اصلاحات کا اثر سات آٹھ ہزار خاندانوں پر پڑتا تھا یہ خاندان ذی اثر اور طاقت ور تھے - چونکہ میں جانتا تھا کہ زمین ہمارے لوگوں کو بڑی پیاری ہے، اس لئے مجھے اس مزاحمت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی جس سے مجھے دوچار ہونا تھا۔ مجھے بھروسا تھا کہ اگر میں اس مرحلے میں کامیاب ہو گیا تو دوسری اصلاحات کو بروئے کار لانا نسبتاً آسان ہوگا -

مغربی پاکستان میں اس وقت صورت حال یہ تھی کہ پنجاب میں پچاس فی صدی سے اوپر قابل استعمال زمین ، شمال مغربی سرحد میں پچاس فی صدی سے ذرا کم اور سندھ میں اسی فی صدی سے زیادہ، چند ہزار زمینداروں کے قبضے میں تھی جو اپنی زمینوں سے دور ، شہروں میں رہتے تھے - سارے صوبے کے بارے میں جو اطلاع مل سکی اس سے ظاہر ہوا کہ مالکان زمین میں سے ۰.۱ فی صد کے قبضے میں زمین کا ۱۵ فی صد رقبہ ، فی کس پانچ سو ایکڑ سے اوپر والی املاک کی صورت میں تھا - اس کے بالمقابل ۶۵ فی صد ایسے زمیندار تھے جن کے پاس اسی قدر زمین فی کس پانچ ایکڑ سے بھی کم رقبے کی صورت میں تھی - ۱۹ کروڑ ۸۶ لاکھ کے کل جغرافیائی رقبے میں سے ، سرکاری رپورٹ کے مطابق، قابل کاشت رقبہ صرف ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ

تھا - ''غیر معلومہ،، رقبہ جس کے بارے میں کوئی رپورٹ نہ تھی ریگستان اور ''خاص رقبوں،، پر مشتمل تھا - اندازہ کیا گیا کہ ''غیر معلومہ،، رقبوں میں ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ایکڑ قابل کاشت زمین شامل ہے، جس کو ملا کر مغربی پاکستان میں قابل کاشت زمین کا کل رقبہ ۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ ہو جائے گا - پنجاب، شمال مغربی سرحد اور سندھ کے پرانے صوبوں کی حکومتوں نے جس قسم کے قانون نافذ کئے تھے ان کے باعث یہاں زراعتی ترقی نہ ہونے کے برابر تھی -

زمین کی ملکیت اور اس کے استعمال سے تعلق رکھنے والے قوانین اور روایات کا پیداوار پر براہ راست اثر پڑتا ہے، اور انہی سے کھیتی باڑی کرنے والوں کا سماجی مزاج متعین ہوتا ہے - چنانچہ ملک کی اقتصادی ترقی اور سماجی نشو و نما سے زرعی اصلاحات کا براہ راست تعلق ہے - پیداوار کی کمی اور کاشت کاروں کی عام بے حسی کا باعث زیادہ تر ہمارے زمینداری ڈھانچے کی خامیاں اور ان شرائط و ضوابط کا نقص ہے جن کے تحت زمین کاشت کی جاتی ہے -

جب سے ہمارا ملک آزاد ہوا ، سیاست داں اس صورت حال میں تھوڑی بہت اصلاح کی کوشش کرتے رہے - مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا - انقلاب سے پہلے مغربی پاکستان میں جو نام نہاد اصلاحات جاری کی گئی تھیں ان کا مقصد سوائے ان رعایتوں کے برقرار رکھنے کے، جو زمینداروں کو حاصل تھیں، اور کچھ نہ تھا - مزارعین کے حقوق کے تحفظ کی طرف کوئی دھیان نہ دیا گیا تھا - جب کبھی زمین کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کی جاتی، زمیندار سیاسی جماعتوں پر اپنا اثر ڈال کر انھیں رد کرا دیتے - یہاں تک کہ ان بہت ہی نرم زرعی اصلاحات کو بھی، جو سنہ ۱۹۵۲ء میں پنجاب میں جاری کی گئی تھیں، ری پبلی کن پارٹی کے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون نے سنہ ۱۹۵۳ء میں منسوخ کر دیا - اس طرح طاقت کے چند ہاتھوں میں اکٹھا ہو جانے سے جو سماجی اور اقتصادی نتائج پیدا ہوتے ہیں اس سے قطع نظر، سیاسی اداروں کی آزادی میں بھی قدرتی طور پر اس سے بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے - جمہوریت اس صورت میں کیا پنپ سکتی تھی کہ بڑے بڑے زمیندار اپنے اپنے

محفوظ انتخابی حلقوں کے مالک بنے رہیں جن پر رائے عامہ کا کچھ اثر نہ ہو۔

سیاست داں جو لمبے چوڑے وعدے کرتے اور سبز باغ دکھاتے، اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ مزارعین کے دل میں جھوٹی امیدیں پیدا ہوں اور زمینداروں میں بے بنیاد خوف و ہراس پھیلے ۔ اس سے زمیندار اور مزارع کے باہمی تعلقات میں اور زیادہ تلخی آ گئی اور آئندہ اپنے اپنے حقوق اور پابندیوں کے بارے میں طرفین سخت وسوسے میں مبتلا ہو گئے ۔ ان سب باتوں کی وجہ سے زراعتی پیداوار میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ۔

میں نے مغربی پاکستان کے گورنر اختر حسینؒ کو جو زرعی اصلاحات کے کمیشن کے چیئرمین بننے والے تھے بتایا، کہ میں زرعی اصلاحات کو ایک تعزیری اقدام کے طور پر نافذ نہیں کرنا چاہتا ۔ میرا مقصد سماجی اونچ نیچ کو دور کرنا ہے ۔ میں حقوق اراضی کے بارے میں ایک معقول پالسی چاہتا ہوں، جس سے ایک طرف تو ہر ایک کے لئے یکساں مواقع کی فراہمی اور سماجی مساوات میں اضافہ ہو، اور دوسری طرف زرعی پیداوار کو بڑھانے کی اقتصادی ضرورت پوری ہو اور زمین کی آمدنی کی مساویانہ تقسیم سے معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے ۔

میں نے جو تدابیر سوچی تھیں، زرعی اصلاحات ان کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھیں ۔ جب تک ہمارے دیہات میں آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت غلاموں کی سی زندگی گزار رہی ہو، ہم جمہوری نظام قائم نہیں کر سکتے تھے ۔ ایسی صورت میں ووٹ محض بے معنی تھا جبکہ تمام انتخابی حلقوں پر چند زمیندار چھائے ہوئے تھے اور ان پر انہی کا پورا قبضہ تھا ۔ تجربے سے ثابت ہے کہ براہ راست انتخاب میں بھی رائے دہی کا عام رجحان ہر علاقے میں چار پانچ ہی آدمیوں کی مرضی سے متعین ہوتا ہے ۔ جاگیرداروں کی طاقت کو اس طرح کم کیا جا سکتا تھا کہ بڑی بڑی جاگیروں کو توڑ کر ہر شخص کے لئے ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے ۔ لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ زمین کی نئی تقسیم کے باعث جو طبقہ

ابھرے وہ زمین کی ترقی سے اتنی دلچسپی رکھتا ہو کہ اس میں جان اور مال کھپائے اور اسے اپنا مستقل پیشہ سمجھے - ایک مضبوط متوسط طبقے کے قیام میں مدد دینے کا بھی یہی طریقہ تھا -

میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایک کنبے کے لئے جو زمین پر گزران کرتا ہو، عزت آبرو کے ساتھ محنت کی زندگی بسر کرنے کے لئے کتنی آمدنی درکار ہوگی - میں ملکیت کے انتہائی رقبے کے لئے ایک ایسی حد مقرر کرنا چاہتا تھا، جہاں ایک کنبے کو زمین سے اتنی آمدنی ہو سکے کہ وہ اس سے ہمہ وقتی پیشے کے طور پر لگاؤ رکھے اور زمین کے لئے جدید آلات مہیا کر کے اسے ترقی بھی دے سکے - مجھے ذاتی طور پر یہ بھی معلوم تھا کہ بہت سے خاندانوں میں بیواؤں اور بن بیاہی عورتوں کو اس امر پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حصے کی زمینیں خاندان کے مردوں کو دے دیں چنانچہ اگر خاندان کے کسی مرد رکن کی مملوکہ زمین کا رقبہ حد سے زیادہ گھٹا دیا گیا تو وہ ان بے چاری عورتوں کو نکال باہر کرے گا - اس لئے قانون میں کوئی ایسی شق رکھنا ضروری تھا جس کی رو سے مالکان زمین اپنی زمین کا کچھ حصہ ایک مقررہ حد تک اپنے متوسلین یا اپنی بیویوں کے نام لکھ سکیں - ہم نے اس مقصد کے لئے اٹھارہ ہزار یونٹ کی حد مقرر کی - یونٹ کی بنیاد زمین کی پیداوار پر رکھی گئی، اس لئے ایک علاقے میں یونٹ کا رقبہ دوسرے علاقے کے یونٹ کے رقبے سے مختلف تھا - یہ تدبیر بھی زمین کی وسیع تقسیم میں معاون ہوئی - یہ تھے وہ امور جن کو نظر میں رکھ کر مملوکہ زمینوں کی حدیں مقرر کی گئیں - ہم نے اس امر کو بھی مد نظر رکھا کہ یونٹ کا رقبہ اتنا بڑا ہو کہ زمین پر مشینوں سے کھیتی باڑی بھی ہو سکے اور عمدہ کھادیں اور بیج استعمال کئے جا سکیں -

سماجی انصاف اور اقتصادی ترقی کے تقاضے ہمیشہ ایک نہیں ہوتے - لہذا یہ کام جو میں نے کمیشن کے سپرد کیا کوئی آسان کام نہ تھا - میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کمیشن اپنی سفارشات جلد سے جلد پیش کر دے - کمیشن نے اس کام کی پیچیدگیوں کے باوجود اپنی جامع رپورٹ تین مہینے کے اندر اندر پیش کر دی -

کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہماری زمین ، دیہاتی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے بہت کم اقتصادی مواقع بہم پہنچاتی ہے - بہت سے علاقوں میں زمین کی تقسیم ملکیت بھی ناہموار اور غیر منصفانہ ہے- چونکہ کھیتی باڑی کے علاوہ روزگار کے اور ذرائع کم ہیں ، اس لئے زمین پر آبادی کا بوجھ بہت بڑھتا جا رہا ہے - آبادی کی کثرت اور وراثت کے قانون کی بنا پر زمین بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے جو اقتصادی طور پر غیر مفید ہے - ہرچند کہ کام کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن بڑی بڑی زمینوں کی ترقی کی رفتار اکثر سست رہتی ہے ، اور بہت سی قابل کاشت زمین سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاتا - مزارعین کو بے دخلی کا دھڑکا رہتا ہے - ان کو اپنی محنت کا پورا صلہ نہیں ملتا - ادھر زمینداروں میں پہل کرنے کا شوق اور ولولہ کم ہے - روپیہ لگا کر پیداوار بڑھانے کی تدبیر نہیں کی جاتی -

کمیشن نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے زرعی اصلاحات کے کم سے کم پروگرام کے طور پر چند تجویزیں پیش کیں - حکومت نے ان تجویزوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ۲۴- جنوری سنه ۱۹۵۹ء کو اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا -

اس فیصلے کی بڑی بڑی شقوں کا خلاصہ یہ ہے :-

کوئی شخص پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ کا مالک نه ہو سکے گا - صرف موجودہ مالکان اراضی کے معاملے میں کچھ معمولی استثنا رکھے گئے ہیں - اس طرح جو زمین حاصل ہوگی اسے مزارعوں اور دوسرے مستحق لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا - زمین کے مالکوں سے جو زمین لی جائے گی اس کا انھیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا - یہ معاوضہ یونٹوں کی تعداد کے لحاظ سے مقررہ شرح پر ہوگا اور چار فی صدی منافع والے تمسکات کی صورت میں دیا جائے گا - یہ بانڈ ایک شخص سے دوسرے شخص کو وراثت میں مل سکیں گے ، اور ایک سے دوسرے کے نام منتقل ہو سکیں گے ، اور انھیں پچیس سال کے بعد بھنایا جا سکے گا - جو مزارع پہلے سے زمینوں پر کام کر رہے ہوں گے ، انھیں موقع دیا جائے گا کہ وہ

پچیس سال کے اندر قسطوں کے ذریعے ان زمینوں کو خرید لیں ۔ ایسے مزارعوں کا خاص خیال رکھا جائے گا جو گنجان رقبوں میں کام کر رہے ہوں گے ۔ تمام مزارعوں کو زمین پر قبضہ رکھنے کی ضمانت دی جائے گی ۔ اگر کوئی بے دخلی قانونی طور پر ہوگی تو اس کا انھیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا ۔ اجارے کی شرح بڑھانے پر پابندی لگا دی جائے گی ۔ مزارعوں سے خلاف قانون کوئی فیس وصول کرنا، بیگار یا کسی اور طرح کی خدمت لینا ممنوع ہوگا ۔ ایک خاص اقتصادی حد سے کم زمین کی تقسیم نہ ہو سکے گی ۔ اور اس بات کا انتظام کیا جائے گا کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی زمینوں کو لازمی طور پر یکجا کر دیا جائے ۔

ان اقدامات میں سے سب سے اہم اقدام یہ تھا کہ انفرادی ملکیت کی حد بہت نیچی رکھی گئی تاکہ زمین کی وہ دولت جس پر مغربی پاکستان کے کوئی چھ ہزار زمینداروں نے قبضہ جما رکھا تھا، بٹ کر بہت سے ہاتھوں میں چلی جائے ۔ اس طرح ایک تو غیر مساوی تقسیم کسی حد تک کم ہو گئی دوسرے ان لوگوں کو جو اپنے ہاتھ سے کاشت کرتے ہیں، زمین کو زیادہ سے زیادہ کام میں لانے اور اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا موقع ملا ۔

ان اصلاحات نے سماجی اور اقتصادی ناانصافی کو دور کرنے اور ترقی پسند زراعتی معیشت قائم کرنے میں بڑی مدد ملی ۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہر ایک کے ساتھ انصاف برتنا ہمارا جزو ایمان ہے، میرے نزدیک ان اصلاحات کا جاری کرنا اس نظام حیات اور ان اقدار کی بقا کے لئے بھی اشد ضروری تھا، جو ہمیں دل سے عزیز ہیں اور جن کی خاطر پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آئی ۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے میرا اقدام محض جذباتی نہ تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ اصلاحات کے بعد بھی زراعت کا پیشہ، ایک معزز پیشہ سمجھا جائے اور آمدنی کے لحاظ سے بھی اس میں کشش ہو تاکہ موزوں اہلیت کے لوگ اسے اپنائیں ۔ یہ ایسا معیار زندگی مہیا کر سکے جو دوسرے پیشوں سے لگا کھا سکے ۔ میں موجودہ نظام کو مٹانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کی اصلاح چاہتا تھا تاکہ یہ

ترقی کے مواقع مہیا کر سکے اور ایسے رہنما پیدا کرے جو دیہاتی زندگی کو سدھار سکیں ۔ مالکان زمین کو اس امر کی ضمانت دی گئی کہ ان کے ساتھ مناسب اور منصفانہ سلوک کیا جائے گا ۔ انہیں اپنی زمینوں کا جو معاوضہ ملا، اس سے وہ اس قابل ہو گئے کہ بغیر کوئی ناواجب تکلیف اٹھائے، خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھال سکیں ۔

جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے انہیں اپنے حقوق کی پہلی تاریخی دستاویز حاصل ہو گئی ۔ ہم نے ان کے لئے وہ سب کچھ کر دیا، جو موجودہ حالات میں ممکن تھا ۔ مغربی پاکستان میں پہلی مرتبہ ان کی حیثیت زرعی نظام کے اہم ترین عنصر کے طور پر تسلیم کی گئی ۔ آئندہ کے لئے انہیں کافی تحفظ حاصل ہو گیا اور اچھے کاشت کار بننے اور زیادہ غلہ اگانے کی ترغیب اور مواقع بھی ۔

میں نے سندھ میں پرندوں کا بہت شکار کھیلا ہے ۔ ایک زمانہ تھا کہ وہاں پرندوں کی بہتات تھی، کیونکہ ان کے چھپنے کے لئے بہت سی جھاڑیاں ہوا کرتی تھیں، یہاں تک کہ کھیتوں کے بیچوں بیچ جھاڑیاں پائی جاتی تھیں ۔ کسان ان جھاڑیوں کو دیکھا کرتے مگر ان کو اکھاڑنے کا کبھی ان کو خیال تک نہ آتا ۔ اب چونکہ کسان کا بھی زمین میں حق ہے، اس لئے کسی کھیت میں ایک جھاڑی تک نظر نہیں آتی ۔ اب ایک ایک انچ زمین پر کھیتی باڑی ہو رہی ہے ۔

زمین سے غائب رہنے والے زمینداروں کا طبقہ اب ختم ہو گیا جو پچھلے نظام کے تحت زبردست سیاسی اثر و رسوخ رکھتا تھا اور یہ مغربی پاکستان میں ایک نئے عہد کا آغاز ہے ۔ ایک طاقتور نیا متوسط طبقہ یقینی طور پر ابھرے گا، جو آئندہ انتخابات اور سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں پر اپنا اثر ڈالے گا ۔ بڑی بڑی زمینوں کا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جانا، اس نئے متوسط طبقے کو اپنی زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو یکجا کرنے پر مائل کرے گا، جس سے کھیتی باڑی بہتر ہوگی اور غلہ زیادہ پیدا ہوگا ۔

لیکن ان اصلاحات کا سب سے زیادہ انقلابی اثر ملک کی سیاسی اور سماجی رہنمائی پر پڑے گا ۔ ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت

کھیتی باڑی کرنے والوں پر مبنی ہے، اور پچھلے ظالمانہ نظام سے چھٹکارا پانے کے بعد اب اسی کے ہاتھ میں سیاست کی باگ ڈور ہوگی۔ ماضی میں شہری آبادی اپنی تعداد، اپنے تجربے اور صلاحیتوں کے تناسب سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر باقی ملک پر چھائی رہتی تھی۔ ان اصلاحات سے انجام کار شہری اور دیہاتی آبادی میں ایک مفید اور صحت مند توازن پیدا ہو جائے گا۔

معلومہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیس لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین میں سے، جس سے زمیندار دست بردار ہوئے، تقریباً بیس لاکھ ایکڑ زمین چھ ہزار سے کچھ زیادہ زمینداروں کے قبضے میں تھی، جو ان کے پاس ملکیت کی مقررہ حد سے زائد تھی۔ مزید پانچ لاکھ ایکڑ زمین جاگیروں کو ختم کرنے سے حاصل ہوئی۔ کوئی نوے لاکھ ایکڑ زمین اشتمال اراضی کے منصوبے کے تحت یکجا کی گئی اور ابھی یہ کارروائی جاری ہے۔

مشرقی پاکستان میں سیاست دانوں نے زرعی اصلاحات کو اس بنیاد پر جاری کیا تھا کہ ہر شخص کو زمین کا ایک ایک ٹکڑا دے دیا جائے۔ انھوں نے تمام دیہات کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور اصلاحات کے نام سے چند تعزیری اور انتہائی شدید اقدامات کئے، جنھوں نے متوسط طبقے کو مٹا کے رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہاں زمین ، کسی شخص کو بھی حقیقی دل چسپی نہیں ہے۔

یہ اصلاحات مسلم لیگ کی وزارت نے مشرق پاکستان میں جاری کی تھیں۔ اس نے مالکان اراضی کو کچھ معاوضہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب عوامی لیگ بر سر اقتدار آئی تو اس نے ایک قانون منظور کر کے اسی دن سے تمام زمینوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ مشرق پاکستان میں انگریزوں کی عمل داری میں دوامی بندوبست کے باعث اراضی کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا گیا تھا، اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس کی کتنی زمین ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی معاوضہ نہیں دیا گیا۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں مشرق پاکستان میں ایک ''مالیہ اراضی کمیشن'' مقرر کیا گیا جس کی سفارش پر مشرق بنگال کے حصول

اراضی و لگان داری کے قانون مجریہ سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک ترمیم کر دی گئی۔ اس کے ذریعے میں نے ''خاص،، خود کاشت زمین کی حد تینتیس ایکڑ سے بڑھا کر کوئی ایک سو بیس ایکڑ کر دی۔ مشرقی پاکستان میں اگر کوئی شخص محنت کرے، تو وہ ایک سو بیس ایکڑ زمین سے مناسب پیداوار حاصل کر سکتا ہے۔ زمین زرخیز ہے اور محنت وصول کرا دیتی ہے۔ اس ترمیم کے تحت مشرقی پاکستان میں ''گزارے کے لائق،، اور ''اقتصادی،، زمینوں کے رقبے بھی علی الترتیب تین ایکڑ اور آٹھ ایکڑ مقرر کر دئے گئے۔

اس دوران میں، میں مشرقی پاکستان کی حکومت پر برابر زور ڈالتا رہا کہ وہ جلد سے جلد اراضی کے ریکارڈ تیار کرے اور مالکان اراضی کو معاوضہ دینا شروع کر دے جن سے زمینیں حاصل کی گئی تھیں، تاکہ یہ لوگ بھی نئے سرے سے زندگی شروع کر سکیں اور سماج کے کارآمد ارکان بن سکیں۔

بعض لوگوں نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ کیا مشینی کھیتی باڑی، کیمیائی کھاد اور عمدہ بیج کا استعمال امداد باہمی سے کاشت کے ذریعے ممکن نہ ہوتا۔ ہم نے تجربے سے یہ بات معلوم کی ہے کہ کوآپریٹو فارمنگ ہمارے سماجی نظام میں کام نہیں دے سکتی۔ یہ صرف کمیونسٹ نظام میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہندوستان والے اپنے ہاں کوآپریٹو فارمنگ کے تجربے کر رہے ہیں۔ انھوں نے زمینوں کو تیس تیس ایکڑ کے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نتیجہ بہت مایوس کن رہا ہے۔ جس ملک کے حالات ہمارے جیسے ہوں وہاں کوآپریٹو سے اچھے نتیجے برآمد نہیں ہوتے، جب تک کہ اوپر سے دباؤ نہ ڈالا جائے۔

رہا یہ امر کہ ہر شخص زمین کا مالک ہو تو یہ کوئی عاقلانہ بات نہیں ہے۔ ہمارے پاس اتنی زمین ہے کہاں کہ ہر شخص کو دیدی جائے۔ البتہ ساجھے داری ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسے طبقے کا ہونا لازمی ہے جس کو زمین میں سرمایہ لگانے سے دلچسپی ہو۔ اور جو اقتصادی سوجھ بوجھ اور جوش ترقی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہو۔ اس طبقے کو مٹانا سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو

ذبح کرنا ہے - پاکستان کی آمدنی کا ساٹھ فیصد زمین سے حاصل ہوتا ہے - ہمارے زمیندار جو روایتی طور پر سست واقع ہوئے ہیں، وہ زرعی اصلاحات کے تحت پہلے سے کہیں زیادہ محنت کر رہے اور کہیں زیادہ غلہ اگا رہے ہیں - وہ زمینوں پر مشینوں سے کام لے رہے ہیں - کیمیائی کھادیں اور عمدہ بیج استعمال کر رہے ہیں - ہمارے نوجوانوں کا ایک نیا طبقہ کالج کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد کھیتی باڑی کے پیشے کو اپنا رہا ہے، اور ایک صحت مند زراعتی آبادی کے ابھرنے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں -

لوگوں کو کھیتی باڑی میں سرمایہ لگانے پر مائل کرنا آسان کام نہیں - خشک علاقوں میں تو مالیہ کی شرح مقرر ہے - لیکن سندھ کے نہری علاقوں میں مالیہ کی رقم فصل کی قسم اور قیمت کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی زیادہ محنت کرے اور زیادہ غلہ اگائے وہ گورنمنٹ کو اور زیادہ ٹیکس بھرے! اس کی اس مشکل کو حل کرنے کے لئے حکومت مغربی پاکستان ان دنوں ایک ایسے نظام پر غور کر رہی ہے جس کے تحت مالیہ کی شرح مستقل طور پر مقرر کی جا سکے - جیسے ہی یہ مرحلہ طے ہوا کاشت کار کو خود بخود زمین سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی ترغیب ہوگی -

امداد باہمی کی انجمنیں پاکستان میں صرف عام قرضوں کی سہولتیں بہم پہنچانے کی حد تک کارآمد ہو سکتی ہیں - میں چاہتا ہوں کہ ہر یونین کونسل میں امداد باہمی کے بینک کام کرنا شروع کر دیں ، اور گاؤں کے مہاجن کی جگہ لے لیں، جس کا وجود تو اب خوش قسمتی سے باقی نہیں رہا مگر جس کی جگہ ابھی پُر نہیں ہوئی ہے - دیہاتیوں کو قرضے کی سہولتیں بہم پہنچانا ایک ضروری مسئلہ ہے - اس کا واحد حل یہی ہے کہ یونین کونسلیں خود اپنے سیونگ اکاؤنٹ کھولیں اور امداد باہمی کا سلسلہ جاری کریں -

نئے آئین کا جمہوری خاکہ زرعی اصلاحات کے بغیر بناوٹی سا معلوم ہوتا ~~ایک کاشت کار جس~~ کا خاندان کئی نسلوں سے ایک

قطعہ زمین پر ہل جوتتا چلا آرہا ہے، اس سے پوچھئے کہ ان اصلاحات کی بدولت اس کی زندگی کا سارا نقشہ کیسا بدل گیا ہے - وہ اپنے باپ دادا کی طرح محنت مشقت کرتا اور پسینہ بہاتا رہا، مگر نہ تو اس کے باپ دادا اس قطعہ زمین کو اپنا کہہ سکتے تھے اور نہ وہ خود - زرعی اصلاحات نے اس کی قسمت ہی بدل ڈالی ہے - آئندہ وہ فخر سے کہہ سکے گا کہ یہ زمین میری ہے -

ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کی کایا پلٹ ہو رہی ہے - وہ حکومتیں جو اپنی وسیع دیہی املاک کے بل پر کسی نہ کسی طرح بر سر اقتدار آجایا کرتی تھیں، اب واپس نہ آسکیں گی - رہنما کو اب اس نظر سے جانچا جائے گا کہ وہ کتنے ایکڑ زمین کا نہیں، بلکہ کن انسانی خواص اور سماجی اقدار کا مالک ہے - ہمارے دیہات میں انتہائی افلاس اور انتہائی دولت مندی کی باہمی آویزش کا جو یاس انگیزی منظر عرصہ دراز سے طاری تھا، اب اس کا آخری پردہ گرچکا ہے -

میں نے اپنے کام کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کا اثر ملک کے بڑے بڑے طاقتور لوگوں کی زندگی پر بھی پڑنے والا ہے اور عوام کی زندگی پر بھی - یہ ضروری تھا کہ سب کے ذہنوں پر اس تبدیلی کی ضرورت اچھی طرح روشن ہو جائے، تاکہ جب یہ تبدیلی واقع ہو تو خواہ شروع شروع میں کسی قدر گراں گزرے، لیکن اسے ان کی حمایت حاصل ہو اور وہ اسے آئندہ بھی برقرار رکھنے کی کوشش کریں- میں سمجھتا ہوں کہ اس بات میں مجھے بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی -

جہاں اجارہ داری پر ضرب پڑے، وہاں ہر قسم کی اصلاحات ناگوار گزرا کرتی ہیں - اور میری اصلاحات زیادہ تر اجارہ داریوں ہی کے خلاف تھیں - ان کی وجہ سے مغربی پاکستان میں چھ ہزار بڑے طاقتور زمینداروں کو تقریباً بیس لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین سے ہاتھ دھونے پڑے - جہاں ایک ایک انچ زمین پر کشت و خون ہو جایا کرتے ہیں، وہاں تقریباً تیس لاکھ ایکڑ زمین بے چون و چرا حکومت کے حوالے کر دی گئی-

تقسیم کے وقت قتل و غارت گری کا جو ہنگامہ برپا ہوا تھا، اس کا حال میں بیان کر چکا ہوں ۔ اس وقت سرسری طور پر میرا اندازہ تھا کہ کوئی دس لاکھ مسلمان پاکستان میں پناہ لینے آئیں گے، اور میں اتنے ہی سے فکرمند تھا کہ حکومت اتنے بڑے مسئلے سے کیونکر نمٹ سکے گی ۔ مگر فی‌الحقیقت دس لاکھ نہیں نوے لاکھ مہاجرین پاکستان آئے ۔ آزاد ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کی مسلسل عداوت، اقتصادی اور سماجی بائیکاٹ، مسلمانوں پر سیاسی لے دے اور ملک چھوڑنے والوں کی بابت قوانین کا جابرانہ اطلاق، ان سب باتوں سے ہجرت کا ایک ایسا الم ناک سانحہ وجود میں آیا، جو دانستہ سیاسی اغراض کا پیدا کردہ تھا اور تاریخ کے عظیم سانحات میں سے ہے ۔ پاکستان میں ہر چھٹا آدمی ہندوستان سے آیا ہوا مہاجر تھا ۔ پچھلی سیاسی حکومتوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ مہاجرین کا مسئلہ بدستور رہے اور مہاجر جماعتی سیاست بازی کا ایک مہرہ بن کے رہ گیا ۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں حکومت نے فیصلہ کیا کہ بے خانماں لوگوں کو ہندوستان میں چھوڑی ہوئی جائیداد کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے ایک اسکیم چلائی جائے، مگر سنہ ۱۹۵۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۸ء تک اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا ۔ اگر کوئی قابل ذکر کارروائی ہوئی تو بس اتنی کہ مطالبات کا اندراج اور چھان بین کرنے کے لئے ایک قانون منظور کیا گیا اور ''کلیمز،، کا ایک محکمہ کھول دیا گیا ۔ فروری سنہ ۱۹۵۸ء میں پارلیمنٹ نے زرعی زمینوں کے ''کلمیز،، مستقل طور پر طے کر دینے کے لئے ایک قانون پاس کیا ۔ لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس قانون کی دفعات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی ٹھوس کارروائی نہیں کی گئی ۔

پچھلی حکومتوں سے جو بنیادی غلطی ہوئی تھی، اور جس کا شکار شروع شروع میں ہم بھی ہوئے وہ یہ تھی کہ اتنی بڑی تباہی اور اتنی کثیر آبادی کے افراتفری میں ہجرت کرنے کے باوجود فرض کر لیا گیا کہ ہر ایک مہاجر کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی چھان بین

کی جا سکے گی، اور پتہ چل سکے گا کہ پاکستان میں اس کا کتنا معاوضہ دیا جائے - یہ کوشش لاحاصل ثابت ہوئی - ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ دستاویزوں کی عدم موجودگی میں یہ پتہ چل ہی نہیں سکتا کہ مہاجرین نے ہندوستان میں کس قدر جائیداد چھوڑی اور یہاں وہ کس قدر جائیداد کے حق دار ہیں - ان جائیدادوں کے بارے میں تو یہ فیصلہ کرنا اور بھی ناممکن تھا، جو ہندوستان کے ان علاقوں میں تھیں جنہیں متروکہ جائیداد کی بابت دونوں ملکوں کے باہمی معاہدے سے خارج رکھا گیا تھا -

میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا، وہ یہ کہ مہاجرین کو یہاں نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا موقع دیا جائے۔ اور معاوضے کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کی جائیں - بھلا جب نوے لاکھ انسانوں پر اتنی بڑی بپتا پڑے، اور وہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ آنے پر مجبور ہو جائیں، تو انہیں کون معاوضہ دے سکتا ہے؟ اور پھر وہ ملک جس نے انہیں پناہ دی ہو اگر معاوضہ دینے کی کوشش بھی کرے تو خیال کیجئے کہ اس کی انتظامی مشینری پر کس قدر بار پڑے گا - مغربی پاکستان کی مشینری تو اس مسئلے کو حل کرنے کے سوچ بچار میں تقریباً رک ہی گئی - اور عرصے تک معطل رہی - اہل سیاست کو کچھ اور ہی سوجھی - انہوں نے اس مسئلے کا یہ مضحکہ خیز حل نکالا کہ اگر کوئی شخص دو گواہ مہیا کر دے کہ یہ شخص نصف ہندوستان کا مالک تھا، تو حکومت پاکستان کو اسے ماننا پڑے گا - اس کے بدلے میں اگر وہ شخص بھی تصدیق کر دے کہ اس کے گواہ باقی ہندوستان کے مالک تھے، تو حکومت کو اس کی بات بھی ماننی پڑے گی - غرض اس فارمولے نے بے ایمانی اور فریب کے دروازے چوپٹ کھول دئے -

میں بے چارے مہاجرین کو الزام نہیں دے رہا ہوں - لیکن اس فارمولے نے مہاجرین کے اخلاق کو بگاڑ دیا - اور ساتھ ہی اس معاشرے کے اخلاق کو بھی جس میں وہ گھل مل جانا چاہتے تھے - ایک موقع پر ہم کسی قدر دشواری کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں کے بارے میں کچھ ریکارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو

گئے - ہم نے نمونے کے طور پر بعض ریکارڈ کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ مہاجرین نے ہمارے پاس جو کلیم درج کرا رکھے ہیں ان میں صرف ۷ ½ فی صد سچائی ہے۔ اس پر وزارت بحالیات کو قدرتی طور پر بڑی تشویش ہوئی - یہ تو ظاہر تھا کہ مہاجرین کو نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا موقع دینا چاہئے - ان کی بحالی کا معاملہ نااہلی، بد دیانتی اور سیاسی پارٹی بازی کی وجہ سے کئی سال سے کھٹائی میں پڑا تھا - ادھر میں زرعی اصلاحات لا رہا تھا اور نوابوں اور زمینداروں کی تعداد کو کم کر رہا تھا - لیکن اگر ہم بحالی کے سلسلے میں پچھلی حکومتوں کی پالیسی پر عمل کرتے۔ تو نوابوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو جاتا - اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہونے پائے -

مارشل لا جاری ہونے کے تین ماہ کے اندر ہم نے ۴- جنوری سنہ ۱۹۵۹ء کو ایک آرڈیننس کا اعلان کر کے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا - اس کے بعد اور آرڈیننسوں کا اعلان کیا گیا - ان میں سب سے زیادہ اہم ضابطہ نمبر ۸۹ تھا، جو ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء میں جاری کیا گیا تھا - اس ضابطے کے تحت زراعتی زمین کے استحقاق کا تعین ایک تدریجی نظام کے ذریعے کیا گیا ، اور پہلے کے درج شدہ کلیموں کی بنا پر نئی زمینیں تقسیم کی گئیں - جو دعویٰ مقررہ ''پیداواری انڈیکس یونٹ،، کے مطابق ڈیڑھ ہزار یونٹ سے اوپر نہ تھا، پورے کا پورا منظور کر لیا گیا - لیکن جو چار ہزار یونٹوں سے اوپر تھا، اس کے صرف دو ہزار ایک سو پچاس یونٹ منظور کئے گئے اور چار ہزار سے اوپر جتنے یونٹ تھے ان کا دس فی صد اور اس میں شامل کر دیا گیا -

اس فارمولے کا مطلب یہ تھا کہ بڑے دعویداروں کے مطالبے میں بھاری کمی کر دی جائے - اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک من مانا قانون تھا ، مگر حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے عین ہمدردانہ اور منصفانہ بلکہ رعایت و مروت پر مبنی - میں نے ایسے بہت سے لوگوں سے پوچھ گچھ کی جن پر اس کا اثر پڑا تھا - کئی لوگوں نے اس وقت جبکہ معاملہ ختم ہو چکا تھا، اقرار کیا کہ وہ جتنی جائیداد

ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے اور اس کے بدلے میں یہاں جتنے کے حقدار تھے، اس سے ان کو تین گنا زیادہ ملا - لیکن بڑی جائیداد والوں کو واقعی نقصان پہنچا - ہم نے ان کی اشک شوئی کے لئے یہ رعایت برتی کہ انھیں چھتیس ہزار ''پیداواری انڈیکس یونٹ،، تک زمین خرید لینے کی اجازت دے دی - یہ زیادہ سے زیادہ رقبہ تھا جو زرعی اصلاحات کے تحت کسی کی ملکیت ہو سکتا تھا - قیمت برائے نام یعنی دس روپے فی یونٹ رکھی گئی، اور آسان قسطوں میں ادا کی جا سکتی تھی - غرض یہ تھا وہ طریقہ جس سے ہم نے ملک کا انتظام سنبھالنے کے بعد مہاجرین کے مسئلے کو حل کیا - یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہئے کہ اگر یہ لوگ ہندوستان ھی میں رہتے تو ان کو کیا ملتا - صرف پچیس سے پچاس ایکڑ تک -

معاوضے کے اس پروگرام کے ساتھ ساتھ ہم نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ بے گھر مہاجرین کو آباد کرنے کے لئے بھی فوری تدابیر اختیار کیں، شہروں میں نئی بستیاں بسائیں، جن میں قابل رہائش مکان اور صحت و صفائی کے ضروری انتظامات مہیا کئے گئے - میں نے دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء میں کراچی سے باہر کورنگی کالونی کا سنگ بنیاد رکھا اور پانچ مہینے کے اندر اندر پندرہ ہزار کوارٹر تیار ہو گئے - ایسی ھی نئی بستیاں کراچی کے شمال میں اور ڈھاکہ کی محمد پور کالونی میں بسائی گئیں -

مہاجرین کی آباد کاری کا قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا - ہندوستان سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر قافلہ در قافلہ پاکستان کی طرف دھکیلتا رہا۔ خصوصاً ہمارے مشرقی صوبے میں - ہندوستان میں آبادیوں کے ادل بدل کی باتیں بھی زوروں پر ہوتی رہیں - میری سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آئی کہ ہندوستان والے آخر سوچ کیا رہے ھیں اور اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کا مقصد کیا ہے - میری دلی خواہش اور دعا ہے کہ ان کے لیڈروں کو اپنی اس بربریت کا احساس ہو جائے - اور وہ اپنے ھی ہم وطنوں کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کر رہے ھیں اس سے باز آجائیں۔

حکومت برطانیہ نے ۳-جون سنہ ۱۹۴۷ء کو دو آزاد اور خود مختار مملکتیں ہندوستان اور پاکستان قائم کرنے کے منصوبے کا اعلان کر دیا - اس منصوبے پر اسی سال ۱۴-اگست سے عمل ہونا تھا - ہندوستان کو تو نئی دهلی میں بنا بنایا اور جما جمایا دارالحکومت مل گیا ، مگر پاکستان کو اپنی مرکزی حکومت کے لئے کوئی موزوں صدر مقام تلاش کرنا تھا - اتنا وقت تو تھا هی نہیں کہ کوئی جگہ مستقل طور پر چن لی جاتی ، فوری ضرورت کا تقاضا یہ تھا کہ جہاں بھی جگہ ملے حکومت کا صدر دفتر قائم کر دیا جائے - نظر دوڑائی تو کراچی سے بہتر کوئی جگہ خیال میں نہ آسکی - شاید اس زمانے میں راول پنڈی کا نام بھی لیا گیا تھا ، مگر راول پنڈی میں زیادہ سہولتیں میسر نہ تھیں ، اور بہر صورت اسے پاکستان کی بری فوج کا هیڈ کوارٹر تو بننا هی تھا -

سندھ کی صوبائی حکومت نے کراچی میں اپنے سکرٹیریٹ کی عمارت خالی کر دی - اور اس میں مرکزی سکرٹیریٹ کی داغ بیل ڈال دی گئی - مگر یہاں گنجائش اتنی کم تھی کہ گزارا ہونا مشکل تھا -چنانچہ شہر کے مختلف حصوں میں عارضی تعمیریں کھڑی کر دی گئیں جن میں مرکزی حکومت کے دفتر کام کرنے لگے- رهنے سہنے کا بندوبست اور بھی ناکافی تھا ، کیونکہ حکومت سندھ نے رهنے کے مکان خالی نہیں کئے تھے - بہت سی فوجی بارکوں کو عارضی مکانوں میں تبدیل کر دیا گیا - سرکاری ملازمین قدرتی طور پر بڑے بددل تھے کیونکہ وہ ان حالات میں اچھی طرح کام نہیں کر سکتے تھے -

کراچی مغربی پاکستان کی واحد بندرگاہ ھے اور بین الاقوامی ہوائی راستوں کے درمیان واقع ھے - اسے غیر ملکی تجارتی فرموں کا مرکز ہونے کی حیثیت تو آزادی سے پہلے هی حاصل ھو چکی تھی ، آزادی کے بعد بہت سے لوگ بمبئی، کاٹھیاواڑ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں سے اٹھ کر کراچی آ گئے ، جن کے پاس روپیہ بھی تھا اور کاروباری شعور اور تجربہ بھی - چنانچہ یہ شہر دیکھتے هی دیکھتے ملک کا سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز بن گیا - مہاجرین کی

آمد اور صنعتی ترقی کے باعث اس کی آبادی بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اور شہری سہولتوں میں ابتری آنے لگی۔ شہر کی آبادی جو سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ڈھائی لاکھ تھی سنہ ۱۹۵۱ء میں دس لاکھ سے اوپر اور سنہ ۱۹۶۱ء میں بیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ کراچی کی آب و ہوا بھی اچھی نہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی طبیعتیں مضمحل رہنے لگتی ہیں اور کام کرنے کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس وقت شہر کی عام حالت بھی تندرستی کے حق میں اچھی نہ تھی اس لئے سرکاری ملازموں کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ چند ہی سال کے اندر تمام انتظامی عملہ خستہ حال نظر آنے لگا۔

کراچی سیاسی شورش اور ہل چل کا مرکز بھی بن گیا تھا۔ سیاست بازوں نے دیکھا کہ وہ کارخانوں کے مالکوں اور تاجروں کو اپنے ساتھ ملا کر بہ آسانی مجمعے اکٹھے کر سکتے اور حکومت پر جس طرح کا چاہیں دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ ایک وقت میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک بھاری جلسہ جس میں کچھ شوریدہ سر لوگ شامل ہوں، حکومت کا تختہ اُلٹ سکتا تھا۔ تاجروں کے ساتھ ہر وقت کے میل جول سے سرکاری افسروں میں اخلاقی بگاڑ بھی پیدا ہوا اور بہت سے لوگ بری ترغیب کا شکار ہوئے۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت کے وزرا کراچی کے مقامی نظم و نسق کے معاملات میں الجھنے لگے۔

مرکزی حکومت انقلاب سے پہلے ہی کسی صحت بخش مقام کو منتقل ہو جانے کی سوچ رہی تھی اور اس سلسلے میں کراچی کے قریب ایک مقام گڈاپ کا نام لیا جاتا تھا، مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ کیونکہ اس وقت حکومت اتنی مضبوط نہ تھی کہ غرض مند لوگوں کے دباؤ کو ٹال سکتی جو نہیں چاہتے تھے کہ حکومت کا صدر دفتر کراچی سے اٹھ جائے اور مرکزی حکومت پر ان کا اختیار نہ رہے۔

میں نے جنوری سنہ ۱۹۵۹ء میں جنرل یحییٰ کے تحت ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ محل وقوع، رسل و رسائل، دفاع، آب و ہوا اور مضافات کی زرخیزی کا لحاظ رکھتے ہوئے، اس بات کو جانچے کہ کراچی مستقل صدر مقام بنائے جانے کے لئے موزوں ہے یا نہیں۔

اور اگر نہیں تو اور کونسی جگہ موزوں ہو سکتی ہے ۔ کمیشن کے ممبر پوری پوری چھان بین کے بعد یک زبان ہو کر اس نتیجے پر پہنچے کہ کراچی موزوں نہیں ہے ۔ انھوں نے ملک کے دونوں حصوں کو خوب دیکھ بھال کر یہ رائے دی کہ پاکستان کا صدر مقام راول پنڈی کے قریب پوٹھوار کی سطح مرتفع پر بنانا چاہئے ۔ میں نے اسے منظور کر لیا اور نئے دارالحکومت کا نام اسلام آباد رکھا گیا ۔

اسلام آباد، راول پنڈی سے کوئی سات میل دور مرگلا کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے ۔ پوٹھوار کے مرتفع خطے کے ساڑھے تین سو مربع میل رقبے میں پھیلا ہوا یہ مقام اترتے چڑھتے مختلف سطح کے قدرتی سبزہ زاروں کا ایک کشادہ منظر پیش کرتا ہے ۔ سمندر سے اس کی اونچائی سترہ سو سے دو ہزار فٹ تک ہے اور عقب میں پہاڑیوں کے سلسلے ہیں ۔ اس علاقے کی تاریخ بڑی شاندار ہے ۔ یہ ان اولیں بستیوں میں سے ہے جہاں انسان نے آج سے تین چار لاکھ سال پہلے بود و باش اختیار کی تھی ۔ اس کا پتہ سوھان تہذیب کی ان یادگاروں سے چلتا ہے ، جو پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اور جو سر مورٹمر ویلر کو پوٹھوار کی سطح مرتفع سے دستیاب ہوئی تھیں ۔ اس کے مدتوں بعد اس علاقے کے باشندوں نے مرگلا کی پہاڑیوں کے دوسرے رخ پر ٹیکسلا کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا ۔ یہ لوگ بدھ مت کے پیرو تھے ۔ انھوں نے اور ان کے بعد یونانیوں نے ان پہاڑیوں کے دوسری طرف کے علاقے کو اس وجہ سے پسند کیا کہ صرف وہیں پانی مستقل طور پر بہم پہنچ سکتا تھا ۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ یہاں راول بند کی تعمیر کا حکم دیا تاکہ یہاں وہی حالات پیدا ہو جائیں جو آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے ٹیکسلا میں تھے ۔ اور یوں ہم نے پھر ٹیکسلا کی طرف عود کیا ، جو عیسوی عہد سے مدتوں پہلے تہذیب و تمدن کا مشہور مرکز اور گندھارا آرٹ کا گہوارہ تھا ۔

کمیشن نے تمام بنیادی باتوں یعنی محل وقوع، آب و ہوا کی موزونی، ترقی کے امکانات، رسل و رسائل اور دفاع کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا :-

"کسی ملک کا دارالحکومت بس ایک شہر ہی نہیں ہوتا بلکہ شہروں کا سربراہ ہوتا ہے ۔ اس شہر میں نظم و نسق، سیاسیات، حرفت و تجارت، ادب و فن، مذہب اور سائنس کے سربراہ آتے ہیں ۔ یہیں سے فکر اور خیال کا دھارا پھوٹتا ہے جو قوم کی زندگی کو سیراب کرتا ہے ۔ یہ ہماری اُمیدوں کی علامت، ہماری آرزوؤں کا آئینہ ، قوم کا دل اور روح رواں ہوتا ہے ۔ اس لئے لازم ہے کہ اس کی فضا اور ماحول ایسا ہو جس سے قوم کو ہمیشہ توانائی حاصل ہوتی رہے ۔"

میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ دارالحکومت محض کام چلانے کے لئے نہیں ہوتے اور خانہ پُری کے لئے نہیں بنائے جاتے ۔ افادیت ضروری چیز ہے لیکن دارالحکومت کے اور بھی کئی اہم رخ ہوتے ہیں اور اس سے کچھ ایسی راہیں بھی نکلتی ہیں جن سے اہل قوم کو ان کی جد و جہد میں روشنی اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے ۔ لہذا ضروری ہے کہ یہ بہتر سے بہتر ماحول میں واقع ہو ۔ پاکستان کے دونوں صوبے ایک دوسرے سے جدا ہیں ۔ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ان لوگوں کو ایک نئے مشترک مرکز پر لایا جائے ۔ کرنا یہی تھا کہ انہیں ایک بالکل ہی نئی جگہ پر لا ملایا جائے ۔

چنانچہ یہ محض ایک شہر کی تعمیر نہ تھی، یہ ایک موقع تھا کہ اہل ملک کو متحد کیا جائے، اور انہیں وہ صحیح ماحول مہیا کیا جائے جس میں رہ کر وہ وطن کی بہترین خدمات انجام دے سکیں ۔ مرکزی حکومت ملکی انتظام کے تمام سوچ بچار کرنے اور پالسی بنانے والے شعبوں پر مبنی ہے ۔ یہاں ملک کے جوہر قابل کا موجود ہونا ضروری ہے تاکہ عوام کی بھلائی کے کام سوچے اور عمل میں لائے جا سکیں ۔ راول پنڈی آنے کے بعد سے افسروں اور عملے کی صحت میں میں نے نمایاں فرق دیکھا ہے ۔ وہ اب مختلف آدمی نظر آتے ہیں ، حالانکہ انہیں پہلے سے کہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے ۔

نئے دارالحکومت کی ترقی و تعمیر و افزائش کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے ۔ نئے سکرٹیریٹ کی عمارتیں قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں ۔ رہائشی علاقوں کی تعمیر کا کام بھی جاری ہے اور یہ

شہر اب ملک کے اتحاد کی علامت اور عوام کی امیدوں اور آرزوؤں کا آئینہ بن گیا ہے۔

(۴)

مارشل لا جاری ہونے کے دو دن بعد میں نے اپنی پہلی اخباری کانفرنس میں تین کاموں کا ذکر کیا تھا جن کو جلد سے جلد عمل میں لانا ضروری تھا۔ یعنی زرعی اصلاحات، مہاجرین کی بحالی اور تعلیمی اصلاحات۔

ہمیں ایک ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت تھی جو ہمیں مختلف طرح کی قیادت کے لئے لائق لوگ مہیا کر سکے، اور اس کے اخراجات بھی ہماری بساط سے باہر نہ ہوں۔ میں نے ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء کو قومی تعلیم کے سلسلے میں ایک کمیشن مقرر کیا اور اسے فوراً کام شروع کرنے کی تاکید کر دی۔ کمیشن کے اراکین تعلیمی نظام اور تعلیمی نظریے کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتے تھے، جس میں برسوں لگ جاتے، مگر میں نے ان سے کہا کہ مجھے جلد سے جلد رپورٹ چاہئے۔ انھوں نے بڑی محنت کی اور کوئی آٹھ مہینے کے اندر ایک جامع رپورٹ تیار کر دی۔

ہماری سب سے اہم ضرورت ایسے اعلیٰ تربیت یافتہ اور نظم و ضبط میں پختہ مردوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کرنا تھا، جو رہنمائی اور ہدایت کا فرض ادا کر سکیں۔ میرے خیال میں ہمارے قومی تقاضوں میں سب سے اہم تقاضا یہی تھا۔ زمین، کھیتی باڑی، قانون اور انتظام کے بارے میں جس قدر اصلاحات بھی نافذ کی جا رہی ہیں اور سیاسی، آئینی، سماجی اور اقتصادی استحکام اور فلاح و بہبود کے لئے جو کوششیں بھی ہو رہی ہیں ان سب کا مقصد ایک ہی ہے، یعنی ایسے حالات پیدا کرنا جو صحیح قسم کے مرد و زن کی نشو و نما کے لئے ضروری ہوں۔

ہماری تمام کوششوں کا مقصود ہمارے نونہال ہیں جو آج اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں مگر کل جن کا فرض ہوگا کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں ملک کی قیادت سنبھالیں۔ جب میں قیادت کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہونا میری

مراد ہرگز نہیں ہوتا جیسا کہ اگلے وقتوں کے لوگ سمجھا کرتے تھے - میرے نزدیک قیادت ایک ایسا ہمہ گیر وصف ہے جو ہر سطح پر پایا جاتا ہے - بچے کی ماں، گھر کی بیوی، کسی دور دراز علاقے کے پرائمری اسکول کا استاد، کسی دیہاتی شفاخانے کا ڈاکٹر، کسی چھوٹے سے میونسپل دفتر کا کلرک، کھیت میں ہل جوتنے والا کسان، کارخانے کا مزدور، ہر ایک کو اپنے اپنے پیشے کا لیڈر ہونا چاہئے اور اپنا اپنا کام خاطر خواہ لیاقت اور تعمیری جذبے کے ساتھ انجام دینا چاہئے - ہمیں ایک ٹھوس اور معقول نظام تعلیم کی ضرورت تھی، جس کے ذریعے قومی زندگی کے ہر شعبے میں قیادت کے لئے جوہر قابل مہیا ہو سکے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات میرے ذہن میں واضح تھی کہ تعلیمی اصلاحات کا مقصد ان اچھی اور قابل قدر روایات کو بلا ضرورت مٹانا نہیں جو ایک مدت میں بنی ہیں - ہمیں ماضی کے جن ورثوں اور خزینوں پر فخر ہے ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے، لیکن پرانے امتیازات کے نقوش اس وقت تک تر و تازہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ انھیں نئی کامیابیوں کے ذریعے روشن نہ رکھا جائے -

کمیشن نے سب سے پہلے ہمارے تعلیمی نظام کی، جو ہمیں ورثے میں ملا تھا، بنیادی کمزوریوں کو واضح کیا - وہ کمزوریاں یہ تھیں:-

''مجہولیت اور عدم تعاون، بدنظمی اور حکم عدولی، جماعت کے مقابلے میں اپنے فائدے کو ترجیح دینا، اور علاقہ پرستی اور صوبہ پرستی کی تفرقہ انگیز ہوا[1]''- کمیشن نے یہ نتائج پاکستان کی سیاسی تبدیلیوں کا گہرا مطالعہ، اور ان اسباب کی چھان بین کرنے کے بعد اخذ کئے تھے، جو سارے سیاسی نظام کے تعطل کا باعث ہوئے- مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں کمیشن کی تحقیقات کے بارے میں اسی کے الفاظ نقل کر دوں - ''بدیسی حکومت کے شروع کے زمانے میں گورنمنٹ کا رویہ عوام کی طرف سرپرستانہ تھا - اور عوام کا

۱- تعلیمی کمیشن کی رپورٹ - صفحہ ٦ حکومت پاکستان، کراچی، سنہ ١٩٦٠ء -

رویہ گورنمنٹ کی طرف معروضانہ اطاعت گزاری کا ۔ جدت اور نئے اقدام کی نہ توقع کی جاتی تھی اور نہ حوصلہ افزائی ۔ حکومت اور عوام کا رشتہ بس ایسا ھی تھا جیسا حاکم اور محکوم کا ھوتا ھے[۱] جس میں ذاتی لگاؤ کو دخل نہ تھا۔،، کمیشن نے کہا کہ آزادی کی جد و جہد کے دوران میں عوام کے تسلیم و اطاعت کے رویے نے سر گرم مزاحمت کی شکل اختیار کر لی ۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد پرانے رویے کی بعض بدترین صورتیں پھر عود کر آئیں ، یعنی جمود و معروضیت کے ساتھ ساتھ نظام حکومت پر شک و شبہ ۔

کمیشن نے تعلیمی نظام کی بنیادی کمزوریاں گنوانے کے بعد ان کی اصلاح کے لئے اپنی تجاویز پیش کیں ۔ اس نے لکھا کہ بنیادی ضرورت بس ''رویوں میں انقلاب،، پیدا کرنے کی ھے ۔ تاکہ بیان کردہ خصوصیات کی جگہ ھمارے معاشرے میں ''انفرادی سعی و کوشش، دیانت داری و بلند کرداری، کامیابی پر فخر، دوسروں پر اعتماد اور اپنے فرض منصبی کا دلی پاس کمیشن کے الفاظ میں: ''پبلک فرائض کا نجی احساس،، پیدا ھو سکے۔[۲]

کمیشن نے ایک منصوبہ بنایا جس کا مقصد تھا معیار تعلیم کو بلند کرنا، امیر بچے ھی کی نہیں ذھین بچے کی حوصلہ افزائی کرنا، اور تعلیم کے ذریعے پاکستان کے دونوں صوبوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان اجنبیت اور باھمی شک و شبہ کا تدارک کرنا ۔

کمیشن نے سفارش کی کہ اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں زیادہ زور معیار پر ھونا چاھئے، تاکہ ھمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا سمندر پار کے تعلیمی اداروں کے طلبا کے ھم پایہ ھو سکیں ۔ اس کے لئے ضروری ھے کہ کالج اور یونیورسٹی کے استادوں کا معیار قابلیت بڑھایا جائے اور یہ بالآخر اس پر منحصر ھوگا کہ ایک تو ھم معلمی کے پیشے میں اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کو بھرتی کریں ، دوسرے

۱۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ ، حکومت پاکستان ۔ کراچی، سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۵

۲۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ ۔ حکومت پاکستان ۔ کراچی ، سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۸ ۔

معلم حضرات کو علم اور تدریس کی لگن ہو ، اور ذاتی تحقیق اور مسلسل مطالعے کے ذریعے اپنے علم اور طریق عمل کو جلا دینے کا شوق رکھتے ہوں۔

جو اُستاد پہلے سے ملازم تھے کمیشن نے ان کی قابلیت بڑھانے کے لئے موسم گرما کے کورسوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے کی سفارش کی، جس میں ہر کورس مختلف تعلیمی شعبوں یا ضابطوں کا احاطہ کرے۔ یہ ایک مستقل پروگرام کا جزو تھا، جس کے ذریعے کالجوں کے اُستاد اپنے علم کی تجدید کر سکیں ، نئے اور اصلاح شدہ طریقوں سے واقف ہوں اور ان کی فکر تیز ہو۔ ان کورسوں میں یونیورسٹی اور کالج کے اُستاد شرکت کریں، اور ان کی نگرانی مشترکہ طور پر ہر ایک ضابطے کے ممتاز مقامی اور غیر ملکی ماہرین خصوصی کے سپرد ہو۔ کمیشن کی سفارشوں کے اس حصے پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جا سکتا تھا ، چنانچہ گورنمنٹ کے کمیشن کی رپورٹ کو منظور کر لینے کے چند ھی ماہ کے اندر اس کام کی کچھ نہ کچھ ابتدا کر دی گئی۔

ثانوی تعلیم کے بارے میں کمیشن نے بتایا کہ قومی تعمیر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی کثیر تعداد میں ضرورت ھے جو صنعت، تجارت اور زراعت کے شعبوں میں مختلف فنی قابلیتیں رکھتے ہوں۔ نیز نئی مملکت کو ایسے افراد کی بھی ضرورت ھے، جو بڑے بلند سیرت اور محب وطن ہوں، اور خدمت کو ایک بلند نصب العین کے طور پر اختیار کر لیں۔ گزشتہ زمانے میں ثانوی اسکول کے پروگرام میں ان باتوں پر کم ھی دھیان دیا جاتا تھا ، اور در حقیقت ادب یا آرٹس کی تعلیم کی روایت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اصلاح یا تبدیلی کی کوئی کوشش کارگر نہ ہونے پاتی تھی۔ ثانوی اسکول کے پروگرام میں زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ طلبا کو یونیورسٹیوں میں داخلے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ثانوی تعلیم کا اپنا ایک جداگانہ مقام اور مطمح نظر ہو اور اس کا مقصد محض اعلیٰ تعلیم کے لئے تیاری ھی نہ رہے۔

پرائمری تعلیم کے متعلق کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ اقتصادی ترقی کو جلد تر ممکن بنانے کے لئے عام طور پر پڑھی لکھی آبادی کی ضرورت ہوگی، تاکہ وہ سائنس کی نئی ایجادوں اور بہتر فنی اور زرعی طریقوں کو سمجھ سکے اور ان سے کام لے سکے ، اسے مقامی اور قومی مسائل سے آگاہی ہو، اور وہ انتخابات کے موقعے پر سوچ سمجھ کر صحیح امیدوار کو منتخب کر سکے، جیسا کہ ہر ایک جمہوری نظام میں ہوتا ہے۔

تعلیمی اصلاحات کا سب سے بڑا مقصد دراصل یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو ملک کی ترقی اور دفاع میں حصہ لینے کے لئے تیار کر سکیں۔ یہ مقصد رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوگا ، لیکن غالباً یہ صحیح ہے کہ ہم نے اس کام کی ابتدا کر دی ہے ۔ البتہ ہمارے راستے میں رکاوٹیں بھی آتی رہی ہیں ۔ مثال کے طور پر سنہ ۱۹۶۳ء کے سارے سال میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے صرف ستائیس دن کام کیا ۔ ہم دونوں صوبوں کو دوش بدوش لانے کے لئے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر رہے ہیں ، لیکن بدقسمتی سے ہماری ترقی کی رفتار اس لئے سست پڑ گئی کہ بہت سے طلبا سیاست دانوں کے ہاتھوں گمراہ ہو کر اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں ۔ یہ بڑی حوصلہ شکن باتیں ہیں، پھر بھی میرا خیال ہےکہ تعلیمی اصلاحات نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے، اور دو تین سال میں ہمیں اپنی یونیورسٹیوں سےپہلے سے کہیں بہتر ثمر مراد ملنےلگے گا۔

رہا غیر ملکی اثر کا معاملہ، تو اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہمیں سب اچھی باتیں خواہ وہ کہیں سے بھی ملیں اپنا لینی چاہئیں ۔ افسوس یہ ہے کہ بری باتیں اختیار کر لینا بڑا آسان ہوتا ہے ، مثلاً نمائش اور سوقیانہ پن ۔ مجھے غیر ملکی خیالات، طرز نظر اور طور طریق کے بارے میں بے جا شکوک لاحق نہیں ہیں ، لیکن میری رائے میں ہمیں اپنی روایات ہی پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہئے اور صرف انھیں غیر ملکی خیالات کو اپنانا چاہئے جو فائدہ مند ہوں اور ہماری زندگی میں گھل مل سکیں ۔

حال ہی میں جو مملکتیں وجود میں آئی ہیں ، ان میں سے بیشتر نے اپنے ہاں مغربی نظام حکومت ہی کو رائج کر لیا ہے ،

کیونکہ ان کے پاس خود اپنا انفرادی نظام سوچنے اور تیار کرنے کے لئے وقت نہ تھا - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان کشیدگی چل رہی ہے - اس کشیدگی کا باعث سیاست دانوں، طلبا اور اخبارات کا رویہ ہے - طلبا کے مظاہرے تمام نئی جمہوری حکومتوں مثلاً پاکستان، ایران، ترکی، فلی پین اور جاپان کے لئے پیچیدہ مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں - ایک زمانہ تھا کہ قاہرہ سے طلبا کی ہنگامہ آرائیوں کے بارے میں بہت خبریں آیا کرتی تھیں - لیکن جب سے وہاں حکومت کا انداز بدلا ہے، طلبا کو قرار آ گیا ہے - ہماری طرح کے نئے ملکوں میں ذمہ داری کی روایات ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوئی ہیں - اور چونکہ اکثر غیر ذمہ دارانہ حرکات پر سزا نہیں دی جاتی، اس لئے لوگ بہ آسانی بے راہرو ہو جاتے ہیں -

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ حکومتیں طلبا کو وہ سہولتیں بہم نہیں پہنچاتی رہیں جن کی ان کو ضرورت ہے - اس کی کئی وجوہ تھیں - جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے پاس وسائل ہی نہیں تھے - ہمارے ہاں طلبا کی تعداد نہایت کثیر تھی، اور عمارتیں، تجربہ گاہیں، لائبریریاں، یہاں تک کہ کھیل اور تفریح کے لئے بھی جگہیں بہت کم تھیں -

ان میں سے بعض کمی تو جلد ہی رفع ہو سکتی ہے، بشرطیکہ انفرادی پہل اور کوشش سے کچھ نئی تدبیریں آزمائی جائیں - مثال کے طور پر جن کھیلوں میں صرفہ اور اہتمام زیادہ ہے ان کی جگہ منظم جسمانی کسرت اختیار کی جا سکتی ہے - استاد لاؤڈ اسپیکر لے کر اونچی جگہ پر کھڑا ہو جائے، اور ایک وقت میں بہت سے طلبا کو کسرت کرانا شروع کر دے - اس طرح ہر روز آدھ گھنٹے کی ورزش سے ان کے جسم اور دماغ کو تقویت بھی پہنچے گی اور شرارت بھی رفع ہو جائے گی -

ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ ایک ہموار اور یکساں نظام تعلیم کی راہ میں سخت رکاوٹ بنا ہوا ہے - کمیشن نے دونوں قومی زبانوں یعنی بنگلہ اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت کی ہے - اس نے دو

رسم الخطوں کے مسئلے کا بھی ذکر کیا ہے - لیکن ان دشواریوں کو بیان نہیں کیا جو دو زبانوں اور دو رسم الخطوں کے ہونے سے ایک ابھرتے ہوئے معاشرے کو پیش آ سکتی ہیں ، جبکہ اس معاشرے کا ایک ھی نصب العین اور ایک ھی مقدر ہو ، اور وہ متحد ہو کر ایک قوم بن جانے کا خواہش مند بھی ہو - زبان کے مسئلے کو لازماً ایک علمی اور سائنسی مسئلے کے طور پر دیکھنا چاھئے - بدقسمتی سے یہ ایک بڑا خطرناک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے - نتیجہ یہ کہ کوئی شخص بھی اس ڈر سے کہ کہیں اس کے الفاظ کے غلط معنی نہ لئے جائیں ، اس مسئلے پر بات کرنا نہیں چاھتا - ہمارے ارباب عقل و دانش جن کو اس مسئلے سے سب سے زیادہ دل چسپی ہونی چاھئے تھی مصلحةً اس سے کنارہ کش رہے ہیں ، کیونکہ ان میں اس مسئلے سے دوچار ہونے کی اخلاقی جرأت نہیں ہے - ان کا رویہ یہ رہا ہے کہ بس اس مسئلے کو سیاسی رہنماؤں ھی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کا حل تلاش کریں اور اس کے نتائج کو بھگتیں - وہ خود آرام سے پیچھے بیٹھ کر اس حل کو تنقید کا نشانہ بنائیں -

مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ دو قومی زبانوں کے ہوتے ہوئے ہم ایک قوم والی مملکت کبھی نہیں بن سکتے ، ہماری حیثیت کئی قوموں والی مملکت ھی کی رہے گی - اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس حیثیت کے خلاف کوئی حجت پیش کر رہا ہوں - میں تو فقط ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں ، جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی - واقعہ یہی ہے کہ ایک زبان کو پورے ملک پر مسلط نہیں کیا جا سکتا - نہ تو بنگالی اور نہ اردو پورے پاکستان کی زبان بن سکتی ہے - اس کے ساتھ ھی یہ بھی بجا و درست ہے کہ اگر عوام، یعنی مشرقی اور مغربی دونوں صوبوں کے عوام، ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جانا چاھتے ہیں، تو انھیں ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعۂ اظہار تو اختیار کرنا ھی پڑے گا ، اور اس ذریعۂ اظہار کو لازمی طور پر قومی ہونا چاھئے - ایسا ذریعۂ اظہار تیار کرنے کے لئے ہمیں بنگالی

اور اردو کے مشترکہ عناصر کو یکجا کرنا ہوگا، اور ایک مشترک رسم الخط کے ذریعے انہیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دینا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام مدتوں میں جا کر پورا ہوگا۔ لیکن جوں جوں دونوں صوبوں کے عوام ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے اور ایک دوسرے سے واقفیت بڑھتی جائے گی، ایک قومی ذریعۂ اظہار خود بخود پیدا ہو کر کوئی واضح صورت اختیار کر لے گا۔ میں اس خیال کو کسی پر مسلط نہیں کر سکتا۔ میں تو بس یہی کر سکتا ہوں کہ یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کردوں۔ اور اس بات پر زور دوں کہ اگر ہم اپنی قومی سالمیت اور یک جہتی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس مسئلے کا حل ضروری ہے۔

انقلاب کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے جتنی اصلاحات شروع کیں، ان سب میں تعلیمی نظام کی نئی تشکیل کے ساتھ مجھے زیادہ گہرا لگاؤ تھا۔ کسی اقتصادی منصوبہ بندی، سماجی ترقی یا روحانی اکتساب کا ایک ٹھوس اور حقیقت پسندانہ تعلیمی بنیاد کے بغیر پنپنا ممکن نہیں۔ یہ بڑا بھاری کام ہے جس کے لئے ملک کی تمام ذہنی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کی ضرورت ہے۔ اور مجھے دلی توقع ہے کہ ایسا ضرور ہوگا، تاکہ اصلاحات کے حقیقی مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ بس اسی وقت ہم ایک ایسا تعلیمی نظام بنا سکیں گے جو ہماری قوم کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات کو پورا کر سکے۔

(۵)

میں نے کئی سال پہلے سنہ ۱۹۵۴ء میں نظام قانون کے مسئلے پر لکھا تھا کہ ''ایک مسئلہ قانونی نظام کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ نظام نہایت مہنگا، غیر موثر، سست رفتار اور ظالمانہ واقع ہوا ہے، اور ہمارے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ اس کی یکسر اصلاح کرنا اور اسے ہمدردانہ، تیز رفتار اور کم خرچ بنانا ہوگا۔ اس کا علاج بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ ملک میں جرگہ اور عدالت کا ملا جلا نظام رائج کیا جائے اور گواہی اور عدالتی کارروائی کے قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔ اور صرف ایک بار اپیل کا حق رکھا جائے۔ ہمیں ہر انتظامی حلقے میں ایک اونچی عدالت قائم کرنی ہوگی، جس میں آئینی مقدموں

کو چھوڑ کر دوسرے مقدمے پیش ہوں گے۔ وفاق یا صوبائی ہائی کورٹ میں صرف وہ مقدمے پیش ہوں، جو آئینی نوعیت رکھتے ہوں۔،،

مجھے یاد ہے میرے والد نے ایک موقع پر مجھے بتایا تھا کہ جب پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو جن لوگوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا تھا، انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہمیں اس کا معاوضہ دلایا جائے۔ حکومت برطانیہ نے ہر ضلع کے حکام سے کہا کہ تم لوگوں پر یہ بات واضح کر دو کہ برطانیہ نے اصلاحات جاری کر کے ہندوستان کے باشندوں کی کس قدر مدد کی ہے۔ ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر نے جو کوئی کرنل جیمز تھا، ہری پور کے ممتاز لوگوں کو بلوا کر ایک جلسہ کیا۔ جلسے میں صرف ایک کرسی تھی جو ڈپٹی کمشنر کے بیٹھنے کے لئے تھی۔ چنانچہ حاضرین جلسہ کو دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنا پڑا۔ میرے والد کو بھی اس جلسے میں شرکت کے لئے بلوایا گیا تھا۔ انھیں یہ بات بری لگی اور وہ ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ حکومت ہندوستانیوں کی بہتری کے لئے ہر ممکن کام کر رہی ہے۔ مگر ان لوگوں میں جو عام پستی پائی جاتی ہے وہ ایک دن میں دور نہیں ہو سکتی۔ اس نے خاص طور پر مقدمے بازی کا ذکر کیا جس میں ضلعے بھر کے لوگ مبتلا تھے۔ اس نے کہا ہر شخص عدالتوں میں جھوٹے دعوے دائر کرتا ہے اور پھر انصاف کا خواہاں ہوتا ہے۔ میرے والد نے کہا یہ سچ ہے کہ لوگ جھوٹے اور من گھڑت دعوے دائر کرتے ہیں اور ہر قسم کے جھوٹ بولتے ہیں، لیکن اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں۔ عدالتوں کا سارا نظام ہی بنیادی طور پر ہمارے لوگوں کے مزاج اور ضرورتوں کے خلاف ہے۔ لوگوں کو تجربے سے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ برطانیہ نے جو عدالتی نظام قائم کر رکھا ہے، اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو جھوٹ اور مکر سے کام لے سکیں۔ حکام ان لوگوں کی ہر طرح ہمت افزائی کرتے ہیں جو خود اپنے ہم وطنوں کے خلاف الزامات لگاتے ہیں۔ لوگوں کی برائی کرنا بیکار ہے۔ ضرورت عدالتی نظام کی درستی اور اصلاح کی ہے۔

پینڈیرل مون ، جو انڈین سول سروس کے ممبر رہ چکے ھیں ، اپنی کتاب ''سٹرینجرز اِن انڈیا،، (ھندوستان میں اجنبی) میں لکھتے ھیں کہ عدالتی نظام ملک کی ایک کثیر آبادی کی فہم سے بالا تر ھے ۔ یہ پیچیدہ ھے ، دیر لگانے والا ھے ، مہنگا ھے اور سب سے بری بات یہ کہ انصاف نہیں کرتا ۔ اگر کوئی شخص اس نظام کے ذریعے انصاف حاصل کرنے میں کامیاب ھو جائے تو اسے بڑا خوش قسمت سمجھنا چاھئے ۔ یہ ایک ایسا نظام ھے جس نے لوگوں کے اخلاق کو تباہ کر دیا ھے ، کیونکہ اپنے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لئے ھر آدمی کو جھوٹ بولنا پڑتا ھے اور پھر جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے اور زیادہ جھوٹ بولنے پڑتے ھیں ۔ یہ عدالتی نظام اسی ملک میں خوب چل سکتا تھا جہاں اس نے جنم لیا ، ھمارے ھاں نہیں ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ اس نظام نے ھماری اخلاق اقدار کی بیخ کنی کر دی ۔ مجھے پینڈیرل مون کے اس قول سے بھی اتفاق ھے کہ اس نظام کو کامیاب بنانے کی کوشش میں ھم نے اسے اخلاق طور پر الٹا بگاڑ کر رکھ دیا اور اس نے جواب میں پورے معاشرے ھی کو اخلاق طور پر تباہ کر ڈالا ۔

جہاں تک میرا تعلق ھے مجھے موجودہ قانونی نظام پر ذرا بھروسا نہیں ۔ میں جانتا ھوں کہ لوگ اس نظام کی خامیوں کی وجہ سے قانون کے پیشے کو برا کہنے لگے ھیں ۔ لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا ۔ یہ قانون پیشہ حضرات کا بنایا ھوا نظام نہیں ۔ یہ تو ان پر مسلط کیا گیا تھا ۔ لیکن تعجب کی بات یہ ھے کہ قانون پیشہ حضرات کے دل میں قانونی نظام کو پاکستانی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کبھی کوئی خواھش پیدا نہیں ھوئی ۔ بہت سے وکلا اس نظام سے غیر مطمئن ھیں لیکن وہ اس کا اظہار کھلے بندوں نہیں بلکہ علیحدگی میں کرتے ھیں ، کیونکہ وہ جانتے ھیں کہ ان کے بعض ھم پیشہ نہایت سختی سے ان کی مخالفت کریں گے ۔ ظاھر ھے کہ اگر اس نظام میں کوئی بڑی تبدیلی کی گئی تو اس سے بعض لوگوں کے ذاتی مفاد کو نقصان پہنچے گا ۔

پاکستان میں بہت سے لوگوں نے قانون کا پیشہ اختیار کر رکھا ھے ۔ ان لوگوں کی تعداد ضرورت سے کہیں زیادہ ھے ۔ پھر ان میں

بہت سے قابل لوگ بھی ہیں ۔ اگر یہ لوگ اپنی قابلیت زندگی کے دوسرے شعبوں میں صرف کرتے تو اس سے ملک کو کس قدر فائدہ حاصل ہوتا ۔ میں نے گاؤں کے غریب لوگوں کی آسانی کے لئے بنیادی جمہوریت کے ممبروں کو چند معمولی اختیارات دے رکھے ہیں ، لیکن بعض قانون پیشہ حضرات نے اس چھوٹی سی بات پر بھی ناک بھوں چڑھائی ہے ۔ میں ان کی وجوہ کو بخوبی سمجھتا ہوں ، لیکن جن لوگوں کو ہمارے قانونی نظام نے سخت بد دل اور لاچار کر رکھا ہے ، ان کی مصیبت کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا ہی تھا۔ میں قانون کا ماہر نہیں ہوں ، اس لئے اس سلسلے میں ہدایت نامے جاری کرنے سے قاصر ہوں ۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ عدالتی کارروائی کو آسان بنایا جائے اور ہماری عدالتیں مقدموں کے فیصلے ذرا جلد جلد کیا کریں ۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ گواہی اور عدالتی کارروائی کے دوسرے قوانین کو بنیادی طور پر بدل دینا چاہئے۔ اگر مارشل لا جاری رہتا تو شاید میں اس کے بارے میں کوئی قدم اٹھا سکتا ۔

ہمارے بعض وکلا اور جج صاحبان میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ طول طویل کلام اور پر تکلف انداز بیان کے بڑے دل دادہ ہیں ۔ مجھے ہائی کورٹ کا ایک مقدمہ یاد ہے ، جو ایک عورت کی طلاق یا شادی کے بارے میں حال ہی میں ہوا تھا ۔ چار یا پانچ جج تھے ۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے سے طویل فیصلے لکھنے میں بازی لے جانے کی کوشش کی ۔ مختصر ترین فیصلہ بہتّر صفحات پر پھیلا ہوا تھا ۔ اور نتیجہ کیا ہوا؟ آخر میں ان سب نے سفارش کی کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے علما کی ایک کانفرنس طلب کی جائے، جو اس مسئلے پر غور و خوض کر کے فتویٰ دے ۔ اس فتویٰ کو آئندہ بھی اس قسم کے مقدموں کے سلسلے میں پیش کیا جا سکے گا اور فیصلوں میں یکسانی پیدا کی جا سکے گی ۔ کاش کوئی ان جج صاحبان کو بتاتا کہ آپ کا کام تو فقط ملک کے قانون کی ترجمانی کرنا ہے ، لمبے لمبے مقالے لکھنا نہیں ۔ یہ ساری بات بڑی مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے دلوں میں اعتماد پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے اس معاملے کی چھان بین کرنے کے لئے مارشل لا کے دوران میں قانونی اصلاحات کا ایک کمیشن مقرر کیا ۔ اس نے بڑی اچھی رپورٹ تیار کی ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس رپورٹ نے مسئلے کی صرف سطح کو چھوا ہے ۔ سچ یہ ہے کہ نظام قانون بنیادی طور پر تباہ کن ہے ۔

اس رپورٹ میں طویل المیعاد قسم کے حل پیش کئے گئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے : عدالتی کارروائی کو آسان بنانا ، تاخیر کو کم کرنا ، عدالت کو انتظامی صیغے سے جدا کرنا ، اسلامی قوانین کا کمیشن مقرر کرنا، قوانین پر نظر ثانی اور ان کی ترتیب و تنظیم کے لئے ایک کمیٹی بنانا، کورٹ فیس میں کمی کرنا، محدود اختیارات کے ساتھ چھوٹے درجے کی عدالتیں قائم کرنا ، یعنی بڑے بڑے شہروں میں فوری فیصلہ کرنے والی عدالتیں ، دیہات میں قانونی پنچایتیں اور دوسرے شہری علاقوں میں محلہ وار عدالتیں ، سرحدی جرائم کے ضابطوں کو منسوخ کرنا ، سارے ملک میں قوانین کو یکساں بنانا، مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ کے عدالتی اختیار کو بلوچستان کے خاص علاقوں تک توسیع دینا اور بلوچستان میں قاضیوں کی عدالتوں کی جگہ باقاعدہ قانونی عدالتیں قائم کرنا ، ازالۂ حیثیت عرفی کے قوانین میں ترمیم کرنا ، موجودہ عدالتی قوانین کے ڈھانچے کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنا وغیرہ وغیرہ ۔

ان میں سے بعض سفارشات پر عمل کیا گیا ۔ مثال کے طور پر ضابطۂ دیوانی میں ترمیم کی گئی تا کہ عدالتی کارروائی کی پیچیدگیوں میں کمی کی جا سکے ۔ مقدمے کی پہلی سماعت کو زیادہ جامع بنا دیا گیا، اور سماعت کا التوا جو پہلے بڑا آسان ہوا کرتا تھا، اب آسان نہیں رہا ۔ پہلے ہائی کورٹ کا ایک جج جو فیصلہ دیا کرتا تھا اس کے خلاف دو ججوں کی بینچ کے سامنے اپیل کرنے کی اجازت ہوا کرتی تھی ، جسے ”لیٹرز پیٹنٹ اپیل“ کہتے تھے ، یہ اپیل ختم کر دی گئی ۔

تاہم جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ سفارشات مسئلے کی تہہ تک نہیں پہنچتیں ۔ اس قانونی نظام سے جو مالی اور مادی نقصان

پہنچتا ہے، مجھے اس کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس افسوس ناک ذہنی اور اخلاق نقصان کی جو اس نظام کے ذریعے لوگوں کو پہنچ رہا ہے۔ ایک بہت نیک اور ایماندار آدمی جو اپنے گاؤں میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، جب عدالت میں جاتا ہے تو اس سے جتنا چاہو جھوٹ بلوا لو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اس نظام پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ اسے اپنا نظام نہیں سمجھتا، غیروں کا نظام سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دل کو یوں تسلی دے لیتا ہے کہ اس نظام کی خلاف ورزی کرنا کوئی بری بات نہیں، کیونکہ یہ تو غیر ملکی نظام ہے جو ہم پر ٹھونسا گیا ہے۔

طول طویل بحثیں جو عرصے تک جاری رہتی ہیں، اور غیر متعلقہ باتوں کو زیر بحث لانے پر عدالتوں کی ڈھیل یہ ظاہر کرتی ہے کہ عدالتی نظام میں نظم و ضبط کی سخت کمی ہے۔ شاید قانون اپنی جگہ پر ٹھیک ہو، لیکن گواہی اور عدالتی کارروائیوں میں قانون کا جس طرح اطلاق کیا جاتا ہے اس سے لوگ بہت ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عدالتی کارروائیاں ابھی تک طولانی اور تکلیف دہ ہیں اور ان کی رفتار سست ہے۔ میرا خیال ہے کہ جج اور مجسٹریٹ اس باب میں کسی قسم کی اصلاح کرنے اور معاملات کو جلد نمٹانے سے خود کو معذور پاتے ہیں۔ میرے پاس بعض دفعہ ایسے لوگوں کی جانب سے رحم کی درخواستیں آتی ہیں، جنہیں قتل کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی ہو، ایسا مقدمہ شاذ ہی میری نظر سے گزرتا ہے، جس کا فیصلہ دو سال سے کم مدت میں ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی قانونی نظام میں ایک فوجداری مقدمے کا اتنا طول کھینچنا، اچھا خاصا ڈنڈ دینا ہوا۔ ادھر دیوانی مقدمات کی تو یہ کیفیت ہے کہ اگر آدمی کے پاس پیسہ ہو اور وہ چاہے کہ مقدمے کا فیصلہ نہ ہونے پائے تو جب تک چاہے جاری رکھ سکتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے ایک جج سے جسے میں ایک مدت سے جانتا تھا پوچھا کہ کہو ہائی کورٹ میں کیسی گزرتی ہے۔ اس نے کہا "یہ تو آپ جانتے ہیں ہی کہ فوجداری مقدمے میں دو فریق ہوتے ہیں، ایک مستغیث، دوسرا ملزم، اور دیوانی مقدمے میں مدعی اور

مدعا علیه - بس آپ وهاں بیٹھے هوئے شروع سے آخر تک فریقین کے جھوٹ اور افترا سنتے رهئیے - اور آپ کا کام یه هے که اس ساری خرافات میں سے مطالب نکالیں اور فیصله دیں - یه هے میری زندگی!،،

میری ذاتی رائے یه هے که همیں اس سارے نظام کی چھان بین قانون دانوں هی سے نہیں بلکه ایسے لوگوں سے بھی کرانی چاهئیے جنھوں نے اس کے هاتھوں دکھ اٹھائے هیں - مجھے اب محسوس هوتا هے که قانونی اصلاحات کے کمیشن میں محض وکلا اور عدالتی عہده داروں کو شامل کرنے میں مجھ سے بھول هوئی - مجھے ایسے لوگوں کو بھی اس کمیشن میں شریک کرنا چاهئیے تھا جنھیں لوگوں کی تکلیفوں سے بھی کچھ واقفیت هوتی -

میں سمجھتا هوں که همارے معاشرے میں جب کسی علاقے میں کوئی واردات هوتی هے ، تو اس علاقے کے لوگوں کو معلوم هوتا هے که اصل مجرم کون هے - اور اگر انھیں موقع دیا جائے اور ان کی پشت پناهی کی جائے تو وه مجرم کا نام بتلا دیں - اسی لئے میرا خیال هے که ان معاملوں کو جس قدر بھی مقامی جماعتوں کے سپرد کیا جائے گا ، اتنا هی زیاده منصفانه اور تسلی بخش کام هوگا - تجربے نے بتایا هے که چھوٹے چھوٹے مقدموں کو مقامی جماعتوں کے هاتھ میں دینے سے حوصله افزا نتائج نکلے - بڑی بات یه هے که مقامی عدالتیں لوگوں میں سمجھوتے بھی کرا دیتی هیں - اگر وه صرف سزائیں هی سناتی رهیں تو شاید ان پر سے اعتقاد اٹھ جائے اور چه میگوئیاں هونے لگیں - اس سے لازمی طور پر یه نتیجه نکلتا هے که داد رسی کے اختیارات کو کسی حد تک بانٹ دینا چاهئیے - البته پیچیده معاملوں مثلاً معاهدے کے قوانین کی بات اور هے -

میں اپنے هاں کے قوانین کو اسلامی بنانے کے مسئلے پر گہری سوچ بچار کرتا رها هوں - اگر هم اس میں کامیاب هو جائیں ، تو همارا قانونی نظام زیاده همدرد انسانیت اور قابل عمل بن جائے - آئنده اس معاملے میں قدم اٹھانا ، مجلس قانون ساز کا کام هوگا - اس مقصد کے لئے جو بھی معقول تجویز پیش کی جائے گی ، میں اس کی تائید پر آماده رهوں گا - اس معاملے پر ادھر ادھر کی باتیں تو بہت هو رهی

ہیں ، لیکن ابھی تک کسی نے یہاں تک کہ علما نے بھی کوئی ٹھوس بات تجویز نہیں کی - میں نے اسلامی نصب العین کے بارے میں ایک مشاورتی کونسل اور ایک اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کر دیا ہے - ان دونوں کو دین کی روشنی میں ہمارے قانونی مسائل کا جائزہ لے کر حکومت کو اپنا مشورہ دینا چاہئے - اس سے ہماری مجلس قانون ساز کے اراکین کو اسلامی عقائد کے مطابق قوانین وضع کرنے میں مدد ملے گی - لیکن ان قوانین کو قابل عمل بنانے کے لئے موجودہ معاشرے کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا -

میں جانتا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں ہے - عقائد اسلام کی شرح اور وقت کے تقاضوں کو نظر میں رکھ کر قوانین میں ترمیم کی کوشش گویا علما کو کفر کا فتویٰ صادر کرنے کی دعوت دینا ہے - شادی بیاہ کے آئین ہی کو لیجئے - اسلام نے مرد کو بعض حالات کے تحت ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی ہے - لیکن یہ اجازت اندھا دھند کثرت ازواج کا سبب بن گئی ہے - جس سے ان گنت بے زبان عورتیں اور معصوم بچے سخت مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار ہو گئے ہیں - مردوں نے اس اجازت کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسے غیر شریفانہ طور پر استعمال کیا ہے کہ اس کی بدولت ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے ہیں - سنہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس کی سربراہی میں ایک کمیشن اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا تھا کہ شادی بیاہ کے قوانین کی جانچ پڑتال کر کے اصلاح کی تجاویز پیش کرے - اس کمیشن کے تمام ممبر عالم فاضل لوگ تھے - سنہ ۱۹۵۸ء میں جب میں نے ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کمیشن نے ایک رپورٹ تیار کر رکھی ہے جس میں متعدد سفارشات کی گئی ہیں - ایک اختلافی نوٹ کو چھوڑ کر کمیشن کے تمام ممبر ان تجاویز پر متفق تھے - پچھلی حکومت علما کے ڈر سے ان سفارشات پر عمل کرنے سے کتراتی رہی ، میں نے بعض ممتاز ماہرین قانون سے ، جن میں مشرقی پاکستان کے جسٹس محمد ابراہیم اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ

کے سابق چیف جسٹس مسٹر منظور قادر شامل تھے ، اس رپورٹ کا معائنہ کرایا ، کمیشن کی سفارشات کسی صورت میں بھی اسلامی شریعت میں خلل انداز نہ ہوتی تھیں - ان میں تو فقط شادی بیاہ سے متعلق احکام اسلامی پر مناسب و معقول طریقے سے عمل درآمد کے لئے ضابطۂ کار بتایا گیا تھا - میں نے کمیشن کی سفارشات پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا ، کیونکہ میں ایک مسلمان اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس بھاری سماجی بدعنوانی کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا جو لوگوں کی زندگیوں کو تلخ کر رہی تھی - چنانچہ سنہ ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کا آرڈی ننس جاری کر دیا گیا - اس پر علما کی ایک جماعت نے فوراً مجھ پر شریعت میں دخل اندازی کا الزام لگایا - بعض علما تو یہاں تک کہنے سے بھی نہ چوکے کہ میں نے (نعوذ باللہ) قرآن حکیم کے بعض حصوں میں تحریف کی ہے - خوش قسمتی سے اس نئے قانون کے سماجی فوائد کا ہماری متاہل زندگیوں اور ہمارے عوام پر بہت اچھا اور فوری اثر ہوا - خاص طور پر ہمارے ملک کی خواتین نے دل کھول کر اس اصلاحی قانون کی حمایت کی - مغالطہ پیدا کرانے والوں کی پیش نہ چلی - اس ذکر سے مجھے یہ بتانا مقصود تھا کہ قوانین کو حالات حاضرہ کے مطابق ڈھالنے میں کیا دقت پیش آتی ہے -

(۶)

پاکستان اور ہندوستان میں دریائے سندھ کے طاس کے پانی پر جو جھگڑا ہے وہ بہت پرانا ہے ، اور اس نے کئی رنگ بدلے ہیں - کشمیر کا مسئلہ تو بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے ، لیکن نہروں کے پانی کا مسئلہ ایک فنی اور اقتصادی مسئلہ ہے جس نے ہندوستان کے غیر مصالحانہ رویے کی وجہ سے ایک تلخ دیرینہ عداوت کی شکل اختیار کر لی ہے - پاکستان میں یکے بعد دیگرے جو حکومتیں بر سر اقتدار آئیں ان کی کمزور اور پس و پیش کی پالسی بھی اس جھگڑے کے بڑھنے کا باعث ہوئی ہے -

مارشل لا جاری ہونے کے جلد ہی بعد میں نے کراچی کی ایک اخباری کانفرنس میں کہا تھا کہ اگر کشمیر اور نہروں کے پانی کے مسئلے صلح صفائی سے طے ہو جائیں ، تو نئی حکومت کوئی ایسی

تدبیر سوچنے کے قابل ہوگی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں امن چین کے ساتھ رہ سکیں - میں نے حقیقت پسندانہ جذبے کے ساتھ ان دونوں مسئلوں کو حل کرنے کی ٹھان لی -

دریائے سندھ اپنے پانچ بڑے معاونوں کے ساتھ دنیا کے عظیم دریائی نظاموں میں شمار ہوتا ہے - اس کے پانی کا سالانہ بہاؤ دریائے نیل سے دگنا اور دجلہ و فرات کے مجموعی بہاؤ سے تگنا ہے - اس کی مقدار تقریباً سترہ کروڑ ایکڑ فیٹ ہے - یا یوں کہئیے کہ اتنا پانی جس سے فرانس یا امریکی ریاست ٹیکساس کا پورا رقبہ ایک فٹ گہرائی میں ڈوب جائے - ان دریاؤں کے آب پاشی کے نظام سے جس کی ترقی پچھلے سو برس کی کوششوں کا نتیجہ ہے ، پاکستان کے چار کروڑ اور ہندوستان کے ایک کروڑ باشندے یا یوں سمجھئیے کہ دونوں ملکوں کی مجموعی آبادی کا تقریباً دسواں حصہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے - دریائے سندھ کے طاس کی آب پاشی کا نظام دنیا میں سب سے بڑا نظام ہے - یہ تین کروڑ ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے - یہ مصر اور سوڈان کے اس رقبے سے بڑا ہے جسے نیل سیراب کرتا ہے -

جب سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو ہمارے آبپاشی کے چند بڑے بڑے نظاموں کے ہیڈورکس ہندوستانی علاقے ہی میں رہ گئے - مرکزی باری دوآب کی تمام نہریں اور وادیٔ ستلج کے پروجیکٹ ، پانی کی بہم رسانی کے لئے ان ہیڈورکس اور ان دریاؤں کے محتاج تھے ، جن پر ہندوستان کا قبضہ تھا - دریائے ستلج، دریائے بیاس اور دریائے راوی جن کا پانی ان نہروں میں آتا تھا ، ان کے منبعے ہندوستان میں تھے اور وہ پاکستان میں داخل ہونے سے پہلے ہندوستانی علاقے کے لمبے لمبے فاصلے طے کرتے تھے -

تقسیم کے تھوڑے ہی دن بعد ہندوستان کو ہماری نہروں کے پانی کی سپلائی روک دینے کی سوجھی - اس کے اس شدید اقدام نے ہمارے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی - آخر چند شرائط کے تحت پانی کھول دیا گیا - ہمارے لئے ان شرائط کو مان لینے کے سوا چارہ نہ تھا ، کیونکہ دوسری صورت میں ہمارے وسیع زرخیز علاقے تباہ و برباد ہو جاتے - یہ مسئلہ اس بات سے اور بھی پیچیدہ ہو گیا کہ

اس وقت تک سندھ کے طاس کا آب پاشی کا نظام پانی کے جمع شدہ ذخیروں پر نہیں بلکہ مطلقاً دریا کے بہاؤ پر قائم تھا - پانی کی بہم رسانی موسمی تبدیلیوں ہی پر موقوف نہ تھی بلکہ سال بہ سال بدلتی رہتی تھی کیونکہ اس کا دار و مدار ہمالیہ کے بالائی سلسلوں میں ہونے والی بارشوں پر تھا -

ہندوستان ستلج ، بیاس اور راوی کے سارے پانی اور غالبا چناب کے کچھ پانی کو اپنے استعمال کے لئے ہتھیانے کی فکر میں تھا - چونکہ ان دریاؤں کا پانی اس کے علاقے سے ہو کر پاکستان آتا تھا ، اس لئے ہمیں اس سے محروم کر دینا اس کے اختیار میں تھا - پانی کے اس طرح بہ آسانی دستیاب ہو جانے کی توقع میں اس نے سوچا کہ سارا پانی ہی فوری اقتصادی ترقی کے لئے استعمال کرے - چنانچہ اس نے انجینیری کی بھاری بھاری تعمیرات کا کام شروع کر دیا - جس کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا ، وہ یہ کہ پاکستان کے لمبے چوڑے علاقے پورے کے پورے ویران ہو جائیں -

دریائے سندھ کے نظام کے پانی کی حصہ داری برسوں سے جھگڑے کا سبب بنی ہوئی ہے - تقسیم سے پہلے سندھ اور پنجاب کے صوبوں میں پانی کے حق پر ہمیشہ اختلاف رہا کرتا تھا - تقسیم کے وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو حد کھینچی گئی وہ سندھ کے نظام کے عین بیچ میں سے ہو کر گزرتی تھی - دریاؤں کا زیریں حصہ پاکستان کو ملا اور اس کی آب پاشی کی بڑی بڑی نہروں میں سے دو کے ہیڈورکس سرحد کے اس پار ہندوستان میں رہ گئے - اس طرح پانی کے استعمال کی شراکت ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گئی - یہ سنہ ۱۹۵۵ء یا سنہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے - میں اس وقت کمانڈر ان چیف تھا - ان دنوں اخبارات میں دریائے سندھ کے طاس کے جھگڑے کا بڑا چرچا ہو رہا تھا - ہندوستان والے ہماری نہروں کا پانی بند کر دینے پر تلے ہوئے نظر آتے تھے - اگر پانی بند ہو جاتا تو عجب نہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جاتی - مجھے اس مسئلے کا کچھ زیادہ علم نہ تھا اور پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا - اس پر مغربی پاکستان کی حکومت نے اپنے دو

انجینیر میرے پاس بھیجے ، جنھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس معاملے کو مجھ پر واضح کر دیا۔

مجھے سب سے زیادہ پریشانی پاکستان کے غیر محفوظ ہونے کی تھی۔ ہمارے دریاؤں کے ہیڈورکس بھی ہندوستان میں تھے اور منبعے بھی۔ ہندوستان نے پانی کا رخ بدل دینے کے انتظامات کر رکھے تھے ، اور ہندوستانی فوج ہماری فوج سے تگنی تھی - میں نے دل میں کہا اگر ہندوستان کے ساتھ ہماری بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور ہندوستان والے دریاؤں کا رخ بدلنے کا فیصلہ کر لیں تو ہمیں جنگ کا سامنا کرنا ہوگا - ہر بات ہمارے خلاف پڑتی تھی - اس لئے مصلحت اسی میں تھی کہ ہندوستان سے سمجھوتہ کر لیا جائے خواہ اس میں ہمیں کچھ خسارہ ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے - اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں -

اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں انقلاب کے فوراً بعد میں نے اس مسئلے کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ، اور اس کے تمام پہلوؤں سے آگاھی حاصل کی - پھر میں نے بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ چند قطعی فیصلے کئے - مئی سنہ ۱۹۵۹ء تک اس مسئلے کے تمام پہلو روشن اور اہم نکات واضح ہو چکے تھے - عالمی بینک ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گیا تھا کہ وہ قطعی طور پر کوئی پیش کش کر سکے - اس نے اصول تلاش کر لئے تھے جن پر نہری پانی کے معاہدے کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی - عالمی بینک نے نئے بند وغیرہ تعمیر کرنے کے بارے میں ہمارا مطالبہ منظور کر لیا تھا - یہ اس سمجھوتے کا ایک جزو تھا جس کی رو سے ہندوستان کو ہمیں مالی امداد دینی تھی - عالمی بنک کے وفد نے جس کے سربراہ اس بنک کے صدر یوجین بلیک تھے ، ہمیں منگلا بند کی تعمیر نیز بعض ہیڈورکس اور متبادل سمتوں کو جانے اور دریاؤں کے سلسلے کو ملانے والی نہروں کی پیش کش کی - انھوں نے جہلم کے قریب رھتاس کے مقام پر ایک اور بند بنانے کی پیش کش بھی کی - اس عظیم تعمیری کام کے اخراجات کا بار زیادہ تر دوست ممالک مثلاً ریاست ھائے متحدہ امریکہ کو اٹھانا تھا اور کچھ ہندوستان اور کچھ پاکستان کو -

لیکن یوجین بلیک سے اپنی گفت و شنید کی کیفیت قلم بند کرنے سے پہلے میں اپنے فنی ماھروں اور منتظموں کی مخالفت کا حال بیان کر دینا چاھتا ھوں جس سے مجھے دوچار ھونا پڑا ۔ مجھے اندازہ ھو گیا کہ انھیں صورت حال کی نزاکت کا پورا پورا احساس نہیں ھے ۔ اور ایسی صورت میں کہ ھماری حالت ھر لحاظ سے کمزور ھے ، وہ ان ھونی باتوں کا مطالبہ کر رھے ھیں ۔ وہ بزور اپنی پالسی منوانے کی بھی کوشش کر رھے تھے ۔ اور معاملے کو اس کی انتہائی حد تک لے جانا چاھتے تھے ۔ تقریباً تیس چالیس آدمی لاھور کے گورنمنٹ ھاؤس میں جمع ھوئے جہاں میں نے ان سے خطاب کیا ۔ میں نے کہا :
''صاحبو! یہ مسئلہ ھمارے لئے بڑے دور رس نتائج کا حامل ھے ۔ میں تمھیں بتا دینا چاھتا ھوں کہ ھر بات پاکستان کے خلاف پڑتی ھے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ھمیں اپنے حقوق سے دست بردار ھو جانا چاھئے ۔ لیکن اس کے ساتھ ھی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اگر ھم کوئی ایسا حل تلاش کر لیں جس کے ذریعے ھم زندہ رہ سکیں ، تو ایسے حل کو منظور نہ کرنا سخت بے وقوفی کی بات ھوگی ۔ یہ بات میں آپ لوگوں سے نہیں بلکہ حقیقت میں اپنے آپ سے کہہ رھا ھوں ، کیونکہ اس حل کی ذمہ داری مجھے لینی ھوگی ۔
''چونکہ آپ میں سے کسی پر بھی اس کی ذمہ داری نہیں ھوگی ، اس لئے میں صاف صاف بتلا دینا چاھتا ھوں کہ پالسی بھی میری ھی ھوگی ۔ فنی تفصیلات کے سلسلے میں جب کبھی مجھے کوئی شک ھوگا تو میں آپ حضرات سے مشورہ طلب کروں گا ، لیکن اگر آپ میں سے کسی نے میری پالسی میں دخل دیا ، تو میں خود اس سے سمجھ لوں گا ۔ اگر اس مسئلے کو سمجھ بوجھ کے ساتھ حل نہ کیا گیا ، تو عجب نہیں کہ ملک ھی کا خاتمہ ھو جائے ۔ میں نے جو کچھ کہا ھے اس کا ایک ایک لفظ صحیح ھے ، اس لئے اس کے بارے میں آپ میں سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں رھنی چاھئے ۔''
میرا خیال ھے کہ وہ میرا مطلب سمجھ گئے ۔

یوجین بلیک کی پیش کش ساٹھ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تھی - اس پر میں نے اپنے فنی مشیروں سے صلاح مشورہ کیا - ان سب کی یہ پختہ رائے تھی کہ منگلا کے مقام پر دریائے جہلم پر بند تعمیر کرنے کے علاوہ ہمیں تربیلا کے مقام پر بھی بند بنانے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس میں دریائے سندھ کا فالتو پانی جمع کیا جا سکے - اس سے نہ صرف نئے انتظامات کے لئے پانی مہیا ہوگا بلکہ ترقی کے کاموں کے لئے بھی کچھ پانی مل سکے گا ، خصوصاً سندھ کی نہروں کے لئے - چنانچہ رہتاس میں بند کی تعمیر سے ہماری مشکل حل نہ ہوتی تھی - اس طرح تعمیر کی لاگت بقدر بیس کروڑ ڈالر بڑھ جاتی تھی- یہ بڑی خطیر رقم تھی - میں جانتا تھا کہ یوجین جب سنیں گے تو بھنا جائیں گے - ہوا بھی یہی ، لیکن میں نے یہ الفاظ ان سے کہے جو مجھے اب تک یاد ہیں: ''میں نے ان علاقوں کا دورہ کیا ہے جن پر ہندوستان کے پانی روکنے کا اثر پڑنے کو ہے - ان علاقوں کے لوگوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ہمیں بھوک اور پیاس سے مرنا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم میدان جنگ میں جان دیں - ان لوگوں کو توقع ہے کہ میں انہیں اس کا موقع ضرور دوں گا - ہمارے فوجی جوان اور دوسرے سب لوگ بھی اسی خیال کے ہیں - چنانچہ اگر تم نے دست گیری نہ کی تو سارے ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک آگ لگ جائے گی - یہ انسانی ہمدردی کا ایک سنگین مسئلہ ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی -

''ہم سے جو سودا کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری نہروں میں جو پانی قدرتی طور پر بہہ کر آتا ہے ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں ، اور اس کے بدلے میں پانی کے ذخیرے پر قناعت کریں - اور پانی کے بند کی یہ کیفیت ہے کہ جیسے ہی وہ بن کر تیار ہوتا ہے اس میں گار جمنی شروع ہو جاتی ہے - علاوہ ازیں ہمیں ان بندوں اور سلسلہ ملانے والی نہروں کی تعمیر میں دس یا اس سے بھی زیادہ برس لگ جائیں گے - اور اتنے ہی عرصے کے لئے ہم اپنی ترقی کی راہ میں پیچھے رہ جائیں گے - جتنی محنت اس کام میں صرف ہوگی اسے ہم

دوسرے تعمیری کاموں میں لگا سکتے تھے - چنانچہ در حقیقت ہم بڑی قربانیاں کر رہے ہیں -

''میں جانتا ہوں کہ بعض ممالک بہ کمال مہربانی ہماری امداد کر رہے ہیں - لیکن جب تک ہمیں نئے انتظامات کی ضرورتوں کے علاوہ ، دوسری ضرورتوں کے لئے پانی نہیں ملے گا ، ملک میں ابتری پھیل جائے گی - اس لئے تربیلا ڈیم کی تعمیر ہمارے لئے اشد ضروری ہے -،،

یوجین بلیک نے کہا ، آپ نے میرے کام کو سخت مشکل بنا دیا ہے - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں امداد دینے والی حکومتوں کو بیس کروڑ ڈالر کی مزید رقم دینے پر کس طرح رضامند کر سکوں گا - آپ مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دیں - میں نے کہا : ''جو بات ایسی صاف اور کھلی ہو ، اس پر سوچنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے -،، غرض ہم ہر پھر کر بار بار اس مسئلے پر بحث کرتے رہے - آخرکار وہ ہمارے مطالبے کی حمایت پر تیار ہو گئے - انہوں نے کہا : میں امداد دینے والے ملکوں سے زائد رقم کی درخواست کروں گا جو رھتاس کے بجائے تربیلا ڈیم کے بنانے میں خرچ کرنی ہو گی - انجام کار ہم سے چوہتر (۷۴) کروڑ ڈالر سے زائد رقم کا وعدہ ہو گیا - مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس سے پہلے چودھری محمد علی دس سے لے کر پندرہ کروڑ ڈالر پر فیصلہ کرنے کو تیار تھے اور یہ رقم بھی انہیں قرض کی صورت میں ملتی -

ہمیں دوست ممالک اور یوجین بلیک کا شکر گزار ہونا چاہئے ، جنھوں نے اس کام میں ہماری امداد کی - بعد ازاں انہوں نے لاگت بڑھ جانے کی وجہ سے تربیلا کی تعمیر کے لئے پینتیس (۳۵) کروڑ ڈالر یا اس کے برابر رقم اور دینے کا وعدہ کیا - اس رقم کے دلانے کا سہرا جارج ووڈز کے سر ہے ، جو یوجین بلیک کے بعد عالمی بینک کے صدر مقرر ہوئے تھے -

سندھ کے معاہدۂ آب کی بنیاد دریاؤں کی تقسیم پر رکھی گئی ہے - اس معاہدے کے رو سے دس برس کی عبوری مدت کے بعد جو پاکستان کی درخواست پر تین برس تک اور بڑھائی جا سکتی ہے ،

تین مشرق دریا—راوی ، بیاس اور ستلج ، بلا شرکت غیرے ہندوستان کے حصے میں چلے جائیں گے ۔ اس کے برعکس تین مغربی دریاؤں— سندھ ، جہلم اور چناب —کا پانی بلا شرکت غیرے پاکستان کو مل سکے گا ۔ البتہ ہندوستان کو اجازت ہوگی کہ وہ اسے مقبوضہ کشمیر، مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے منبع کی طرف کے علاقوں میں محدود طور پر استعمال کر سکے ۔ اس عبوری مدت میں پاکستان آبپاری کا ایک نیا نظام تعمیر کر لے گا ، جس سے مغربی دریاؤں کا پانی اس نہری آب پاشی کے لئے استعمال کیا جا سکے گا ، جو اب تک مشرق دریاؤں کے پانی سے ہوتی تھی ۔

سندھ کے نظام آبپاری کا پروگرام دنیا میں اپنی قسم کا سب سے بڑا پروگرام ہوگا ۔ اس پر ایک ارب سات کروڑ ڈالر لاگت آئے گی ۔ جس میں سے ستاسی کروڑ ڈالر پاکستان میں خرچ کئے جائیں گے ۔ اس نظام میں دو بڑے بند پانی جمع کرنے کے لئے بنائے جائیں گے ۔ ایک دریائے جہلم پر جس کے پانی کے ذخیرے کی مقدار سینتالیس لاکھ پچاس ہزار ایکڑ فیٹ ہوگی ۔ دوسرا بالائی سندھ پر جس کے پانی کے ذخیرے کی مقدار بیالیس لاکھ ایکڑ فیٹ ہوگی ۔ علاوہ ازیں پانچ بند اور آٹھ سلسلہ ملانے والی نہریں ہوں گی ، جن کی مجموعی لمبائی تقریباً چار سو میل ہوگی ۔ ان نہروں کے ذریعے مغربی دریاؤں کا پانی ان علاقوں میں پہنچ سکے گا جنھیں پہلے مشرق دریا سیراب کیا کرتے تھے ۔ یعنی یہ نہریں مرکزی باری دوآب اور وادی ستلج کی نہروں کے بجائے انہی کے علاقوں میں پانی بہم پہنچائیں گی ۔ جہلم ڈیم پر پاور اسٹیشن قائم کئے جائیں گے جو آٹھ لاکھ کاوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا کر سکیں گے ۔ ان کے علاوہ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے اور پانی کی نکاسی کا بندوبست کیا جائے گا ۔ تاکہ آب پاشی کے علاقے میں جس کا رقبہ پچیس لاکھ ایکڑ ہے ، سیم اور تھور کا تدارک ہو سکے ۔ جب تک اس نظام کی تعمیر کا کام جاری رہے گا ، ہندوستان طے شدہ پروگرام کے تحت مشرقی دریاؤں کا پانی دیتا رہے گا ۔ اس پروگرام میں پاکستان کی بعض ترقیاتی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا ۔

ان طول طویل مذاکرات کے دوران میں یہ بات ظاہر ہو گئی کہ پاکستان اور ہندوستان میں آبیاری کے اس نظام پر جس کو دونوں حکومتوں نے باہمی سمجھوتے کے تحت منظور کر لیا ہے ، اس قدر زیادہ لاگت آئے گی کہ وہ ان دونوں ملکوں کی بساط سے کہیں باہر ہوگی ۔ اس پر عالمی بینک نے اس سارے پروگرام پر روپیہ لگانے کے لئے ''طاس سندھ کی ترقیات کا فنڈ،، کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا ۔ ہندوستان نے اس فنڈ میں سترہ کروڑ چالیس لاکھ ڈالر دینے کا ذمہ لیا ۔ پاکستان میں اس نئے نظام آبپاشی کی تعمیر پر جو لاگت آئے گی وہ اس طاس سندھ کے فنڈ سے دی جائے گی ۔

اس معاہدے کی تفصیلات سے ظاہر ہے کہ سندھ کے نظام آبیاری کے مجموعی پانی میں سے اسّی (۸۰) فی صدی پاکستان کو ملے گا، اور بیس فی صدی ہندوستان کو ۔ اس معاہدے پر ۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو کراچی میں میں نے، مسٹر نہرو نے اور عالمی بینک کے وائس پریزیڈنٹ آئلف نے دستخط کئے ۔

جیسا کہ میں نے اس معاہدے پر دستخط کرنے کے وقت اپنی قوم سے بیان کیا تھا ، یہ حل جسے انجام کار ہم نے منظور کر لیا ، ایسا تو نہ تھا جسے مثالی کہا جا سکتا ، لیکن موجودہ حالات میں اس سے بہتر بھی ممکن نہ تھا ۔ یہ نہ بھولئے کہ اس جھگڑے نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی تھی کہ اس پر برصغیر میں جنگ چھڑ جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی ۔ چنانچہ اس خطرے نے سنہ ۱۹۵۱ء میں عالمی بینک کو ہمارے جھگڑے میں ثالث بننے پر مجبور کر دیا تھا ۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ ہم سچے دل اور پکے ارادے کے ساتھ اس جھگڑے کا، جو دو ملکوں کے امن کو ملیا میٹ کیا چاہتا تھا ، معقول حل تلاش کرنے میں عالمی بینک کا ہاتھ بٹائیں ، کوئی ایسا حل جو ہم کو زندہ رکھ سکے، جو ہمارے لئے مالی اور فنی وسائل مہیا کر دے ، جن سے کام لے کر ہم مغربی دریاؤں کا پانی اپنی نہروں میں لانے کا انتظام کر سکیں اور ہماری نہریں مشرقی دریاؤں کی محتاج نہ رہیں ۔

سال ہا سال کی نہایت پیچیدہ گفت و شنید ، صبر آزما رد و کد اور

لیت و لعل ، اور آئے دن کے تعطل کے بعد ، ہمیں ایک ایسا حل مل گیا تھا ، جو میرے خیال میں مناسب تھا - ہرچند اس معاہدے پر دستخط ہو جانا کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ، تاہم یہ احساس بھی کچھ کم موجب اطمینان نہ تھا کہ ایک نہایت بھیانک صورت حال ٹل گئی -

جب انسان اس قسم کے نازک مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو اسے حقیقت پسند بننا اور صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہی پڑتا ہے تاکہ وہ اس کے حل کی کوئی معقول صورت نکال سکے - اکثر اوقات سارے کی طلب میں انسان آدھے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے - ہم نے مثالی حل کی جستجو ترک کر دی ، حالات پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی ، حقیقت پسندانہ غور و خوض کیا ، اور حل کو اچھا سمجھ کر قبول کر لیا - اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ہم ایک ایسے وقت جنگ میں الجھ جاتے جبکہ حالات کئی لحاظ سے ہمارے لئے سازگار نہ تھے - چنانچہ جہاں تک ہمارا تعلق تھا ، اس عہد نامے کی بنیاد حقیقت پسندی اور عملی اصول پر رکھی گئی تھی - جذبات کو اس میں دخل نہ تھا ، اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اس حل سے لاکھوں انسانوں کا مستقبل اور عافیت وابستہ تھی - میں پریزیڈنٹ بلیک ، وائس پریزیڈنٹ آئلف اور عالمی بینک کے فنی ماہروں کی جماعت کی کوششوں کو ، جس کے سربراہ جنرل وھیلر تھے ، سراہے بغیر نہیں رہ سکتا - انھوں نے اس جھگڑے کو ایک فنی اور انسانی مسئلے کی صورت بخش دی اور اس کا درجہ سیاسی نزاع کی سطح سے بلند کر دیا -

ہم ان دوست حکومتوں کے بھی شکر گزار ہیں ، جنھوں نے طاس سندھ کی ترقیات کے فنڈ میں عطیے دے کر ہمارے لئے سمجھوتے کی شرائط کو قابل قبول بنانے میں آسانی پیدا کر دی - اس انتظام کی لاگت کا بار اٹھانا ہماری بساط سے کہیں باہر تھا - مگر ان دوست ملکوں نے جن میں امریکہ ، دولت مشترکہ ، آسٹریلیا ، نیوزی لینڈ ، کینیڈا اور مغربی جرمنی شامل ہیں ، بلا تامل مالی امداد کی پیش کش کر کے واضح کر دیا کہ انھوں نے نہ صرف اس معاملے کو ہمدردانہ

طور پر سمجھنے کی کوشش کی بلکہ وہ دنیا کے اس متاثرہ خطے کے استحکام اور سلامتی کو برباد ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے ۔ عالمی بینک نے اپنے طرز عمل سے دنیا کے سامنے اس امر کی بہت عمدہ مثال پیش کی کہ فراخ دلی اور نیک نیتی کے ذریعے گتھیاں کیسے سلجھائی جا سکتی ہیں ۔ میں یہاں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ گفت و شنید کے آخری مرحلوں میں مسٹر نہرو نے اپنا ذاتی اثر استعمال کر کے کئی الجھنوں کو دور کر دیا تھا ، جو عبوری مدت کے انتظامات کے بارے میں پیدا ہو گئی تھیں ۔

معاہدے کی بات چیت کے آخری مرحلوں میں جو جذبہ نظر آتا تھا، اسے دیکھ کر مجھے امید پیدا ہوئی کہ شاید کشمیر کا مسئلہ بھی منصفانہ طور پر صلح صفائی کے ساتھ حل ہو جائے ۔ اب چونکہ پاکستان کو صرف تین مغربی دریاؤں پر قناعت کرنا تھا اس لئے ان کے بالائی حصوں پر اختیار رکھنا ہمارے لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا، تاکہ ہم ان دریاؤں کے پانی کو کام میں لا کر پاکستان کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری کر سکیں ۔ چنانچہ اس معاہدے کی تکمیل کے بعد مجھے مسئلۂ کشمیر اور بھی زیادہ اہم اور فوری حل کا محتاج نظر آنے لگا ۔

اس معاہدے پر دستخط ہو جانے کے بعد ہمارے قومی معاملات میں طویل اور تشویشناک رد و کد اور امید و بیم کا ایک باب ختم ہو گیا، اور ان تھک محنت کا ایک نیا باب شروع ہوا تاکہ ہم پانی کے نئے نظام کے لئے عظیم الشان ذخیرے اور لمبی لمبی سلسلہ ملانے والی نہریں تیار کر سکیں ۔ ہمیں امید ہے کہ ہم سنہ ۱۹۷۰ء تک اس کام کو مکمل کر لیں گے ۔ اس کے بعد ہم پانی کی بہم رسانی کے لئے ہندوستان کے محتاج نہ رہیں گے ۔

نواں باب

خارجہ پالسی – ۱

آزادی مفت ھاتھ نہیں آتی ، اس کے لئے لڑنا پڑتا ھے - کوئی کسی کے لئے نہیں لڑتا ، ھر ایک کو اپنی لڑائی خود لڑنی پڑتی ھے -

پاکستان کی خارجہ پالسی میں گہری اخلاقی اقدار مضمر ھیں - اس کی بنیاد میں یہ شعور کارفرما ھے کہ سب قومیں آپس میں برابر ھیں اور ھر قوم کو حق حاصل ھے کہ اس کی حکومت اپنے ھاتھ میں ھو اور اس کے اپنے نصب العین کے مطابق ھو - پاکستان کی خارجہ پالسی کے بڑے بڑے مقاصد سلامتی اور ترقی ھیں - سلامتی کے مفہوم میں ملک کا دفاع اور نصب العین کی بقا دونوں شامل ھیں - دفاع کی ضروریات کو اس حقیقت نے پیچیدہ بنا دیا ھے کہ ھم دو حصوں میں بٹے ھوئے ھیں - جن کو ایک ھزار میل سے زیادہ لمبے علاقے نے جدا کر رکھا ھے اور یہ علاقہ غیر ھے ، چنانچہ ھر ایک حصے کی حفاظت مجموعی دفاع کے نقشے کے مطابق کرنی لازم ھے- اس جغرافیائی علیحدگی نے اس امر کی اور بھی زیادہ ضرورت پیدا کر دی ھے کہ ان دونوں حصوں کے لوگ آپس میں مل کر ایک ھو جائیں - بالکل ایک اور ناقابل تفریق - جب تک مکمل اتحاد نہ ھوگا، ملک کی سلامتی کو خطرہ درپیش رھے گا - اور چونکہ ھم متخالف نظریوں کی دنیا میں رھتے ھیں ، اس لئے ھمیں اپنے نصب العین کو جو ھماری قومی زندگی کی بنیاد ھے ، پائندہ رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی ھوگی - ترقی کا مسئلہ اس لئے ضروری ھے کہ اس کے بغیر بقا ممکن نہیں - بقا بجائے خود کچھ معنی نہیں رکھتی ، اس کا کچھ نہ

کچھ مقصد ہونا چاہئے - ہمارا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے عوام اپنے عقیدے کی سلامتی میں خوشی کی زندگی گزاریں اور ترقی کریں - مگر یہ مقاصد امن کی فضا ہی میں پروان چڑھ سکتے ہیں - چنانچہ عالمی امن ، خصوصاً اِس خطے کے امن و امان کے ساتھ ہمارا گہرا مفاد وابستہ ہے -

ہمارے پاس اپنے مقصد کے حصول کے لئے نہ تو لامحدود وسائل ہیں اور نہ لامحدود وقت - ہمیں تو جو وقت اور جو وسائل بھی میسر ہیں انہیں کو احتیاط اور خوش تدبیری سے کام میں لانا ہوگا کہ فائدے زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں اور نقصان کم سے کم - ہمیں قومی انداز فکر پیدا کرنا اور قومی حکمت عملی مرتب کرنا ہوگا - آج کل ''آزاد،، خارجہ پالسی کی بڑی رٹ لگائی جا رہی ہے - ''آزاد،، سے مراد ہے اپنے سوا باقی ہر ایک پر نکتہ چینی کرنے اور اسے بُرا بھلا کہنے کی آزادی - لیکن ہم محض اس دکھاوے کے لئے کہ ہماری خارجہ پالسی ''آزاد،، ہے ، دوسروں پر ناحق نکتہ چینیاں کرنا نہیں چاہتے - ہماری خارجہ پالسی کو قومی پالسی ہونا چاہئے ، جس میں ہمارے اپنے فائدوں پر نظر رکھی جائے اور ان کے مطابق قدم اٹھایا جائے - ہمیں ظاہر داری اور اداکاری کی ضرورت نہیں ، سکون اور سنجیدگی سے کام لینا ہے -

دنیا آج مساوات کے لئے لڑ رہی ہے ، افراد کے درمیان مساوات ، اقوام کے درمیان مساوات خواہ وہ بڑی ہوں یا چھوٹی - اس کے لئے ضرورت ہے کہ تمام دنیا صاف صاف اس بات کو تسلیم کر لے کہ ہر قوم مساویانہ حقوق اور مواقع کی مستحق ہے - دنیا کے ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کی ان کے رقبے یا وسائل کی بنیاد پر درجہ بندی نہیں کی جا سکتی - یہ بڑی صاف سی بات ہے اور کوئی بھی اس سے انکار کی جرأت نہ کرے گا - لیکن اس اصول کو دنیا میں نافذ کرانے کے کوئی ذرائع نہیں ہیں - یہ دنیا بڑوں ہی بڑوں کی دنیا ہے - خواہ دو بڑے ہوں یا تین بڑے یا چار یا اور بھی زیادہ - یہی دنیا کی تقدیر کا فیصلہ کرتے اور اس کی راہیں متعین کرتے ہیں - چھوٹے چھوٹے ملک خصوصاً وہ جو ابھی صنعتی

ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے ہیں، ان کا وجود ادنیٰ درجے سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے غلامی کا جوا تو اتار پھینکا ہے، لیکن ابھی ان میں سے اکثر اپنی فضا کو پرانے سامراجی اثرات سے پاک صاف کر کے اپنے انفرادی وجود اور تصورات کو ابھار نہیں سکے۔ ہمیں بھی اپنی انفرادیت کو تسلیم کرانا اور ایک مساوی اور باوقار حیثیت حاصل کرنے کے لئے لڑنا ہے۔

تاریخ نے ہمیں بڑی بڑی حکومتوں کے متضاد مفادات کی راہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہمارے محل وقوع کی وجہ سے ہمیں جنوب مشرق ایشیا میں بھی اور مشرق وسطیٰ میں بھی بڑی جنگی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہندوستان ہمارے وجود کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکا، جس کی وجہ سے کئی مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے اس رویے کو سوائے مریضانہ ذہنیت کے اور کسی طرح تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی لیڈر مسلمانوں سے گہری نفرت رکھتے ہیں، اور چونکہ انھیں اپنے اس جذبے سے ہمیشہ انکار کرنا پڑتا ہے، اس لئے وہ ایک مسلسل ذہنی کش مکش کا شکار رہتے ہیں۔ ہندوستان نے شروع ہی سے ہماری راہ میں مشکلیں پیدا کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ہندوستان نے ہمارے لئے پناہ گیروں کی بحالی کا زبردست مسئلہ اسی لئے پیدا کیا تھا کہ ہماری معیشت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں وہ ساز و سامان دینے سے بھی انکار کر دیا، جس میں ملک کی تقسیم سے پہلے ہمارا حصہ تھا۔ اس نے ہمیں ان دریاؤں کے بہاؤ کا رخ بدل دینے اور ان کا پانی روک دینے کی دھمکی دی جو ہمارے ملک میں بہتے ہیں۔ پھر اس نے تمام معاہدوں اور اصولوں کے خلاف جموں اور کشمیر کی ریاست کے ایک بڑے حصے پر بزور قبضہ کر لیا، اور اپنی فوجیں وہاں جمع کر کے ہمارے ملک کی سلامتی کے لئے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا۔

اِن سب باتوں کی تہ میں ہندوستان کی یہ ہوس کار فرما تھی کہ وہ یا تو پاکستان کو اپنے میں جذب کر لے یا اسے اپنا حاشیہ نشین بنا لے۔ ہندوستانی لیڈروں نے اپنے ارادوں کو ڈھکا چھپا نہیں

رکھا تھا - آچاریہ کرپلانی نے جو سنہ ۱۹۴۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر تھے بالاعلان کہا کہ ''نہ تو کانگرس اور اور نہ قوم اکھنڈ ہندوستان کے دعوے سے دستبردار ہوئی ہے۔''[1] اس زمانے میں سردار ولا بھائی پٹیل نے جو پہلے انڈین ہوم منسٹر تھے اور کانگرس پارٹی کے ''مرد آہن'' کہلاتے تھے، یہ کہا تھا: ''بہت دیر نہ گزرے گی کہ ہم دوبارہ ایک ہو کر اپنے ملک کی اطاعت گذاری میں باہم شریک ہو جائیں گے۔'' آزادی کے روز ہی سے پاکستان اپنے وجود اور اپنی سلامتی کو قائم رکھنے کی تلخ اور طویل جد و جہد میں مصروف ہو گیا تھا - سنہ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کو اپنی سلامتی کی خاطر مجبوراً مغربی طاقتوں سے ناتا جوڑنا پڑا - وہ معاہدۂ بغداد اور جنوب مشرق ایشیا کے دفاعی معاہدے سیٹو کا ممبر بن گیا - یہ دونوں معاہدے اشتراکی دنیا میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے -

سنہ ۱۹۵۸ء میں جب میں نے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے ملک کے معاملات اپنے ھاتھ میں لئے، تو مغربی طاقتوں سے پاکستان کا سیاسی اتحاد مکمل ہو چکا تھا - پاکستانی افواج کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت میں معاہدۂ بغداد سے، جو عراق کے انقلاب کے بعد سینٹو کے نام سے یاد کیا جانے لگا، میرا بھی تعلق رہا تھا، لیکن میری دلچسپی محض اپنے ملک کے دفاع کی حد تک تھی - میں اس انتظام سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر پاکستان کی دفاعی افواج کی تعمیر کرنا چاہتا تھا - ''سیٹو'' سے براہ راست میرا کبھی واسطہ نہ رہا - در حقیقت پاکستانی افواج کو اس معاہدے کی خبر اس وقت دی گئی تھی، جب پاکستان نے اس ادارے کا ممبر بننا منظور کر لیا تھا - میں اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا کہ یہ معاہدات کیوں کر وجود میں آئے -

اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں انقلاب کے وقت میں نے ملک کو کس احوال میں پایا، میں یہاں اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ پیش کرنا چاہتا

۱- امرت بازار پتریکا، کلکتہ ۱۸ - اگست سنہ ۱۹۴۷ء -

ہوں ۔ ہندوستان نے سوویٹ یونین اور ساتھ ہی ساتھ بعض مغربی طاقتوں سے اسلحہ حاصل کر کے اپنی فوجی طاقت بے اندازہ بڑھا لی تھی ۔ اُس نے جموں اور کشمیر کے مقبوضہ علاقے میں خوف اور دہشت کی حکومت قائم کر کے اپنے قبضے کو بہت مضبوط بنا لیا تھا ۔ بیشتر کشمیری لیڈر جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے تھے ، اور تمام شہری آزادیاں سلب کر لی گئی تھیں ۔ اقوام متحدہ کو اپنی قرار دادوں پر عمل درآمد کرانے سے کوئی دل چسپی نہیں معلوم ہوتی تھی ۔ یہ قراردادیں جموں اور کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا آزادانہ اور منصفانہ موقع دلانے کے بارے میں تھیں ، اور ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ان پر عمل کرنے کا اقرار کیا تھا ۔

کمیونسٹ دنیا سے ہمارا بہت کم ربط و ضبط تھا ۔ سوویٹ روس ہمیں شک و شبہ اور بد گمانی کی نظر سے دیکھتا تھا ، اور محض امریکہ کا خیمہ بردار تصور کرتا تھا ۔ چین کی عوامی جمہوریہ سے ہمارے تعلقات بس دور کی صاحب سلامت کے تھے ۔ مشرق وسطیٰ میں ہمارے وقار کو ٹھیس پہنچ چکی تھی جس کے ذمہ دار ہمارے بعض لیڈر صاحبان تھے جنھوں نے نہر سویز کے موقع پر بڑے بے ڈھنگے پن سے کام لیا تھا ۔ صدر ناصر اور ان کے زیر اثر جو عرب ملک تھے، ہم سے بدظن ہو کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہم دنیائے عرب میں پھوٹ ڈلوانے کی کسی گہری سازش میں شریک ہیں ۔ اُدھر افریقی ایشیائی برادری کے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ نہ تھا ۔ اور افریقہ ہمارے لئے ایک تاریک براعظم سے زیادہ کچھ نہ تھا ۔ غرض یہ تھی اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں ہمارے ملک کی صورت حال ۔

ہم ایک دن میں ان سب باتوں کی کایا پلٹ نہیں کر سکتے تھے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے بیرونی تعلقات کے اس سارے سلسلے پر بنیادی طور سے دوبارہ غور و فکر کی ضرورت تھی ۔ ہمارے جغرافیائی محل وقوع کی بعض لازمی خصوصیات پر ابھی نظر نہیں کی گئی تھی ، نہ ان سیاسی مجبوریوں کی نوعیت کا صحیح اندازہ کیا گیا تھا جو ہمیں درپیش ہو سکتی تھیں ۔ میرا خیال ہے کہ یہ

(۱۳ - ا) شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ راولپنڈی میں ملاقات
۲۴ مئی ۱۹۶۴ء

(۱۳ - ب) ہز میجسٹی ظاہر شاہ فرمانروائے افغانستان کے ساتھ کابل میں
یکم جولائی ۱۹۶۴ء

(۱۴-ا) مسٹر جومو کینیاٹا، وزیرِ اعظم کینیا کے ساتھ لندن میں
۹ جولائی سنہ ۱۹۶۴ء

(۱۴-ب) صدر جمال گرسل اور ہز امپیریل میجسٹی شہنشاہِ ایران کے ساتھ اکابر کی کانفرنس میں
استنبول - ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۶۴ء

واقعات کا لازمی تقاضا تھا کہ ہم ان سب باتوں کا جائزہ لینے پر مجبور ہوئے۔

شروع کے برسوں میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی تھی کہ ہندوستان کی طرف سے ہماری سلامتی اور ہمارے وجود کو جو خطرہ درپیش ہے، وہ حقیقی بھی ہے اور مستقل بھی۔ ہندوستانی خارجہ پالسی کا واحد مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان بے یار و مددگار رہ جائے اورٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ اس خطرے کے باعث ہمیں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا، میں نے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے ان کی جانچ پڑتال کی تھی اور مجھے اپنی صورت حال کے کمزور پہلوؤں اور کوتاہیوں کا علم ہو گیا تھا۔ ہم نے ہندوستان کو یہ یقین دلانے میں کوئی کسر آٹھا نہ رکھی کہ ہم اس کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کے ہمسایے میں ایک طاقتور اور خود مختار اسلامی مملکت بھی اپنا وجود رکھے۔ چنانچہ ہمیں ٹھنڈے دل سے اور حقیقت پسندانہ طور پر صورت حال کا معائنہ کرنا پڑا۔ اور دوسرے ملکوں خصوصاً اپنے ہمسایوں کے ساتھ اپنے تعلقات اپنی سلامتی کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے ہوئے استوار کرنے پڑے۔

جب میں اس مسئلے سے دوچار تھا تو مجھے اپنے ملک کی جغرافیائی اور سیاسی صورت حال کا گہرا احساس ہوا۔ میں نے سب سے پہلا سوال اپنے آپ سے یہ کیا: ''وہ کون کون سے بڑے ملک ہیں جن کو پاکستان سے دل چسپی ہے؟،، اس کے بعد یہ معلوم کرنا تھا کہ ان کی دل چسپی کی نوعیت کیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ تعلقات کا ایک ایسا سلسلہ پیدا کیا جائے کہ ہمارا ملک غنیم کے حملے سے بھی محفوظ رہے اور اسے ترقی کرنے اور متحد ہونے کی مہلت بھی مل جائے۔

پہلے جغرافیائی محل وقوع کو لیجئے۔ مشرقی پاکستان کی حالت یہ ہے کہ اسے تین طرف سے ہندوستان نے گھیر رکھا ہے۔ چوتھی طرف سمندر ہے جو وہاں پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سمندر پر قابو رکھنا غنیم کے لئے کچھ مشکل بات نہیں۔ آدھر مغربی پاکستان

تین بہت بڑی بڑی طاقتوں کے مقام اتصال پر واقع ہے - اوپر سوویٹ یونین ہے ، شمال مشرق میں چین کی عوامی جمہوریہ اور جنوب مشرق میں ہندوستان - غالباً دنیا میں ایسی اور کوئی مثال نہیں ہے کہ ایک چھوٹے ملک کے ہمسائے اتنے زبردست ممالک ہوں ، چاہے اسے خوبی کہئیے یا خرابی - اب ایک طرح سے یہ جغرافیائی محل وقوع کمزوری کا باعث ہے ، لیکن اگر ہم ان ممالک سے جن میں ہم گھرے ہوئے ہیں، خوش گوار تعلقات قائم کرنے اور میل ملاپ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری یہی کمزوری طاقت کا موجب بن سکتی ہے -

ان میں سے ایک ملک یعنی ہندوستان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے - اس لئے ہمیں ہندوستان کی کٹر دشمنی کو گوارا کرتے ہوئے جینے کا ڈھب نکالنا ہوگا -

اب سوویٹ یونین کو لیجئے - ہم نے سیٹو اور سینٹو میں شامل ہو کر اسے بیگانہ بنا لیا تھا اور اس کی ہمدردی سے محروم ہو گئے تھے، لیکن چونکہ ہم نے اس کے خلاف کبھی کسی منصوبے یا کارروائی میں حصہ نہیں لیا ، اور ہمارا ان معاہدوں میں شرکت کرنا محض اپنی سلامتی کے تقاضوں کے تحت تھا ، اس لئے پورا پورا امکان ہے کہ ہم اس کے شکوک اور وسوسے رفع کرکے اس سے مفاہمت پیدا کر لیں -

اور پھر چین کی عوامی جمہوریہ تھی جو بڑی تیزی سے بڑی طاقتوں کی صف میں اپنی جگہ بنا رہی تھی - چین زندگی کے تمام شعبوں میں قابل قدر ترقی کر رہا تھا - اور اپنے ہمسایوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا سخت خواہش مند معلوم ہوتا تھا - ہمیں بس اتنا ہی کرنا تھا کہ اسے اپنے خلوص اور خیر سگالی کا یقین دلا دیں -

اس صورت حال سے یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم اپنے تینوں بڑے ہمسایوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم نہیں کر سکتے تو دو ہی کے ساتھ سہی - ان کے آپس میں کچھ اندرونی اختلافات ہوں گے، مگر ہمیں ان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں - ہمارے نئے انداز فکر میں یہ بات لازمی طور پر شامل تھی کہ ہم دوسرے ملکوں کے اندرونی اختلافات اور تنازعات سے خود کو الگ تھلگ رکھیں -

نہ ان کے مسائل کی بابت فلسفہ بگھاریں، اور نہ خدائی فوجدار بنیں ۔ اسی بنیاد پر میں نے چین کی عوامی جمہوریہ اور سوویٹ یونین سے اپنے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لئے قدم بڑھایا تھا ۔ انہی معنی میں ہمارے ملکوں کی جغرافیائی حدود اور اس سے پیدا ہونے والے سیاسی تقاضوں سے پچھلے چند برسوں میں ہماری خارجہ پالسی کا رخ اور راستہ متعین ہوا ہے ۔

پھر ہمیں اپنے ملک کو ترقی دینے کی ضرورت بھی تھی تاکہ عوام کے رہنے سہنے کے معیار کو بہتر بنایا جا سکے ، اور اس جد و جہد کی بنا پر پاکستان کے دونوں صوبوں کے عوام میں اور زیادہ یک جہتی پیدا ہو ۔ ترقی کے لئے وسائل کا ہونا لازمی ہے، اور ہمارے سماجی حالات اور ہماری اقدار اس بات کی متقاضی نہ تھیں کہ یہ وسائل اندرونی طور پر جبری نظام کے ذریعے پیدا ہو سکتے یا کام میں لائے جا سکتے ۔ اس لئے ہمیں ضروری سماجی استعداد پیدا کرنے اور بنیادی سرمایہ مہیا کرنے کے سلسلے میں بیرونی امداد کی جستجو کرنی پڑی ۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں سے جو ہمیں اقتصادی امداد دے سکتی ہیں بہت اچھے تعلقات رکھیں ۔ امداد کے ساتھ کچھ زیر باری اور کچھ مطالبات بھی عائد ہو جاتے ہیں ۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم پر کوئی ایسی زیر باری عائد نہ ہو جس سے ہمارے قومی مفاد یا وقار کو نقصان پہنچتا ہو ۔

یہاں شاید کہا جائے کہ مسئلہ اتنا سیدھا سادا نہیں ۔ لیکن ہمارے نقطہ نظر سے یہی طرز عمل معقول اور حقیقت پسندانہ تھا ۔ مقصد یہ تھا کہ چاروں بڑی طاقتوں کے ساتھ جن کا ایشیا میں دخل ہے ، اچھے تعلقات قائم کیے جائیں اور کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ دیا جائے ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک سادہ سا اصول وضع کیا گیا ۔ وہ یہ کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ علیحدہ علیحدہ روابط قائم کرنے کی کوشش کریں گے ، لیکن اس واضح شرط کے ساتھ کہ ان روابط کی نوعیت اور ان کی شکل ایسی ہوگی کہ ان سے مشترک مفادات کو ترقی تو ہو ، مگر کسی تیسرے فریق کے

جائز مفادات پر زد نہ پڑے - یہ طرز عمل اس لئے اختیار کیا گیا کہ ہماری قوم جو دیانت دارانہ، سیدھے اور صاف رویے پر ایمان رکھتی ھے، اس کی قدر کرے گی اور اسے سمجھ سکے گی -

مجھے خطرات کا بھی علم تھا - کوئی باھمی رابطہ بالکل الگ تھلگ رہ کر قائم نہیں کیا جا سکتا - دوسرے روابط کا اس پر اثر انداز ہونا ضروری ھے - انجام کار اس کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ تیسرا فریق کس حد تک اس کا روادار ہو سکتا ھے - لٰہذا ھر ایک رابطے کا ان فریقوں کے لئے بھی قابل قبول ہونا شرط ھے ، جن کے ساتھ ہم نے باھمی مشترک مفاد کے لئے ایسا ھی رابطہ قائم کیا ہو - یہی وہ مقام ھے جہاں مشکلات اور پیچیدگی پیدا ہونے کا احتمال ھے - اس کی مثال ایسی ھے جیسے کوئی تکونے تنے ہوئے رسے پر چلنے کی کوشش کرے - باھمی تعلقات کے سلسلے میں رواداری کی حدود کیا ہوں گی، اس بات کا صاف طور پر تعیّن کر لینا لازمی ھے - مثال کے طور پر اگر ہم امریکہ کے مفادات یا ایشیا میں اس کی حکمت عملی کا لحاظ رکھے بغیر کمیونسٹ طاقتوں سے باھمی روابط قائم کریں تو امریکہ اس بات کا زیادہ خواھش مند نہیں ہوگا کہ ھمیں غیر محدود اقتصادی اور فوجی امداد دیتا رہے - لٰہذا اگر ہم خود کو غیر محدود طور پر امریکی مفادات کا حامی نہیں بنا سکتے تو ھمیں غیر محدود امریکی امداد سے کم تر درجے کی امریکی امداد سے کام چلانا ہوگا -

اسی طرح ھمیں امریکہ پر یہ بات واضح کر دینی ہوگی کہ ہم اپنے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر کس حد تک اس کا ساتھ دے سکتے ھیں - چین کی عوامی جمہوریہ سے بیگانگی برتنا ہمارے مفاد کے خلاف ھے - اسی طرح سوویٹ یونین سے خوش گوار دوستانہ تعلقات قائم کرنا ہمارے مفاد کے حق میں ھے - چنانچہ امریکہ کو اس امر کا یقین دلایا جا سکتا ھے کہ چین کی عوامی جمہوریہ یا سوویٹ یونین سے ہمارے تعلقات ایشیا میں امریکی مفادات کے خلاف نہیں ھیں - امریکہ ھمیں جو اقتصادی امداد دے ، اس کے بدلے میں ہم اسے اپنی خیر سگالی اور تجارت و صنعت کے میدان میں اشتراک عمل کے بڑھتے ہوئے مواقع پیش کر سکتے ھیں - لیکن اس کے بدلے میں

وہ ہم سے کسی ایسی بات کی توقع نہ رکھے جس سے کسی تیسرے فریق کو نقصان پہنچتا ہو ۔ اگر امریکی مسائل سے ہمارا ہمدردی رکھنا اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا، امریکہ کی عالمی پالسی کے لئے سازگار ہے، تو چشم ما روشن دل ما شاد ۔ لیکن اگر وہ اس سے زیادہ کا طلب گار ہو اور چاہے کہ ہم کوئی ایسا کام کریں جس سے کسی دوسری طاقت کے مفادات پر زد پڑتی ہو تو ہمیں اس مطالبے کو نامنظور کر دینا ہوگا، کیونکہ یہ خود پاکستان کے مفادات کے خلاف ہے ۔ میں یہ جانتا تھا کہ ہمارے اس نئے طرز عمل کی بنا پر بعض اوقات ہمیں اس طرح کی صورت ضرور درپیش ہوگی ۔ اس صورت میں ہمارے ملک کے ذمہ دار افراد کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ کونسی بات قبول کریں ۔ کسی بڑی طاقت کے دباؤ میں آ کر اس کی بات مان لیں یا سیاسی ، فوجی یا اقتصادی جو امداد بھی ملنے والی ہو ، اس سے دست بردار ہو جائیں ۔ اس کا آخری فیصلہ بہر حال پاکستان کے عوام کو کرنا ہوگا ۔

اس کا بھی امکان ہے کہ اگر ہم اعتدال اور تدبر سے کام لیں تو اس قسم کا دو ٹوک فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہ آئے ۔ چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر اب سوویٹ یونین اور امریکہ کی وہ اگلی سی عداوت رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے ۔ اور آئندہ کئی برس تک یہ تینوں طاقتیں مختلف ملکوں میں اپنا اپنا حلقۂ اثر قائم کرنے کی جد و جہد میں مصروف رہیں گی ۔ ان میں سے کوئی طاقت بھی کسی ابھرتے ہوئے ملک سے پورے طور پر علیحدگی اختیار کر لینا یا اس کی دشمنی مول لینا پسند نہیں کر سکتی ۔ بہر کیف ہمیں کسی دو ٹوک فیصلے پر مجبور کیا جائے یا نہ کیا جائے ، ہماری سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان بڑی بڑی طاقتوں سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم تمہارے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے ۔ ہم تو بس اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ملک کی سلامتی اور عوام کے باہمی اتفاق اور ترقی کے لئے کام کرنے دیا جائے ۔ ہم ان کے ساتھ اقتدار کی کشمکش میں شریک ہونے کے لئے کوئی سودا نہیں کر سکتے ۔

ہمارے اس طرز عمل کو اس قسم کی ''غیر جانبداری،، کے ساتھ

بڑی آسانی سے گڈمڈ کیا جا سکتا ہے، جسے ہندوستان نے پچھلی دھائی کے ابتدائی سالوں میں اپنا شعار بنا رکھا تھا، اور جو آخر میں دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ اس میں اور ہمارے اس طرز عمل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ تو غیر جانب داری کا محض ایک انداز تھا جس کا بہتر سے بہتر مفہوم یہ تھا کہ کس طرح دونوں فریقوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اور بدتر معنی میں اسے ریاکاری، منافقت اور حیلہ سازی کہا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصے تک ہندوستان اپنی وسعت اور ایشیا میں اپنی جنگی اہمیت کے باعث، یہ ڈھونگ کامیابی سے رچائے رہا۔ اس کی غیر جانب داری اپنے کو بڑا ظاہر کرنے کی ایک کوشش اور اپنے اثر کو پھیلانے کا ایک حیلہ تھی۔ لیکن ہمارے دل میں ایسے مغالطے راہ نہیں پاتے۔ ہمارا مقصود تو بس یہ ہے کہ اپنے وسائل کو کفایت سے کام میں لائیں اور الجھاووں سے بچیں۔

ہندوستان نے خود کو روشنی کے ایک مینار کے طور پر پیش کیا تھا جس کی روشنی بھٹکی ہوئی انسانیت کی ہدایت کے لئے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب تک امریکہ اور سوویٹ یونین میں کشیدگی باقی تھی، وہ اپنا یہ بہروپ قائم رکھ سکتا تھا، اور دونوں کے درمیان ایک پل کا کام بھی دے سکتا تھا۔ چونکہ بڑی طاقتیں اپنی باہمی جد و جہد میں مصروف تھیں اورچین پر ابھی ہندوستانی ذہنیت کا انکشاف نہیں ہوا تھا، اس لئے ہندوستانی لیڈروں کے لئے یہ ممکن تھا کہ فلسفے کا درس دیتے رہیں، اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں کے خلاف ہندوستان کے عزائم کی اعانت کریں۔ میرے خیال میں وہ اس کام میں حد سے بڑھ گئے اور خود فریبی میں آ گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے قول اور فعل میں زیادہ سے زیادہ تضاد پیدا ہوتا گیا اور اس کی تاویل کرنا مشکل سے مشکل تر ہو گیا۔

عالمی طاقتوں اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمارا طرز عمل اس احساس پر مبنی ہے کہ ہماری بساط محدود ہے۔ ہمیں نہ تو اس کی خواہش ہے نہ مقدور کہ ہم ان کے جھگڑوں میں خود کو پھنسا لیں۔ ہم اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ ان کے فیصلوں پر اثر ڈال سکیں یا ان کے

مسائل کو سلجھا سکیں ۔ چنانچہ ہماری خارجہ پالسی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں ۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ ہم اپنے اندرونی معاملوں کو سلجھائیں ، اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کریں ۔ ان کی بھلائی کے لئے کوشاں ہوں اور اپنی سیاسی اور نظریاتی انفرادیت کو برقرار رکھ سکیں ۔ اسی مفاہمت کے دائرے کے اندر رہ کر ہم دوسرے ملکوں کی امداد کے جویا ہیں ۔ ہم ان سے ایسے مطالبات نہیں کرنا چاہتے، جن کا ماننا ان کے لئے مشکل ہو یا ان کے مقدور ہی میں نہ ہو ۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جلد اس حیثیت میں آ جائیں جہاں ہمیں زیادہ امداد کی ضرورت نہ رہے اور ہمارے مطالبات کم سے کم ہوتے چلے جائیں ۔ نام نہاد غیر جانب داری کا مقصد ہے ایسی حیثیت اختیار کرنا جہاں زیادہ سے زیادہ سودے بازی کی جا سکے ۔ ہمارا تصور دوسرے ملکوں سے باہمی تعلقات کی بابت یہ ہے کہ اپنے وسائل اور حیثیت کو دیکھ کر اور اپنی حدود میں رہ کر نیز دوسرے ملک کے وسائل اور مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے باہمی رابطہ قائم کیا جائے ۔ ہم دوسروں سے سودے بازی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ۔ ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ حتی المقدور ہماری مدد کریں گے اور اس کے بدلے میں ہم حتی المقدور ان کی مدد کریں گے ۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ بڑی طاقتوں اور خصوصاً اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمارے تعلقات محض سرسری سے ہوں گے ۔ اور اگر کل کلاں کو پاکستان پر کوئی مصیبت آئی تو کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچے گا ۔ میں اس بات کو مانتا ہوں ۔ لیکن ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ پاکستان کی حفاظت بہر صورت خود ہمیں کو کرنی ہے ۔ کسی دوسرے ملک سے اس کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر ہمیں اپنی دفاعی تیاری اور دوسرے اقدامات کرنے ہوں گے ۔ بڑی طاقتوں کے خود اپنے مسائل ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات کے ساتھ ان کی پالسیاں بھی بدل جائیں ، اور انجام کار ہم خود کو بے یار و مددگار پائیں ۔ یہی وہ

مقام ہے جہاں خداوند تعالیٰ پر ہمارا بھروسا ہماری آس بندھاتا ہے کیونکہ : ''دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تراست،،

دو قوموں کے درمیان جو جنگ و جدال ہوتے ہیں اس سے دوسری قومیں الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں - اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو لامحالہ دوسری طاقتیں بھی اس میں کھنچ آئیں گی - مگر ہمیں اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ دوسری قومیں کیا کریں گی اور کیا نہیں کریں گی ، دشمن کے مقابلے کے لئے اپنی طاقت کو بڑھانا اور اپنے عزم کو مضبوط بنانا چاہئے -

(۲)

خارجہ پالسی کے عام اصول بیان کر دینے کے بعد اب میں دوسرے ملکوں سے پاکستان کے روابط پر روشنی ڈالوں گا ، اور بتاؤں گا کہ یہ روابط کب اور کیسے شروع ہوئے ، ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کو قائم کرنے میں ہمیں کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا -

سب سے پہلے میں ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کا ذکر کروں گا - آزادی کے بعد سے لے کر اب تک ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی جو کیفیت رہی ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں - پچھلے اٹھارہ برس میں پاکستان نے بہتیرا چاہا کہ ہندوستان سے اچھے ہمسایوں کا سا رشتہ قائم ہو جائے مگر کامیابی نہ ہوئی - میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب سے پہلے پاکستانی رہنماؤں نے ہندوستان سے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر لینے کے لئے بڑا زور لگایا تھا - مگر ہندوستان کی طرف سے کچھ اس قسم کی حجتیں پیش کی جاتی رہیں : ''آؤ ہم اپنے جھگڑوں کو بھلا دیں - آؤ ہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں - آؤ ہم اپنی تجارت کو بڑھائیں - دونوں ملکوں میں آمد و رفت کھل جائے - اور دونوں طرف کے ثقافتی وفد آئیں جائیں - اس طرح فریقین کے جذبات میں گداز پیدا ہو جائے گا - بس ایک مرتبہ دونوں طرف خیر سگالی اور مفاہمت کی فضا پیدا ہو گئی تو پھر سب مسئلے آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے-،،

ہندوستانیوں کو اپنا یہ استدلال بڑا معقول معلوم ہوتا ہے اور وہ اکثر چوٹ کھائی ہوئی معصومیت کے انداز میں ، کہا کرتے ہیں کہ ہم

نے تو بڑے خلوص اور سچے دل سے کوششیں کر دیکھیں ، مگر پاکستان سے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملا ۔

پاکستان کی پوزیشن کیا ہے؟ پاکستان یہ سوال کرتا ہے کہ جب تک بنیادی اختلاف اور جھگڑے باقی رہیں، خیر سگالی اور مفاہمت کی فضا کیسے پیدا ہو سکتی ہے ۔ اگر ھندوستان پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاھدہ کرنا چاھتا ھے ، تو وہ جنگ کی اتنی زبردست تیاری کیوں کر رہا ہے؟ ھندوستان والے جواب میں کہیں گے کہ یہ جنگی تیاری چین کے حملے کو روکنے کے لئے ھے ۔ لیکن اس کی کیا وجہ ھے کہ جو جنگی مشین وہ تیار کر رہے ھیں وہ دراصل میدانی علاقوں ھی میں کام دے سکتی ھے ۔ پاکستان اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتا ھے کہ ھندوستان اپنی موجودہ پوزیشن میں چند گھنٹے کے اندر اندر پاکستان کے خلاف بھاری فوجیں میدان میں آتار سکتا ہے؟ دفاعی معاملوں میں ملک اپنی پالسیاں دوسروں کے ارادوں کی بنیاد پر نہیں بنایا کرتے ، ان کو دوسروں کی جنگی استعداد پر نظر رکھنی پڑتی ھے ۔ اگر ھندوستان جیسا بڑا ملک پاکستان پر حملہ کرنے کی استعداد رکھتا ھے ، تو ارادے ھمیشہ بدل سکتے ھیں خواہ کوئی معاھدہ ھو یا نہ ھو ۔ ''جنگ نہ کرنے کا معاھدہ'' اس وقت تک کچھ معنی نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے ساتھ ھی ساتھ یہ معاھدہ نہ ھو کہ فریقین کتنی کتنی تعداد میں فوج رکھ سکتے ھیں ۔

ھمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاھئے کہ جنگ نہ کرنے کے معاھدے کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔ یہ اس لئے پیش آئی کہ دونوں ملکوں میں ایسے جھگڑے موجود ھیں، جن کی وجہ سے جنگ چھڑ سکتی ھے ۔ اب اگر ان جھگڑوں کو منصفانہ اور آبرو مندانہ طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو محض جنگ نہ کرنے کا معاھدہ جنگ کے خطرے کو ٹال نہیں سکتا ۔ یہ معاھدہ جبھی بامعنی ھو سکتا ھے کہ ان جھگڑوں کے آبرو مندانہ تصفیے کے لئے کم از کم ایک معقول مشینری بھی قائم کرے ۔ اس قسم کی مشینری کو دونوں ملکوں کا اعتماد اور دونوں ملکوں کی حمایت حاصل ھونی چاھئے ۔ اور

یہ بندوبست بھی ہونا چاہئے کہ اگر دونوں فریقوں میں اتفاق نہ ہو سکے تو اس معاملے کو کس طرح پُر امن طریق سے حل کیا جائے گا۔ فوج میں کمی کئے بغیر اور مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی مشینری بنائے بغیر، جنگ نہ کرنے کے معاہدے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک خاص وقت پر نیک ارادوں کا اظہار کر دیا جائے اور بس۔ اس قسم کا خالی خولی معاہدہ یقیناً دنیا کی نظروں میں ہندوستان کے اس دعوے کو تقویت پہنچائے گا کہ اس کے ارادے پُر امن ہیں۔ اس سے یقیناً پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، کیونکہ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ یہ ارادے کسی لمحے بھی بدلے جا سکتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جھگڑے آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے، تو یہ بھی کہنے کی بات ہے۔ بنیادی جھگڑوں کو جن کے ساتھ لوگوں کی زندگی اور آزادی وابستہ ہو، بالائے طاق نہیں رکھا جا سکتا اور نہ انہیں وقت کی دھول میں دفن کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسئلے پھٹ پڑتے ہیں۔ کیونکہ بنی نوع انسان کو ابدی غلامی میں نہیں جکڑا جا سکتا۔

یہ وہ نکتہ ہے جسے جموں و کشمیر کے مسئلے پر غور کرتے وقت ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو نظر کے سامنے رکھنا چاہئے۔ یہ مسئلہ ریاست کے عوام کا مسئلہ ہے جو اپنا حق خود ارادیت منوانے کے لئے زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ اور جب ہندوستان کہتا ہے کہ خیر سگالی پیدا ہونے دو، مسئلے آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے تو وہ اس بات کی بھی ضمانت نہیں دیتا کہ اس اثنا میں مسئلوں کو جوں کا توں رہنے دیا جائے گا۔ تمام شواہد سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان والے ان مسئلوں کو اپنے حسب منشا حل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے ایک بڑے حصے پر طاقت کے بل پر قبضہ کر رکھا ہے، وہ اس قبضے کو مضبوط بنا رہے ہیں۔ وہ ریاست کی آبادی کی نوعیت کو بدل رہے ہیں۔ ان کے اس قول کا کہ ''خیر سگالی پیدا ہونے دو'' اگر کچھ مطلب ہے تو یہ کہ ''ہمیں من مانی کرنے دو۔''

پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان متعدد معاملوں پر جو معاہدے ہوئے ان سب کا ریکارڈ موجود ہے ۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ہندوستان نے کس صورت میں اور کہاں تک ان معاہدوں کی پابندی کی ۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ آزادی کے موقع پر پاکستان کو کس طرح اپنے حصے کا ساز و سامان ، روپیہ پیسہ ، اسٹور اور گولہ بارود دینے سے انکار کیا گیا تھا ، حالانکہ ان میں سے ہر ایک مد کے بارے میں باقاعدہ معاہدے ہو چکے تھے جن کی پابندی کرنے کا دونوں مملکتوں نے اقرار کیا تھا ۔ اقوام متحدہ نے ہندوستان و پاکستان کی قرار داد پر عمل کرانے کے لئے اپنا ایک کمیشن مقرر کر رکھا ہے ۔ یہ قرار داد جموں و کشمیر کے تنازعے کے بارے میں ہے ، جس میں ہندوستان و پاکستان دو فریقوں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ لیکن جب کبھی اس قرار داد پر عمل کرانے کی کوشش کی جاتی ہے ہندوستان ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اس کوشش کو رد کر دیتا ہے ۔ پہلے تو وہ یہ کہتا رہا کہ جموں و کشمیر کے حالات کو معمول پر آ جانے دو اس کے بعد وہاں لوگوں کو اپنا حق خود ارادیت استعمال کرنے کا موقع دیا جا سکے گا۔ اور جب حالات معمول پر آ گئے تو اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اب چونکہ حالات پُر سکون ہو گئے ہیں اس لئے لوگوں کی رائے کا ذکر نہ چھیڑا جائے کیونکہ اس سے معاملات پھر بگڑ جائیں گے ۔ غرض شروع سے لے کر آخر تک ہندوستان کی پالیسی کا یہی انداز رہا ہے ۔ یعنی کبھی تو یہ کہ ''پہلے حالات کو معمول پر آ جانے دو، اس کے بعد ہم اس مسئلے کو حل کریں گے۔'' اور کبھی یوں کہ : ''اب حالات معمول پر آ گئے ہیں تو گڑے مردے کیوں اکھاڑے جائیں۔''

پنڈت جواہر لال نہرو سے میری دو ملاقاتیں ہوئی تھیں ۔ ایک تو یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو نئی دھلی میں پالم کے ہوائی اڈے پر ، اور دوسری ۱۹ اور ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان جب وہ دریائے سندھ کے معاہدۂ آب پر دستخط کرنے پاکستان آئے تھے ۔ پالم کی ملاقات تقریباً دو گھنٹے تک رہی ۔ اس کے آخر میں ہم نے ایک

مشترک بیان جاری کیا جس میں ہم نے اپنے تعلقات کو ایک معقول اور سوچی سمجھی بنیاد پر قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ ہم نے اس امر پر بھی اتفاق کیا تھا کہ ہمیں اپنے بڑے بڑے معاملوں اور مسئلوں کو انصاف، دیانت داری، دوستی، تعاون اور ہمسایہ داری کے نیک جذبے کے ساتھ حل کرنا چاہئے۔ بعد میں میں نے اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ''ضرورت ہے معاملات کو دوبارہ جانچنے کی، بھول جانے اور معاف کر دینے کی، اور ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ حقیقت پسندانہ، عاقلانہ اور ہوشمندانہ رشتہ قائم کرنے کی۔''

مجھے یہ تو محسوس نہیں ہوا کہ پنڈت نہرو کو مجھ سے مل کر کوئی غیر معمولی خوشی ہوئی، لیکن وہ میرے بعض مشوروں سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک تھکے ہوئے انسان معلوم ہوئے گو ابھی تک ان میں لڑائی کا دم خم اور سیاسی سوجھ بوجھ موجود تھی۔ وہ تصوریت یا افلاکی نظر جو اکثر ان سے منسوب کی جاتی ہے، مجھے ان میں نظر نہ آئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری رائے میں ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات بے راہروی کا نتیجہ ہیں، تدبر کو اس میں دخل نہیں۔ اس کا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ فریقین میں سے کسی نے بھی ہمسایگی کے تعلقات قائم کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ دونوں طرف کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ساری سماجی اور اقتصادی برائیاں برطانیہ کے دم قدم سے ہیں، جیسے ہی برطانیہ کا قدم یہاں سے ہٹا ہر چیز پر بہار آ جائے گی۔ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کا یہ خیال پورے طور پر درست نہ تھا۔ گو ہماری بہت سی مصیبتیں برطانوی راج ہی کی وجہ سے تھیں۔ دونوں ملکوں میں بہت سی مصیبتیں لائی گئیں، بہت نفرت و حقارت پیدا کی گئی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ آئندہ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ سروکار نہ رکھنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں ابھی موقع ہے کہ عاقلانہ اور ہوشمندانہ بنیادوں پر باہمی تعلقات استوار کرنے کا منصوبہ بنا لیا جائے۔

پنڈت نہرو نے جنگ نہ کرنے کے اعلان کا ذکر کیا۔ میں نے

کہا کہ اس قسم کا اعلان کرنے سے بہتر ہوگا کہ پہلے ہم اپنے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک مشینری قائم کرنے کا فیصلہ کریں - نیز جنگ نہ کرنے کے اعلان کو موثر بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے مقابل میں اور اسی نسبت سے خود کو غیر مسلح کر لیں - میں نے انہیں بتایا کہ فوجی نقطہ نظر سے استعداد بڑا خطرناک عنصر ہوتی ہے - اگر کوئی ملک فیصلہ کن فوجی استعداد رکھتا ہے ، تو وہ جب چاہے اپنے ارادے کو بدل سکتا اور حملہ آور ہو سکتا ہے - میں نے انہیں یاد دلایا کہ ہندوستان نے دو مرتبہ ، ایک دفعہ سنہ ۱۹۵۰ء میں اور دوسری دفعہ سنہ ۱۹۵۱ء میں ، پاکستان کے خلاف اپنی فوجیں جمع کر لی تھیں ، حالانکہ فوجی لحاظ سے اس کا کوئی جواز نہ تھا -

اس کے بعد میں نے کشمیر کا مسئلہ اٹھایا - میں نے انہیں بتایا کہ اس مسئلے میں صرف اہل کشمیر ہی فیصلہ کن رائے دے سکتے ہیں - اس لئے ایسا ماحول تلاش کرنا لازمی ہے ، جو جموں و کشمیر کے لوگوں کو مطمئن کر سکے - مسٹر نہرو نے میرے خیالات سے اختلاف تو نہ کیا ، مگر دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا - انہوں نے کہا کہ اس کی ابتدا یوں ہو کہ سرحد پر جھڑپیں اور فائرنگ بند ہو جائے -

ہماری دوسری ملاقات ۲۱- ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو مری میں ہوئی- ہم نے پہلی ملاقات میں بات چیت کا سلسلہ جہاں چھوڑا تھا وہیں سے آگے شروع کیا - میں نے پھر کشمیر کا مسئلہ چھیڑ دیا - میں نے کہا کہ یہ اس جھگڑے کو چکانے اور ہندوستان و پاکستان میں امن و امان قائم کرنے کا بڑا مبارک موقع ہے - آپ ہندوستان کے تسلیم شدہ لیڈر ہیں- اور شاید پاکستان کے لوگ میری بات بھی سننے کو تیار ہو جائیں - ایسا اتفاق شاید پھر مدتوں نہ ہو - چنانچہ اس موقع کو ہاتھ سے گنوا دینا، بڑے ہی افسوس کی بات ہوگی - یہ خیال کہ وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان مسئلہ جموں و کشمیر کے آبرومندانہ اور منصفانہ حل کی ضرورت کو بھول جائے گا ، بڑا ہی غیر حقیقت پسندانہ ہوگا - ملک کا بچہ بچہ اس معاملے میں یک دل و

یک زبان ہے ، اور پاکستان کی کوئی حکومت بھی اس مسئلے کو پس پشت نہیں ڈال سکتی۔

میں نے انھیں کشمیر اور مغربی پاکستان کا ایک نقشہ دکھایا ، اور بتایا کہ کس طرح ہماری تمام ریلوں اور سڑکوں کے سلسلے کٹ گئے اور نہروں کے ہیڈ ورکس کس طرح باہر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کی سلامتی کا تقاضا ہے کہ اس مسئلے کو منصفانہ طور پر حل کیا جائے۔ اب اس کی ایک اور اقتصادی وجہ بھی پیدا ہو گئی ہے، کیونکہ مغربی پاکستان کو صرف تین ہی دریاؤں کے پانی پر گزارا کرنا ہوگا پاکستان کو ان دریاؤں کے ایک ایک قطرے کو جمع کرنا ہوگا اور یہ صرف کشمیر کے پہاڑی علاقوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کو مزید بجلی کی ضرورت ہوگی۔ یہ ضرورت بھی صرف ان ہی علاقوں کے ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشنوں سے پوری ہو سکے گی۔ اگر ہندوستان و پاکستان کو دو اچھے ہمسایوں کی طرح مل جل کر رہنا ہے ، تو اس مسئلے کو ایک نہ ایک دن حل کرنا لازمی ہوگا۔ اگر یہ مسئلہ صلح صفائی اور عزت آبرو کے ساتھ اور دونوں حکومتوں کے قول و قرار کے مطابق حل ہو جائے تو دونوں کو بے اندازہ فائدے حاصل ہوں گے۔ اور اس طرح ہندوستان اس قابل ہو سکے گا کہ اپنی فوج آدھی کر دے ، اور ہم بھی اپنے فوجی اخراجات میں اسی تناسب سے تخفیف کر سکیں گے۔

اس موقع پر پنڈت نہرو نے بہت رُک رُک کر اور سوچ سوچ کر میری باتوں کا جواب دینا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہو گیا ہے۔ فریقین اپنی اپنی بات پر سختی سے اڑ گئے ہیں اور اس سے ٹلنے کو تیار نہیں۔ کشمیر میں دو ''انتخابات،، ہو چکے ہیں اور تیسرا ہونے کو ہے۔ ہندوستان نے فوجی اخراجات سے قطع نظر ، کشمیر کو ترقی دینے پر بے اندازہ روپیہ خرچ کیا ہے۔ پھر ہندوستان میں کثیر مسلم اقلیت کا بھی معاملہ ہے۔ یہ مسلم اقلیت ہندوستانی معاشرے میں گھل مل رہی ہے۔ اگر کشمیر کے معاملے میں کسی قسم کی جلد بازی کی گئی تو اس کا اس عمل پر الٹا اثر پڑے گا۔ ہندوستان اپنے عوام کی قوت

کو تعمیری کاموں میں لگانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اگر کشمیر کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی ہوئی تو عوام کی قوت تخریبی کاموں میں لگ جائے گی ۔

میں نے انھیں بتایا کہ یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ریاست میں شہری آزادیوں کے نہ ہونے کی صورت میں وہاں کس قسم کے ''انتخابات،، ہوئے ہوں گے ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جموں و کشمیر کے عوام اپنی ریاست پر ہندوستانی فوج کے مسلسل قبضے سے سخت ملول ہیں ۔ رہا ہندوستان کی مسلم اقلیت کا معاملہ تو انھیں یرغمال کے طور پر تو رکھا نہیں جا سکتا ، اور نہ ان کے مستقبل کو جموں و کشمیر کے مسئلہ سے منسلک کیا جا سکتا ہے ۔ جب تک کشمیر کے سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوئی تصفیہ نہیں ہو جاتا ہندوستانی مسلمانوں کے ہندوستانی معاشرے میں گھل مل جانے کا عمل کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ باقی رہا عوام کی قوت کو تعمیری کاموں میں لگانے کا سوال ، تو یہ جبھی ممکن ہے کہ معاشرے کا کوئی نصب العین ہو ۔ غرض ہم میں دیر تک اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی ۔

آخر میں پنڈت نہرو نے مجھ سے پوچھا : مان لیا کہ دونوں ملکوں میں امن قائم کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ بھی کہ مسئلہ کشمیر کے تصفیے میں رد و کد کی کم ہی گنجائش ہے ، تو اس صورت میں آپ کے خیال میں پہلا قدم کیا اٹھانا چاہئے ۔ میں نے کہا کہ اس کا انحصار اس مقصد پر ہوگا جو ہم حاصل کرنا چاہیں گے ۔ ایک دفعہ مقصد متعین ہو جائے تو پھر اس کے حصول کے لئے ایک عملی نظام قائم کیا جا سکتا ہے ۔

مسٹر نہرو نے کہا کہ مجھے پیشتر ہی سے ایسا نظر آ رہا ہے کہ میرے ملک کے سیاسی حلقے اس کی سخت مخالفت کریں گے ۔ انھوں نے بیان کیا کہ ہندوستان کی رائے عامہ نے ''ہندوستانی علاقے،، پر چینیوں کے ''قبضے،، پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ مجھے یہ بات کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوئی کیونکہ کشمیر کبھی ہندوستانی علاقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک بین الاقوامی تنازعے کا موضوع تھا جس کو دونوں ملکوں

نے اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق طے کرنے کا اقرار کیا تھا۔

مجھے اس بات کا یقین پیدا نہ ہو سکا کہ پنڈت نہرو واقعی مسئلے کا کوئی مستقل حل نکالنا چاہتے ھیں۔ وہ اس گفت و شنید میں تو مضائقہ نہیں سمجھتے تھے جو اس وقت ھو رھی تھی، مگر دونوں ملکوں کے درمیان ایک خوشگوار مستقبل کا خیال ان کے ذھن میں نہیں تھا، اگر واقعی انھیں اس کا خیال ھوتا تو وہ میری تجاویز پر زیادہ دھیان دیتے۔ مثلاً مشترک دفاع کی بابت جو تجاویز میں نے سنہ ۱۹۵۹ء میں کی تھیں۔ انھوں نے نہ جانے کیوں اسے ھندوستان کی سالمیت اور خودداری پر حملہ تصور کیا۔ اس تجویز میں کسی فتور نیت کو دخل نہ تھا اور نہ اسے پیش کرنے والا میں پہلا شخص تھا۔ قائد اعظمؒ نے پاکستان اور ھندوستان کے لئے، بہ حیثیت دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کے، اس بات کو اشد ضروری تصور کیا تھا کہ یہ دونوں زمین پر اور سمندر میں اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے دوستانہ طور پر تعاون کریں نیو زیور کر زیتونگ اخبار کے نامہ نگار خصوصی ڈاکٹر ایرک سٹرائف نے قائد اعظمؒ سے پوچھا تھا: ''کیا پاکستان اور ھندوستان اپنے اندرونی معاملات میں مل جل کر کام کریں گے۔ نیز کیا وہ زمین پر اور سمندر میں اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے دست تعاون بڑھائیں گے۔ اور بیرونی حملے کا مل کر مقابلہ کریں گے؟''

قائد اعظم نے جواب دیا:

''ذاتی طور پر میرے دل میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ ھمارے نہایت اھم مفادات کا تقاضا یہ ھے کہ پاکستان کی ڈومینین اور ھندوستان کی ڈومینین کو ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاھئے تاکہ انھیں بین الاقوامی معاملات میں اور آئندہ رونما ھونے والے واقعات میں پورا پورا دخل حاصل ھو۔

علاوہ ازیں پاکستان اور ھندوستان کے لئے، بہ حیثیت دو آزاد و خود مختار مملکتوں کے، یہ بھی اشد ضروری ھے کہ وہ دوستانہ طور پر اور مل جل کر زمین اور سمندر میں اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے سے بچائیں۔



(۱۵-ا) صدر انڈونیشیا ڈاکٹر سوئیکارنو کے ساتھ راولپنڈی میں
۱۹ ستمبر ۱۹۶۴ء

(۱۵-ب) چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ نیشنل پیپلز کونسل ہال میں
۴ مارچ ۱۹۶۵ء



(۱۶-الف) ہزامپیریل میجسٹی شہنشاہِ ایران
کے ساتھ طیران گاہِ "مہر آباد" پر
یکم جولائی ۱۹۶۴ء



(۱۶-ب) صدر ایوب نے عوامی جمہوریہ
چین کی کاؤنسل کے وزیرِ اعلیٰ چو-این-
لائی کو چک لالہ کی طیران گاہ پر خوش آمدید
کہا۔ راولپنڈی ۲ جون ۱۹۶۵ء

لیکن اس کا انحصار کلیۃً اس بات پر ہے کہ پاکستان اور ہندوستان پہلے خود اپنے اختلافات دور کر سکتے ہیں یا نہیں - دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بین الاقوامی معاملات میں اسی وقت نمایاں حصہ لے سکتے ہیں کہ پہلے اپنے اندرونی معاملات کو سدھار لیں -،،[1]

اپریل سنہ ۱۹۵۳ء میں محمد علی بوگرا نے جو اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم تھے ، اعلان کیا تھا کہ ''ایک دفعہ دونوں ملکوں کے آپس کے بڑے بڑے جھگڑے طے پا جائیں ، اور سازگار فضا پیدا ہو جائے ، تو ہندوستان اور پاکستان اپنے مشترکہ دفاع پر غور کر سکتے ہیں ، جس میں دونوں کا فائدہ ہے-،، انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ مشترک دفاع کی بدولت ''دونوں ملک اپنے دفاعی اخراجات میں سے ایک خطیر رقم بچا سکتے ہیں جسے قومی بھلائی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے کام میں صرف کیا جا سکتا ہے-،،[2]

میں نے ۲۴-اپریل سنہ ۱۹۵۹ء کو کہا تھا کہ بیرونی حملے کی صورت میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کو آپس میں قریب آ جانا چاہئے اور مل جل کر اس بر صغیر کا دفاع کرنا چاہئے - ہندوستانی لیڈروں نے خیال کیا کہ میں کسی قسم کے دفاعی معاہدے کی بات سجھا رہا ہوں اور اس سے ان کے دلوں میں خوف اور بد گمانی پیدا ہوئی - اس کے چند روز بعد میں نے کوئٹہ میں اپنی اس تجویز کی وضاحت کی - میں نے کہا ، اس کا مطلب کوئی خاص معاہدہ نہیں ہے جو ہندوستان کی پریشانی کا موجب ہو - میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ دونوں ملکوں میں امن و امان کی خاطر عمومی سمجھوتہ ہو جائے - میں نے اس بات پر زور دیا کہ اس قسم کی مفاہمت کی اولیں شرط یہ ہے کہ کشمیر اور نہروں کے پانی جیسے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جائیں - ایک دفعہ ان معاملوں کا تصفیہ ہو جائے تو پھر دونوں ملک اپنی اپنی فوجوں کو فارغ کر کے ایسی سرحدوں

۱- مطبوعہ ڈان کراچی ۱۲ - مارچ سنہ ۱۹۴۸ء -
۲- مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی ۲۶ - اپریل سنہ ۱۹۵۳ء -

پر بھیج سکتے ہیں جہاں حملے کا خطرہ ہو ۔ بس یہی مشترک دفاع کی غرض و غایت ہے یعنی ہم ایک دوسرے کے خوف سے آزاد ہو کر اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکیں ۔

مسٹر نہرو نے جان بوجھ کر اس تجویز کا غلط مطاب سمجھا اور ۴ مئی کو لوک سبھا میں اعلان کیا : ''خواہ کچھ بھی ہو ہم کسی ملک کے ساتھ فوجی اشتراک کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔،، اس کی تشریح انھوں نے یوں کی : ''میں پاکستان کے ساتھ اپنے جھگڑے مٹانے اور امن، دوستی اور ہمسایہ داری کے جذبے کے تحت زندگی گزارنے کا دل سے خواہاں ہوں ۔ لیکن ہم کوئی مشترک دفاعی پالسی اختیار کرنا نہیں چاہتے جو گویا ایک قسم کے فوجی معاہدے کے مترادف ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب لوگ مشترک دفاعی پالسیوں کی بات کرتے ہیں تو ان کا حریف کون ہوتا ہے ۔ کیا ہم کو بغداد پیکٹ ، سیٹو یا ایسے ہی کسی اور معاہدے کا ممبر بننا ہے؟،،[1] بعد ازاں جنوری سنہ ۱۹۶۰ء میں مسٹر نہرو نے بنگلور میں کانگرس پارٹی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے سوال کیا : ''فوجی معاہدے کا کیا مطاب ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ فوجیں ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مارچ کر سکتی ہیں؟،، اس کے بعد انھوں نے کسی قدر جوش میں آ کر کہا : ''چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ، ہندوستان غیر ملکی فوجوں کو اپنی دھرتی پر قدم رکھنے کی اجازت کبھی نہ دے گا ، خواہ یہ فوجیں اس کی حفاظت ہی کے لئے کیوں نہ آتی ہوں،،[2]

جو بات مسٹر نہرو مطلق نہیں سمجھے، یہ تھی کہ میں نہ تو دونوں ملکوں کی خارجہ پالسیوں میں کسی قسم کی تبدیلی کا مشورہ دے رہا تھا ، اور نہ کوئی باضابطہ دفاعی انتظام تجویز کر رہا تھا ۔ انھوں نے جو یہ نقشہ کھینچا تھا کہ پاکستانی فوجیں ہندوستانی سرحدوں کی حفاظت کے بہانے ہندوستان کی دھرتی پر مارچ کرتی چلی

۱۔ مطبوعہ ڈان کراچی ۵ ۔ مئی سنہ ۱۹۵۹ء ۔

۲۔ مطبوعہ مورننگ نیوز کراچی ۱۶ ۔ جنوری ۱۹۶۰ء ۔

آ رہی ہیں، اس سے دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹ جائے - اور اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے آپس کے بڑے بڑے جھگڑوں کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کر لیں، تاکہ دونوں ملکوں کے عوام امن چین سے زندگی بسر کر سکیں - میں بار بار اس تجویز کا ذکر کرتا اور اس کی زیادہ سے زیادہ وضاحت کرتا رہا، تاکہ ہندوستان کے لوگوں پر اس کی معقولیت ظاہر ہو جائے - میں نے پہلے ہندوستانی لیڈروں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس تجویز سے ان کی ''ناطرفداری،، کی پالسی پر جس کا وہ پرچار کرتے رہے ہیں کوئی زد نہیں پڑتی - میں نے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کیا کہ اس تجویز کا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں، تو پھر دونوں ملک اپنی اپنی فوجوں کو جو اس وقت آمنے سامنے ڈٹی ہوئی ہیں، ادھر سے فارغ کر کے اپنے اپنے علاقے کی حفاظت پر لگا سکیں گے -

لیکن ہندوستان کے وزیر اعظم کو پاکستان سے اپنے جھگڑے طے کرنے یا اس کے ساتھ امن چین سے رہنے میں کوئی خوبی دکھائی نہ دی - جب سے دونوں ملک آزاد ہوئے تھے ان کے آپس کے اختلاف نے انھیں ایک دوسرے سے دست و گریباں کر رکھا تھا، اور ان کی فوجیں کشمیر میں اور دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحدوں پر آمنے سامنے ڈٹی ہوئی تھیں - میری تجویز کا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ یہ فوجیں غلط مقام پر کھڑی ہیں اور اگر ایک دفعہ یہ جھگڑے سلجھ جائیں تو وہ اپنے صحیح مقام پر جا سکتی ہیں، نیز یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے کے خوف سے نجات مل سکتی ہے - اس تجویز میں دونوں ملکوں کے درمیان اس قسم کے سمجھوتے کا بھی امکان موجود تھا کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان دونوں میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو اسے یہ خدشہ نہ رہے گا کہ دوسرا اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے -

اس تجویز کا غلط مطلب نکالنے والوں میں ہندوستان کے وزیر اعظم

کے علاوہ پاکستان کے کچھ لوگ بھی شامل تھے، جو یہ سمجھے کہ اس سے شاید ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک قسم کا نیم وفاق قائم ہو جائے گا - وہ اس نتیجے پر کس طرح پہنچے، یہ میں نہیں سمجھ سکا - اس طرف تو انہی لوگوں کا خیال جا سکتا ہے جو نہ تاریخ کا علم رکھتے ہوں نہ اس کی سمجھ بوجھ - اگر اس قسم کے نظام کو زبردستی رائج بھی کر دیا جائے، تب بھی ہندوستان و پاکستان اس نیم وفاق میں مل جل کر کام نہیں کر سکتے - اس کی وجہ بڑی سادہ ہے - ہندوستان کی قومیت کی بنیاد ہندو دھرم پر ہے اور پاکستان کی اسلام پر - یہ دونوں فلسفے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں - ان دونوں کو ملایا نہیں جا سکتا، لیکن یہ صلح اور امن کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب رہ سکتے ہیں - یہی ہندوستان کے بارے میں ہماری خارجہ پالسی کا مدعا ہے - جو لوگ نیم وفاق کا ذکر کرتے ہیں وہ گزشتہ تاریخ، دونوں قوموں کی افتاد مزاج، ان کے نصب العین اور فلسفے کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں -

جب سنہ ۱۹۶۴ء میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ پاکستان آئے، تو وہ بھی ہندوستان پاکستان اور کشمیر کے نیم وفاق ہی کی بے معنی تجویز لائے تھے - میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم اس سے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہتے - کیسی عجیب بات ہے کہ ہم تو کشمیریوں کو غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، اور ان کی زبان سے ایسی تجویز کہلوائی جا رہی ہے جس پر اگر عمل کیا جائے تو وہ خود ہماری غلامی کا موجب بن سکتی ہے - یہ ظاہر تھا کہ مسٹر نہرو نے انہیں یہی بات کہنے کے لئے یہاں بھیجا تھا - میں انہیں الزام نہیں دیتا کیونکہ انہیں حالات نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا - لیکن ان سے ملاقات کے بعد میرے دل میں ذرا شک و شبہ نہ رہا کہ ان کا مستقبل پاکستان ہی سے وابستہ ہے -

میرے خیال میں مسٹر نہرو اور ان کی قوم کو یقین نہ آیا کہ میں نے یہ تجویز بڑے خلوص کے ساتھ پیش کی تھی - انہوں نے

شاید یہ سمجھا کہ میں مسئلۂ کشمیر کو بڑے سستے داموں طے کرانے کی کوشش کر رہا ہوں - وہ یہ نہ سمجھے کہ میں دونوں ملکوں کے درمیان طویل المیعاد بنیادوں پر امن قائم کرنے کی فکر میں ہوں - بیشک میں جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے لوگوں کی خواھشات کے مطابق کرانا چاھتا تھا ، لیکن میں اس کا بھی متمنی تھا کہ ھندوستان نے پاکستان کے خلاف جو جارحانہ اور دشمنانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ تبدیل ہو جائے - میری کوشش یہ تھی کہ دونوں ملک زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول پر کاربند ہوں ، بے فکری کا سانس لیں، اور ایک دوسرے کی بات کو سنیں اور سمجھیں -

مگر ایسا نہ ہو سکا - قدرت نے ھندوستان و پاکستان کو ایک عظیم موقع بخشا تھا ، مگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکا - اس کی وجہ یہ تھی کہ ھندو لیڈر اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ وہ اپنے عوام پر کس درجہ تباہ کن بوجھ ڈال رہے ہیں، اپنے آپ کو مسلح کئے جا رہے تھے- انھوں نے ایک چھوڑ دو دو فوجیں تیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا- ایک چین سے جنگ و جدال کے لئے ، اور دوسری پاکستان اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ھمسایوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے - چنانچہ دونوں ملکوں کے روابط بجائے اس کے کہ کسی سطح پر مستحکم ہو جاتے ، پرُ اضطراب اور تشدد آمیز مستقبل کا پیش خیمہ بن گئے-

(۳)

ریاست ھائے متحدہ امریکہ اور پاکستان کے روابط گھری دوستی اور یگانگت کے رہے ہیں - جب میں صدر بنا تو یہ روابط مضبوطی سے قائم ہو چکے تھے - اس سلسلے میں میرا تعلق ان امور سے تو ضرور رہا تھا ، جن کا اثر براہ راست دفاعی سروسوں پر پڑتا تھا ، لیکن ان روابط کی تشکیل کے ذمہ دار ھمارے سیاسی لیڈر ھی تھے - اس زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ امریکہ قدرتی طور پر ایشیا کی چھوٹی چھوٹی طاقتوں کی بھلائی اور سلامتی میں گھری دل چسپی رکھتا ہے - اس کی وجہ میں یہ سمجھتا تھا کہ سوویٹ یونین اور چین کی عوامی جمھوریہ بلکہ ھندوستان تک باوجود اپنی سخت

اندرونی کمزوریوں کے، اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر قائم کرنے کے خواہش مند تھے - ان میں اس امر پر سمجھوتہ ہونا تو بڑا مشکل نظر آتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کا حلقۂ اثر کتنا اور کہاں تک ہو، لیکن ایک بات پر وہ ضرور متفق ہو سکتے تھے، وہ یہ کہ امریکہ جیسے دور دراز ملک کے پاؤں ایشیا میں نہ جمنے پائیں -

اب یہ دیکھئے کہ ان تین بڑے بڑے ملکوں میں کئی چھوٹی چھوٹی قومیں گھری ہوئی ہیں، جن میں ایک طرف ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان اور دوسری طرف نیپال، برما، ملیشیا، انڈونیشیا، فلپائن اور کوریا شامل ہیں - یہ چھوٹے چھوٹے جغرافیائی ٹکڑے بڑے بڑے زمینی خطوں کے ساتھ پیوست ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان سب کو زیادہ فکر اپنی اپنی سلامتی کی ہے - چنانچہ یہ فرض کر لینا بے جا نہ تھا کہ ان چھوٹی چھوٹی قوموں کو ایسے دوستوں کی جستجو ہے جو مصیبت کے وقت ان کے کام آئیں اور ان کی حفاظت کر سکیں - اسی طرح فرض کیا جائے کہ امریکہ بھی ایشیا میں اپنا حلقۂ اثر قائم کرنے کا خواہش مند ہے تو قدرتی بات ہے کہ وہ خود پاکستان جیسے ملکوں سے دوستی پیدا کرے گا - کچھ عرصے تک امریکہ کی پالسی اسی خیال کے مطابق رہی - لیکن جب چین کی عوامی جمہوریہ ایشیا میں ایک ابھرتی ہوئی طاقت کی حیثیت سے نمودار ہوئی، اور خصوصاً ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی چپقلش واقع ہوئی، تو امریکہ کے خیالات اور اس کی ایشیائی پالسی میں ایک انقلابی اور بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی -

اب امریکہ کے ارباب حل و عقد کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ایشیا میں بعض ممالک کو چین کے خلاف دفاعی مورچوں کے طور کھڑا کیا جائے - انھوں نے اس مقصد کے لئے جاپان اور ہندوستان کو منتخب کیا - ہندوستان کو تیار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے وافر فوجی ساز و سامان سے لیس کیا جائے - اس سے قدرتی طور پر ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں کے دل میں خوف و ہراس نے جگہ پانی شروع کی - چونکہ ہندوستان پاکستان کو اپنا دشمن نمبر ایک تصور کرتا ہے، اس لئے امریکی پالسی کی اس تبدیلی کا

سب سے زیادہ اثر پاکستان ھی پر پڑا - امریکی پالسی کی اس تبدیلی کی اھمیت کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ھے کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر شروع سے نظر ڈالی جائے -

پاکستان مئی سنہ ۱۹۵۴ء میں مغربی طاقتوں کا حلیف بنا تھا جب کہ اس نے امریکہ کے ساتھ مشترکہ دفاعی امداد کے معاھدے پر دستخط کئے تھے - بعد ازاں اسی سال وہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، تھائی لینڈ، فلپائن، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ ''سیٹو،، کا ممبر بن گیا تھا - اس کے ایک سال بعد وہ معاھدۂ بغداد میں شریک ھو گیا - یہ بھی ایک مشترکہ دفاعی تنظیم تھی جس میں برطانیہ، ترکی، ایران اور عراق بھی شامل تھے - امریکہ اس تنظیم میں خود شامل تو نہ ھوا - لیکن اس کے ساتھ شروع ھی سے اس کا گہرا تعلق رھا - سنہ ۱۹۵۸ء میں جب عراق اس معاھدے سے الگ ھو گیا، تو اسے معاھدۂ بغداد کے بجائے ''سینٹو،، (سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کے نام سے موسوم کیا جانے لگا - ترکی، ایران اور پاکستان بطور علاقائی ممبروں کے بدستور اس میں شریک رھے - سنہ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دو طرفہ تعاون کے معاھدے پر دستخط کئے - ایسے ھی معاھدے ترکی اور ایران نے بھی کئے اس معاھدے کا مدعا سینٹو کے دفاعی مقاصد کو مزید تقویت دینا تھا۔ اس طرح ایک چھوڑ چار چار مشترکہ دفاعی تنظیموں کے تحت پاکستان کے روابط امریکہ کے ساتھ قائم ھو گئے - اس لحاظ سے بعض دفعہ پاکستان کو ایشیا میں امریکہ کا سب سے بڑا حلیف یا ''سب سے زیادہ متحد اتحادی،، کہا جاتا - ایشیا میں پاکستان ھی وہ واحد ملک ھے جو سیٹو اور سینٹو دونوں کا ممبر بنا -

پاکستان جب ان معاھدوں میں شریک ھوا تو ھندوستان کی طرف سے اس پر بڑی لے دے ھوئی - ھندوستان نے اس پر الزام لگایا کہ اس کارروائی سے ''پاکستان سرد جنگ کو بر صغیر تک لے آیا ھے-،، تاھم جوں جوں وقت گزرتا گیا، ھندوستان کے اس واویلا کا اصلی مقصد کھلتا گیا - خصوصاً اس وقت جب سنہ ۱۹۵۹ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دو طرفہ تعاون کے معاھدے پر دستخط کئے -

اس معاھدے کے تحت امریکہ کے لئے بعض حالات میں یہ لازمی ہو گیا تھا کہ اگر پاکستان کسی حملے کا شکار ہو تو امریکہ اس کی مدد کرے - ہندوستان نے امریکہ سے اس کی وضاحت طلب کی، اور بقول مسٹر نہرو واشنگٹن کی حکومت نے خاص طور پر یقین دلایا کہ یہ معاھدہ ''ہندوستان کے خلاف بروئے کار نہ آئے گا''[1] صاف لفظوں میں اس مطالبے کا مقصد امریکہ سے اس امر کی ضمانت طلب کرنا تھا کہ اگر ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے تو امریکہ اس معاھدے کے تحت پاکستان کی مدد نہ کر سکے - پاکستان کی طرف ہندوستان کے روایتی رویے کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

ہندوستان کے اس رویے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اب تک پاکستان کی فوجی امداد کی مخالفت کیوں کرتا رہا - اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ پاکستان سے ڈرتا تھا، کیونکہ وہ پاکستان سے پانچ گنا بڑا ہے اور ہندوستانی فوجیں پاکستانی فوجوں سے چوگنی ہیں - اور پھر پاکستان کو ملنے والی فوجی امداد کا مقصد بھی تو اتنا ھی تھا کہ وہ محض اپنی مدافعت کر سکے - چنانچہ ہندوستان کو پاکستان سے خطرے کا کوئی سوال ھی نہ تھا -

پاکستان اور امریکہ کے اتحاد پر ہندوستان کی مخالفت کا ذکر میں کر چکا ہوں - اس نے پاکستان کو اس اتحاد سے روکنے کے لئے، اس پر براہ راست دباؤ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی - اگست سنہ ۱۹۵۳ء میں اس دوطرفہ گفت و شنید میں کچھ مہینے صرف ہو چکے تھے، تو نہرو اور محمد علی بوگرہ نے جو اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم تھے کشمیر پر ایک مشترک سرکاری بیان جاری کیا - اس میں دونوں نے اس امر پر اتفاق ظاہر کیا تھا کہ ''ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ یہ (مسئلۂ کشمیر) اس ریاست کے لوگوں کی خواھشات کے مطابق حل ھونا چاھئے - لوگوں کی خواھشات معلوم

۱- ہندوستانی پارلیمنٹ میں نہرو کی تقریر - ۱۴ - مارچ سنہ ۱۹۵۹ء -

کرنے کا سب سے زیادہ قابل عمل ذریعہ آزادانہ رائے شماری ہے۔"[1]
علاوہ ازیں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اپریل سنہ ۱۹۵۴ء کے آخر تک ناظم رائے شماری مقرر کر دیا جائے۔ ناظم ایسی تجاویز پیش کرے جنھیں وہ ساری ریاست میں منصفانہ اور غیر جانب دارانہ رائے شماری کرانے کے سلسلے میں ضروری سمجھتا ہو۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد نہرو کو کہیں سے یہ سن گن مل گئی کہ پاکستان امریکہ سے اتحاد کرنے اور اس سے فوجی امداد لینے والا ہے۔ پھر کیا تھا انھوں نے ایک طول طویل خط میں بڑے پر زور الفاظ میں یہ بات جتائی کہ اگر پاکستان اس ارادے سے باز نہ آیا تو ہندوستان اور پاکستان میں کشمیر پر جو معاہدہ ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا۔[2]

محمد علی نے جواب میں لکھا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ پاکستان کو امریکہ سے محض دفاعی مقاصد کے لئے جو فوجی امداد ملے، اس سے مسئلۂ کشمیر کو حل کرنے اور ہندوستان و

۱- ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کا مشترک سرکاری بیان ۲۰۔ اگست سنہ ۱۹۵۳ء۔

۲- ہم نے ہندوستان میں ایک ایسی خارجہ پالسی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو نہ صرف امن عالم کے مفادات کے حق میں ہے بلکہ خاص طور پر ایشیائی ممالک کے لئے بھی سود مند ہے۔ یہ پالسی ایک آزاد پالسی ہے، اور یہ طاقتوں کے کسی بلاک کے ساتھ منسلک نہیں ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ پاکستان اس سے مختلف پالسی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان فوجی اعتبار سے امریکہ کے ساتھ پیوست ہو جائے گا۔ اور اس کا تعلق طاقتوں کے اس مخصوص گروہ کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔ اس سے موجودہ صورت حال میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا اثر ہندوستان و پاکستان کے تعلقات پر اور خصوصاً مسئلۂ کشمیر پر پڑتا ہے۔ (نہرو کا خط وزیر اعظم پاکستان کے نام مورخہ ۲۱۔ دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء)۔

پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی ضرورت کس طرح کم ہو جاتی ہے ۔ اور پھر یہ بات تو سمجھ میں آنی اور بھی مشکل ہے کہ پاکستان کے امریکہ کے ساتھ کسی فوجی معاہدے میں شامل ہو جانے سے کشمیر کے لوگ اپنے اس حق سے کیونکر محروم ہو جائیں گے کہ وہ چاہیں تو ہندوستان میں شامل ہوں اور چاہیں تو پاکستان میں ۔ کشمیر کے لوگوں کے اس حق کا اعتراف اقوام متحدہ، ہندوستان اور پاکستان تینوں کر چکے ہیں ۔

دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء میں ہرچند اس وقت تک پاکستان نے نہ تو امریکہ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا، اور نہ اسے کسی قسم کی فوجی امداد ملی تھی، مسٹر نہرو نے اعلان کر دیا کہ کشمیر کے متعلق مشترک سرکاری بیان میں جو معاہدے کئے گئے تھے ان کی پابندی نہیں کی جائے گی، کیونکہ ''اگر امریکہ سے فوجی امداد (پاکستان کو) ملی تو وہ صورت حالات بدل جائے گی، جس کے تحت یہ معاہدے کئے گئے تھے۔[1]

ظاہر ہے کہ پاکستان مسٹر نہرو کو یہ اجازت کیسے دے سکتا تھا کہ وہ اپنے حسب منشا پاکستان کی خارجہ پالیسی وضع کرائیں ۔ مئی سنہ ۱۹۵۴ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ مشترکہ دفاعی امداد کے معاہدے پر دستخط کر دیے ۔ اسی کے ساتھ یہ امر یقینی ہو گیا کہ وزیر اعظم ہندوستان کشمیر کے بارے میں مشترک سرکاری بیان کو مسترد کر دیں گے ۔ پاکستان نے بہتیرا چاہا کہ یہ صورت حال پیدا نہ ہو، مگر جب مئی سنہ ۱۹۵۵ء میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم آخری مرتبہ ملے تو کشمیر کے بارے میں ان کا باہمی سمجھوتہ ملیا میٹ ہو گیا ۔

اسی سال پاکستان پر امریکہ کے ساتھ اپنے اس اتحاد کے باعث اور بھی زیادہ دباؤ پڑا ۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں جب پاکستان معاہدۂ بغداد (حالیہ سینٹو) میں شریک ہوا، تو سوویٹ یونین کو یہ بات ناگوار گزری ۔ اس وقت تک سوویٹ یونین کا رویہ کشمیر کے جھگڑے کے

۱۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں مسٹر نہرو کا بیان ۲۳ - دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء -

سلسلے میں غیر جانبدارانہ رہا تھا ۔ جب کبھی سلامتی کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوتا تو اس کے نمائندے ووٹ دینے سے احتراز کرتے ۔ مگر اب سوویٹ یونین نے پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ معاہدۂ بغداد میں شامل ہو کر ایک ''جارحانہ مغربی تنظیم،، کا رکن بن گیا ہے ۔ اور کشمیر کے بارے میں اس کا رویہ یکسر بدل گیا ۔ اب اس نے ہندوستان کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی کہ کشمیر میں نہ تو کوئی رائے شماری ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے ، نیز یہ کہ کشمیر ہندوستان کا ''اٹوٹ انگ،، ہے۔

ادھر پچھلے دس برس میں امریکہ کی پالسیوں میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کے بالمقابل امریکہ کے اتحادی پاکستان کے لئے متواتر نقصان کا باعث ہوتی رہیں ۔ جب ہم نے پہلے پہل امریکہ کے ساتھ اتحاد کیا تھا تو اس غیر جانبداری کو جسے ہندوستان ''ناطرفداری،، کے نام سے موسوم کرنا زیادہ پسند کرتا تھا ، امریکہ میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ، بلکہ درحقیقت ''غیر اخلاق،، سمجھا جاتا تھا ۔ کیونکہ اس کا مطلب تھا دونوں فریقوں کو بے وقوف بنا کر اپنا آلو سیدھا کرنا ۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ، امریکیوں کی نظروں میں ہندوستان کے اس طرز عمل کا احترام پیدا ہوتا گیا ۔ پچھلی دھائی کے آخری سالوں میں تو یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ امریکہ بعض اوقات سوویٹ یونین سے بازی لے جانے کی کوشش میں اس کی عملی حمایت بھی کرنے لگا تھا ۔ مزید برآں امریکہ کے بااثر حلقے ہندوستان کو بھاری امداد دینے کی سفارش بھی کرنے لگے تھے ۔

اسی زمانے میں امریکہ کے اتحادیوں میں جن میں صرف پاکستان ہی شامل نہ تھا ، یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ امریکہ کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہماری حمایت کو روز بروز ایک امر مسلمہ سمجھنے لگا ہے جس کی چنداں پروا کرنا ضروری نہیں ۔ رفتہ رفتہ امریکی پالسی کی تبدیلی کے باعث ، امریکہ سے اقتصادی امداد حاصل کرنے والوں میں غیر جانب دار ہندوستان کا نمبر سب سے زیادہ بڑھ گیا حالانکہ ہندوستان اقوام متحدہ کے اندر اور

باہر امریکہ کو بے روک ٹوک لتاڑتا رہا ۔ پاکستان امریکی خارجہ پالسی کی اس کایا پلٹ کو بڑھتے ہوئے استعجاب اور آزردگی کے ساتھ دیکھتا رہا ۔

ہماری تشویش کا باعث یہ تھا کہ ہندوستان کی فوجی تیاریوں کا رخ زیادہ تر پاکستان ہی کی طرف تھا ۔ ہندوستانی لیڈروں کی نعرہ بازیاں اور پاکستانی سرحدوں پر ہندوستانی فوجوں کا مسلسل ہجوم اس کا کھلا ثبوت تھا ۔

بہر صورت سنہ ۱۹۶۲ء تک امریکی پالسی غیر جانبدار ہندوستان اور امریکہ کے اتحادی پاکستان کے درمیان مناسب تفریق ملحوظ رکھتی رہی ۔ یوں تو مشترکہ دفاعی امداد کے معاہدے کے تحت، جس پر سنہ ۱۹۵۱ء میں دستخط ہوئے تھے اور جس کی تجدید سنہ ۱۹۵۸ء میں کی گئی تھی ، ہندوستان کو بھی امریکہ سے فوجی امداد مل رہی تھی ، حالانکہ اس نے کوئی پابندی قبول نہ کی تھی جو اتحادی کی حیثیت سے عموماً لازم آتی ہے ۔ تاہم امریکہ براہ راست فوجی امداد کے معاملے میں ایک اتحادی اور ایک غیر جانب دار ملک کے مابین امتیاز رکھتا رہا ۔ لیکن جب سنہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی معاملے پر جنگ چھڑ گئی تو امریکہ نے یہ امتیاز یکسر اٹھا دیا ۔

اس حقیقت کے باوجود کہ امریکیوں کی نظروں میں اتحادی اور غیر جانب دار کے درمیان امتیاز کا تصور روز بروز دھندلا پڑتا جا رہا تھا ، پاکستان بڑی مضبوطی سے امریکہ سے اپنے اتحاد پر قائم رہا ۔ ہمارا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ جب تک ہم اس اتحاد میں شامل ہیں ، ہم اپنے فرائض کو بہ حیثیت ایک رکن کے حتی المقدور آبرومندانہ طریق سے انجام دیتے رہیں ۔

تاہم سنہ ۱۹۶۳ء میں پاکستان کو امریکہ کی خارجہ پالسی کے بارے میں ایک اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ۔ ہندوستان اور چین کی سرحدی لڑائی شروع ہوتے ہی، امریکہ نے ہندوستان کو دھڑا دھڑ اسلحہ بھیجنا شروع کر دیا ۔ یہ اسلحہ اس قدر زیادہ مقدار میں بھیجا گیا جس کا صورت حال کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے کوئی

جواز نہ تھا ۔ اس کے بعد تو گویا تھاک بندھ گئی ۔ ہندوستان کو امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے تو بھاری مقدار میں اور دولت مشترکہ کے ممبروں کی طرف سے کم تر درجے پر اسلحہ پہنچنے لگا ۔

امریکہ کے لوگ بعض دفعہ پوچھتے ہیں : امریکہ ہندوستان کو جو فوجی امداد دے رہا ہے کیا وہ صرف کمیونسٹ چین کے ساتھ لڑنے کے لئے نہیں ہے؟ کیا ہندوستان نے اس بات کا وعدہ نہیں کیا کہ وہ اس اسلحہ کو پاکستان کے خلاف استعمال نہیں کرے گا؟ کیا امریکہ اور برطانیہ نے اس امر کی ضمانت نہیں دی کہ اگر ہندوستان نے اس اسلحہ کو پاکستان کے خلاف حملہ کرنے میں استعمال کیا تو وہ اس کے حملے کو ناکام بنا دیں گے؟ کیا یہ ساری یقین دہانیاں اور وعدے پاکستان کے خلاف اس مغربی اسلحہ کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے میں مختصر طور پر وہ حقائق بیان کر دینا چاہتا ہوں جو ہندوستان کو مسلح کرنے کی مغربی پالسی کا موجب ہوئے ۔

۱۲-اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء کو مسٹر نہرو نے اعلان کیا کہ میں نے ہندوستانی فوج کو ہدایت دے دی ہے کہ وہ متنازعہ فیہ علاقوں سے "چینیوں کو نکال باہر کریں۔" اس اعلان کو نیویارک کے اخبار "ہیرلڈ ٹریبیون" (۱۵-اکتوبر) نے "باضابطہ اعلان جنگ کے مترادف" قرار دیا ۔ ادھر برطانوی اخبار "گارڈین" نے اسے "الٹی میٹم" کے نام سے تعبیر کیا ۔ یہ بات کہ پہلی گولی ہندوستانیوں نے چلائی ، "نیویارک ٹائمز" نے بعد کو ۱۹-اپریل سنہ ۱۹۶۳ء کی ایک رپورٹ میں سجھائی ۔ اس رپورٹ میں لکھا تھا کہ "جنرل میکسویل ڈی ٹیلر چیرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف نے کانگریس کے ایک خفیہ بیان میں جسے آج مشتہر کیا جا رہا ہے ، اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کمیونسٹ چین کے ساتھ سرحدی لڑائی ہندوستان نے شروع کی ہو۔" ۲۰-اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء کو لداخ (کشمیر) کی متنازعہ فیہ سرحد کے متعدد مقامات پر اور نارتھ ایسٹ فرنٹیر ایجنسی (نیفا) کے اس علاقے میں جو ریاست بھوٹان کے مشرق

میں واقع ہے ، ہندوستان اور چین میں زبردست معرکے شروع ہو گئے ۔
اس کے بعد جو کچھ پیش آیا ، وہ عموماً سب کو اچھی طرح معلوم ہے ۔ چین سے ہندوستان کے دو مختصر سے معرکے ہوئے ۔ پہلا اکتوبر میں اور دوسرا نومبر میں جن میں ہندوستانی فوج کو شدید نقصان اٹھانا پڑا ۔ ۲۰-نومبر تک ہندوستان لداخ کے متنازعہ فیہ علاقے میں مزید دو ہزار مربع میل رقبے سے دستبردار ہو گیا ۔ اور اس طرح پندرہ ہزار مربع میل رقبے کا وہ قریب قریب سارا علاقہ جو کشمیر کے اس حصے میں تھا اور جن پر چینیوں کو ملکیت کا دعویٰ تھا ، ان کے قبضے میں چلا گیا ۔ نیفا کے علاقے میں ہندوستانی فوجوں کو اور بھی زیادہ ہزیمت اٹھانی پڑی ۔ ۲۰-نومبر تک نہ صرف نیفا کا سارا متنازعہ فیہ علاقہ بلکہ آسام تک چین کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے قبضے میں جاتا ہوا نظر آنے لگا ۔ اس کے بعد اچانک ۲۱-نومبر کو چینیوں نے جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اور یکطرفہ طور پر یہ مان لیا کہ وہ اس سارے علاقے کو چھوڑ کر ، جو انہوں نے فتح کر لیا ہے ، خط میک موہن کی پچھلی چوکیوں پر واپس چلے جائیں گے ۔ چینیوں نے اپنے اس قول کو پوری طرح نباھا اور اس کے ساتھ ھی انہوں نے ہندوستان کو صلح و آشتی کے ساتھ سرحدی جھگڑوں پر بات چیت کرنے کی دعوت بھی دی ۔ اس کے بعد اس ساری متنازعہ فیہ سرحد کے کسی حصے میں بھی کوئی قابل ذکر فوجی واقعہ پیش نہیں آیا ۔

۲۹-دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء کو جب ہندوستان اور چین کی سرحد پر جنگ بند ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا تو ناساو کے مقام پر امریکہ اور برطانیہ نے ہنگامی حالات کی بنیاد پر ہندوستان کی فوجی امداد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور بارہ کروڑ ڈالر کی مالیت کے سامان کا اقرار کر لیا ۔ فوجی امداد کے اس پروگرام میں مختلف قسم کا اسلحہ شامل تھا ۔ مگر اس پروگرام کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ چھ ہندوستانی ڈویژنوں کو پہاڑی لڑائی کے لئے مسلح کیا جائے گا ۔ ناساو کے فیصلے کے تحت امریکہ ، برطانیہ اور کینیڈا کا ایک مشترک فضائی مشن اس بات کی پڑتال کرنے ہندوستان بھیجا گیا کہ اگر

چین ہندوستان پر دوبارہ حملہ کر دے ، تو ہندوستان کو کس قدر ہوائی امداد کی ضرورت ہوگی ۔ اس کے بعد ایک اور امریکی مشن یہ دیکھنے کے لئے ہندوستان پہنچا کہ ہندوستان کی اسلحہ سازی کی پیداوار کو کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے ۔ ناساو میں ہندوستان کو جس قدر فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا ، اس سے قطع نظر ۳۰۔جون سنہ ۱۹۶۳ء کو برچ گروو کے مقام پر بھی امریکہ اور برطانیہ نے ہندوستان کو مزید بھاری فوجی امداد دینے کا پروگرام بنایا اور زیادہ ہتھیار مہیا کرنے کے علاوہ اس پروگرام میں راڈار کے وسیع تر انتظامات ، ہوائی بار برداری اور تربیتی سہولتیں بہم پہنچانا بھی شامل تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ اور برطانیہ نے ہندوستان کی خود اپنی اسلحہ سازی کی پیداوار کو وسیع پیمانے پر بڑھانے میں مدد دینے کا بھی فیصلہ کیا ۔

ہندوستان کو اس بات کا بھی اطمینان دلایا گیا کہ اسے چین سے کے خلاف فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے مغربی طاقتوں کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں ۔ بلکہ اس سے یہ کہا گیا کہ یہ بات خود مغربی طاقتوں کے مفاد میں ہے کہ ہندوستان اپنی ''ناطرف داری،، کی پالسی پر بدستور کاربند رہے اور سوویٹ یونین سے بھی فوجی امداد حاصل کرتا رہے ۔ ہندوستان نے مغربی طاقتوں کے اس حوصلہ افزا رویے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ۔ اور جلد سے جلد اپنی مستقل فوج کے گیارہ ڈویژنوں کے بجائے بائیس ڈویژن بنانے اور اپنی ہوائی اور سمندری فوج میں بھاری اضافہ کرنے کی ٹھان لی — یہ سب کچھ بظاہر چین کے خلاف استعمال کرنے کے لئے کیا گیا ۔

آئیے پہلے اس بات پر غور کریں کہ ہندوستان کو اس قدر وسیع پیمانے پر مسلح کرنا ضروری یا واجب بھی تھا یا نہیں ۔ امریکہ اور برطانیہ نے ہندوستان کو فوجی امداد دینے کا پروگرام دراصل اس وقت بنایا تھا جب ان مغربی طاقتوں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں ہندوستان اور چین کی یہ چپقلش بڑھ کر بڑی جنگ کی صورت اختیار نہ کر لے ۔ جب یہ لڑائی شروع ہوئی تھی ، تو ہم نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ایک سرحدی جھڑپ کے سوا اور کچھ نہیں ۔

ہندوستان اور چین کی پہلی آویزش کے بعد میں نے ۵۔ نومبر سنہ ۱۹۶۲ء کو ایک بیان دیا تھا ۔ جس میں میں نے یہی بات کہی تھی ۔ میں نے اس امر پر بھی تشویش ظاہر کی تھی کہ مغربی طاقتوں نے یہ فرض کر کے کہ ہندوستان چین کے ساتھ ایک بڑی جنگ سے دوچار ہے ، تیزی کے ساتھ وسیع پیمانے پر امداد دینے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ حالانکہ ایسا فرض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ۔ میں نے کہا فوجی اعتبار سے یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ چین ہمالیہ کے پہاڑوں پر عین سردی کے زمانے میں ہندوستان پر حملے کی ٹھان لے ۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ چین کسی بڑی جنگ کا خواہش‌مند نہ تھا ۔ بعد ازاں جب میں نے چین کا دورہ کیا تو اس ملک کے سب سے مقتدر آدمی نے مجھے بتایا کہ تبت کی سرحد پر چین اور ہندوستان کی جھڑپ محض ہندوستانی فوجوں کی چھیڑ خانیوں کا نتیجہ تھی ۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ چین کے وزیر اعظم اور چیف آف سٹاف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ، انھوں نے ثابت کر دیا کہ چین نے ہندوستان پر کوئی بڑا حملہ کرنے کا منصوبہ نہیں باندھا تھا ۔ اس کے بعد چینیوں نے اس جھگڑے کو صلح صفائی کے ساتھ ختم کرنے کی خواہش بھی اچھی طرح ظاہر کر دی ۔ ادھر ہندوستانی بھی چین سے اور زیادہ لڑائی بھڑائی سے بچنا چاہتے ہیں اور پرُامن تصفیے کے لئے کوشش کر رہے ہیں ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہندوستان اور زیادہ فوجی امداد کا مطالبہ بھی کر رہا ہے اور یہ اسے ملتی ہی چلی جا رہی ہے ۔

اس وقت ہندوستان نے تین روپ بھر رکھے ہیں ۔ اس کا ایک روپ تو مغربی طاقتوں کے لئے ہے جس کے مطابق وہ بڑی شدومد کے ساتھ چین کے خلاف جنگ کے منصوبے باندھ رہا ہے ۔ دوسرا روپ سوویٹ یونین کے لئے ہے جس میں وہ اپنے اس عزم پر مضبوطی کے ساتھ قائم معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ''ناطرف داری،، کی پالسی ترک نہیں کرے گا ۔ اور تیسرا روپ چین کے لئے ہے جس کے تحت وہ

غیر جانب دار سفیروں کے ذریعے خفیہ نامہ و پیام سے پرامن تصفیہ کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔

مجھے پختہ یقین ہے کہ چین اور ہندوستان کا جھگڑا صلح صفائی سے طے ہو سکتا ہے۔ اور ہوگا بھی ایسا ہی۔ لہذا ہندوستان کو فوجی امداد دئے چلے جانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور اگر چین اور ہندوستان کے درمیان دوبارہ سرحد پر لڑائی شروع بھی ہو جائے، حالانکہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے، تو اس کوہستانی محاذ میں ہندوستان چین کے خلاف تین چار ڈویژنوں سے زیادہ فوج استعمال نہیں کر سکتا۔ اس پر قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنی فوج کو دگنا یعنی بائیس ڈویژنوں تک بڑھا دینا چاہتا ہے؟ اگر ریزور فوج کی گنجائش رکھ لی جائے، تو پھر بھی اس کے پاس بہت سے ڈویژن بچ رہتے ہیں۔ آخر وہ ان کو کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اپنے اسلحہ کے مطالبے پر مغربی طاقتوں کو رضامند پا کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ ایک چھوڑ دو دو فوجیں تیار کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ ایک فوج چین کے مقابلے کے لئے اور دوسری اپنے سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے، پاکستان اور اپنے دوسرے چھوٹے چھوٹے ہمسایوں کے خلاف۔ جو فوج چین کے خلاف تیار کی جائے گی وہ لازمی طور پر اس طرح متعین کی جائے گی کہ وقت آنے پر اس کا رخ فوراً مشرق پاکستان کی طرف موڑ کر ادھر حملہ کیا جا سکے۔ اس طرح ان دونوں فوجوں سے پاکستان کو سخت خطرہ لاحق ہوگا۔

اس زبردست جنگی مشینری کے تیار کر لینے کے بعد، جس کی وجہ سے ہندوستان کے عوام کو یقیناً سخت مصیبتیں جھیلنی پڑی ہوں گی، ہندوستانی لیڈروں کے لئے اس کی ضرورت کا جواز پیش کرنا ہوگا۔ پھر شاید ہندوستانی اپنے اس وقار کو بھی بحال کرنا چاہیں، جو چین کے ساتھ جنگ کر کے مٹی میں مل گیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے ہی کوئی سازگار موقع دیکھے اپنی اس زبردست مشینری سے پاکستان پر دھاوا بول دے۔ شاید اس کا پہلا حملہ کشمیر کے اس حصے پر ہو جو پاکستان کے تحت ہے اور جسے

ہندوستان اپنا قرار دے کر اس پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔[1]

میں نے یہاں مختصر طور پر ان واقعات کا ذکر کیا ہے، جو پاکستان و امریکہ کے روابط میں کشیدگی کا موجب ہوئے۔ یہ بات تو مجھ پر اسی وقت کھل گئی تھی جب کینیڈی اور نکسن میں صدارتی انتخاب کا مقابلہ ہو رہا تھا، کہ امریکہ ہندوستان کو اپنے سیاسی حلقۂ اثر میں لانے کے لئے ہر ممکن طریقے سے اس کی رضا جوئی چاہتا ہے۔ اور اگر پاکستان اس امر سے رنجیدہ ہے تو خیر، بڑے افسوس کی بات ہے، مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔

میں صدر کینیڈی کی دعوت پر جولائی سنہ ۱۹۶۱ء میں امریکہ گیا تھا۔ صدر کینیڈی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ: ''پاکستان ہمارا آج کا دوست بھی ہے اور مستقل دوست بھی۔'' انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''امریکہ کے لوگ نجی طور پر اور اپنی عام زندگی میں دوستی اور دوستانہ اسنا ل کی قدر کرنا جانتے ہیں۔''[2] ان کے ان بیانات سے میری بڑی دل جمعی ہوئی تھی، کیونکہ دوستی وہی ہوتی ہے جو باہمی اور دوطرفہ ہو۔

۱۲۔ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو میں نے امریکی کانگرس کے ایک مشترک اجلاس سے خطاب کیا۔ میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بر صغیر کی تقسیم کی بنیاد کو اجاگر کیا۔ ہم نے اپنے لئے ایک الگ وطن کا جو مطالبہ کیا تھا، وہ اس حقیقت پر مبنی تھا کہ ہمارے لئے عزت و آبرو کے ساتھ ایک ایسے معاشرے میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں جو ذات پات کی قیود میں بری طرح بندھا ہوا ہو۔ یہ مطالبہ تعصب یا عدم رواداری کی بنا پر نہ تھا، بلکہ یہ تو حقیقت ہی اس

۱۔ صفحات ۲۲۳ تا ۲۲۵ کا مضمون ایک مقالے سے لیا گیا ہے، جو میں نے پاکستان و امریکی اتحاد کے موضوع پر لکھا تھا، اور جو بعد میں امریکہ کے سہ ماہی جریدہ ''فارن افیئرز'' (جنوری ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ میرے خدشات بنیادی طور پر کس درجہ صحیح تھے۔

۲۔ بمقام اینڈریوز فورس بیس (۱۱۔ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء)۔

تعصب اور عدم رواداری سے بچنے کی ایک صورت تھی جس کے ہم ہندوستانی معاشرے میں ایک مدت سے نشانہ بنے ہوئے تھے - ہم کوئی ایسا معاشرہ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے جس میں ملاؤں کا زور ہو ، بلکہ ایک آزاد خیال اور ترقی پسند معاشرہ جس میں ہم اپنے نصب العین اور اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کر سکیں - ہمارے معاشرے میں رنگ یا نسل کے امتیاز کی کوئی جگہ نہیں - ہم ایسی قوم ہیں جسے رنگ یا نسل کا فرق سجھائی نہیں دیتا۔،، میں نے کانگرس کو اس کی ذمہ داریاں اور اس کے عالمی فرائض یاد دلائے۔ جب میں نے یہ کہا کہ : ''جو لوگ آپ کا ساتھ دیں گے وہ پاکستان ہی کے لوگ ہوں گے،، تو اس پر بڑی تالیاں بجائی گئیں - لیکن ابھی ان تالیوں کا شور تھمنے نہ پایا تھا کہ میں نے اتنا اور بڑھا دیا ''بشرطیکہ۔ بشرطیکہ آپ بھی پاکستان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں - چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کی مصلحت کے تقاضے کچھ بھی ہوں ، آپ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو ہمارے مسائل کو مشکل بنا دے یا ہماری سلامتی کو کسی قسم کے خطرے میں ڈال دے - جب تک آپ اس بات کو یاد رکھیں گے ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی۔،،

امریکہ کے اس دورے میں میں نے بار بار کشمیر کے جھگڑے کے منصفانہ اور آبرومندانہ تصفیے کی ضرورت پر زور دیا - جس کے بغیر اس بر صغیر میں امن چین ممکن ہی نہیں - میں نے امریکی حکومت سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان پر اپنے بڑھتے ہوئے اثر کو کام میں لا کر ہندوستانی لیڈروں کو سمجھائے کہ پاکستان کے ساتھ صاف صفائی سے رہنے میں کیا فائدے ہیں - مجھ سے ایک اخباری نمائندے نے پوچھا کہ : ''صدر کینیڈی مسٹر نہرو کو مسئلہ کشمیر کے حل پر آمادہ کرنے میں کس حد تک بڑھ سکتے ہیں ؟،، میں نے جواب دیا : ''یہی تو ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں - صدر کینیڈی خاصی دور تک بڑھ سکتے ہیں۔،،[1]

---

[1]- اخباری نمائندوں سے ملاقات (اتوار ١٦ جولائی ١٩٦١ء) -

اس سے چند روز پہلے مجھے واشنگٹن میں نیشنل پریس کلب کے ایک لنچ کے جلسے میں مدعو کیا گیا تھا ۔ اس موقع پر مجھ سے جو سوالات کئے گئے، ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ : ''اگر ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دی گئی ، تو اس پر پاکستان کا رد عمل کیا ہوگا؟''

میں نے کہا : ''ہم نے امریکہ بلکہ ساری دنیا پر اپنی پوزیشن واضح کر دی ہے ۔ ہم ہندوستان کے ساتھ صلح صفائی سے رہنا چاہتے ہیں ۔ کشمیر پر ہماری بات بگڑ گئی ہے ۔ کشمیر کا مسئلہ کشمیر کے لوگوں کے جذبات و خواہشات سے وابستہ ہے ۔ یہ مسئلہ ہندوستان کی پاکستان دشمنی کو بھی ظاہر کرتا ہے ۔ علاوہ ازیں کچھ اقتصادی اور کچھ ہماری سلامتی کے امور بھی غور طلب ہیں ۔ ہندوستان پاکستان کے ساتھ صلح صفائی کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا ۔ ہندوستان کی مسلح افواج ہماری مسلح افواج سے تگنی ہیں ۔ ان افواج کا صرف پندرہ فی صد حصہ چین کے مقابلے کے لئے ہے ۔ باقی پاکستان کی تاک میں ہے ۔ اس قسم کی صورت حال میں اگر ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دی گئی تو پاکستان خود کو غیر محفوظ خیال کرے گا ۔ اور پاکستان کی رائے عامہ لازمی طور پر امداد دینے والے ملک کے خلاف ہو جائے گی ۔ چنانچہ اس کا امریکہ کے ساتھ ہماری دوستی پر بھی زبردست اثر پڑے گا۔''

صدر کینیڈی سے میری جو ملاقاتیں ہوئیں ، ان میں میں نے یہ بات ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان میں کشمیر کے مسئلے پر تنازعہ رہے گا اس بر صغیر میں حالات معمول پر نہیں آئیں گے ۔ میں نے انہیں یہ بات سمجھائی کہ امریکی انتظامیہ ایسی فیصلہ کن حیثیت میں ہے کہ وہ اس معاملے میں ہندوستان پر خوشگوار اثر ڈال سکتی ہے ، نیز یہ کہ جب تک اس بر صغیر میں امن امان قائم نہ ہوگا ، امریکی پالسی کے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے ۔

امریکی پالسی میں غیر جانب دار ملکوں کے بارے میں جو تبدیلی پیدا ہو گئی تھی ، میں نے اس کا ذکر بھی چھیڑا ۔ میں نے پوچھا

که اس تبدیلی کا ''سینٹو،، اور ''سیٹو،، جیسے معاهدوں پر کیا اثر پڑے گا - میں نے کہا که امریکی رویے کی اس تبدیلی کی بنا پر علاقائی ممبروں کو ان معاهدوں سے وابسته رهنے کا جواز پیش کرنا مشکل هو جائے گا - صدر کینیڈی نے مجھے ڈھارس دیتے هوئے کہا : ''مجھے اجتماعی سلامتی کی ضرورت کا بڑا شدید احساس هے - میں سمجھتا هوں که ''غیر جانب دار،، ممالک کی امداد کے معاملے میں میری پوزیشن کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا - یه دوستوں کو ترک کرنے اور غیر جانب داروں کو گلے لگانے کی بات نہیں هے - میرا کہنا تو بس یه هے که غیر جانب داروں کو دشمن نه سنجھا جائے،، صدر کینیڈی خاص طور پر یه معلوم کرنا چاهتے تھے که ''سیٹو،، اور ''سینٹو،، کو کس طرح مضبوط بنایا جا سکتا هے اور هندوستان و پاکستان کے باهمی جھگڑوں کو چکانے میں امریکه کیا مدد دے سکتا هے -

میں نے ان سے یه بھی پوچھا که مشترکه سلامتی کے قانون کی توسیع کے بارے میں امریکی انتظامیه کا کیا اراده هے؟ کیا وه اس میں غیر جانب دار ملکوں کو بھی شامل کرنا چاهتا هے؟ کیا اس کا مطلب هندوستان کو اسلحه کی امداد دینا هوگا؟ میں نے انهیں صاف صاف بتا دیا که اس قسم کے اقدام سے پاکستان کی رائے عامه پر بہت برا اثر پڑے گا - اب تو پاکستان هی نہیں ، کوریا سے لے کر ترکی تک کے عوام نے اس بات پر تعجب کرنا شروع کر دیا هے که کیا امریکه ''دوستوں،، اور ''غیروں،، میں تمیز نہیں کر سکتا!

مجھے اس امر کا یقین دلایا گیا که کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جائے گی ، جو همارے لئے مشکلات پیدا کر دے - نیز یه که اس ترمیم شده قانون کے تحت غیر جانب دار ملکوں کو کسی قسم کی امداد دینے سے پہلے هم سے مشوره کر لیا جائے گا -

میں نے صدر کینیڈی سے تنازعۂ کشمیر کا پس منظر ذرا تفصیل سے بیان کیا - میں نے کہا جب تک هندوستان اور پاکستان کی فوجیں آمنے سامنے بھری بندوقیں لئے کھڑی رهیں گی ، دونوں ملکوں کی ترقی کے سارے ضروری کام رکے رهیں گے - اگر یه جھگڑا مٹ جائے

تو اس سے اس خطے ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا کا بھلا ہوگا ۔ میں نے ان سے نہرو کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا ذکر بھی کیا جو مئی سنہ ۱۹۶۰ء میں لندن میں ہوئی تھی ۔ میں نے کہا جب میں نے نہرو سے مسئلۂ کشمیر کا ذکر چھیڑا ، تو انہوں نے اس کو حل کرنے پر کچھ زیادہ دل چسپی ظاہر نہیں کی ۔ میں نے اس وقت مسٹر نہرو سے کہا تھا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کشمیر کے بارے میں آپ کا رویہ بعض جذباتی وجوہ کے تابع ہے ۔ انہوں نے جواب دیا : اگر ایسا ہوتا تو وادئ کشمیر ایک قسم کا سوئٹزر لینڈ بنائی جا سکتی تھی ، جہاں میں جب چاہتا آیا جایا کرتا ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میری والدہ لاہور کی رہنے والی تھیں ، لیکن اس کے باوجود مجھے اس شہر سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہے ۔

میں نے صدر کینیڈی سے کہا ، ظاہر ہے کہ نہرو نے جموں و کشمیر کے ایک بڑے حصے پر طاقت کے بل پر جو قبضہ کر رکھا ہے ، اس کا وہ ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ۔ وہ اپنی دانست میں معاملے کو ختم کر بیٹھے ہیں ۔ میں یہ امر صدر کینیڈی کے ذہن نشین کرنا چاہتا تھا کہ اگر ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دی گئی تو اس سے اس کا حوصلہ بڑھے گا ، اور وہ ان علاقوں پر جو اس کی ملکیت نہیں ہیں ، بدستور اپنا قبضہ جمائے رکھے گا اور اس طرح اس جھگڑے کے منصفانہ تصفیے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا ۔

صدر کینیڈی نے اس بارے میں مجھ سے اتفاق کیا کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کی اشد ضرورت ہے ۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ان کی پوزیشن ایسی نہیں کہ اس معاملے میں عملی طور پر یا براہ راست دخل دے سکیں ۔ ان سے مل کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے دماغ میں تفکرات کا ہجوم ہو اور وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہوں ۔ انہیں صدر کا عہدہ سنبھالے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ذہن پر بڑا بار ہے ، شاید اس وجہ سے کہ 'بے آف پگز' والا معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کے رہ گیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں معاملات پر پوری گرفت حاصل نہ ہو ، اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو بہت زیادہ نظریہ بازوں نے گھیر

رکھا ہے ۔ یہ لوگ بڑے مفید ہوتے ہیں ۔ لیکن بعض دفعہ انسان کو صحیح عملی راہ سے بھٹکا بھی دیتے ہیں ۔ انسان کو ٹھوس دماغ والے، حقیقت پسند اور تجربہ کار لوگوں کو اپنے قریب رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ، خاص کر کسی بحران کے موقع پر ۔ صدر کینیڈی نے مجھ سے کہا ، میں تم سے آدھ گھنٹے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں ، وہ میرا بازو تھام کر مجھے وائٹ ہاؤس کے لان میں لے گئے جہاں ہم ایک درخت کے سائے میں ایک نشست گاہ پر بیٹھ گئے ۔ انھوں نے برلن کی صورت حال کا ذکر کرنا شروع کیا اور مجھ سے پوچھا کہ تم ان حالات میں کیا کرتے ۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے اس مسئلے کو حل کرنے کی توقع نہ رکھتے تھے، بس وہ تو اس معاملے پر جو ان کے لئے بڑی پریشانی کا موجب بنا ہوا تھا ، ذرا دل کا بخار نکالنا چاہتے تھے ۔ جب میں وہاں سے چلا تو ان کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ ان کے دماغ پر سخت بوجھ ہے ، اور وہ دل لگا کر کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتے ۔

جب میں امریکہ سے واپس آیا ، تو مجھے ایک گونہ اطمینان تھا کہ میں نے اپنا نقطۂ نگاہ بغیر لگی لپٹی رکھے، صدر کینیڈی پر واضح کر دیا ہے ۔ اب میں صرف امید ہی کر سکتا تھا کہ مسئلۂ کشمیر کے طے نہ کرنے سے جو خطرے پیدا ہو سکتے ہیں، امریکہ کو ان کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ ہندوستان کو وسیع پیمانے پر اسلحہ بہم پہنچانے میں جلد بازی سے کام نہ لے گا ۔

اس زمانے میں ہم سوویٹ یونین کے ساتھ تیل کا کھوج لگانے کے معاہدے کے بارے میں گفت و شنید کر رہے تھے ۔ ادھر پاکستان اور چین میں سرحد کی نشان بندی کی بات چیت ہو رہی تھی۔ امریکہ نے ان دونوں باتوں پر کچھ کچھ تشویش ظاہر کرنی شروع کر دی تھی ۔ ان دونوں معاملوں میں میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اب چونکہ صورت حال بدل گئی ہے ، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم سوویٹ یونین اور چین کی عوامی جمہوریہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کریں ۔ ہم خواہ مخواہ کے سیاسی بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے تھے ۔

میں اوپر کچھ واقعات کا ذکر کر چکا ہوں جو ۱۹۶۲ء میں چین

اور ہندوستان کی جنگ کے دوران میں پیش آئے تھے - اس معاملے نے جو جو رنگ بدلے ، میرے خیال میں اس کا بیان ذرا تفصیل چاہتا ہے ، تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ اس صورت حال کا امریکہ پر کیا رد عمل ہوا - اور کس طرح دھیرے دھیرے یہ المناک حقیقت ہم پر منکشف ہوئی کہ امریکہ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں سے ہندوستان کو چن لیا ہے -

تبت میں چینی حکام نے جولائی ۱۹۵۹ء میں ایک حکم جاری کیا ، جس کی رو سے ہندوستانی اور تبتی دونوں سکے ناجائز قرار دے دیے گئے - ہندوستانی قومیت والوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر جان کی خیریت چاہتے ہوں تو تبت کا رخ نہ کریں - اگست ۱۹۵۹ء میں ایک چینی فوج نے آسام اور تبت کی سرحد پر لانگ جو کی سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا- اور لداخ میں بھی ایک چوکی اپنے قبضے میں لے لی - اس پر ہندوستان اور چین نے ایک دوسرے کو احتجاجی مراسلے بھیجے - نومبر ۱۹۵۹ء میں نہرو نے اعلان کیا کہ : ”میں لوگوں کے دماغ سے اس قسم کے شبہات نکال دینا چاہتا ہوں کہ اگر چینیوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم اپنی سالمیت کی حفاظت نہ کر سکیں گے - ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی طاقت اور اپنے عزم پر پورا بھروسا ہے ، اور ہم پوری طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں گے-“

مسٹر چو این لائی نے مسٹر نہرو کو مشورہ دیا کہ دونوں فریق اپنی اپنی فوجیں تمام ڈھائی ہزار میل لمبی سرحد سے بیس بیس کیلومیٹر پیچھے ہٹا لیں ، اور اس طرح پچیس میل چوڑے علاقے کو غیر فوجی قرار دے دیا جائے - تاوقتیکہ ”سرحد کے مسئلے پر آپس میں دوستانہ تصفیہ نہ ہو جائے-“ مسٹر نہرو نے اس تجویز کو رد کر دیا - تاہم چینی حکومت نے اپنے سرحدی دستوں کو گشت کرنے سے روک دیا تاکہ فوجوں میں جھڑپ نہ ہونے پائے -

اپریل ۱۹۶۰ء میں نئی دہلی میں مسٹر نہرو اور مسٹر چو این لائی میں گفت و شنید ہوئی ، مگر اختلافات نہ مٹ سکے - اس کے بعد سرکاری سطح پر کئی بار بات چیت ہوئی - مارچ ۱۹۶۱ء میں چینی

قومیت والے بعض افراد کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا - ۱۹۶۱ء کے سارے سال میں چین اور ہندوستان کے تعلقات سخت کشیدہ رہے - نہرو نے جنگ جویانہ رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا - دونوں فریق اپنے اپنے علاقے میں فضائی اور زمینی خلاف ورزیوں کی شکایتیں کرتے رہے - مسٹر کرشنامینن نے جو وزیر دفاع تھے ، ۱۱-اپریل ۱۹۶۱ء کو لوک سبھا میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ حکومت ہندوستان نے ہمالیہ کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ''تمام ضروری اقدامات کر لئے ہیں -'' نیز یہ خیال کہ کمیونسٹ حملہ آور ''جب چاہیں آ دھمکیں'' اب درست نہیں رہا -

جولائی ۱۹۶۲ء میں سرحد پر دو اور وارداتیں ہوئیں - ستمبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ایک بار پھر یہ تجویز پیش کی کہ : ''کشیدگی دور کرنے کے لئے دونوں طرف کی مسلح فوجوں کو سارے محاذ سے بیس بیس کیلومیٹر پیچھے ہٹ جانا چاہئے -'' ہندوستان نے اب کے پھر اس تجویز کو مسترد کر دیا - ستمبر ۱۹۶۲ء کے وسط میں ہمالیہ کی سرحد کے مشرق سرے پر مزید جھڑپیں ہوئیں - نیفا کی سرحد پر ۱۰-اکتوبر تک تو خاموشی رہی مگر اس دن میک موہن لائن کے انتہائی مغربی سرے پر ہندوستانی اور چینی فوجوں میں سخت معرکہ ہوا - ۱۳-اکتوبر کو چینیوں نے ایک مرتبہ پھر مسٹر نہرو کو تنبیہ کی کہ : ''وہ خطرے کی غار کے دہانے سے پیچھے ہٹ جائیں -'' کیونکہ چینیوں کے قول کے مطابق چین ''ہندوستان کے ساتھ ہرگز آمادۂ پیکار'' نہیں ہونا چاہتا تھا - اس کے ایک ہفتے بعد لداخ میں بڑے زور شور کی لڑائی ہوئی - چینی فوجوں نے لداخ میں اس علاقے تک ، جس کی ملکیت کا ان کو دعویٰ تھا پیش قدمی کی اور پھر وہ تھم گئیں - نیفا میں چینیوں نے دو چوکیوں پر قابو پا لیا - اس کے بعد ان کے حملے نے میک موہن لائن کے دونوں سروں پر ایک عام دھاوے کی صورت اختیار کر لی - تین دن کے اندر چینی فوجیں تقریباً نوے میل تک آگے بڑھ آئیں اور انہوں نے درۂ سیلا اور بوم دیلا پر قبضہ کر لیا - ۲۱-نومبر ۱۹۶۲ء کو چینی حکومت نے یک طرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا ، اور اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا -

چینی فوجیں ہٹتے ہٹتے اس لائن سے بھی بیس کیلومیٹر پیچھے ہٹ آئیں جو سات نومبر ۱۹۵۹ء تک سرحد کا کام دیتی رہی تھی ۔

۲۸-نومبر ۱۹۶۲ء کو صدر کینیڈی نے مجھے ایک خط لکھا ، اس میں انھوں نے اس صورت حال پر تشویش ظاہر کی ، جو چین و ہند کی لڑائی سے پیدا ہو گئی تھی ۔ انھوں نے مجھے مطلع کیا کہ امریکہ ہندوستان کی فوری ضرورتوں کے لئے اپنے مقدور بھر مدد دینا چاھتا ھے ، اور اس بات کا ضرور اطمینان کر لے گا کہ وہ ہندوستان کو جو کچھ بھی مدد دے گا ، اسے صرف چینیوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا ۔ انھوں نے کہا ، پاکستان اس وقت ایسی پوزیشن میں ھے کہ وہ ایک ضروری اقدام کر سکتا ھے ، اور یہ اقدام بقول ان کے صرف پاکستان ھی کر سکتا تھا یعنی پاکستان ہندوستان کو خاموشی سے مگر مؤثر طریقے سے اس بات کا اشارہ کر دے کہ اسے پاکستان کی طرف سے جو تشویش ھے ، اور جسے خود صدر کینیڈی قطعی طور پر ناواجب سمجھتے ھیں ، مگر جس کی وجہ سے ہندوستان کو اپنی فوج کے ایک بہت بڑے حصے کو پاکستانی سرحدوں پر متعین کرنا پڑا ھے ، اسے اپنے دل سے نکال دے ۔ صدر کینیڈی نے کہا : شاید اس کا مؤثر طریقہ یہ ہو کہ آپ مسٹر نہرو کو ایک نجی پیغام کے ذریعے یہ اطمینان دلا دیں کہ پاکستان اپنی سرحدوں پر کوئی ایسی کارروائی نہیں کرے گا ، جس سے ہندوستان کو تشویش لاحق ہو ۔ صدر کینیڈی نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ہندوستان کو باھر سے خواہ کتنی ھی امداد کیوں نہ ملے وہ چینیوں کا مقابلہ کرنے میں اتنی مؤثر ثابت نہ ہوگی جتنی کہ ان کی اپنی فوجوں کی آزادانہ نقل و حرکت ۔ صدر کینیڈی نے کہا کہ میں کشمیر کی تاریخ سے واقف ہوں اور یہ تجویز بے سوچے سمجھے پیش نہیں کر رہا ہوں ۔ میں یہ تجویز اس امید اور بھروسے پر کر رہا ہوں کہ ہندوستان اپنی موجودہ مصیبت سے سبق حاصل کرے گا ، اور اس کو احساس ہوگا کہ سارے بر صغیر کو شمال کی طرف سے جو خطرہ درپیش ھے ، وہ اس خطے کے اندرونی جھگڑوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ھے ۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ آپ اس بر صغیر کے وسیع تر مفادات کے لئے جو اقدامات

کریں گے ، ان سے آگے چل کر پاکستان اور ہندوستان کے باھمی جھگڑوں کے مناسب تصفیے میں جو مدد ملے گی ، کسی اور بات سے نہیں مل سکتی۔

ذیل میں میں وہ پورا خط درج کرتا ہوں ، جو میں نے ۵-نومبر ۱۹۶۲ء کو صدر کینیڈی کے نام جواباً لکھا :

ڈیئر مسٹر پریزیڈنٹ

آپ کے سفیر کے ذریعے ۲۸-اکتوبر ۱۹۶۲ء کو مجھے آپ کا جو التفات آمیز پیغام ملا اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ھوں۔

ہندوستان نے پچھلے پندرہ برس سے ھم پر ایک بہت بڑا فوجی خطرہ مسلط کر رکھا ھے ۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ محض امریکی اور برطانوی ساز و سامان کی بدولت اس نے اپنی فوجوں کو ھماری فوجوں سے تگنا چوگنا کرلیا ھے ، اور وہ کھلے بندوں کہہ رھا ھے کہ پاکستان اس کا دشمن نمبر ایک ھے ۔

اس کی اسی (۸۰) فیصد یا اس سے بھی زیادہ مسلح افواج ھمارے خلاف کارروائی کے لئے مخصوص کی جا چکی ھیں ، ان میں سے بیشتر ھماری سرحدوں پر متعین ھیں ، اور دس دن کے نوٹس پر حملہ آور ھونے کے لئے پورے طور پر تیار ھیں۔ ھم ان تمام برسوں میں محض اس وجہ سے ہندوستان کے ان جارحانہ ارادوں کا شکار رھے ھیں کہ وزیر اعظم ہندوستان اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں ، خاص طور پر وہ وعدہ جو کشمیر کے تصفیے کے بارے میں کیا گیا تھا اور جس میں ھم اپنی معیشت اور سلامتی کی بنا پر انتہائی دل چسپی رکھتے ھیں ۔ یہی وجہ ھے کہ ھمیں پچھلے کم و بیش پندرہ برس میں اپنی فوجوں کو ھر وقت چوکس رکھنا پڑا ھے ۔ چین اور ہندوستان میں جو معرکہ ھوا ھے ، اس نے ھمارے لئے اور بھی گہری تشویش کے حالات پیدا کر دئے ھیں ۔ تاھم اس سلسلے میں ھمیں جو تھوڑی بہت اطلاعات ملی ھیں ، ان سے ھم یہ یقین کرنے پر مجبور ھیں کہ چینیوں کا ارادہ صرف اسی علاقے پر قبضہ کرنے کا ھے جو ان کے خیال کے مطابق ان کی ملکیت ھے ، اور جو دراصل چین اور ہندوستان کی جنگ کا سبب بنا ۔ ۱۹۵۴ء میں خود مسٹر نہرو نے

ہندوستانی پارلیمنٹ میں تبت میں چینیوں کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے ، اپنی فراست کے مطابق یہ اعلان کرنا مناسب سمجھا تھا کہ میرے علم میں پچھلی چند صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ، جب کسی بیرونی ملک نے چین کی فرماں روائی کو ، یا اسے بالا دستی ہی کہئے ، جھٹلایا ہو۔ اس تمام عرصے میں چین خواہ کمزور تھا یا طاقت ور اور خواہ اس کی کوئی سی بھی حکومت رہی ہو اس نے تبت پر اپنی حاکمیت کے دعوے کو ہمیشہ قائم رکھا .... سلطنت برطانیہ نے لارڈ کرزن کے زمانے میں اپنا تسلط تبت تک وسیع کر لیا ، اور وہاں کئی قسم کے تصفیے کئے ، اب ہمارے لئے ان میں سے کسی تصفیے کو برقرار رکھنا ناممکن اور نامناسب ہے ...... یہ نقشے اور معاھدے برطانوی سامراجیوں نے تیار کئے تھے ۔ ان معاھدوں اور نقشوں کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہم بھی وہی کارروائی کریں جو انہوں نے کی تھی۔،،

تاہم فوجی اعتبار سے ہم یقین نہیں کرتے کہ چین فیصلہ کن نتائج حاصل کرنے کے لئے ، اپنی بڑی افواج ہمالیہ کے کٹھن پہاڑی علاقے سے ہندوستان کے خلاف آتار سکتا ہے اور اگر اس کا ایسا ارادہ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ برما کے راستے ہندوستان کے بازو سے حملہ کرے ۔ ہماری رائے میں یہ طریقہ آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی ۔ اگر چینیوں کے ارادے محدود حملے کے نہیں بلکہ بڑے حملے کے ہیں ، اور ان کی نیت آسام پر قبضہ جمانے کی ہے ، تو اس صورت میں ہمارے لئے بھی یہ حملہ ایسا ہی باعث تشویش ہوگا جیسا کہ ہندوستان کے لئے ۔ کیونکہ اس کا اثر براہ راست مشرق پاکستان پر پڑے گا ۔ صورت حال کا یہ اندازہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے ۔

اس بر صغیر میں اور ہندوستان کے ارد گرد یہ صورت حال کیوں کر پیدا ہوئی؟ ہمارے خیال میں یہ مسٹر نہرو اور ان کے رفقا کی کج فہمی، حیلہ جوئی اور ان کی بے آصولی خارجہ پالسی کا براہ راست نتیجہ ہے ۔

یہ خارجہ پالسی مندرجہ ذیل اجزا پر مبنی ہے :

الف ۔ کمیونزم کی رضا جوئی کے لئے سر تسلیم خم کرنا ۔

ب ۔ غیر جانبداری کا سفید پھریرا لہرا کر کمیونزم کی خوشنودی حاصل کرنا ، اور متذبذب اقوام کو اپنے ساتھ ملانا ۔ اور اس طرح خود کو ساری دنیا کے لئے باعث فساد بنانا ۔

ج ۔ پاکستان کو ڈرانا اور دھمکانا ، تاکہ وہ سیاسی طور پر بے یار و مددگار رہ جائے ۔ اور اقتصادی طور پر کمزور رہ جائے ۔

د ۔ مغربی طاقتوں کو خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کو موقع بے موقع بُرا بھلا کہنا ۔

واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ اس وقت مسٹر نہرو پر جو کچھ گزر رہی ہے ، وہ اسی کج فہمی کا نتیجہ ہے ۔ ہم اس سارے عرصے میں یہی بات سمجھاتے اور اس بات سے خبردار کرتے رہے ہیں ۔

مسٹر پریزیڈنٹ ، اب آپ ہم سے اس بات کے خواہاں ہیں ، کہ ہم مسٹر نہرو کو گویا اس بات کا اطمینان دلا دیں کہ وہ اپنی ان فوجوں سے کسی اور جگہ کام لے سکتے ہیں ، جو انہوں نے اس وقت ہمارے خلاف چڑھا رکھی ہیں ۔ مجھے تعجب ہے کہ ہم سے اس قسم کی درخواست کی جا رہی ہے ، حالانکہ ہم نے جو کچھ کیا ، وہ اس خطرے کی روک تھام کے سوا اور کچھ نہیں ، جو ہمیں ہندوستان کی طرف سے درپیش رہا ہے ۔ کیا فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ہم اپنے بچاؤ کے لئے جو تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہیں ، انہیں ترک کر دیں؟ کیا ہماری اپنی قوم اس صورت حال کو منظور کر لے گی؟

ہماری اطلاع کے مطابق ہندوستان نے ہماری سرحد سے اپنا ایک پورا اور ایک آدھا پیدل ڈویژن ہٹا لیا ہے ۔ لیکن اس امر کے قطعی آثار پائے جاتے ہیں کہ وہ اس کے بجائے اپنی محفوظ بکتربند فوج کا ایک ڈویژن اور ایک بریگیڈ ہمارے خلاف مورچوں پر پہنچا رہا ہے ۔ اسی طرح اب اس نے ایک کور ہیڈ کوارٹرز قائم کیا ہے ۔ تاکہ ان فوجوں کی نگرانی کی جائے جو مشرقی پاکستان کے خلاف صف آرا ہیں ۔ اس کے بحریہ کے جہاز دو چھوٹے جہازوں کو چھوڑ کر سب کے سب بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہیں ۔ بظاہر اس کی وجہ مرمت بتائی

جاتی ہے لیکن دراصل انہیں ہمارے لئے خطرے پیدا کرنے کے لئے وہاں جمع کیا گیا ہے۔

مسٹر پریزیڈنٹ، ان اقدامات کو کسی صورت میں بھی ہمارے متعلق ہندوستان کے پر امن ارادوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ہم اس قسم کی صورت حال میں اس سے اپنی دوستی کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں؟

جی نہیں مسٹر پریزیڈنٹ اس مسئلے کا حل کچھ اور ہے۔ اس کا حل ایسی صورت حال پیدا کرنا ہے کہ ہم ہندوستان کے خطرے سے اور وہ ہمارے خطرے سے آزاد ہو سکے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ مسئلۂ کشمیر کا تصفیہ ہو جائے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ حل ہونا مشکل ہے۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستان اپنا رویہ بدل لے تو اس مسئلے کا ایک منصفانہ اور آبرومندانہ حل تلاش کر لینا کچھ دشوار نہیں۔

ہمارا مقصد امن سے رہنا ہے، خاص طور پر اپنے ہمسایوں کے ساتھ۔ میں آپ کی اس یقین دہانی کے لئے شکر گزار ہوں کہ آپ ہندوستان کو جو اسلحہ مہیا کر رہے ہیں اسے ہمارے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔ لیکن جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑ رہا ہے، ان کو اور ان کی تاریخ کو جو پیماں شکنیوں کی ایک مسلسل داستان ہے، جانتے ہوئے، میں آپ جیسے دوست کو یہ رائے نہ دوں گا کہ خود کو ایک دشوار صورت حال میں مبتلا کریں۔ جونا گڑھ، مانگرول، حیدرآباد، کشمیر اور گوا کا جو حشر ہوا، اس سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان آج آپ سے جو اسلحہ چین کے خلاف استعمال کرنے کے لئے حاصل کر رہا ہے، وہ بلاشبہ پہلا ہی موقع آنے پر ہمارے خلاف استعمال کرے گا۔ تاہم اس وعدے کو نظر میں رکھتے ہوئے، جو آپ نے بکمال مہربانی ہم سے کیا تھا اور جو یہ تھا کہ آپ ہندوستان کو کسی قسم کی فوجی امداد دینے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیا کریں گے، ہم توقع کرتے تھے کہ ہم سے مشورہ کیا جائے گا نیز ہمیں اس امر سے بھی مطلع کیا جائے گا کہ جو اسلحہ اور ساز و

سامان ہندوستان کو مہیا کیا جا رہا ہے، وہ کس قسم کا ہے اور اس کی مقدار کیا ہے ۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کسی بات پر بھی عمل نہیں کیا گیا ۔

میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت ہندوستان خود کو ستم رسیدہ اور مظلوم ظاہر کر رہا ہے ، لیکن حقیقت میں وہ مستقل طور پر اپنے آس پاس کے ہمسایوں کو ڈراتا دھمکاتا رہا ہے ،کسی کو کم کسی کو زیادہ ۔ آپ یقین جانیے کہ ایشیا کے بہت سے لوگ ہندوستان کے ارادوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں ، اور ہندوستان کے امن پسند قوم ہونے کا تصور کبھی کا زائل ہو چکا ہے ۔

مسٹر پریزیڈنٹ ، آپ نے پاکستانی اخبارات کے تبصروں کا ذکر کیا ہے ۔ ہرچند کہ ہم نے اپنے اخبارات کو انتہا پسند خیالات کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن ان کی آزادی میں مداخلت کرنا ممکن نہیں ، کیونکہ یہ قوم کے خیالات کا آئینہ ہیں ۔ اس امر کو بھی دھیان میں رکھئے کہ ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دینے سے جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے ، اس نے رائے عامہ پر برا اثر ڈالا ہے ۔ اس وجہ سے اور بھی کہ ہندوستان ہماری سلامتی کے لئے بدستور خطرہ بنا ہوا ہے ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری حکومت کے لئے رائے عامہ کو نظر انداز کرنا انتہائی مشکل ہوگا ۔

پر خلوص جذبات کے ساتھ

آپ کا مخلص

دستخط

محمد ایوب خان

نیویارک ٹائمز نے اپنی ۳۱-اکتوبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں ایک نامہ نگار کا مراسلہ شائع کیا۔ یہ اس مراسلے کے بارےمیں تھا جو میرے نام صدر کینیڈی نے لکھا تھا اس میں بتایا گیا کہ صدر کینیڈی نے میرے خط کے ساتھ ساتھ مسٹر نہرو کو بھی ایک خط لکھا تھا ، جس میں انھوں نے مسٹر نہرو سے ''چین کے ساتھ ان کے ملک کی جنگ پر امریکہ کی ہمدردی ظاہر کی تھی۔،، یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''سنا ہے

امریکی حکام پاکستان کے ان خدشات سے بخوبی واقف ہیں جو ہندوستان کو مزید فوجی ساز و سامان دیے جانے پر اسے پیدا ہوں گے۔ لیکن واشنگٹن میں یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ مارشل ایوب کی حکومت امریکی فوجی امداد کی غرض و غایت کو سمجھ جائے گی ۔ یہاں یہ امید بھی ظاہر کی جا رہی ہے کہ اہل پاکستان کشمیر پر ہندوستان سے اپنے دیرینہ جھگڑنے کے سلسلے میں اب کوئی نیا قدم نہیں اٹھائیں گے۔،،

اسی روز واشنگٹن پوسٹ نے اپنے اداریے میں لکھا :

''ہرچند اس واقعے نے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے ۔ مگر یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوئی کہ ایشیا کی یہ عظیم طاقت خطرے سے پوری طرح چوکس ہے۔ گو ہندوستان چین کے مقابلے کے لئے فوجی وسائل کی جستجو کر رہا ہے ، لیکن ابھی ہندوستان نے خود کو ایسی خطرناک صورت میں نہیں پایا کہ اسے اپنی ساری فوجی طاقت استعمال کرنی پڑ جائے ۔ ہندوستان کی جو فوجیں چینیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں ان کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے ، کیونکہ ایک تو وہ تعداد میں کم ہیں ۔ دوسرے ان کے پاس عمدہ قسم کا جنگی سامان نہیں ہے۔ ہندوستان کی بیشتر طاقت ور ترین فوجیں تو وہ ہیں ، جو پاکستان کی سرحد پر بے کار بندھی کھڑی ہیں اور کوئی نقل و حرکت نہیں کر سکتیں . . . . مغربی دنیا اس بر صغیر کو خواہ کتنی ہی امداد کیوں نہ دے وہ اتنی مفید ثابت نہیں ہو سکتی جتنی وہ مدد جو ہندوستان اور پاکستان اپنے جھگڑے (کشمیر) کا تصفیہ کر کے ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں . . . . . .،،

امریکی اخبارات کے ایک حصے نے امریکی انتظامیہ کو اس خطرے سے آگاہ کیا ، جو ہندوستان کو اندھا دھند فوجی امداد پہنچانے میں تھا ۔ اخبار ''فلیڈلفیا انکوائرر،، نے اپنے ۳۰ ۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے اداریے میں لکھا : تاہم اس بات کی معقول وجہ موجود ہے کہ اندھا دھند کارروائی نہ کی جائے اور ایسی مالی امداد نہ مہیا کی جائے جو ہماری استطاعت سے باہر ہو ، یا ایسے اسلحہ جات دوسروں کے حوالے نہ کئے جائیں جو عجب نہیں کہ کل آزاد دنیا ہی کے خلاف

استعمال ہونے لگیں - یہ ملک اربوں ڈالر کی مالیت کی اقتصادی امداد ہندوستان کو دے چکا ہے - اور اس ملک کی یہ حالت ہے کہ اس نے ۱۹۴۷ء میں جوناگڑھ اور کشمیر کو اپنی فوجی طاقت کا نشانہ بنایا ، اس کے بعد کمزور قوموں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا - گوا کی فتح اس سلسلے کا تازہ ترین کارنامہ ہے - ان معاملوں میں سے کسی میں بھی نہ تو اقوام متحدہ سے رجوع کیا گیا اور نہ ان علاقوں کے لوگوں کو رائے شماری کے ذریعے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع دیا گیا - پاکستان کے لئے جو ہندوستانی پالیسی کا ایک شکار ہے ، اپنے ہمسائے ہندوستان کو اس قدر وسیع پیمانے پر فوجی امداد کا ملنا بجا طور پر باعث تشویش ہے..... وزیر اعظم نہرو کی اس خواہش کا بڑا چرچا ہے کہ وہ ''اسلحہ کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں،، ان کی اس خواہش کی حوصلہ افزائی اس صورت میں ضرور کی جانی چاہئے کہ یہ ناطرفداری یا نام نہاد غیر جانبداری کے نام پر ان کی جارحانہ کارروائیوں کا صرف ایک بہانہ نہ ہو -

۲-۱ کتوبر ۱۹۶۲ء کو امریکہ میں ہمارے سفیر کی ملاقات اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک عہدہ دار سے ہوئی - ہمارے سفیر نے دریافت کیا کہ ہندوستان نے امریکہ سے کس قسم کی فوجی امداد مانگی ہے - اس کو بتایا گیا کہ ہندوستان نے ابھی اپنی فوری ضروریات کی تشریح نہیں کی ہے - البتہ مسٹر نہرو نے نئی دھلی میں اسی روز صبح کو امریکی سفیر گالبریتھ سے ملاقات کی تھی ، اور چین کے خلاف استعمال کرنے کے لئے امریکی اسلحہ مانگا تھا - سفیر گالبریتھ نے اپنی حکومت کی جانب سے مسٹر نہرو کو بتایا تھا کہ حکومت ریاستہائے متحدہ ہندوستان کو فوجی امداد دے گی ، البتہ مسٹر نہرو کو اپنی ضروریات خود ہی بتانی ہوں گی - ہندوستان نے کینیڈا والوں سے ''کاری بو،، بار برداری کے ہوائی جہازوں کے لئے جو درخواست کر رکھی ہے امریکہ نے اس معاملے میں اپنی مقدم مانگ سے دستبردار ہونا پہلے ہی منظور کر لیا ہے -

ہمارے سفیر نے صدر کینیڈی کی اس یقین دہانی کا ذکر کیا جو انہوں نے مجھ سے کی تھی اور جو یہ تھی کہ ہندوستان کو اسلحہ دینے

کا فیصلہ کرنے سے پہلے پاکستان سے مشورہ کر لیا جائے گا ۔ ظاہر ہے کہ امریکی حکومت نے دو بہت اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا ۔ اول تو انھوں نے پاکستان سے مشورہ کئے بغیر ہی ہندوستان کو اسلحہ کی امداد دینے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ دوسرے اس امر کی اطلاع پاکستان کو دینے سے پہلے ہندوستان کو دے دی تھی ۔ ہمارے سفیر نے یہ امید ظاہر کی کہ آئندہ ہندوستان کو دیے جانے والے اسلحہ کی مقدار ، نوعیت اور ان شرائط کے بارے میں جن پر یہ اسلحہ دیا جائیگا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے پاکستان سے مشورہ لے لیا جائے گا ۔ ہمارے سفیر کو بتایا گیا کہ ممکن ہے ہندوستان کو یہ امداد یا تو ادھار پٹے پر دی جائے اور مقامی سکے میں ادائیگی ہو ، یا پھر التوائی ادائیگی کی بنیاد پر ۔

ہمارے سفیر کو بتلایا گیا کہ امریکہ ذرا بھی وقت ضائع کئے بغیر عمل کرنے کے لئے مضطرب ہے ۔ امریکہ چینیوں کے اس اقدام کو کوریا کے بعد کا سب سے بڑا اقدام تصور کرتا ہے ۔ کوریا کے معاملے میں امریکہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ فیصلہ کیا تھا ۔ موجودہ صورت حال میں بھی اسی قدر تیزی سے کام کرنے کی ضرورت ہے ۔ ہندوستانیوں کو چینی خطرے سے آگاہ ہونے میں پانچ سال لگ گئے ۔ لیکن اب ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں ۔ امریکہ ہندوستان کو پوری پوری امداد دینے کا خواہش مند ہے ، ہاں اس بات کی مناسب ضمانت ضرور ہونی چاہئے کہ اس کے دیے ہوئے اسلحہ کو صرف چین کے خلاف استعمال کیا جائے گا ۔

اگلے روز اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ایک اور ملاقات میں ہمارے سفیر کو بتلایا گیا کہ مسٹر نہرو کی جانب سے فوجی ساز و سامان کی امداد کے سلسلے میں ایک تفصیلی درخواست موصول ہوئی ہے ۔ یہ درخواست دو فہرستوں پر مشتمل ہے ۔ ایک فہرست کی اشیا کی وصولی کے لئے ایک سو بیس دن کی میعاد مقرر کی گئی ہے ۔ اور دوسری فہرست میں ایسی اشیا ہیں جن کی فوری طور پر ضرورت ہے اور جن کو بذریعہ ہوائی جہاز بھیجنا ہوگا ۔ یہ سامان ہندوستان کو روپوں کے بدلے دیا جائے گا جو ایک فنڈ میں جمع کئے جائیں گے اور ان کو

پی۔ایل ۴۸۰ والے پروگرام کی طرح استعمال کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اس رعایت پر بھی غور ہو رہا ہے کہ پہلی کھیپ کے دام معاف کر دئے جائیں۔ ہندوستانیوں نے جو ساز و سامان مانگا تھا وہ اس خاص جنگی صورت سے نمٹنے اور اسی نسبت سے محفوظ ذخائر رکھنے کے لئے تھا۔ امریکہ کا مقصد اس سامان کو فوری طور پر مہیا کرنے سے یہ تھا کہ ہندوستان کی لڑنے کی صلاحیت کو تقویت دی جا سکے۔ ہمارے سفیر کو بتایا گیا کہ ہندوستان امریکہ کا یہ اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال نہیں کرے گا نیز یہ کہ اس بارے میں ہمارے سفیر کو ''امریکہ کے قول پر اعتماد کرنا چاہئے۔'' ہمارے سفیر کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہندوستان کو جنگی سازوسامان بہم پہنچانے سے بر صغیر میں طاقت کے توازن میں جو ناہمواری پیدا ہوگی پاکستان کو اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سفیر کو مشورہ دیا گیا کہ پاکستان کو پرانی باتیں بھول جانی چاہئیں اور ہندوستان کی طرف خیر سگالی اور تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہئے۔ اس کے اس اقدام سے ہندوستان پر زبردست اثر پڑے گا اور یقیناً پاکستان کی طرف اس کا رویہ نرم ہو جائے گا اور پھر کیا عجب کہ اس سے مسئلۂ کشمیر کے اطمینان بخش حل کی بھی کوئی راہ نکل آئے۔ یہ تھا مختصر طور پر امریکہ کا نقطۂ نگاہ۔

یہ ظاہر تھا کہ امریکہ نے ہندوستان کو ہنگامی طور پر مدد دینے کے علاوہ طویل المیعاد بنیاد پر بھی جنگی سامان دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہوگیا تھا کہ ہرچند امریکہ ہندوستان و پاکستان کے تنازعۂ کشمیر کے پرامن حل کا خواہش مند ہے، مگر وہ اس سلسلے میں براہ راست ہندوستان پر اپنا پورا اثر ڈالنے کے لئے تیار نہیں کہ کہیں ہندوستان یہ نہ سمجھ لے کہ اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ درحقیقت امریکہ کا رویہ یہ تھا کہ ہندوستان سے تو ہر طرح ہمدردی ظاہر کی جائے اور اس کی مدد اور حمایت کی جائے اور پاکستان کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس کام میں روڑے نہ اٹکائے۔

مسٹر نہرو نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو مجھے ایک خط لکھا، جس میں انہوں نے ہند و چین کی سرحدی نشان بندی کے سلسلے میں

پیدا ہونے والے جھگڑے کے بارے میں اپنا بیان رقم کیا - میں نے ۵-نومبر کو انہیں مندرجۂ ذیل جواب بھیجا :

ہمارے لئے یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ یہ جھگڑا سخت فوجی کارروائیوں کی صورت اختیار کر لے ، اور جنگ کے نئے نئے امکانات پیدا کر دے ، اور اس خطے کے امن اور استحکام کو خطرے میں ڈال دے جس سے پاکستان کا گہرا تعلق ہے -

مجھے آپ کے اس بیان سے پورا پورا اتفاق ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں دھوکا دہی اور طاقت آزمائی کے ازالے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھنی چاہئے - میں اس سلسلے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان و پاکستان کے آپس کے بڑے بڑے جھگڑوں کو بھی صلح صفائی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے ، بشرطیکہ حکومت ہند خلوص اور عزم کے ساتھ ان اصولوں پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لے -

ہم پاکستان والوں نے اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ اور خاص کر ہندوستان کے ساتھ پر امن اور دوستانہ تعلقات کی پالسی اختیار کرنے کا عہد کر رکھا ہے - ہم نے یہ راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ ہمارے خیال میں یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم اپنے اقتصادی و صنعتی ترقی کے عظیم کاموں کو انجام دے سکتے ہیں جن سے عوام کی خوش حالی اور بھلائی وابستہ ہے -

۲۵-اکتوبر ۱۹۶۲ء کو مسٹر ہیرلڈ میکمیلن نے اپنے ہائی کمشنر کے ذریعے مجھ کو ایک پیغام بھیجا - اس کے چند روز بعد اسی قسم کا پیغام مجھے آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر آر-جی مینزیز کی طرف سے بھی ملا - میں نے ان دونوں کو بھی قریب قریب وہی باتیں لکھیں جو مسٹر کینیڈی کے خط کے جواب میں لکھی تھیں - اس میں میں نے اپنے اس مدلل یقین کو دہرایا تھا کہ چینی ہندوستان پر بھرپور فوجی حملہ کرنا نہیں چاہتے - مجھے امید تھی کہ مغربی طاقتیں ہندوستان کو وسیع پیمانے پر جنگی ساز و سامان دیتے وقت ہمارے نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھیں گی - لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغربی طاقتیں ہندوستان کو جلد سے جلد اسلحہ اور گولہ بارود پہنچانے کی خواہش میں نہ تو ہماری بات سننے کو تیار ہیں اور نہ انہیں اس امر

کا کوئی خیال ہے کہ ان کی اس کارروائی سے آگے چل کر اس بر صغیر میں طاقت کے توازن میں سخت ناہمواری پیدا ہو جائے گی۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان والوں کے دل میں یہ بات بٹھا کر انہیں خوف زدہ کرنے کی قطعی طور پر کوشش کی گئی تھی کہ ان پر چینی برما کے راستے یا تبت سے پچیس تیس ڈویژنوں کے ساتھ حملہ کرنے والے ہیں۔ مسٹر نہرو نے، جو چین کے ساتھ ایک ''طویل جنگ،، کی باتیں کرنے لگے تھے، یہ یقین کر لیا تھا کہ چینیوں کا حملہ لازمی ہے۔ اس قسم کے امکان کا چرچا کرنا ان کے حق میں مفید تھا۔

یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ جنگی کارروائیوں میں دلّی سے کس قدر مداخلت کی گئی، لیکن اس قسم کی مداخلت ہمیشہ بڑی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اس کا صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر ایک کمانڈر چن لیا جائے اور پھر جنگ کی قیادت اس کی مرضی پر چھوڑ دی جائے۔ جنرل کول جو شمال مشرق محاذ پر ہندوستانی فوج کی کمان کر رہے تھے، سپلائی اور ٹرانسپورٹ کے افسر تھے اور کسی بڑی لڑائی کا تجربہ نہ رکھتے تھے۔ ایک ہندوستانی بریگیڈ کو ٹھیک ''درۂ سیلا،، کی اگلی ڈھلوانوں پر متعین کیا گیا، جہاں چینی فوجیں عین سامنے تھیں۔ اس قسم کی کارروائی کسی بھی تجربہ کار کمانڈر سے سرزد نہ ہوتی۔ چینیوں نے پہلے اس بریگیڈ کو سامنے سے للکارا، اور پھر پہلو سے جا کر اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ کول کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے پچھلے بریگیڈ کو مدد کے لئے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جب یہ کارروائی عمل میں آئی تو چینیوں نے پیچھے سے جا کر دوسرا حصار باندھ لیا اور ان خندقوں کو جا لیا جو پچھلے بریگیڈ نے خالی کی تھیں۔ جب پچھلے بریگیڈ نے دیکھا کہ چینی فوجوں نے اگلے بریگیڈ پر جو گھیرا ڈال رکھا ہے اس کو وہ توڑ نہیں سکتا تو اس نے لوٹ جانے کی کوشش کی۔ وہاں چینیوں نے ان کی خندقوں پر پہلے ہی قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر سپاہیوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور وہ جان بچانے کے لئے تتر بتر ہو گئے۔ اس اثنا میں چینی فوجوں نے ایک اور حصار باندھنے کے لئے نقل و حرکت کی اور آسام کے میدانوں میں داخل ہو گئیں۔ اس سے وہاں کی شہری آبادی میں بھگدڑ مچ گئی۔ ادھر

خود ہندوستانی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہی تھی اور اس میں لڑنے کا ذرا دم نہ رہا تھا ۔ اگر اس کی فوجی قیادت بہتر ہوتی ، دستوں کی صف بندی صحیح ہوتی اور بازوؤں پر جوابی حملے کے لئے ریزرو فوج رکھی جاتی ، تو شاید نتائج ایسے تباہ کن نہ نکلتے ۔

چینی فوجیں نہایت ذہین کمانڈروں کے تحت بڑی ہوشیاری سے لڑیں اور کچھ یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ جفاکش ہیں ، اور اس قسم کی آب و ہوا میں لڑنے کے عادی ہیں ۔ تبت میں تقریباً اٹھارہ ہزار فیٹ کی بلندی پر رہنا ، یہی بات اُن کی برتری کے لئے کافی ہے ۔ اب خیال کیجئے کہ ہندوستانیوں اور امریکیوں کا تصور تو یہ تھا ، کہ چینی اپنے پچیس تیس ڈویژن جنگ میں لا اتاریں گے ، مگر حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس سارے علاقے میں چینی فوج کی تعداد چھ سات ہلکے ڈویژنوں سے زیادہ نہ تھی ۔ اور نیفا کے محدود علاقے میں تو وہ انڈین آرمی کے خلاف کسی بھی حصے میں ایک یا ڈیڑھ ڈویژن سے زیادہ فوج مقابلے میں نہیں لائے تھے ۔ اتنی کم فوج کے باوجود وہ اتنی ہوشیاری و ہنرمندی سے لڑے کہ ہندوستانی فوجوں کے گرد گھیرے پر گھیرے ڈال دیے ۔ لیکن میں یہاں ہندوستانی سپاہی کو ہیٹا نہیں ٹھہرانا چاہتا ۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ دنیا میں کسی سے کم نہیں ۔ مگر ان کو غلط طور پر استعمال کیا گیا ۔ اگر ان کو بہتر قیادت نصیب ہوتی تو وہ ضرور اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ۔

(۴)

ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ انھیں عنقریب چین کے ایک بھرپور حملے کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ ان کے دل میں یہ بات بٹھانے میں امریکہ بھی شریک تھا ۔ چنانچہ ہندوستان کو بے اندازہ جنگی ساز و سامان ملنے لگا ۔ جہاں تک امریکہ اور پاکستان کے باہمی اتحاد اور معاہدوں کا تعلق تھا ، امریکہ نے بس اتنا ہی ضروری سمجھا کہ پاکستان کو یقین دہانی کرا دی جائے کہ یہ جنگی ساز و سامان اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا اور کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے ہندوستان و پاکستان میں براہ راست گفت و شنید کی راہ ہموار کی جائے گی ۔

۱۷-نومبر ۱۹۶۲ء کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے یہ یقین دہانی ایک بیان کی صورت میں جاری ہوئی :

''اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے آج ان مراسلات کے متن کو شائع کر دیا ہے جو حکومت امریکہ اور حکومت ہند نے ایک دوسرے کو بھیجے اور جو حکومت امریکہ کی حکومت ہند کو دی جانے والی دفاعی امداد کے متعلق ہیں - ان مراسلات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ امداد ہندوستان کو چینی کمیونسٹوں کے حملے سے بچاؤ کے لئے دی جا رہی ہے - جس سے اس وقت ہندوستان دوچار ہے -

۱۹۵۴ء میں جب ریاستہائے متحدہ امریکہ نے پاکستان کو فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا تھا تو حکومت ہندوستان کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر کوئی بھی ملک جس میں پاکستان شامل ہے ہماری امداد کا غلط استعمال کرے گا یا کسی دوسرے ملک کے خلاف حملہ کرنے میں اس سے کام لے گا تو حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنے آئینی اختیار کے تحت فی‌الفور اس حملے کو ناکام بنانے کے لئے اقوام متحدہ کے اندر اور اقوام متحدہ کے باہر مناسب کارروائی کرے گی۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے حکومت پاکستان کو بھی یقین دلایا ہے کہ ہندوستان کو جو امداد دی جا رہی ہے اگر اس کا غلط استعمال کیا گیا یا کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنے میں اس سے کام لیا گیا تو حکومت اپنے آئینی اختیار کے مطابق فی‌الفور اقوام متحدہ کے اندر اور باہر ایسے حملے کو روکنے کے لئے مناسب کارروائی کرے گی -

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ یقین دلاتے وقت امریکہ کو پورا یقین ہے کہ یہ دونوں ملک جن کو امریکہ کی امداد مل رہی ہے ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ ارادے نہیں رکھتے -''

صدر کینیڈی نے خود بھی ۲-نومبر ۱۹۶۲ء کو ایک بیان جاری کیا :

''ہندوستان کو فوجی امداد دیتے وقت ہمیں پاکستان کے ساتھ اپنے اتحاد کا پورا پورا خیال ہے - ہماری اس امداد کا مقصد محض چینی کمیونسٹوں کی تخریبی کارروائی کو شکست دینا ہے - ہماری اس امداد

سے جو هندوستان کو دی جا رهی هے نه تو پاکستان کے ساتھ همارے معاهدوں کی اهمیت کم هوتی هے اور نه اس میں کسی قسم کا فرق آتا هے - هم نے یه امر دونوں حکومتوں پر واضح کر دیا هے -،،

هندوستان اور پاکستان کے درمیان براه راست گفت و شنید کا انتظام کرانے میں مسٹر ڈنکن سینڈیز جو اس وقت برطانیه میں وزیر تعلقات دولت مشترکه کے عهدے پر فائز تھے ، اور مسٹر ایورل هیری مین امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے امور مشرق بعید نے بڑا نمایاں حصه لیا - ذیل میں وه بیان درج کیا جاتا هے جو هندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے ۲۹-نومبر ۱۹۶۲ء کو مشترکه طور پر جاری کیا تھا اور جس پر نہرو اور میں نے دستخط کئے تھے :

صدر پاکستان اور وزیر اعظم هندوستان نے اس امر پر اتفاق کیا هے که ان دونوں ملکوں کے درمیان کشمیر اور دوسرے متعلقه معاملات میں جو بڑے بڑے اختلافات موجود هیں ان کے تصفیے کی ازسرنو کوشش کی جائے ، تاکه هندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی سے ره سکیں -

اس مقصد کے لئے انھوں نے بہت جلد مذاکرات کرنے کا فیصله کیا هے تاکه ایک آبرومندانه اور منصفانه سمجھوتا هو سکے -

یه مذاکرات ابتدا میں وزارتی سطح پر هوں گے - مناسب موقع آنے پر مسٹر نہرو اور صدر ایوب میں براه راست بات چیت هوگی -

دستخط	دستخط
ایم-اے- خان	جے-ایل-نہرو
ایفدایم	۲۹-۱۱-۶۲
۲۹-۱۱-۶۲	۱۰-۷ - شام

اس مشترکه بیان پر ابھی دستخطوں کی سیاهی بھی سوکھنے نه پائی تھی که مسٹر نہرو نے لوک سبھا میں ایک بیان دے ڈالا - مسئلهٔ کشمیر کے مفید اور تعمیری مذاکرات کے متعلق مسٹر نہرو کی نیت پر مجھے پہلے هی سے شبه تھا - ان کے اس بیان نے اس شبه کو قوی تر بنا دیا - ۳۰-نومبر کو مسٹر ڈنکن سینڈیز نئی دهلی سے لندن

لوٹتے ہوئے کراچی پہنچے ۔ جب انہیں نہرو کے بیان کا متن دکھایا گیا تو وہ ایسے متعجب ہوئے کہ انہوں نے اس معاملے کو صاف کرنے کے لئے واپس دھلی جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ دھلی کے ہوائی اڈے سے وہ سیدھے وزیر اعظم کی کوٹھی پر پہنچے ۔ نہرو سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ مسٹر سینڈیز نے انہیں جا لیا ۔

نہرو نے پہلے پہل یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے ان کی سمجھ ہی میں نہ آ رہا ہو کہ یہ واویلا کس لئے مچایا جا رہا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ میں نے یہ بیان حسب عادت بغیر تیار شدہ متن کے دیا تھا ۔ میں نے جو رائیں ظاہر کی تھیں وہ ایک سوال کے جواب میں تھیں ، جس کے لئے ان کو پہلے سے کوئی نوٹس نہیں دیا گیا تھا ۔ یہ سوال بی-بی-سی کی ایک افواہ کے بارے میں تھا ، جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کی تقسیم کا خیال زیر بحث ہے ۔ مسٹر نہرو نے کہا کہ ان کے بعض الفاظ کو ضرورت سے زیادہ معنی پہنانا درست نہ ہوگا ۔ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بیان دینے کے خیال کو اس لئے پسند نہ کیا کہ کہیں اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے بیان سے منحرف ہوگئے ہیں ۔ تاہم مسٹر ڈنکن سینڈیز کے اس مشورے کو انہوں نے قبول کر لیا کہ کوئی اس قسم کا بیان سوچ لیا جائے جس کا مطلب یہ تو نہ ہو کہ وہ اپنی بات سے پلٹ رہے ہیں ، مگر ساتھ ہی ان الفاظ کی اس طرح وضاحت کی جائے کہ لوک سبھا والے بیان سے جو شبہات پیدا ہوگئے ہیں دور ہو سکیں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں یکم دسمبر ۱۹۶۲ء کو مسٹر نہرو نے جو بیان دیا وہ یہ ہے :

''دونوں حکومتیں جو مذاکرات شروع کرنے والی ہیں ان کی حدود پہلے سے مقرر کر لینے یا پیشگی شرطیں عائد کرنے کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا ۔ جیسا کہ کل میں نے لوک سبھا میں اشارہ کیا تھا ، کشمیر کا مسئلہ پیچیدہ اور مشکل ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر دونوں فریقوں نے خیر سگالی سے کام لیا تو اس کا اور دوسرے مسئلوں کا آبرومندانہ اور منصفانہ حل تلاش کر لینا ناممکن نہ ہوگا،،

اس اثنا میں نہرو امریکہ کو فوجی امداد کے لئے ایک اور تاکیدی درخواست بھیج چکے تھے ۔ ۲۰-نومبر ۱۹۶۲ء کو امریکہ نے فوجی

باربرداری کے بارہ عدد سی-۱۳۰ قسم کے ہوائی جہاز بھیجے - اس کے بعد مزید امداد کے طور پر پہاڑی لڑائی کے مطلب کا ساز و سامان بھیجا گیا۔ ان ہوائی جہازوں کو ہندوستانی علاقے کے اندر رسد پہنچانے کے لئے استعمال کیا جانا تھا - علاوہ ازیں ان کو نیفا کے علاقے میں فوجی مورچے سنبھالنے کے سلسلے میں ''فوری کام،، انجام دینے تھے -

اس وقت ہندوستانیوں کے نقطہٴ نظر سے فوجی صورت حال بڑی مایوس کن نظر آتی تھی - چینی فوجیں نیفا کے علاقے میں وادی کے دونوں سروں پر بڑی تیزی سے نقل و حرکت کر رہی تھیں - نیفا کے علاقے میں ہندوستانی فوجوں کے بڑے بڑے حصے ایک سے لے کر ڈیڑھ ڈویژن تک ، بے کار کر دیے گئے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ چینی شاید تیز پور ، جورہاٹ ، اور ڈگبوئی پر قبضہ کر لیں گے - نومبر کے تیسرے ہفتے میں ایک اونچے درجے کی جماعت جو پینٹا گن اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسروں اور وائٹ ہاؤس کے ایک نمائندے پر مشتمل تھی، اس مقصد کے لئے ہندوستان آئی کہ ''ہندوستان کی ضرورتوں کا اندازہ لگانے میں ،، وہاں کے امریکی سفارت خانے کی امداد کرے ، اور ''متعلقہ پالسی کے امور،، پر مشورہ دے۔ اس وقت امریکیوں کا اندازہ یہ تھا کہ اگر چینی فوجیں متنازعہ فیہ علاقے سے آگے بڑھ گئیں تو یہ جنگ ''صرف ، ہندوستان کا معاملہ،، نہ رہے گی بلکہ ''اس سے کچھ سوا،، ہو جائے گی -

غرض یہ تھی وہ صورت حال جب نہرو نے مشترکہ بیان پر دستخط کئے تھے ، جس کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو مسئلہٴ کشمیر کے حل کے لئے ازسرنو جد و جہد کرنی تھی - چینیوں کے جنگ بند کرنے کے یک طرفہ اعلان کو ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ ہندوستانیوں کا رویہ بالکل بدل گیا ، اور وہ مذاکرات جن کی کامیابی کے پہلے ہی کچھ آثار نظر نہ آتے تھے ضابطے کی بابت اختلاف اور لفظی بحثوں میں پھنس کر رہ گئے -

صدر کینیڈی اور وزیراعظم میکمیلن نے مجھے مطلع کیا کہ وہ کس حد تک ہندوستان کو اسلحہ مہیا کر رہے ہیں - میں نے ۲-جنوری سنہ ۱۹۶۳ء کو صدر کینیڈی کو لکھا :

''کشمیر کا فوری اور منصفانہ تصفیہ ھی اس بات کی ضمانت دے سکتا ھے کہ ھندوستان کو دی جانے والی بڑھتی ھوئی فوجی امداد آئندہ پاکستان کے خلاف استعمال نہ کی جائے گی۔

''مجھے اس امر میں آپ کی رائے سے پورا پورا اتفاق ھے کہ کوئی بھی اقدام اس بر صغیر کی سلامتی کے لئے اتنا کارآمد ثابت نہیں ھو سکتا جتنا کہ مسئلہٗ کشمیر کا حل کیا جانا۔ اس موضوع پر مسٹر نہرو کے حوصلہ شکن اور اشتعال انگیز بیانات کے باوجود ھم اس مسئلے کے ایک ایسے تصفیے کے لئے ھندوستان سے گفت و شنید کرنے کی پُرخلوص کوشش کئے جا رھے ھیں، جس سے تین ضرورتیں پوری ھو سکیں: جموں اور کشمیر کے لوگوں کی خواھشات کا احترام، پاکستان کے اھم مفادات کی حفاظت، اور ھندوستان کے جائز مطالبات کا مناسب لحاظ۔

''اس سلسلے میں صحیح فیصلہ جبھی ھو سکے گا کہ ان تینوں بنیادی باتوں کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ لیکن اگر ھندوستان نے صرف اپنے ھی فائدے پر نظر رکھی یا تصفیے میں رکاوٹ پیدا کی جیسا کہ آثار سے معلوم ھوتا ھے، تو ھم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ھو سکیں گے''۔

''وزیراعظم ھیرلڈ میکمیلن کو بھی میں نے اسی دن خط لکھا:

''میں آپ کے ۲۴ دسمبر کے پیغام کے لئے شکرگزار ھوں۔ سر مورس جیمس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ نے اور صدر کینیڈی نے اپنی ناساو کی ملاقات کے موقعے پر ھندوستان کو کس حد تک فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا ھے۔

''کشمیر کے تصفیے کے بغیر ھندوستان کو برطانیہ اور امریکہ کے اس حد تک فوجی امداد دینے سے ھمیں تشویش پیدا ھو گئی ھے۔ ناساو کے فیصلے کے مطابق جس کی بنیاد آپ کے فوجی ماھرین کے اندازے پر رکھی گئی ھے، جو امداد دی جائے گی وہ آپ کی حکمت عملی کے نقطہٗ نگاہ سے شاید کم سے کم معلوم ھو، جس کی نیفا اور لداخ کی راہ سے ھونے والے حملے سے بچنے کے لئے ھندوستان کو ضرورت ھوگی، لیکن اس کے برعکس ھمارے لئے یہ یقین کر لینا

مشکل ہے کہ ان راستوں سے کوئی حملہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ آپ جو فوجی امداد ہندوستان کو دے رہے ہیں وہ مقدار اور اقسام کے لحاظ سے اتنی زیادہ ہے کہ اس سے اس بر صغیر میں فوجی طاقت کا موجودہ توازن بگڑ جائے گا ، اور اس طرح پاکستان کی سلامتی کو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

"میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اس بر صغیر کی سلامتی کو برقرار رکھنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی مسلح افواج کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی سے روک دیا جائے۔ دونوں طرف کی یہ صف آرائی کشمیر کے تصفیے ہی سے ہٹائی جا سکتی ہے - لیکن کسی تصفیے کے بغیر ہندوستان کو بھاری فوجی امداد دیے جانے سے اس امر کا امکان ہے کہ اسے ہندوستان کے شمال مشرقی خطے یا ہندوستان اور چین کی سرحد کے مغربی حصوں کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"چند روز ہوئے راولپنڈی میں ہندوستان اور پاکستان میں وزارتی سطح پر جو گفت و شنید ہوئی تھی ، ہم نے اس سے برطانوی ہائی کمشنر کو آگاہ رکھا ہے - یہ ملاقات محض ابتدائی جانچ پڑتال کرنے کے لئے تھی - کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے ارادوں کا حال اس وقت کھلے گا جب نئی دلی میں جنوری کے وسط تک دونوں ملکوں میں اگلی وزارتی میٹنگ ہوگی -

"پاکستان کا رویہ سخت گیرانہ نہ ہوگا۔ میں نے اپنے وفد کو ہدایت کی ہے کہ وہ تصفیے کا امکانی حل تلاش کرنے میں تین اصولوں کی پیروی کرے :

۱ - کیا یہ حل جموں اور کشمیر کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے -

۲ - کیا یہ پاکستان کے عام مفادات کی حفاظت کرتا ہے ، اور

۳ - کیا یہ ہندوستان کے جائز مطالبات کو پورا کرتا ہے -

"مجھے اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ایسا فارمولا جو یہ تینوں شرطیں پوری کرتا ہو آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے - لیکن اگر ہندوستان سچے دل سے اس جھگڑے کو ختم کرنے کا

خواہاں ہو اور دونوں فریق خیر سگالی کا اظہار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے ایک یا دو مہینے کے اندر دونوں ملک اس مسئلے کا ایک منصفانہ اور آبرومندانہ حل تلاش نہ کر لیں۔

''پاکستان میں رائے عامہ کی کیفیت یہ ہے کہ گو میں صبر و استقلال سے کام لینے پر آمادہ ہوں لیکن اگر مذاکرات کے سلسلے ایک کے بعد ایک یونہی ناکام ہوتے رہے اور تصفیے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو میرے لئے اپنے عوام کو صبر و استقلال کی تلقین کرنا محال ہو جائے گا۔

''مجھے یقین ہے کہ منصفانہ اور پر امن سمجھوتے کی کلید آپ کے اور صدر کینیڈی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اسلحہ اس قرینے سے مہیا کیا جائے کہ ہندوستان معقولیت کی طرف مائل ہو سکے تو ہونے والے مذاکرات سے ضرور اچھے نتائج نکل سکیں گے۔

''نئے سال کے موقع پر آپ کی صحت اور خرمی و خوش حالی کی نیک خواہشات کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

(دستخط)

محمد ایوب خان،،

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ایک دن صبح کو چینی سفیر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہ چین کی طرف سے جنگ بندی کے اعلان کے بعد کی بات ہے۔ اسے مجھ تک یہ بات پہنچانے کی ہدایت کی گئی تھی کہ بعض حلقوں میں ایسے شر انگیز بیانات دئیے جا رہے ہیں جن کا مقصد تصفیۂ کشمیر کے سلسلے میں چینی رویے کی بابت پاکستانیوں کو بدظن کرنا ہے۔ چینی سفیر نے مجھے یقین دلایا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں اس مسئلے کا آبرومندانہ تصفیہ ہو گیا تو چینی حکومت کو اس سے بڑی خوشی ہوگی۔

ہندوستان اور پاکستان میں جو گفت و شنید ہوئی مجھے اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ ہندوستانی ٹال مٹول کرتے رہے۔ انھوں نے مغربی طاقتوں سے بےاندازہ جنگی سامان حاصل کر لیا تھا۔ اس کے عوض کشمیر پر مذاکرات کے

لئے مشترکہ بیان جاری کر دینا کچھ مہنگا سودا نہ تھا ۔ ہم خوب جانتے تھے کہ جب تک امریکہ اس معاملے میں براہ راست دل چسپی نہ لے ، ہندوستان ٹس سے مس نہ ہوگا ۔ لیکن امریکہ کا خیال تھا کہ ان حالات میں اس کا مذاکرات میں حصہ لینا نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگا ۔ چنانچہ قدرت نے جموں اور کشمیر کے مسئلے کے تصفیے کا جو یہ نادر موقع بخشا تھا وہ ہاتھ سے جاتا رہا ، جب امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کو دی جانے والی جنگی امداد کو مسئلۂ کشمیر کے تصفیے سے مشروط نہ کیا جائے گا ، تو ہندوستانیوں کو پاکستانیوں کے ساتھ اس مسئلے پر سنجیدگی سے بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی ۔

دسمبر ۱۹۶۳ء میں میری ملاقات جنرل میکسول ٹیلر سے ہوئی ۔ انہوں نے امریکہ کی اس خواہش کا ذکر کیا کہ بحر ہند میں ایک ''نیوکلئیر ٹاسک فورس،، تعینات کی جائے ۔ میں نے کہا امریکہ اپنی مرضی کا مالک ہے ۔ وہ کھلے سمندروں میں جو چاہے کر سکتا ہے ، لیکن میں اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس اقدام سے اسے کیا فوجی یا سیاسی فائدہ حاصل ہوگا ۔ امریکہ اپنے موجودہ اڈوں سے بھی اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہے ۔ پھر بحر ہند میں کشیدگی کا ایک اور عنصر پیدا کر دینے کی کیا ضرورت ہے؟ سیاسی طور پر یہ اقدام نہایت نامقبول ہوگا اور افریقہ اور ایشیا کے ممالک سخت ناراض ہوں گے ۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ، اس فوج سے ہماری مشکلات بڑھ جائیں گی اور ہندوستان کو من مانی کرنے کی اور زیادہ شہ ملے گی ۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ، اس زمانے میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک دوطرفہ سمجھوتہ تھا کہ پاکستان پر حملے کی صورت میں ، خواہ وہ کسی طرف سے بھی ہو امریکہ اس کی مدد کرے گا ۔ امریکہ نے کئی مرتبہ ہمیں ایسی تجاویز پیش کیں جن کے تحت اس نے اپنی ایک ''ٹاسک فورس،، بذریعۂ ہوائی جہاز پاکستان بھیجنی چاہی ، ہم نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ کیا یہ فوج ہمارے ساتھ مل کر کسی ہنگامی منصوبے پر کام کرے گی ، جس میں ہماری فوجیں بھی مشترکہ طور پر بھرپور حصہ لے سکیں گی ۔ امریکی اس

پر راضی نہ تھے۔ وہ تو بس ہم کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ان کی فوجیں دور دراز اڈوں سے آڑ کر پاکستان پہنچ سکتی ہیں ۔ اس سے ہمیں دل چسپی نہ تھی ۔ جس قسم کی مشق ہم چاہتے تھے امریکہ نے اسے منظور نہ کیا ، اس لئے ہم نے محسوس کیا کہ پاکستان میں ایسی امریکی فوج کا جنگی مشقوں کے لئے آنا کچھ مفید ثابت نہ ہوگا ۔ اس وقت ہم پر یہ بات کھلتی جا رہی تھی کہ اگر ہندوستان ہم پر حملہ کر دے تو اس کا امکان بہت کم ہے کہ امریکہ اپنا وعدہ پورا کرے گا اور ہماری مدد کو پہنچے گا ۔

دسواں باب

خارجہ پالسی - ۲

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ایشیا میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جو سیٹو اور سینٹو دونوں میں شریک ہے - مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان معاہدوں میں ہمارے شامل ہونے کی وجوہ کو پورے طور پر نہیں سمجھا گیا ، حتیٰ کہ پاکستان میں بھی - ان وجوہ کا لب لباب شروع ہی سے ہندوستان کا دشمنانہ رویہ رہا ہے - ہمیں لازماً اپنی سلامتی کے لئے دوستوں اور اتحادیوں کی جستجو ہوئی - علاوہ ازیں پاکستان ہمیشہ اس امر کا خواہش مند رہا ہے کہ اپنے مشرق وسطیٰ کے ہمسایوں سے گہرے تعلقات قائم کرے ، خصوصاً دوسرے اسلامی ملکوں سے ، کیونکہ ہمارے اور ان کے درمیان نہ صرف دینی رشتہ قائم ہے بلکہ ہمارا نظریۂ حیات ، ہماری اقدار ، ہمارا تاریخی پس منظر اور ہمارے مسائل بھی وہی ہیں جو ان کے ہیں -

معاہدۂ بغداد کا خیال ریاستہائے متحدہ امریکہ نے پیش کیا تھا - شروع شروع میں وہ خود بھی اس معاہدے کا پورا پورا رکن بننے کو تیار تھا ، لیکن صدر ناصر کے مخالفانہ رویے کی وجہ سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ، اور صرف ایک مبصّر کی حیثیت سے اس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا - امریکیوں کو اس معاہدے سے جو دل چسپی تھی اس کا حال سب کو معلوم ہے - امریکی مشرق وسطیٰ میں اشتراکیت کا زور توڑنا چاہتے تھے - اشتراکیت کا یہی وہ خوف تھا جس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عیسائی دنیا کو اسلامی دنیا کی حمایت پر مجبور کر دیا تھا - اسلامی دنیا ایک ایسے خطے میں واقع ہے جو

فوجی اور اقتصادی لحاظ سے نہایت اہم ہے ۔ اسی سبب سے امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنے میں اپنا فائدہ دیکھا۔ اسلامی دنیا خود اس وقت مغربی طاقتوں کے تسلط سے آزاد ہو رہی تھی ۔ اسے مادی امداد کی ضرورت تھی ، وہ مہلت چاہتی تھی، اور اسے فنی واقفیت کی بھی ضرورت تھی ۔ تاکہ اپنے انسانی اور مادی وسائل کو ترقی دے سکے ۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتے ۔ ہمارے لئے ہماری اپنی ترقی کی ضروریات بے حد اہم تھیں ۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے معاہدوں میں شرکت کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مشرق وسطیٰ کے ملک زیادہ تعداد میں معاہدۂ بغداد میں شامل ہوتے تو اسلامی مملکتوں کو ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے اور ایک دوسرے کی پالیسیوں اور منصوبوں کو ہم آہنگ بنانے کا نہایت عمدہ موقع ملتا ۔ مسلمانوں کے پاس اپنی آواز اٹھانے کے لئے کوئی مشترکہ ادارہ نہ تھا ۔ معاہدۂ بغداد سے یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک طاقت ور انجمن بن جائے گی جہاں مسلمان قومیں باہمی تعاون کی راہیں تلاش کر سکیں گی ۔

یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی کہ عرب ممالک میں اس خیال کو سراہا نہیں گیا ۔ وہ شروع ہی سے اس معاہدے کو شک و شبہ کی نظروں سے کیوں دیکھنے لگے تھے ، اس کی وجوہ سمجھ میں آ سکتی ہیں ۔ انھوں نے سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں بڑے دکھ سہے تھے ، اور سویز میں برطانیہ اور فرانس کے غلط اقدام نے جس کی حمایت اسرائیلیوں نے کی تھی ، عربوں کے دلوں کو اس اتحاد سے اور بھی دور کر دیا تھا ۔ وہ کسی ایسے ادارے پر بھروسا کرنے کے لئے تیار نہ تھے جس میں برطانیہ کا عمل دخل ہو ۔ میں نے نومبر ۱۹۶۰ء میں قاہرہ کا دورہ کیا تھا ۔ وہاں نیشنل یونین کا اجتماع ہوا ۔ میں نے اپنے ایڈریس میں کہا کہ سویز کے بحران کے موقع پر ممکن ہے پاکستانی نمائندوں نے بے ڈھنگے پن کا ثبوت دیا ہو ، لیکن پاکستان کے تمام سمجھ دار لوگوں کو اس حملے سے دلی صدمہ پہنچا تھا ، اور ان کی ہمدردیاں تمام تر مصر کے ساتھ تھیں ۔ میں اس وقت پاکستانی فوج کا کمانڈر ان چیف تھا ۔ میں نے اسی زمانے میں

حکومت کو اس امر سے خبردار کر دیا تھا کہ ممکن ہے برطانیہ دوسری طاقتوں کے ساتھ مل کر مصر پر حملہ کر دے - مجھے فکر یہ تھی کہ کسی طرح مصری حکام کو چوکس کر دیا جائے ، اور اس مصیبت کو ٹالنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے - پاکستان عربوں کے مقاصد کی ہمیشہ حمایت کرتا رہا ہے - جس کے ثبوت میں اقوام متحدہ کے ریکارڈ پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن پاکستانیوں کو بجا طور پر اس بات کا دکھ ہے کہ خود ان کی اپنی جد و جہد میں دنیائے اسلام نے ان کی مستقلاً حمایت نہیں کی -

پاکستان کے معاہدۂ بغداد میں شامل ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ وہ مشرق وسطیٰ کو ایک ایسا خطہ سمجھتا تھا جس پر خطرات منڈلا رہے تھے اور جس کے وسیع قدرتی ذرائع سوویٹ یونین اور مغربی طاقتوں کے درمیان تصادم کا موجب ہو سکتے تھے - اگر یہ جھگڑا شروع ہو جاتا تو اس کے اثرات ہماری سرحدوں تک پہنچ جاتے اور ہماری سلامتی کے لئے خطرہ پیدا کر دیتے - چنانچہ قدرتی بات تھی کہ ہم اس علاقے کے تحفظ اور سلامتی کے کسی انتظام میں پورے دل سے حصہ لیں - ہمیں یہ بھی اُمید تھی کہ ہم اس معاہدے کے ذریعے مشرق وسطیٰ میں ہندوستانیوں کے خطرناک ارادوں سے ایک حد تک محفوظ رہیں گے - ہمارے ہمسایوں کو ہمارے مسائل سے واقفیت پیدا ہوگی اور وہ اس خطرے کو بخوبی سمجھ سکیں گے جو ہندوستان کی طرف سے ہمیں درپیش ہے - اور اس طرح ہم ان ہمسایوں کی ہمدردی اور حمایت حاصل کر سکیں گے -

غرض معاہدۂ بغداد میں شامل ہونے میں ہمارا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہم اپنی پوزیشن کو مضبوط بنائیں ، دوسرے اس سارے علاقے ، خصوصاً اسلامی دنیا کی یک جہتی اور استحکام میں حصہ لیں - ہم امن اور استقلال کو تقویت دینا چاہتے تھے - لیکن بعض عرب ملکوں نے یہ سمجھا کہ ہم مغربی طاقتوں کے مفاد کے لئے کام کر رہے ہیں - مجھے اس سے انکار نہیں کہ معاہدۂ بغداد سے مغربی طاقتوں کے جو مقاصد وابستہ تھے وہ ہمارے مقاصد سے قطعی مختلف تھے ، لیکن ہم نے اپنے ارادوں یا اپنے مفادات کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا -

ممکن ہے کہ اگر ہم زیادہ کوشش کرتے تو عرب ممالک کو اپنے نیک ارادوں کا یقین دلا سکتے - لیکن افسوس ہے کہ عربوں کے رویے نے خواہ وہ ان کے نقطۂ نگاہ سے کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، اس معاہدے کو اسلامی دنیا کا ایک طاقت ور پلیٹ فارم نہ بننے دیا - اس معاہدے سے ہمارے جو مقاصد تھے وہ عربوں کے مقاصد کے خلاف نہیں تھے اور در حقیقت اگر ہم معاہدۂ بغداد کے تحت آپس میں مل بیٹھتے تو شاید ہم عرب لیگ سے بھی زیادہ مؤثر ادارہ ثابت ہوتے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب ہمارے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے، بلکہ انہوں نے ہمارے متعلق یہ کہا کہ ہم دنیائے عرب میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کر رہے ہیں - انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم عراق کو پھسلا کر مغربی طاقتوں کے دائرۂ اثر میں لے آئے ہیں - اب بھلا کوئی یہ پوچھے کہ عربوں میں پھوٹ ڈلوانے سے ہمارا کیا فائدہ تھا - اس سے ہمارے قومی مفادات کو کیا مدد مل سکتی تھی؟ دنیائے عرب کو یوں منتشر دیکھ کر ہمیں دلی رنج ہوتا ہے - اس انتشار کا باعث معاہدۂ بغداد نہ تھا - اگر ایسا ہوتا تو اس معاہدے سے عراق کی علیحدگی کے بعد عربوں میں صلح صفائی ہو گئی ہوتی - ہمارے اس اقدام کا مقصد دنیائے عرب میں تفریق پیدا کرنا نہ تھا بلکہ تمام مسلمانوں کو جن میں عرب بھی شامل ہیں ایک مشترک پلیٹ فارم پر لانا تھا -

اس معاہدے میں شامل ہونے سے ہمیں ایک اور بڑا نقصان بھی پہنچا - اس نے ہمیں ایک عرصے تک سوویٹ یونین کو سمجھنے سے محروم رکھا - روسی ہمارے ہمسائے تھے، اور جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے، اگر ہماری ان سے راہ و رسم پیدا ہوتی تو یقینی طور پر ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکتے - لیکن میل جول کے نہ ہونے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں، اور سوویٹ یونین کے لیڈروں نے ہندوستان کی پوری پوری امداد کرنے کا فیصلہ کر لیا - اس طرح اس معاہدے سے ہمیں جو اقتصادی اور فوجی فائدے پہنچے تھے وہ ملیا میٹ ہو گئے بلکہ اُلٹا خسارہ لازم آیا-

لیکن اس قصے کا ایک روشن پہلو بھی ہے - اس معاہدے کے

ذریعے ایران اور ترکی کی حکومتوں سے ہمارا تعلق قائم ہو گیا جس نے بہت جلد گہری دوستی کی صورت اختیار کر لی - یہ اسی ربط و ضبط اور دوستی کا نتیجہ ہے کہ ہم بالآخر علاقائی تعاون برائے ترقی کا منصوبہ بنانے میں کامیاب ہو گئے - ایران اور ترکی کے لوگ ہمارے خلوص پر ایسا ہی یقین کرنے لگے ہیں جیسا کہ ہم ان کے خلوص پر -

معاہدۂ بغداد سے ہم نے ایک اور طریقے سے بھی فائدہ اٹھایا - وہ یہ کہ ہمیں ان خطروں اور نقصانات سے آگاہی ہو گئی جن کا علاقائی قسم کے سیاسی یا فوجی اتحادوں میں پایا جانا ضروری ہے - میں نے آر-سی-ڈی کا نظریہ دو مفروضوں پر قائم کیا - پہلا یہ کہ اس بات سے قطع نظر کہ کوئی ملک چھوٹا ہے یا بڑا علاقائی اتحاد کے ہر ممبر کو اپنی آواز اٹھانے کا مساوی حق ہونا چاہئیے - اگر کسی تنظیم میں کوئی ایک شریک غالب ہو تو اسے ضرور مشکلات کا سامنا ہوگا - دوسرا مفروضہ یہ کہ ہم سیاسیات اور فوجی معاملات سے حتی القدور کنارہ کش رہیں گے - میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی اتحاد کو کم از کم ابتدا میں صرف اقتصادی - ثقافتی اور ترقیاتی امور میں تعاون تک محدود رکھا جائے ، تو اس سے مفاہمت کی ایک مضبوط بنیاد قائم ہو سکتی ہے جس پر ایک پائیدار ڈھانچہ کھڑا کیا جا سکتا ہے -

جب میں نے آر-سی-ڈی کا خیال هز امپیریل میجسٹی شہنشاہ ایران اور ترکی کے صدر گرسل اور وزیر اعظم انونو کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے کمال مہربانی سے اس کا خیر مقدم کیا - میرے یہ کہنے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ان حضرات کو یہ خیال ایسا بھایا کہ انھوں نے سنتے ہی فوراً اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی - ایران اور ترکی کے اپنے اپنے حالات نے یہ بات ان سربراہوں کے ذہن نشین کر دی تھی کہ علاقائی مفاہمت ایک ضروری چیز ہے - چھوٹے چھوٹے ملک الگ تھلگ رہیں تو دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں - چنانچہ دنیا میں اپنی وقعت اور عزت پیدا کرنے اور ایک مضبوط محاذ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جائیں - ہم اپنی اندرونی کوتاہیوں سے بے خبر نہ تھے -

مثال کے طور پر ترکی عسکری اور سیاسی لحاظ سے بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کا یورپین کامن مارکیٹ سے تعلق ہے ، اور اسے بہت بڑی حد تک ناٹو (شمالی اقیانوس کے معاہدے) پر بھروسا کرنا پڑتا ہے ، لیکن اپنی ان حد بندیوں کے باوجود ہم نے معلوم کیا کہ ہمارے پاس تعاون کے لئے خاصا بڑا میدان موجود ہے ۔ معاہدۂ بغداد میں شامل ہوئے بغیر ہماری ایک دوسرے سے راہ و رسم پیدا نہ ہوتی، نہ ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی ہوتی ، اور نہ آر۔سی۔ڈی کا منصوبہ وجود میں آتا ۔

دوسرا معاہدہ جس میں ہم شامل ہوئے سیٹو (جنوب مشرق ایشیا کا اتحاد) تھا ۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے حکومت پاکستان کو اس ادارے میں شامل ہونے پر آکسایا ۔ دراصل یہ بات چودھری ظفراللہ خان سے پوچھنی چاہئے جو اس وقت ہمارے وزیر خارجہ تھے ۔ ہم سپاہیوں سے اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا ۔ غالباً ہمیں جنرل ہیڈ کوارٹرز میں اس کی اطلاع بھی اس وقت ملی تھی جب وزیر خارجہ اس معاہدے پر دستخط کر چکے تھے ۔ اس وقت بھی میں نے یہی خیال کیا تھا کہ پاکستان کے سیٹو میں شامل ہونے کا تو کوئی جواز ہی نہیں ۔ شاید اس کا مقصد محض امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا ، جو ہمیں بھاری اقتصادی امداد دیتا رہا تھا ۔ درحقیقت اس کے سوا اس ادارے کا ممبر بننے میں مجھے کوئی اور مقصد دکھائی نہ دیتا تھا ۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ اس سے پاکستان کے مشرق حصے کی پوزیشن کسی لحاظ سے مضبوط ہو سکتی تھی تو وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرے گا کہ مشرق پاکستان کو تو اصلی خطرہ ہندوستان سے ہے جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ۔

سیٹو اور سینٹو دونوں معاہدے بڑی حد تک اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے ہیں ، گو ایک طرح سے ابھی تک ان کا رسمی وجود باقی ہے ۔ ان کی اہمیت زائل ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیشتر ملکوں سے جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے ہمارے دوطرفہ سمجھوتے ہو چکے ہیں ، گو ان کی قدر و قیمت بھی مشکوک

ہے ۔ اب ان دونوں معاہدوں کی جو اہمیت باقی رہ گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اگر کسی ممبر ملک پر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا ملک اس سے اظہار ہمدردی کر دے ۔ جہاں تک ان کی فوجی اہمیت کا تعلق ہے اس سے میرے خیال میں سوائے دوسروں کو برافروختہ کرنے کے اور کچھ فائدہ نہیں ۔ اور اگر ان دونوں معاہدوں کو ختم کر دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ کسی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کوئی ممبر ملک اس انتظام کو توڑنے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا ۔ ہرچند امریکہ ان معاہدوں کو ناپسند کرتا ہے مگر وہ اس خیال سے ان کو ختم کرنا نہیں چاہے گا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسے اس علاقے سے دل چسپی نہیں رہی ۔ اگر اس قسم کا گمان پیدا ہوگیا تو یقیناً دوسری بڑی طاقتیں اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کریں گی ۔

ان معاہدوں کا بس ایک ہی فائدہ ہے کہ وہ امریکہ کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں ، اور ان کے ذریعے اسے کسی حد تک سیاسی اثر حاصل ہے ۔ ان معاہدوں کا فائدہ زیادہ ہے یا نقصان ، یہ امریکہ جانے اور اس کا کام ، لیکن جہاں تک دوسرے ملکوں کا تعلق ہے یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ یہ علاقائی انتظامات موجودہ حالات میں حقیقت پسندانہ نہیں رہے ۔ سوویٹ یونین کے بارے میں امریکہ کے رویے میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے سینٹو کو تو یقیناً ماضی کی چیز بنا دیا ہے ۔

(۲)

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک کا جو زمانہ گزرا ، اس میں ہمیں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کیسی تشویش پیدا ہوگئی تھی ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے امریکہ نے اپنی حکمت عملی کو حالات کا تابع کر دیا ہے ، نیز یہ کہ جو تبدیلیاں وہ کر رہا تھا ان سے امریکی پالسیوں اور پروگراموں کے اخلاقی پہلو کی بابت لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچ رہی تھی ۔ پاکستان کے لوگوں کو سخت مایوسی ہو رہی تھی ۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ اور پاکستان

میں بڑی محنتوں کے بعد جو رشتہ قائم ہوا تھا ، اب لوگوں کے دلوں سے اس کا احترام اٹھتا جا رہا تھا ۔ ہم ہندوستان کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے ۔ نہ ہندوستان کے حملہ کرنے کی صورت میں امریکہ کی امداد پر بھروسا کر سکتے تھے ۔ امریکہ جس پالسی پر عمل کر رہا تھا ہم جانتے تھے کہ اس سے آگے چل کر ایشیا میں اس کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی ، لیکن ہمارے پاس امریکہ کو اس پالسی سے باز رکھنے کے کوئی ذرائع نہ تھے ۔ امریکی حکومت کے دل و دماغ پر چین کا خطرہ چھایا ہوا تھا اور وہ ہندوستان سے بے اختیارانہ آس لگا رہی تھی کہ ہندوستان چینی خطرے کا توڑ ثابت ہوگا ۔

جیسا کہ میں پچھلے باب میں بتا چکا ہوں ، ہم نے اس معاملے میں امریکہ کو بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا ۔ ہم تو اتنی بات بھی اس کے ذہن نشین نہ کرا سکے کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان میں ان بن رہے گی اس بر صغیر میں کسی قسم کا استحکام یا امن و امان قائم ہو ہی نہیں سکتا ۔ میرا خیال ہے کہ برطانیہ کو ، ہندوستان اور پاکستان کے مابین تصفیے کی ضرورت کا زیادہ احساس تھا مگر اقتصادی اور فوجی لحاظ سے اسے چنداں کوئی اثر حاصل نہ تھا ۔ یہ اثر تو بس امریکہ ھی کو حاصل تھا اور وہ اسے استعمال کرنے سے گریز کر رہا تھا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ کی مسلح افواج ہمارے نقطۂ نگاہ سے زیادہ ہمدردی رکھتی تھیں ، مگر وہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے پالسی بنانے والوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھیں ۔

اس نازک دور میں ہم نے انتہائی احتیاط برتی کہ ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جس کا امریکہ خواہ مخواہ برا مان جائے یا جو اس کو مشتعل کر دے ، مگر ہم اپنے قومی مفادات کی طرف سے بھی آنکھ بند نہیں کر سکتے تھے ، چنانچہ ہم نے اپنے ہمسایوں سے اپنے تعلقات کو معمول پر لانے کے لئے چند اقدامات کئے ۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری اس کارروائی نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو برہم کر دیا ہو ۔ جو اس تصور کو قبول نہ کر سکا تھا کہ پاکستان اپنے بیرونی معاملوں میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکتا ہے ۔ بعض کا شاید یہ خیال

بھی ہو کہ چونکہ امریکہ پاکستان کو کافی امداد دے چکا ہے اس لئے خواہ حالات بدل ہی کیوں نہ گئے ہوں ، پاکستان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی حفاظت کا بندوبست یا سلامتی کا استحکام کرے ۔

امریکہ نے پاکستان پر جو دباؤ ڈالنے کی کوششیں کیں ان کی یہی ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے مگر امریکہ نے یہ نہیں سوچا کہ پاکستان کی کوئی حکومت بھی اس اصلی خطرے سے چشم پوشی نہیں کر سکتی جو اسے ہندوستان کی طرف سے لاحق ہے ، اور نہ کھو کھلی یقین دھانیوں اور کاغذی ضمانتوں پر ملک کی سلامتی کو موقوف رکھ سکتی ہے ۔ اور میرے خیال میں امریکہ نے اس امر کا بھی پورے طور پر اندازہ نہیں کیا کہ پاکستان کے لوگ اپنے ملک کی آبرو اور سالمیت کی خاطر کس حد تک مالی پریشانیاں اور مصیبتیں جھیل سکتے ہیں ۔ ترقی پذیر ملکوں کے لوگ امداد کے خواہاں ہیں ، لیکن باہمی احترام کی بنیاد پر ۔ وہ دوست چاہتے ہیں آقا نہیں ۔ چین کے ساتھ امریکہ کا جو تعلق ہے اس سے ہم بخوبی آگاہ ہیں ۔ لیکن امریکہ کو بھی ہماری سیاسی اور جغرافیائی مجبوریوں کا علم ہونا چاہئے ۔ جب امریکہ نے ہماری ان مجبوریوں کو سمجھ لیا اور ان کو تسلیم کرلیا تو پھر اس کے ساتھ ہمارا رشتہ ایک نئی مفاہمت کی بنیاد پر از سر نو استوار ہوا ۔ چین کی عوامی جمہوریہ اور سوویٹ یونین کے ساتھ اپنے تعلقات کو معمول پر لانے کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہم کمیونسٹوں کے حلقۂ اثر میں داخل ہو رہے ہیں اور وہ سب فوجی معاہدات قبول کر رہے ہیں جو اس کے ساتھ لازم ہیں ۔ تعلقات کو معمول پر لانے کی حدود واضح اور طے شدہ تھیں ۔

(۵)

چین اور ہندوستان کی جنگ سے امریکی یہ سمجھ بیٹھے جیسے ایشیا کی صورت حال میں کوئی بہت ہی اہم اور بنیادی تبدیلی واقع ہو گئی ۔ اس جنگ میں شکست کھانے سے ہندوستان کو جو دھچکا لگا اس نے ہندوستان کے رویے کو بدل دیا ۔ اس جنگ سے پہلے ہندوستان کی پاکستان دشمنی کے علاوہ کوئی فوجی پالسی تھی ہی نہیں مگر

اب اچانک اس کو چین میں اپنا ایک دیرپا دشمن نظر آنے لگا ۔ ہندوستانی رجحان میں یہ تبدیلی امریکہ کے لئے بے حد اہمیت رکھتی تھی ۔ اس سے وقتی طور پر امریکہ کو ایسی حیثیت حاصل ہوگئی کہ جہاں تک اسلحہ کی امداد اور ہندوستان کی فوجی تیاری کا تعلق تھا ، ہندوستان امریکہ کا دست نگر ہوگیا ۔ بین الاقوامی معاملات کی روشنی میں ہندوستان اپنے سیاسی فلسفے پر نظر ثانی کرنے پر بھی مجبور ہوا ۔ واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان کو خود اپنی سلامتی کے لئے امریکہ سے گہرے اقتصادی اور فوجی روابط قائم کرنے ہوں گے ۔ امریکہ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ چین نے ہندوستان کو خواب غفلت سے جگا دیا ہے ۔ پھر امریکہ ایشیا میں بہتر توازن قائم کرنے کا یہ موقع بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا ۔

امریکیوں کو چینیوں کے اس اقدام سے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ نہ جانے چین کے ارادے کیا ہیں اور آگے چل کر وہ کیا کچھ نہ کر بیٹھے ۔ انھوں نے خیال کیا کہ چین تبت پر اپنے قبضے کو مضبوط بنانے کے لئے ہمالیہ کی مملکتوں نیپال ، بھوٹان اور سکم کے ساتھ ساتھ نیفا کے علاقے کو بھی حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا ہے ۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہو چکی تھی کہ سوویٹ یونین اور چین میں بہت اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ۔ چین میں سوویٹ قونصل خانوں کا بند ہو جانا ، روس چین کو جو اقتصادی امداد دیا کرتا تھا اس میں کمی آ جانا ، اور روس کا یہ مطالبہ کہ چین مقررہ وقت پر ادائیگی کرے ، یہ باتیں ان اختلافات کا کھلا ہوا ثبوت تھیں ۔ اس کے علاوہ سوویٹ یونین اور چین کی عوامی جمہوریہ میں نظریاتی بحث بھی خاصی شدت سے جاری تھی ۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمیونسٹ کیمپ میں سخت پھوٹ پڑ چکی ہے ۔ توقع تھی کہ چینی ۱۹۶۲ء تک ایٹم بم تیار کر لیں گے ، مگر اس میں تاخیر ہوگئی ۔ اس کی کئی وجوہ تھیں جن میں چینیوں کے زراعتی پروگرام کا ناکام ہو جانا بھی شامل ہے ۔ ان سب باتوں سے امریکی ماہروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ چینیوں کو ان ناکامیوں کا پلہ برابر کرنے کے لئے فتوحات اور کامیابیوں کی بری طرح ضرورت ہے ۔ چنانچہ

وہ ہندوستان سے اپنی جنگ کا کوئی اہم نتیجہ برآمد کرنے کے خواہش مند ہوں گے - چینی ہمالیہ کے سرحدی علاقے کے ساتھ ساتھ بڑی مضبوط پوزیشن قائم کرنا چاہتے تھے - یہ علاقہ جنوب مشرق ایشیا کے ساحلی جزیروں کی نسبت ''بودا،، تھا - اس مفروضے کو نظر میں رکھتے ہوئے امریکی منصوبہ ساز اس نتیجے پر پہنچے کہ چین ہمالیہ اور آسام کی مشرق سرحد سے علی الترتیب تبت اور برما کو اڈا بنا کر ہندوستان پر دوبارہ حملہ کر دے گا -

فوجی نقطۂ نگاہ سے مجھے یہ ساری بات بڑی بے سر و پا معلوم ہوئی - لداخ اور آسام میں ہندوستان کے کسی چھوٹے سے حصے کو بھی فتح کر لینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ چینی امریکیوں کی مداخلت اور ایٹمی جنگ کو راہ دیتے اور اپنی بار برداری اپنے وسائل اور معیشت پر زبردست بوجھ ڈال لیتے - میں یقین نہ کر سکتا تھا کہ چینی ایسے بیکار اور بے نتیجہ اقدام پر کمر بستہ ہوں گے - ان کو اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ اور اگر ہمالیہ کے اس پار ایک لاکھ بیس ہزار چینی فوج کے تبت میں مقیم ہونے سے ہندوستان خوفزدہ ہو کر اپنی فوج کو بارہ لاکھ تک بڑھا دے ، اور اپنے فوجی بجٹ میں تین سو فیصد اضافہ کر ڈالے ، اور عوام کی خوفناک مصیبتوں کا بالکل خیال نہ کرے ، تو چین کو اور کیا کرنے کی ضرورت باقی رہی - ہندوستان اپنے مسائل کے بوجھ تلے خود ہی پس جائے گا - بس وقت گذرنے کی دیر تھی - ضرورت صرف اتنی تھی کہ ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے -

ہندوستان نے دنیا پر یہی ظاہر کرنے میں فائدہ دیکھا کہ اسُ کی شکست تعداد کی کمی کے سبب واقع ہوئی - انھوں نے دنیا کے سامنے ایسا نقشہ کھینچا کہ جیسے چینی فوجوں کے دَل بادل ان پر چھا گئے ہوں - حقیقت یہ ہے کہ تبت میں چینیوں کے صرف چھ یا سات ہلکے ڈویژن تھے - اور کسی حصے میں بھی ایک یا دو ڈویژنوں سے زیادہ نہ تھے - یہ ڈویژن ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کو نہ پہنچ سکتے تھے - چینیوں کی پیش قدمی کو روکنے میں ہندوستان کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی

ہے کہ ہندوستانی فوج بولٹ ایکشن رائفلوں سے مسلح تھی - یہ فضول بات ہے - اس قسم کی رائفل آج بھی بڑی مؤثر ہے - بہرحال اگر ان کے پاس خود کار رائفلیں ہوتیں تب بھی کچھ زیادہ فرق نہ پڑتا کیونکہ چینی فوجوں نے خود کو ہندوستانیوں کی گولیوں کی زد میں آنے ہی نہیں دیا - فوجی نقطۂ نگاہ سے ہندوستانیوں کی ناکامیوں کی وجہ کمزور قیادت اور ناقص ٹریننگ تھی - ان کی شکست کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے فوجی نظریوں نے زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کی تھی - انھوں نے ۱۹۳۹ء کے نمونے کی جنگ لڑی - وہ جنگی مہارت اور تجربہ نہ رکھتے تھے ، اور ان کا طریق جنگ چینیوں کے مقابلے میں ناقص تھا - ہندوستانیوں نے گھنے جمگھٹوں کی صورت میں دفاعی مورچے سنبھال لئے - اور اس طرح خود کو چینیوں کی گولیوں کا نشانہ بننے کا عمدہ موقع بہم پہنچا دیا - علاوہ ازیں وہ جن مقامات کی حفاظت کر رہے تھے وہ بھی پاس پاس نہ تھے کہ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے - پھر ان کے محاذ بھی تنگ تھے - اور ان کے پاس جوابی حملوں کا کوئی انتظام بھی نہ تھا - اور وہ اپنے دونوں بازوؤں کی جنگی دیکھ بھال کرنے میں بھی ناکام رہے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ جب چینیوں نے پیش قدمی کی تو ہندوستانی ششدر رہ گئے اور ان کے سارے دفاعی مورچے ڈھے گئے -

(۴)

جب چینی تبت میں داخل ہوئے اور دلائی لاما نے ہندوستان میں پناہ لی تو ہندوستان اور چین کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونی شروع ہو گئی - میں نے اس وقت خیال کیا کہ میک موہن نے نقشے پر سرحد کی لکیر تو کھینچ دی ، مگر جب تک زمین پر اس کی نشان بندی نہ ہو یہ خطرہ باقی رہے گا کہ سرحد پر فریقین کے فوجی دستوں کے گشت کرنے کا موقع آئے تو ان میں جھڑپ ہو جائے -

خود ہماری سرحد پر سنکیانگ اور بلتستان کے علاقوں میں نشان بندی نہ ہونے کی وجہ سے ایسی ہی صورت حال پیدا ہو سکتی تھی - ہمیں وقتاً فوقتاً اس قسم کی اطلاعیں ملتی رہتی تھیں کہ چینیوں کے گشتی دستے شمشال تک آنے لگے ہیں - گولی چلنے کا تو کوئی واقعہ

پیش نہ آیا لیکن چینی بعض علاقوں سے ہمارے کچھ مویشی بھگا لے گئے - میں نے سوچا کہ کیوں نہ چینیوں سے کہا جائے کہ آؤ سرحد کی نشان بندی کر لیں - سرحد کو یونہی چھوڑ دینے میں دونوں فریقوں میں سے کسی کا بھی فائدہ نہ تھا - میں نے پوچھا کہ کیا اس سے پہلے حد بندی کی کوشش کی گئی تھی - اس پر مجھے متعلقہ نقشے اور کاغذات دکھائے گئے - انگریزوں نے کچھ کوشش کی تھی - میں نے اپنے ماہروں سے کہا کہ وہ نقشے پر نشان لگا کر دکھائیں کہ ہمارے خیال کے مطابق ہمارے علاقے کی ٹھیک حد کہاں تک ہے - چنانچہ اس پر عمل کیا گیا - ہم نے دیکھا کہ ہم شمشال کے درّے کے سامنے ایک خاص مقام تک اپنے جائز قبضے کا دعویٰ کر سکتے ہیں - شمشال گاؤں کے لوگ رواج کے مطابق ایک سرسبز وادی میں جو درّے کے اس طرف تھی اور جہاں چینیوں نے دو چوکیاں بنا رکھی تھیں اپنے مویشی چرانے کے لئے لے جایا کرتے تھے - وہ اس علاقے سے نمک بھی حاصل کرتے تھے ، جو وہاں کمیاب اور قیمتی چیز ہے - میں نے کابینہ کے ایک اجلاس میں اس معاملے کا ذکر کیا - عام خیال یہ تھا کہ چینی سرحد کی نشان بندی پر تیار نہ ہوں گے - میں نے سوچا کہ ایک یاد داشت تیار کر لینے اور چینی حکام سے سلسلہ جنبانی کرنے میں حرج ہی کیا ہے - یہ ۱۹۰۹ء کے آخری دنوں کی بات ہے -

چینی حکومت نے خاصے طویل عرصے تک کچھ جواب نہ دیا - اس اثنا میں اقوام متحدہ میں چین کے داخلے کے مسئلے نے خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی - بیشک ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ چین کو اقوام متحدہ میں شامل ہونے کا حق ہے - ۱۹۶۱ء میں جب میں امریکہ گیا تھا تو میں نے پاکستان کے اس نقطۂ نگاہ کو واضح کر دیا تھا - میں نے کھلے طور پر کہہ دیا تھا کہ چین کی عوامی جمہوریہ کو اقوام متحدہ میں اس کا جائز مقام دلانا عین انصاف ہے - میرے اس بیان پر امریکی اخبارات نے مجھ پر سخت نکتہ چینی کی تھی اور لکھا تھا کہ ایک مہمان کی حیثیت سے مجھے اس مسئلے میں کھلے بندوں امریکہ کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے تھی -

دسمبر ۱۹۶۱ء میں جب میں امریکہ کے دورے سے واپس آیا

تو چین کا سفیر مجھ سے ملنے آیا ۔ اس نے کہا کہ آپ اس تجویز پر ہماری حمایت کریں کہ اقوام متحدہ میں چین کی شمولیت کا فیصلہ ممبروں کی دو تہائی اکثریت کی بجائے محض اکثریت کی بنیاد پر کیا جائے ۔ میں نے چین اور پاکستان کی سرحد کی نشان بندی کے بارے میں اپنی تجویز کے متعلق پوچھا ۔ اس نے کہا کہ یہ بڑا پیچیدہ معاملہ ہے ۔ میں نے کہا کہ اگر سرحد کی نشان بندی کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے تو اقوام متحدہ میں چین کے داخلے کا معاملہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے ۔ میں نے کہا کہ ہمیں اس بات کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ دونوں معاملے آسان ہیں یا پیچیدہ ، ہمیں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط ۔ ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو صحیح اور معقول ہو ۔ ہم اقوام متحدہ میں چین کی شمولیت کی جو حمایت کر رہے ہیں اس کا مقصد چین کو خوش کرنا نہیں ہے بلکہ ہم اسے سچے دل سے چین کا حق سمجھتے ہیں ۔ میں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ہم نے چین و پاکستان کی درمیانی سرحد کی نشان بندی کی جو تجویز پیش کی تھی چین کی طرف سے ہمیں اس کا کچھ جواب نہ ملا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ چینی سفیر میری بات سے متاثر ہو کر گیا ۔

بعد ازاں ہمارے وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر نے چینی سفیر سے اس مسئلے پر گفت و شنید کی اور اس سے صاف طور پر پوچھا کہ کیا آپ تنازعۂ کشمیر کی وجہ سے سرحد کی نشان بندی پر بات چیت کرنے سے کترا رہے ہیں ؟ ہمارے وزیر خارجہ کو چینی سفیر کی باتوں سے احساس ہوا کہ اصل وجہ یہی ہے ۔ نیز یہ کہ چین اس زمانے میں ہندوستان سے کوئی اور جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا تھا ۔ ہم نے چینی حکومت پر واضح کر دیا کہ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ معلومہ مقامات کے درمیانی خط کا تعین ہو جائے ۔ اس خط کے شمال میں جتنا علاقہ ہوگا وہ چین کا سمجھا جائے گا ، لیکن اس خط کے جنوبی علاقے کی حیثیت کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ۔ شمالی علاقے کی حفاظت کا ذمہ دار چین ہوگا اور جنوبی علاقے کا پاکستان ۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد چینیوں نے ہم سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ

سرحد کی نشان بندی کی بات چیت کرنے کے لئے تیار ھیں - دونوں فریقوں نے اس مسئلے کی جانچ پڑتال کے لئے اپنے اپنے ماھروں کی جماعتیں مقرر کر دیں -

یہ قریب قریب وھی زمانہ تھا جب مسٹر نہرو دریائے سندھ کے طاس کے معاھدے پر دستخط کرنے پاکستان آئے - انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نے چین سے سرحد کی نشان بندی کے لئے کہا تھا - میں نے ساری بات بتا دی - انھوں نے مجھ سے وہ نقشہ دکھانے کے لئے کہا جس پر ھم اپنے دعوے کی بنیاد رکھ رھے تھے - اور وہ اس علاقے کی ٹھیک ٹھیک حدود بھی معلوم کرنا چاھتے تھے جس کی ملکیت کا ھم دعویٰ کر رھے تھے- میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ھم کسی ایسے رقبے پر دعویٰ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے جس پر ایمان داری کے ساتھ ھمیں یہ یقین نہ ھو کہ وہ دراصل ھمارے علاقے میں شامل ھے - ھاں یہ ممکن ھے کہ ھم مقامی آبادی کی سہولت کے لئے سرحد کے اس پار کا کچھ علاقہ مانگ لیں -

مسٹر نہرو نے مجھ سے اس نقشے کی ایک نقل مانگی اور میں نے اصولی طور پر ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا - جیسے ھی وہ ھندوستان پہنچے انھوں نے سرحد کی نشان بندی کے متعلق چین سے ھماری بات چیت پر نکتہ چینیاں شروع کر دیں - انھوں نے اس نقشے کا ذکر کیا جو میں نے انھیں دکھایا تھا اور لکھا کہ ان لوگوں کو تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ سرحد ھے کہاں ، اور یہ کہ یہ لوگ طفلانہ باتیں کرتے ھیں - یہ مسٹر نہرو کا مخصوص انداز تھا - وہ اس جذبے کو بالکل بھول گئے جس کے تحت ھم میں یہ بات چیت ھوئی تھی - انھوں نے تو بس اس معاملے کو بحث کا موضوع بنا لیا - اس کے ساتھ ھی انھوں نے نقشے کے لئے سرکاری طور پر درخواست بھیجی - ھمارے لوگوں نے کہا کہ مسٹر نہرو کے اس رویے کو دیکھتے ھوئے ھمیں نقشہ دینے سے انکار کر دینا چاھئے - میرا خیال یہ تھا کہ مسٹر نہرو اپنے رویے کے ذمہ دار ھیں ، اور میں اپنے رویے کا - چونکہ میں وعدہ کر چکا ھوں اس لئے ان کا قول یا فعل کچھ بھی ھو ھمیں نقشہ بھجوا ھی دینا چاھئے - چنانچہ انھیں نقشہ بھیج دیا گیا -

اس کے بعد جلد ہی چینیوں کے ساتھ باضابطہ گفت و شنید شروع ہوگئی - شروع شروع میں چینیوں کا رویہ سخت گیرانہ تھا لیکن ایک دفعہ جب انھیں معلوم ہوگیا کہ ہم ان سے کوئی چالاکی نہیں کرنا چاہتے بلکہ آبرومندانہ تصفیے کے خواہاں ہیں ، تو ان کا رویہ بدل گیا - انھوں نے ایک نقشہ نکالا جس کی بنیاد پر انھوں نے بعض علاقوں کی ملکیت کا دعویٰ کیا جو سرحد کے ادھر ہماری طرف تھے - یعنی خنجراب کی وادی اور کےٹو کے چند قریبی علاقے - آخرکار انھوں نے سرحد کے اس اصل خط کو تسلیم کر لیا جو ہمارے نقشے میں دکھایا گیا تھا ، اور بعض معمولی ترمیموں کے بعد اسی کو حد فاصل مان لیا گیا - سندھ کے طاس کے دریاؤں کا پن دھارا ہماری طرف دکھلایا گیا ، اور یاکانگ اور بعض دوسرے ملحقہ علاقوں کے دریاؤں کا پن دھارا چینیوں کی طرف - کےٹو کے بارے میں کچھ بحث مباحثہ ہوا - آخر میں فریقین نے اس امر پر اتفاق کیا کہ سرحد کا خط عین کےٹو کے اوپر کھینچا جائے ، اور یوں پہاڑ کی چوٹی دونوں کی ملکیت میں رہے ، جیسا کہ ماؤنٹ ایوریسٹ کے سلسلے میں نیپال کے ساتھ عمل میں آچکا تھا - جیسے ہی ہم میں سرحد کی نشان بندی پر اتفاق ہوگیا - ہوائی جہازوں سے اس علاقے کے سروے کا کام شروع ہوگیا - اور یہ سارا معاملہ بغیر کسی دقت کے دوستانہ طریق سے انجام پا گیا -

ہم نے چراگاہوں کا سوال اٹھایا جو کئی سو مربع میل میں شمشال درّے کے اس طرف پھیلی ہوئی تھیں - ہم نے چینی نمائندے پر یہ ثابت کیا کہ اس علاقے کو شمشال کے لوگ پشت ہا پشت سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں ، اور اگر ان کو اس علاقے میں جانے کی مناہی کر دی گئی تو ان کو بڑی مصیبت اٹھانی پڑے گی - چینیوں نے کہا کہ ہم سنکیانگ کے لوگوں سے اس امر کی تصدیق کرائیں گے لیکن اصولی طور پر وہ یہ بات مان گئے کہ اس معاملے کا فیصلہ امر واقعی پر موقوف ہونا چاہئے - آخرکار انھوں نے یہ علاقہ ہمیں دینا منظور کر لیا -

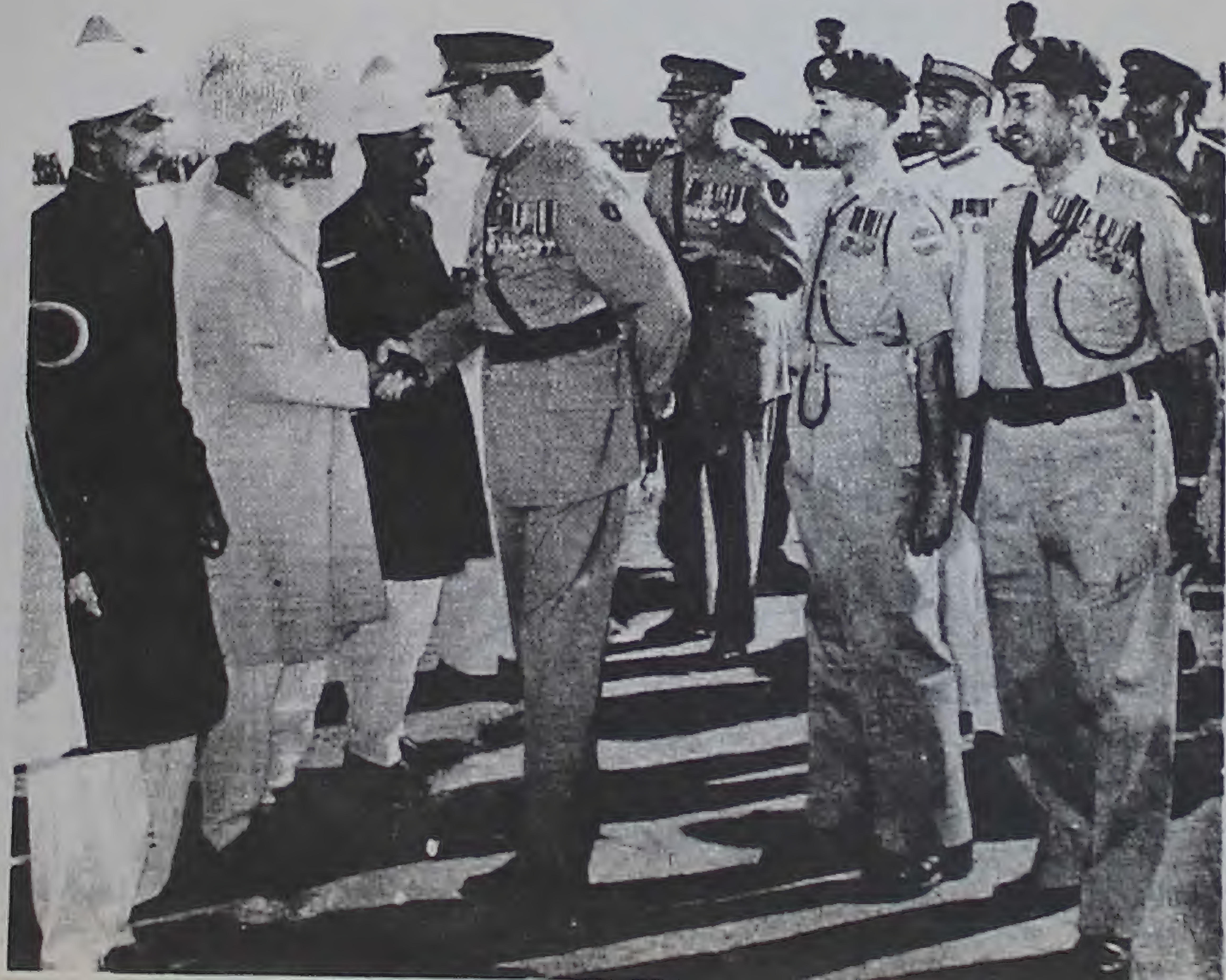
سرحد کی نشان بندی کا معاہدہ پاکستان اور چین کے درمیان

دوستانہ روابط کی ترقی کا پہلا قدم تھا - اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ آئندہ دونوں ملکوں میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ پیدا نہ ہونے پائے - چینیوں نے اس معاہدے کے بعد ہم پر اعتماد کرنا شروع کر دیا اور ہم نے بھی محسوس کیا کہ صاف دلی اور کھرے پن سے کام لیا جائے تو چینیوں کے ساتھ بھلے مانسوں کا سا نباہ مشکل نہیں -

اس معاہدے کے بعد چین اور پاکستان میں ہوائی مواصلات کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا - پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز نے کچھ بوئنگ خریدے جو بہت قیمتی ہوائی جہاز ہیں - ان کی قیمت ادا کرنے کے لئے لازمی تھا کہ ہم کافی غیر ملکی زر مبادلہ کمائیں ، اسی مقصد کو نظر میں رکھتے ہوئے ہمیں غیر ملکی فضائی راستوں کی جستجو ہوئی - میرا خیال ہے پی-آئی-اے نے اپنی ہی سطح پر چینیوں سے درخواست کی کہ اسے جاپان جانے کے لئے ھانگ کانگ کے بجائے چین کے راستے پرواز کی اجازت دی جائے - غالباً پی-آئی-اے کو ھانگ کانگ کے راستے جانے میں کچھ دقت پیش آ رہی تھی - اس زمانے میں متعدد ہوائی کمپنیوں نے جن میں کے-ایل-ایم اور بی-او-اے-سی شامل تھیں چینیوں سے پرواز کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی تھی -

چینیوں نے پی-آئی-اے کی تجویز منظور کر لی - غالباً اس لئے کہ وہ ایک یورپین ملک کے بجائے جس سے ان کے سفارتی تعلقات تک نہ تھے ایک ھمسایہ ملک سے کاروباری تعلق قائم کرنا بہتر سمجھتے تھے - اس وقت تو فرانس کے بھی چین کے ساتھ سفارتی تعلقات نہ تھے اور برطانوی تعلقات صرف کونسلر کی سطح تک محدود تھے - میرے خیال میں چینیوں نے برطانیہ سے کہا کہ پہلے سفارتی تعلقات قائم کرو اس کے بعد پرواز کے حقوق کی بات چیت کی جائے گی -

جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا یہ ساری کارروائی ایک تجارتی معاملے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی - جب یہ معاملہ طے ہو گیا تو اسے ہر قسم کے سیاسی معنے پہنائے جانے لگے - کہا گیا کہ پاکستان نے چینیوں کے لئے ایک دریچہ کھول دیا ہے جس سے وہ باقی کی دنیا کو دیکھ سکیں - ظاہر ہے کہ یہ محض سخن آرائیاں تھیں - اگر ہم چین کے ساتھ اس قسم کا انتظام نہ کر لیتے تو یقیناً



(۱۷) راولپنڈی میں ”یوم دوشنک“ پر سابق
فوجیوں سے مُلاقات - ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء



اسلام آباد کا منظر

کے-ایل-ایم یا بی-او-اے-سی یہ ٹھیکہ ہتھیا لیتی - چینیوں کے لئے ویسے بھی بہت سے دریچے کھلے ہوئے تھے - اس کے بعد چین اور پاکستان میں آمد و رفت بڑھ گئی - ہرچند کہ اس سے پہلے بھی جب سہروردی وزیر اعظم تھے ، چینی وزیر اعظم پاکستان آ چکے تھے اور سہروردی نے بھی چین کا دورہ کیا تھا -

چین کے ساتھ ہمارے معاملات کے متعلق مغربی طاقتوں کو جو بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں اس کی بڑی وجہ میرے خیال میں یہ تھی کہ ہم نے افریشیائی معاملات میں زیادہ سر گرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا - افریشیائی کانفرنسوں کو مغربی طاقتیں ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی رہیں - چنانچہ یہ خیال کیا گیا کہ ہم افریقی و ایشیائی فورم یا ''تیسری دنیا،، کی تشکیل میں چینیوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں - میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چینیوں نے ہم پر کبھی اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی ، اور نہ وہ افریشیائی اجتماعوں میں کسی خاص تجویز پر ہماری حمایت کے طالب ہوئے -

افریشیائی دنیا میں ہماری دل چسپی کا بڑا سبب اقتصادی تھا ، نیز یہ کہ ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے - مقصد یہ تھا کہ ایسی صورت سوچی جائے جس کے مطابق ترقی پذیر دنیا ترقی یافتہ دنیا کے ساتھ مل جل کر رہ سکے اور تجارت کر سکے - ہم خام مال پیدا کرنے والے ملکوں میں شامل ہونے کی وجہ سے بڑے گھاٹے میں تھے - اور یہ امر ضروری معلوم ہوتا تھا کہ افریشیائی ملکوں کے درمیان مناسب اقتصادی تعلقات قائم ہوں تاکہ باہمی تجارت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے - ہم میں سے کچھ پختہ مال تیار کرنے کی منزل پر پہنچے ہوئے تھے - ہم نے دیکھا کہ ہماری برآمدات کے لئے یا تو یورپی اور امریکی منڈیوں کے دروازے بند ہیں یا پھر ان پر سخت پابندیاں لگا دی گئی ہیں -

یہ تھیں وہ باتیں جو ہم افریشیائی کانفرنسوں میں کرنا چاہتے تھے اور ہم نے یہ امر چین ہی پر نہیں بلکہ ان کانفرنسوں کے دوسرے ممبروں پر بھی واضح کر دیا تھا - لیکن مغربی طاقتوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کانفرنسوں کا صرف ایک ہی مقصد ہے ، اور وہ ہے مغربی

استعمار اور نو استعماریت پر حملہ کرنا ۔ مغرب کو بڑا بھلا کہنے والوں میں شامل ہونے کی بجائے ہم تو ان کانفرنسوں میں توازن اور اعتدال پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ سچ یہ ہے کہ الجزائر کانفرنس کی تنظیم کے سلسلے میں ۱۹۶۴ء میں جکارتا میں وزرائے خارجہ کا جو پہلا جلسہ ہوا تھا اس میں کئی ممبروں کی طرف سے ایک تجویز پیش کی گئی تھی، جس میں ویت نام میں امریکہ کی کارروائی کی مذمت کی گئی تھی، لیکن ہماری مداخلت سے یہ قرارداد ترک کر دی گئی ۔ ہماری طرف سے یہ دلیل پیش کی گئی کہ اس قسم کی قرارداد سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس سے صرف اشتعال پیدا ہوگا ۔ ہم نے کہا کہ کانفرنس کو صرف تعمیری اور ٹھوس معاملوں پر دھیان دینا چاہئے ۔

ممکن ہے کہ بعض مغربی ملکوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ چین کی عوامی جمہوریہ کے ساتھ ربط پیدا ہو جانے سے ہم کمیونسٹ بن جائیں گے ۔ میں نے بعض امریکی دوستوں سے کہا کہ اس سے زیادہ لغو بات اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔ آپ ہی دیکھئے کہ مغربی ملکوں سے مدتوں ہماری کتنی گہری دوستی رہی ہے ۔ لیکن نہ تو انھوں نے ہمیں عیسائی بنایا اور نہ ہم نے انہیں مسلمان ۔ کمیونزم اس قسم کی چیز نہیں جسے باہر سے لایا جا سکے ، یہ تو ملک کے اپنے معاشری و اقتصادی حالات سے پیدا ہوتا ہے ۔ جہاں حالات ایسے ناگفتہ بہ ہو جائیں کہ لوگوں کو مایوسی ہی مایوسی نظر آنے لگے تو وہ مروجہ ظالمانہ نظام کو ملیامیٹ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ ایک دفعہ ایک بڑے آدمی نے جو کمیونسٹ تھا اس امر پر تعجب ظاہر کیا کہ ہرچند کارل مارکس جرمن نسل سے تھا مگر جرمنی نے کبھی کمیونزم کو قبول نہ کیا ۔ میں نے اس سے کہا کہ گو جرمنی کو دو عالمی جنگوں کے بعد سخت مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں مگر جرمنی کا معاشری و اقتصادی ڈھانچا پورے طور پر ٹوٹنے نہیں پایا ۔ چنانچہ وہاں لوگوں کو مایوس ہو کر یہ کارروائیاں کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ۔ اس کے برعکس روس میں اور بعد ازاں چین میں یہی صورت حال پیش آئی ۔ وہاں معاشرہ مطلقاً ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ، اور اسے اپنی نجات کمیونزم ہی کو اختیار کر لینے میں نظر آئی ۔ کمیونزم

برآمد کی جانے والی شے نہیں - یہ اس معاشرے کے لئے جو کسی سخت مرض میں مبتلا ہو اکسیر کا حکم رکھتی ہے - معاشرے کے شفا پا جانے کے بعد اس کی تاثیر کیا ہوگی یہ دیکھنا ابھی باقی ہے - پاکستانیوں کا ایک اپنا نظریۂ حیات ہے، ایک اُمیدوں بھرا نظریۂ حیات اور یہ بات تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ اپنے اس نظریۂ حیات کو ترک کر دیں گے - اور کوئی غیر ملکی فلسفۂ حیات قبول کر لیں گے - یہ دلیل امریکیوں کو متاثر نہیں کرتی، غالباً اس وجہ سے کہ ان کی زندگی میں مذہب ویسا فیصلہ کن کردار ادا نہیں کرتا جیسا ہماری زندگی میں کرتا ہے - امریکی کمیونزم کو معاشری و اقتصادی ڈھانچے کے ٹوٹنے کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ اسے چھوت کی بیماری سمجھتے ہیں -

میرے خیال میں پاکستان اور چین دونوں کو اس امر کا پورا پورا علم اور لحاظ ہے کہ ان کے تعلقات کے پھلنے پھولنے کی حدود کیا ہیں - دو عناصر ہیں جو تعلقات کے پھلنے پھولنے پر اثر ڈال سکتے ہیں - اول چین کا یہ سمجھنا کہ امریکہ سوویٹ یونین کے اشتراک سے چین کے گرد ایک گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے، تاکہ اس کے زور کو توڑا اور اسے دنیا سے علیحدہ کیا جا سکے - اب اگر پاکستان سوویٹ یونین یا امریکہ کے ساتھ اس قسم کے کسی انتظام میں شریک ہوگا تو چین سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے گا - چنانچہ ہمیں چین کو اس امر کا یقین دلانا ہے کہ ہم اس پر آمادہ نہیں - لہذا چین کو ہمارے بارے میں اس قسم کا کوئی خدشہ یا شک و شبہ نہ ہونا چاہئے -

دوسرا عنصر اس امر کا امکان ہے اور اس کا بعض اوقات چرچا بھی کیا جاتا ہے کہ شاید ہندوستان اور چین میں کوئی سمجھوتا ہو جائے - اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی چین سے صلح صفائی کے امکانات کا کھوج لگانے کے لئے اپنے سفارتی نمائندے بھیجتے رہے ہیں، اور اس بارے میں انھوں نے دوسرے ملکوں سے امداد بھی چاہی ہے - لیکن ذاتی طور پر مجھے مستقبل قریب میں ہندوستان اور چین میں ''بھائی بھائی،، والی صورت پیدا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا -

اس کی کئی وجوہ ہیں - اول تو یہی کہ اب کے چینی ہندوستان پر بھروسا کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں گے - یہ احساس مجھے چینی لیڈروں سے اپنی ملاقاتوں سے ہوا ہے - ہندوستانی بھی چینیوں سے صفائی کرنے پر تیار نہ ہوں گے ، کیونکہ امریکہ سے ان کی خوب نبھ رہی ہے - بھلا وہ ایسے اچھے ذریعۂ آمدنی کو کیوں ہاتھ سے دینے لگے - ادھر جوں جوں ہندوستان امریکہ کا زیادہ سے زیادہ دست نگر ہوتا جائے گا ، چین کے لئے یہ یقین کرنا اتنا ہی دشوار ہوتا جائے گا کہ اس کے خلاف امریکہ اور ہندوستان میں گٹھ جوڑ نہیں ، یا یہ کہ اگر کل کلاں کو امریکہ اور چین میں جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان امریکہ کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے میں کسی قسم کی بھی ہچکچاہٹ محسوس کرے گا -

بعض دفعہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان اور چین ہمیشہ جدا جدا رہیں گے ، کیونکہ وہ ایشیا کا لیڈر بننے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں - لیکن میں ہندوستان کو اس مقابلے میں شریک نہیں سمجھتا - ہندوستان اپنے معاشرے کی بناوٹ اور اپنی طرز زندگی کے باعث اس مقابلے میں کبھی چین کو للکار نہ سکے گا - دنیا کے معاملات میں کوئی اہم کردار ادا کرنا تو الگ رہا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بڑی طاقت کا دست نگر رہے گا ، یہاں تک کہ اپنی بقا کے لئے بھی - ہندوستانی اپنے سماجی ، اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کی کوتاہیوں سے بخوبی واقف ہیں - ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بڑھتی ہوئی مایوسی کے باعث اس کے معاشرے کا ڈھانچا ہی بیٹھ جائے - اس صورت میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کس قسم کا کمیونزم ہندوستان پر چھائے گا - چینی کمیونزم یا سوویٹ کمیونزم - میں سمجھتا ہوں کہ اگر کمیونزم کو ہندوستان میں آنا ہی ہے تو وہ سوویٹ قسم کا کمیونزم ہوگا - اور اسے ہندوستانی معاشرے کے ذات پات کے رسم و رواج کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا - اس سے ہندوستان اور چین کے تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہو جائیں گے -

(۵)

چینی اپنے لوگوں اور اپنے علاقوں کو متحد کرنے میں بڑی سر گرمی

سے مصروف ہیں - ان کو جو بات پریشان کر رہی ہے وہ تائیوان (فارموسا) کا مستقبل ہے ، نیز تائیوان میں امریکیوں کی موجودگی اور اس کے اردگرد امریکیوں کے اڈے - تائیوان کے مسئلے کے حل کی عرصہٴ دراز تک کوئی امید نظر نہیں آتی - امریکہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ تائیوان کے مسئلے پر امریکہ اور چین میں سمجھوتا ہو جائے تو یہ امریکہ کے لئے مفید ثابت ہوگا - لیکن امریکہ چیانگ کائی شک کے ساتھ فوجی اور سیاسی معاہدوں میں بری طرح جکڑا ہوا ہے - چیانگ کائی شک کی کمان میں چھ لاکھ جوانوں کی فوج ہے - ادھر ویت نام میں جنگ ہو رہی ہے جو کسی وقت بھی چین اور امریکہ میں ایک بڑے مقابلے کی شکل اختیار کر سکتی ہے - چینی جانتے ہیں کہ اس کے قوی امکانات موجود ہیں ، اور وہ اپنے بچاؤ کی پوری تیاریاں کر رہے ہیں -

ہرچند چینیوں کو تائیوان کے وجود اور ایک بڑی جنگ کے امکان سے پریشانی ہے ، تاہم میرے خیال میں ان کی زیادہ تر توجہ اپنے ملک میں سوشلزم کو ترقی دینے کی طرف ہے ، تاکہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر کر سکیں اور اپنے وسائل سے پورے طور پر فائدہ اٹھا سکیں - میری ذاتی رائے یہ ہے کہ گو ان میں خود اعتمادی اور عزم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ، لیکن وہ کوئی ناعاقبت اندیشانہ قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے جنگ چھڑ جائے - چین کی عوامی جمہوریہ کا طویل المیعاد مقصد سوویٹ یونین اور امریکہ کے مساوی درجہ حاصل کرنا ہے - اس میں وقت لگے گا - چین ، امریکہ اور سوویٹ یونین میں جو مسلسل تناؤ اور اختلاف چلا آ رہا ہے دنیا کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جاری رہے گا -

سوویٹ یونین اور امریکہ میں مفاہمت اس وقت پیدا ہوئی جب سوویٹ یونین نے اپنے میں یہ صلاحیت پیدا کر لی کہ وہ اپنے ملک کے اندر سے براہ راست امریکہ پر وار کر سکے - بس اس وقت سے ان دونوں ملکوں کو خیال پیدا ہوا کہ کسی حد تک ایک دوسرے کے وجود کو گوارا کریں اور امن کے ساتھ رہنے کی صورت نکالیں تاکہ جان بوجھ کر نہیں تو کسی خوفناک غلطی کا شکار ہو کر وہ ایک دوسرے کو تباہ نہ کر بیٹھیں - آخرکار چین ، امریکہ اور سوویٹ یونین

ان تینوں میں بھی اسی قسم کی مفاہمت پیدا ہو جائے گی لیکن اس وقت جب چین اپنے اندر ان جیسی صلاحیت پیدا کر لے گا۔ ممکن ہے اس میں پندرہ سولہ سال لگ جائیں۔ اس اثنا میں ان تینوں طاقتوں میں سے ہر ایک دوسری دو طاقتوں کو ایک محدود لڑائی میں الجھا ہوا دیکھ کر خوش ہوگی، کیونکہ اس طرح لڑنے والوں کی طاقت کمزور ہوتی رہے گی۔ اس صورت حال میں تمام چھوٹی طاقتیں مجبور محض ہیں۔ امن کے مشن بنا بنا کر بھیجنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بڑی طاقتیں تو جب تک سخت مجبوری نہ آ پڑے اپنی پالسیاں بدلا نہیں کرتیں۔

اگر چین کی عوامی جمہوریہ کو اقوام متحدہ میں شریک کر لیا جائے تو ممکن ہے یہ کشیدگی کسی حد تک کم ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر چین اور مغربی طاقتیں ایک دوسرے سے براہ راست گفت و شنید کرنے لگیں، اور اپنے معاملات خود طے کرنے لگیں تو ان کے خواہ مخواہ کے خدشے اور بدگمانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ امریکہ کا خیال ہے کہ اگر چین ایک مرتبہ اقوام متحدہ میں شامل ہوگیا تو ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ترقی پذیر ملک اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ابھرتا ہوا ملک اس بات کو پسند نہ کرے گا کہ اس کا ناتا کسی بڑی طاقت کے ساتھ مستقل طور پر جوڑ دیا جائے، کیونکہ اس طرح اس کی آزادیٔ عمل پر ضرب پڑے گی، اور اس کا اندرونی استحکام کمزور ہو جائے گا۔

(۶)

سوویٹ یونین سے پاکستان کا براہ راست تعلق اپریل سنہ ۱۹۶۵ء سے پہلے قائم نہ ہو سکا۔ اٹھارہ برس تک ہمارے درمیان ذاتی میل ملاقات نہ ہونے پائی۔ دونوں فریق پہلے سے قائم شدہ رائے کے زیر اثر رہے۔ علاوہ ازیں دور دراز فاصلے نے بھی ان دونوں کو ملنے جلنے سے روکے رکھا۔ لیاقت علی خان نے سوویٹ یونین جانے کا بلاوا قبول کر لیا تھا، مگر بدقسمتی سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ بغداد پیکٹ میں ہمارے شامل ہونے سے سوویٹ یونین کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کسی قدر کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ ہندوستان کو ایسا موقع اللہ دے۔ اس نے ہمیں

سوویٹ یونین کی نظروں میں اس رنگ میں پیش کیا گویا یہاں کوئی ملائیت پرست حکومت قائم ہے جو ہر قسم کی آزاد خیال باتوں کی دشمن ہے ۔ ادھر پاکستان میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کا خیال تھا کہ روس سے میل جول ہوا تو یہاں کمیونزم پھیل جائے گا ۔

لیکن اس کی اصل وجہ میرے خیال میں یہ تھی کہ ہرچند وسطی ایشیا سے ہمارے گہرے تہذیبی و تمدنی روابط تھے ، لیکن برطانیہ کی دو سو سالہ حکومت نے ان روابط کو مٹا دیا تھا ۔ جس وقت انگریز یہاں سے چلے گئے تو وسطی ایشیا سے ہمارا تعلق ختم ہو چکا تھا ۔ جب ہم نے آزادی حاصل کی تو قدرتی طور پر ہماری نظریں مغربی طاقتوں پر پڑیں ۔ اپنے ہمسایوں کی طرف ہمارا خیال نہ گیا ۔ ادھر مغربی ملک بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ سوویٹ یونین سے ہمارا کسی قسم کا واسطہ ہو ۔ چنانچہ سنہ ۱۹۶۵ء میں جب میں سوویٹ یونین کے دورے پر گیا تو میرا اصل مقصد اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنا تھا ، اور اس امر کو واضح کرنا کہ یہ ہمسایگی ایک جغرافیائی حقیقت ہے جس کو تسلیم کرنا لازمی اور ضروری ہے ۔

سوویٹ یونین کے موجودہ لیڈروں سے میری سب سے پہلی ملاقات ۳-اپریل سنہ ۱۹۶۵ء کو ہوئی ۔ ہماری پہلی باضابطہ کانفرنس مسٹر کوسی گن کے دفتر میں ہوئی ۔ اس روز بلا کی سردی پڑ رہی تھی، اور وہ سہ پہر اداس اور اندھیری تھی ۔ مسٹر کوسی گن نے مسٹر پولی ین سکی، مسٹر گرومیکو اور چند دوسرے ارکان حکومت کو بلوا رکھا تھا ۔ کمرے کے اندر کی فضا بھی معنوی طور پر کچھ کم سرد نہ تھی ، ہرچند کہ مرکزی گرمائش (سنٹرل ہیٹنگ) کا انتظام تھا ۔ سوویٹ وفد کے ممبر کچھ روٹھے ہوئے اور بیزار سے نظر آتے تھے ۔ رسمی سلام و نیاز کے بعد میں منتظر ہوا کہ سوویٹ وزیر اعظم گفتگو کا آغاز کریں ۔ لیکن مسٹر کوسی گن سمجھتے تھے کہ چونکہ ہم ان کے مہمان ہیں اس لئے ابتدا ہمارے بیان سے ہونی چاہئے ۔ انہوں نے کہا :

”ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے ۔“

''بڑی سہولت ہے اس دستور میں ، مسٹر پرائم منسٹر،، میں نے کہا ۔

''آپ یہ تو نہ چاہیں گے کہ ہمارے دستور سہولت سے عاری ہوں مسٹر پریزیڈنٹ؟،، مسٹر کوسی گن نے جواب دیا ۔

میں نے محسوس کیا کہ روسیوں کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ وہ شطرنج کی ابتدائی پیادہ چالیں بڑی چابکدستی سے چلتے ہیں ان کی یہ شہرت غلط بنا پر نہیں ۔ میں نے دل میں کہا بہتر ہوگا کہ فوراً اصل مقصد کی طرف رجوع کیا جائے ۔ چنانچہ میں نے اپنے خیال کے مطابق واقعات عالم کا نقشہ کھینچا ۔ میں نے ان تعلقات کا ذکر کیا جو سوویٹ یونین نے ہندوستان سے قائم کر رکھے ہیں، اور بتایا کہ ان تعلقات کا ہم پر کیا اثر پڑ رہا ہے ۔ سوویٹ یونین کے امریکہ اور چین کے ساتھ جو تعلقات تھے میں نے ان کا بھی ذکر کیا ، اور بتایا کہ ہم اپنے طور پر ان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ، سوال یہ ہے کہ پاکستان اور روس کے تعلقات کس طرح بہتر بنائے جا سکتے ہیں اور ان کے درمیان مفاہمت کن باتوں پر ہو سکتی ہے ۔

مسٹر کوسی گن نے میرا خیال ہے کہ بڑی احتیاط اور تامل کے ساتھ بولنا شروع کیا ۔ انھوں نے اس ترقی کا ذکر کیا جو سوویٹ یونین نے مختلف شعبوں میں کی تھی اور آخر میں یہاں پہنچے کہ سوویٹ یونین کی پالسی مشرق و مغرب دونوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیمانے پر رشتۂ اشتراک قائم کرنا ہے ۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ سوویٹ یونین مشرق و مغرب دونوں کے درمیان واقع ہے اس لئے وہ ایسا رشتۂ اشتراک بڑی سود مندی کے ساتھ قائم کر سکتی ہے ۔ کوسی گن میری بات کے نکتے کو سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے بولے :

''آپ لوگ مشرق میں رہتے ہیں پھر بھی دونوں سے اشتراک کرنا بڑا سودمند سمجھتے ہیں ۔،،

اب سرد مہری کم ہونی شروع ہوئی ۔ مسٹر کوسی گن نے بھی اسے محسوس کیا اور کہنے لگے : ''جلد ہی ہم ترجمان کے بغیر ہی کام

چلا سکیں گے۔،، ان کا دل گرمایا اور انھوں نے ایک ایک کر کے ان سوالوں کا جواب دینا شروع کیا جو میں نے اٹھائے تھے ۔ وہ ویت نام کی صورت حال سے بڑے فکرمند معلوم ہوتے تھے ۔ انھی دنوں یہ خبر آئی تھی کہ امریکہ نے ویت نام میں گیس استعمال کی ہے۔ صدر جانسن نے اس کی توجیہ یہ کی تھی کہ یہ حرکت فوجی کمانڈروں نے میری منظوری کے بغیر کی ہے ۔ مسٹر کوسی گن اس توجیہ کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے ۔ انھوں نے کہا ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امریکہ کے صدر کو اپنی فوج پر اختیار نہ ہو۔،، انھوں نے امریکہ پر الزام لگایا کہ اس نے معاہدۂ جنیوا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بغیر کسی اشتعال کے ویت نام پر حملہ کیا ہے ۔ مسٹر کوسی گن کی رائے تھی کہ امریکہ ویت نام میں زیادہ سے زیادہ الجھتا جائے گا یہاں تک کہ اس کے لئے خود کو نکالنا مشکل ہو جائے گا ۔ انھوں نے اس امداد کا ذکر کیا جو سوویٹ یونین شمالی ویت نام کو دے رہی تھی ۔ ان کے خیال میں جو مسئلہ فوری توجہ چاہتا تھا ، یہ تھا کہ اس جنگ کو کیسے ختم کیا جائے ۔ انھوں نے کہا اس کا جواب دینا ان لوگوں کے ذمے ہے جنھوں نے یہ جنگ شروع کی ہے ۔ جہاں تک سوویٹ یونین کا تعلق ہے وہ شمالی ویت نام کی حمایت کرتی رہے گی ۔

اس کے بعد مسٹر کوسی گن نے کہا کہ شاید امریکہ چین اور روس کے اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ لیکن امریکہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اختلافات ویت نامیوں کو مدد دینے میں سوویٹ یونین کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کریں گے ۔ انھوں نے کہا سوویٹ یونین اور چین کی عوامی جمہوریہ کے اختلافات ''خلقی نہیں ہیں،، یہ ایک عارضی صورت ہے ۔ ویت نام کے معاملے سے ہمارے اختلافات بڑھنے نہ پائیں گے بلکہ کم ہوتے چلے جائیں گے۔ سوویٹ یونین اور چین کی عوامی جمہوریہ ''ایک مشترکہ نظریے،، کی تابع ہیں ۔ سوویٹ یونین اور چین کے لوگوں میں دوستی کی ایک عظیم روایت موجود ہے اور سوویٹ عوام کی نظروں میں چینی عوام کی بڑی عزت اور قدر و منزلت ہے ۔

بعد ازاں مسٹر کوسی گن نے ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات

کا ذکر چھیڑا - جس وقت وہ ہندوستان کو فوجی امداد دینے کی توجیہ کر رہے تھے ، تو میں نے کہا ''یہ عجیب اتفاق ہے کہ سوویٹ یونین اور امریکہ کی پالسیاں ہندوستان کے معاملے میں ایک ہو گئیں -،، اس سے مسٹر کوسی گن کچھ برا مان گئے اور کسی قدر جوش میں آ کر کہنے لگے ''ایسی بات آپ سے ہمارے کسی دشمن ہی نے کہی ہوگی -،، میں نے کہا کوئی اور کیا کہتا ہم خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں - آپ خود سوچئے ہندوستان میں اسلحہ کی بھرمار کر دینے سے ، خواہ یہ اسلحہ مغربی طاقتوں نے دیا ہو یا سوویٹ یونین نے، اس بر صغیر کی سلامتی محفوظ تھوڑا ہی رہ سکتی ہے- نیت اور توجیہ میں فرق ہو سکتا ہے لیکن نتیجہ تو ایک ہی رہتا ہے- ہندوستان کی فوجی تیاریوں سے اس خطے کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کی سلامتی سخت خطرے میں پڑ گئی ہے - امریکہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ ہندوستان کو یہ اسلحہ اس لئے چاہئے کہ اس پر چین حملہ کرنے والا ہے - ہم اس امر کو فوجی نقطہ نگاہ سے بے معنی سمجھتے ہیں -

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا : سوویٹ یونین ہندوستان کو اسلحہ اس لئے بہم پہنچا رہی ہے کہ وہ اس امر میں امریکہ سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی - ان سب باتوں سے ہندوستان کی جارحانہ اور ملک گیرانہ پالسیوں کو تقویت پہنچ رہی ہے - میں نے نہیں بتایا کہ پچھلے دنوں ہندوستان نے پانچ لاکھ مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا - نیز یہ کہ ہندوستان کھلے بندوں کشمیر میں جنگ بندی لائن کی خلاف ورزیاں کر رہا ہے - ہم ہندوستان سے اپنے اختلافات اس وجہ سے دور نہ کر سکے کہ اس نے فوجی امداد حاصل کر کے اپنی طاقت بڑھا لی ہے ، اور وہ اس کے بل پر جموں و کشمیر کے بڑے علاقے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں جس پر اس نے جبری قبضہ کر رکھا ہے - وہ بڑی ڈھٹائی سے اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی تحقیر کر رہا ہے - جب کبھی ہم اس معاملے کو عالمی فورم کے سامنے پیش کرتے ہیں تو اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا ، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سوویٹ ویٹو کے طفیل اس کا بال بھی بیکا نہ ہوگا -

مسٹر کوسی گن بڑے صبر اور توجہ سے میری باتیں سنا کئے - انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان و پاکستان کے اختلافات اس اسلحہ کی وجہ سے نہیں ہیں جو مغربی طاقتیں یا روس ہندوستان کو دے رہا ہے - بلکہ یہ استعمار کا ورثہ ہیں ، اور استعمار پرست ہندوستان و پاکستان میں کشیدگی جاری رکھنے میں ابھی تک اپنا فائدہ سمجھتے ہیں - اس کے بعد انھوں نے پاکستان کی سیٹو اور سینٹو کی ممبری کا سوال اٹھایا جن میں بقول مسٹر کوسی گن ''امریکہ کا طوطی بولتا ہے،، انھوں نے خاص طور پر ''یو-ٹو،، کے واقعے کا ذکر کیا جس نے بڑی بدگمانی پیدا کر دی تھی -

معاہدوں کے بارے میں سوویٹ یونین کی شکایت بجا تھی لیکن اسے ہماری پوزیشن پر بھی دھیان دینا ضروری تھا - ہندوستان نے ہمیں بے یار و مددگار بنانے کی ٹھان رکھی تھی - چنانچہ ہمیں کہیں نہ کہیں تو دوست تلاش کرنے ہی تھے - ہم ان معاہدوں میں اس لئے شامل نہیں ہوئے تھے کہ اس سے کسی قسم کی جارحیت کو تقویت پہنچے بلکہ ہمیں اپنی سلامتی کے لئے تشویش تھی - ''یو-ٹو،، کے واقعے میں بے شک ہماری غلطی تھی ، لیکن اس معاملے سے ہمیں بھی ویسا ہی دھکا لگا تھا جیسا کہ سوویٹ یونین کو لگا - اس کے بعد میں نے بتایا کہ ان معاہدوں میں ہماری شرکت اعتدال پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے ، اور بہر صورت یہ معاہدے سوویٹ یونین کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچا رہے - مسٹر کوسی گن نے کہا : ''تکلیف نہ پہنچا رہے ہوں لیکن راحت بھی تو نہیں پہنچا رہے،، اس کے بعد انھوں نے پھر ہندوستان و پاکستان کے مسئلوں کی طرف رجوع کیا - اور براہ راست گفت و شنید کرنے کا مشورہ دیا -

میں سمجھتا ہوں کہ اس پہلی ملاقات نے جو تین گھنٹے تک جاری رہی ، ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد دی - ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بڑی صاف صاف باتیں کیں - دونوں وفدوں کے نمائندوں کی پریشان نظروں اور تنے ہوئے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ گفت و شنید کے رسوم و آداب کی پیروی نہیں کی جا رہی -

دوسرے دن ہم نے ایک ''داچا،، میں ملاقات کی - یہ جگہ

ماسکو سے کوئی پچیس میل دور تھی - یہ ایک پرانا دیہاتی مکان تھا - جو صنوبر اور برچ کے جنگل کے بیچوں بیچ واقع تھا - اس کے قریب دریائے ماسکو بہتا تھا جو ان دنوں یخ بستہ تھا - ہم نے کچھ دیر مٹی کے بنے ہوئے کبوتروں پر نشانہ بازی کی -

ہم نے اپنی بات چیت ساڑھے گیارہ بجے صبح سے شروع کی جو ایک بجے بعد دوپہر تک جاری رہی - اس ملاقات میں مسٹر بریزنیف بھی سوویٹ وفد کی طرف سے شامل ہوگئے تھے - ہم قریب قریب ان ہی موضوعوں پر گفتگو کرتے رہے جن پر پہلے روز بات چیت ہوئی تھی لیکن فضا بہت مختلف تھی - دونوں طرف گرم جوشی تھی اور مفاہمت - میں نے ہندوستان کی جنگی تیاریوں کا پھر سوال اٹھایا - اگر یہ بات ناقابل یقین ہو کہ چین ہندوستان پر حملہ کرے گا تو پھر ہندوستان خود کو اس قدر مسلح کیوں کر رہا ہے؟ کیا ہوس ملک گیری کے سوا اس کا کوئی اور مقصد بھی ہو سکتا ہے؟ ہندوستان کے نظریہ باز دریائے جیحون سے لے کر میکانگ تک کی سرحدوں پر ملکیت کے دعوے کر رہے ہیں - ہر بات استعمار پرستوں ہی کے سر نہیں تھوپی جا سکتی - ہندوستان اپنے موجودہ حلقۂ اثر پر قانع نہیں ہے ، اور وہ جانتا ہے کہ پاکستان اس کی ملک گیری کی ہوس کو پورا نہ ہونے دے گا - اس لئے وہ ہمیں دھونس دے کر اپنا تابع بنانا چاہتا ہے - ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ہم مساویانہ اور آبرومندانہ طور پر اس کے ہمسائے بن کر رہیں مگر اس کو یہ بات منظور نہیں - برھمنوں کی یہ جنگ جویانہ وطن پرستی ، ضد اور ہٹ ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم اپنے لئے ایک الگ وطن تلاش کرنے پر مجبور ہوئے جہاں ہم اپنی فکر اور عقیدے کے مطابق زندگی گزار سکیں - وہ ہمیں غلام بنائے رکھنا چاہتے تھے - بالکل اسی طرح جس طرح آج انھوں نے ہندوستان کی مسلم اقلیت کو غلام بنا رکھا ہے - ہندوستان اور پاکستان کے نظریۂ حیات میں زمین آسمان کا فرق ہے - ہندوستان کے سارے معاشرے کی بنیاد طبقاتی امتیاز پر ہے - اس معاشرے میں ایک چھوٹی ذات کے آدمی کا سایہ بھی ایک اونچی ذات کے آدمی کو ناپاک کر سکتا ہے -

مسٹر کوسی گن نے خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات بے حد پیچیدہ ہوگئے ہیں - انھوں نے بیان کیا کہ سوویٹ یونین کسی قوم کو بھی مسلح کرنے کے خلاف ہے - اور وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی بالخصوص اِس حصے میں لڑائی بھڑائی کی صورت پیدا ہونے کو پسند نہیں کرتی - مسٹر کوسی گن نے یہ تو مان لیا کہ ہندوستان و پاکستان کا نظریۂ حیات جدا جدا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے وجود کو گوارا کرنے کے اصول پر کوئی نہ کوئی عملی طریقہ وضع کرنا ہوگا- سوویٹ یونین استعمار پرستانہ نظام کے خلاف جنگ کرنے کے لئے مختلف ملکوں کو اسلحہ مہیا کر رہی ہے - میں نے پوچھا کہ ہندوستان کس استعمار پرستانہ یا نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ کر رہا ہے - اس موقع پر مسٹر بریزنیف نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان غیر جانب دار ہے وہ کسی دفاعی معاہدے کا ممبر نہیں - اس پر میں نے کہا ”مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ ہندوستان کو غیر جانب دار سمجھا جا رہا ہے حالانکہ وہ پروپیگنڈہ بازی کے لئے اڈے مہیا کر رہا ہے ، مشترک فوجی مشقوں میں شرکت کر رہا ہے، نیوکلئیر سائبان طلب کر رہا ہے اور بھاری مقدار میں فوجی امداد وصول کر رہا ہے - اگر یہ سب کچھ غیر جانب داری ہے تو پھر جانب داری کسے کہتے ہیں؟“

ہم پھر معاہدوں کے موضوع پر آگئے - اب کے میں نے پاکستان کے موقف کو ذرا تفصیل سے بیان کیا - میرا خیال ہے کہ اس وقت تک سوویٹ لیڈر ہمارے نقطۂ نگاہ کو زیادہ ہمدردی سے دیکھنے لگے تھے - ہم نے سوویٹ یونین اور پاکستان میں دو طرفہ بنیاد پر اشتراک عمل کے مختلف امکانات پر بات چیت کی- مسٹر کوسی گن نے کہا کہ آپ لوگوں نے چوبیس گھنٹے سے بھی کم عرصے میں اس سے بھی کچھ زیادہ کر دکھایا ہے جو دوسروں نے اٹھارہ سال میں کیا- انھوں نے کہا: ”ہم آپ کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے تھے کہ آپ فلاں فلاں معاہدے کے رکن ہیں —خواہ یہ معاہدے کاغذی ہی سہی— ہم آپ کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور آپ سے محتاط رہنا چاہتے تھے-“

میرے خیال میں دونوں طرف کے لوگوں نے اس امر کو تسلیم کیا کہ ممکن ہے یہ ملاقات ہمارے تعلقات میں ایک نقطۂ انقلاب ثابت ہو - نیز یہ کہ دونوں ملکوں میں تعاون کے زبردست امکانات پائے جاتے ہیں - میں نے روسی لیڈروں کو بے حد ہوشمند اور باخبر پایا - وہ بڑے خوش اخلاق، شائستہ اور مہماں نواز تھے - لیکن اپنے بنیادی مفروضوں پر مضبوطی سے قائم - میرا خیال ہے کہ انہیں بھی ہمارے خلوص کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ ہمارے موقف کو بہتر طور پر سمجھنے لگے تھے-

سوویٹ یونین کے اس دورے میں مجھے چین و روس کے اختلافات کی نوعیت کا بھی بخوبی علم ہوا - مجھے اس مسئلے سے یوں دل چسپی تھی کہ اس کا ہماری سلامتی سے براہ راست تعلق تھا - ہندوستان نے اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء میں چین سے جنگ چھیڑی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جب چین و سوویٹ یونین کے اختلافات کھل کر دنیا کے سامنے آئے تھے - ان دونوں واقعات ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور مغربی ملکوں میں اور دوسری طرف ہندوستان اور سوویٹ یونین میں گہرا ربط و ضبط پیدا ہوا - امریکہ اور سوویٹ یونین دونوں ہندوستان کو اسلحہ مہیا کرنے کے مقابلے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے - ایک کا مقصد ہندوستان کو چین کے مقابلے پر تیار کرنا تھا اور دوسرے کا مقصد ایشیا میں توازن برقرار رکھنا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان سے تصفیے کے لئے ہندوستان پر اگر کچھ دباؤ بھی تھا تو وہ ختم ہو گیا -

چین و سوویٹ یونین کے اختلافات کی عام نوعیت تو سب پر عیاں ہے- اور اسی طرح لوگ ان الزامات سے بھی واقف ہیں جو وہ ایک دوسرے پر لگاتے ہیں اور ان کے متفرق دلائل سے بھی - لیکن اس سے اس تلخی کی وجہ پورے طور پر سمجھ میں نہیں آتی جو ان دونوں میں پائی جاتی ہے خصوصاً چینیوں کے دل میں - چینی ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا جا رہا ہے - شاید ان کا خیال ہے گو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس میں کس حد تک حق بجانب ہیں کہ سوویٹ یونین چین کو ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا - چینی یہ بھی سمجھتے ہیں،

کہ سوویٹ یونین کی امریکہ والوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی سعی میں چین دشمنی کا عنصر بھی شامل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہرچند ان کے درمیان نظریاتی بحث جاری ہے، جسے فلسفیانہ الفاظ کے الٹ پھیر نے الجھا رکھا ہے، لیکن بدگمانی کی اصل وجہ دونوں کی قوم پرستی ہے۔ چین کا بڑا مقصد امریکہ اور سوویٹ یونین کے مساوی درجہ حاصل کرنا ہے۔ لیکن اسے خدشہ ہے کہ سوویٹ یونین اور مغربی طاقتوں میں ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کے اصول پر جو مفاہمت پیدا ہو رہی ہے اس سے اس مقصد کے حصول میں تاخیر پیدا ہوگی۔

سوویٹ لیڈر یہ سوچتے ہیں کہ ایٹمی طاقت کی ترقی کے باعث اشتراکی دنیا اور سرمایہ دار دنیا کی جنگ نہایت خوفناک صورت اختیار کر لے گی، اس سے فریقین ہی نہیں بلکہ ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے فریقین کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایٹمی جنگ کے المناک امکانات پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔

سوویٹ یونین ایسے دور میں داخل ہو رہی ہے جسے اقتصادی اور سماجی طور پر اطمینان کا دور کہا جا سکتا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور وہاں کے عوام کا معیار زندگی بہتر ہو رہا ہے۔ روسیوں کو ایسے وسیع قدرتی وسائل دریافت ہوئے ہیں جن کو پورے طور پر ترقی دینے میں سالہا سال لگ جائیں گے، ظاہر بات ہے کہ وہ جو کچھ حاصل کر چکے ہیں اس کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے اور نہ وہ اپنے عوام کو جنگ میں جھونک کر آئندہ پر مسرت زندگی سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ شاید بعض لوگوں کو یہ بات خروشیف کے اس فیصلے سے لگا کھاتی ہوئی معلوم نہ ہو جو انھوں نے کیوبا میں راکٹوں اور ایٹمی ہتھیاروں کے اڈے قائم کرنے کے بارے میں کیا تھا، لیکن یہی وہ زمانہ تھا جب دنیا کی ان دو بڑی طاقتوں نے خود کو تباہی کے غار کے دہانے پر پایا تھا لیکن عین وقت پر وہ سنبھل کر پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ میرے خیال میں وہ ایک خوف ناک غلطی تھی جس کا شاید پھر کبھی اعادہ نہ کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح وہ سرد جنگ ختم ہوگئی جو کئی برس سے جاری تھی، اور جس نے جنگ کا خطرہ لاحق کر رکھا تھا، مقابلے کے امکانات

ختم ہو گئے اور امریکہ اور سوویٹ یونین کو ماننا پڑا کہ اس جوہری توانائی کے زمانے میں رواداری کے اصول کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔

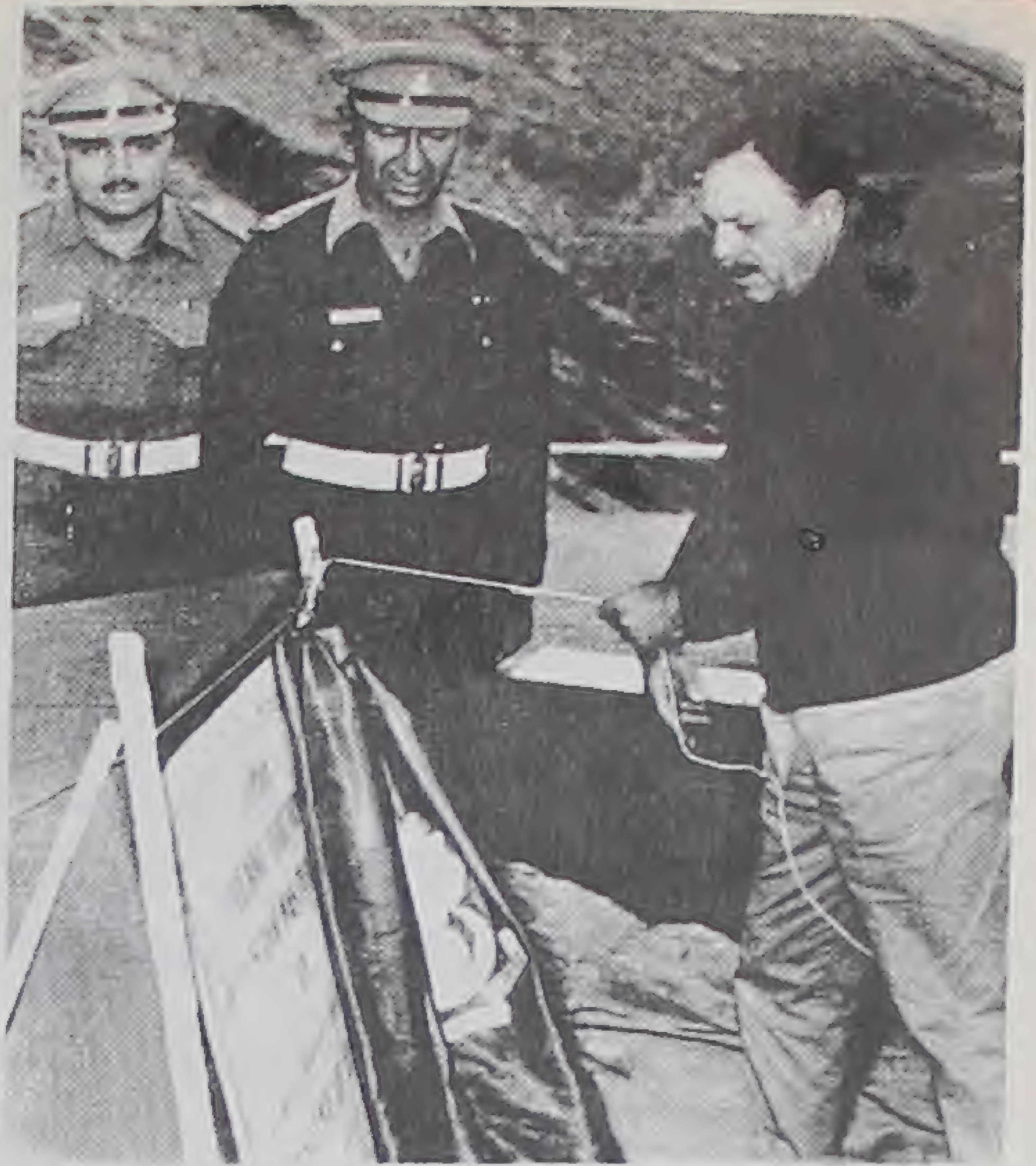
جیسا کہ مسٹر کوسی گن نے کہا، ان کے اور چین کے اختلافات خلقی نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھگڑے جاری رہیں گے۔ ہاں اگر سوویٹ یونین یا چین کی عوامی جمہوریہ ان دونوں میں سے کسی پر بھی کسی تیسرے ملک نے حملہ کیا تو یہ اختلافات ختم ہو جائیں گے اور یہ دونوں اشتراکی طاقتیں مل کر اس کا مقابلہ کریں گی۔ دونوں ملکوں کے لیڈروں کے خیالات خواہ کچھ بھی ہوں، ایک ملک پر بڑے حملے کی صورت میں دوسرے ملک کے عوام خاموش بیٹھے تماشا نہیں دیکھتے رہیں گے۔

(۷)

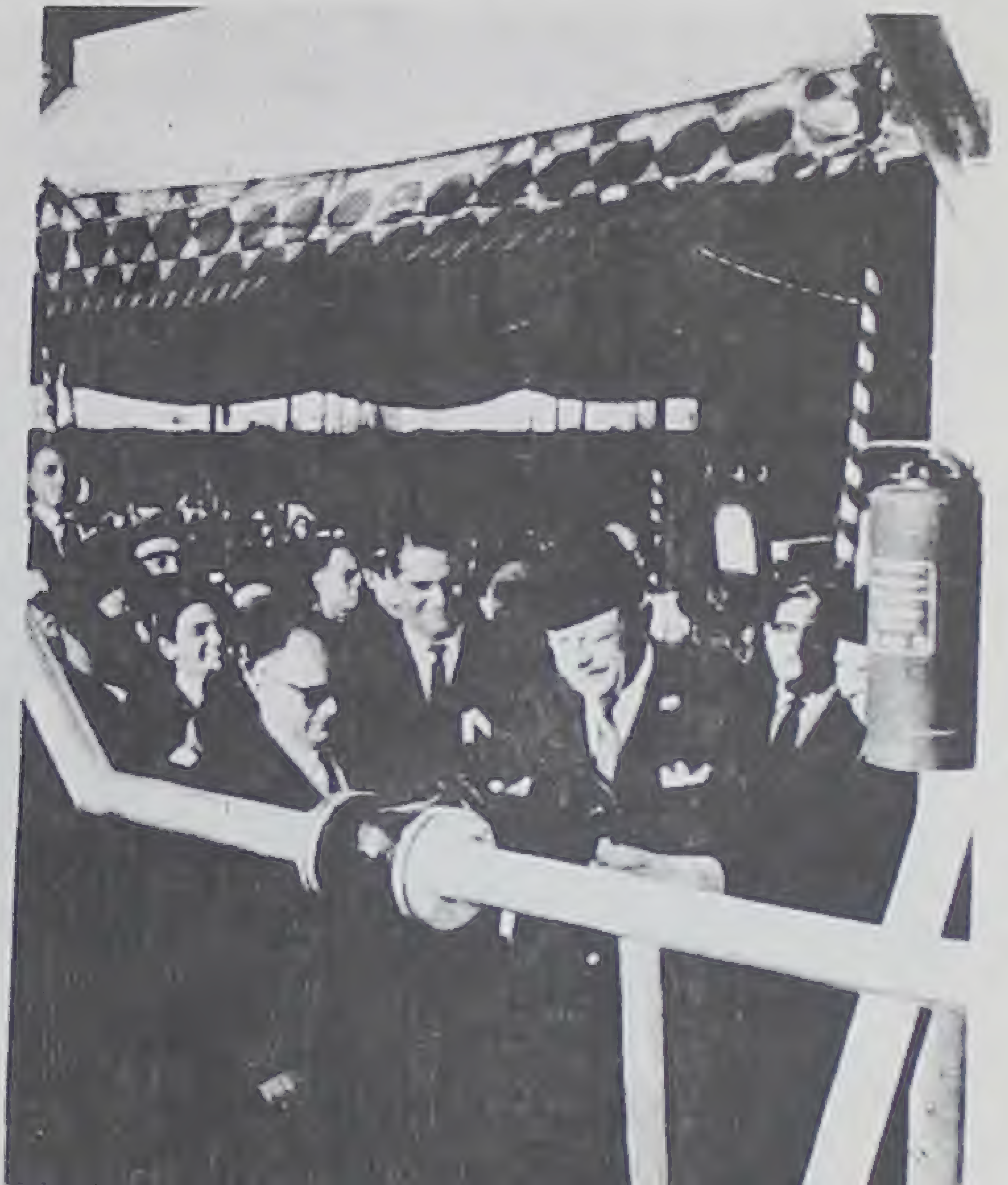
افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات اس دوستی اور بھائی چارے کے نہیں رہے ہیں جس کی دو ہمسایہ اسلامی ملکوں سے امید ہونی چاہئے تھی۔ جب ہندوستان و پاکستان دو آزاد و خود مختار مملکتوں کی حیثیت سے وجود میں آئے تو بہت سے افغانوں کے دل میں دو غلط باتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پہلی بات جو لگاتار ہندوستانی پروپیگنڈے کا نتیجہ تھی یہ تھی کہ پاکستان ایک علیحدہ ریاست کی حیثیت سے زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گا۔ افغانستان کے حکمراں اس کو سچ سمجھ بیٹھے اور انھوں نے پاکستان کے مٹنے سے پہلے پہلے اس کے ایک حصے پر اپنا حق جتانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ انھوں نے ہمارے شمالی علاقوں کے کچھ حصے پر جہاں پٹھان یا پختون رہتے ہیں اپنا حق ملکیت جتانا شروع کر دیا۔ اس طرح افغانستان کے حکمرانوں نے ہماری سرحدوں کے اندر 'پختونستان'، کی مصنوعی ریاست کے تصور کو ایک سیاسی مسئلے کا رنگ دے دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ہم کبھی منظور نہ کر سکتے تھے۔ بھلا کوئی خود مختار مملکت اپنے اندرونی معاملوں میں کسی دوسرے ملک کی دخل اندازی کو کیسے گوارا کر سکتی ہے۔ ہندوستانیوں نے افغانوں کے اس دعوے کی حمایت کی، کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ شروع ہو تو افغان شمال مغربی سرحد سے ہمارے

(١٩ - الف) سلہٹ میں فینچو گنج کے کیمیائی کھاد کے کارخانے کا دَورہ
۴ فروری سنہ ۱۹۶۲ء

(١٩ - ب) کرنافلی کے مختلف المقاصد منصوبے کا دَورہ
۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء



(۲۰-ا) کوئٹہ کے قریب سراخا بند کا
اِفتتاح کیا، جسے فوجی اِنجنیئروں نے بنایا
ہے۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۶۲ء



(۲۰-ب) کراچی میں نیشنل آئل ریفائنری
کا اِفتتاح کیا۔ ۲۱ فروری ۱۹۶۳ء

خلاف دوسرا محاذ کھول دیں ۔ ہندوستانیوں کا استدلال یہ بھی تھا کہ اگر ان میں اور افغانستان میں مفاہمت ہو جائے تو پاکستان پٹھان قبائلیوں کو ان کے خلاف استعمال نہ کر سکے گا ۔ اور اس طرح ہندوستانی اپنے خیال کے مطابق ہمیں گھیر لیں گے اور دونوں طرف سے نرغے میں ڈال دیں گے ۔

دوسری غلط بات خود افغان حکمرانوں کے اپنے طرز فکر کا نتیجہ تھی ۔ اگر ان کا پہلا اندازہ غلط ثابت ہو اور پاکستان زندہ و سلامت رہے تو وہاں ضرور جمہوری حکومت قائم ہوگی ، جس سے قدرتی طور پر افغانستان کے ان حکمرانوں کی اپنی پوزیشن کو دھکا لگے گا ۔ چنانچہ اسی وجہ سے انھوں نے ایک طرف تو ہمارے علاقوں پر حق ملکیت جتانا شروع کر دیا اور دوسری طرف ڈیورنڈ لائن پر جو دونوں ملکوں کو جدا کرتی ہے چھاپے مارنے لگے ۔ انھوں نے کرائے کے ایجنٹوں اور مخالف قبائلیوں کے ذریعے ان علاقوں میں گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی ۔ اس سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے عوام کی توجہ خود اپنی اندرونی مشکلات سے ہٹ گئی ۔

ہم شروع سے لے کر اب تک افغانستان کے ساتھ تحمل کی پالسی پر کاربند رہے ہیں ۔ ہم نے انھیں اپنی ریلوں کے ذریعے مال لانے لے جانے کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی ہے اور ان کے ساتھ اپنی تجارت پر مبادلے کا کنٹرول نہیں لگایا ہے ۔ ہم نے یہ سب باتیں اس لئے کی ہیں کہ ہم افغانستان کے عوام کے لئے انتہائی دوستی کے جذبات رکھتے ہیں ۔ افغانستان کی حیثیت ایک ایسے محصور ملک کی ہے جس کی سمندر تک رسائی نہیں ۔ ہم نے کافی اخراجات اپنے ذمے لے کر اہل افغانستان کو تجارتی اور دوسری سہولتیں بہم پہنچائی ہیں ۔

ہم نے کئی موقعوں پر ان سے اپنے باہمی مسائل پر مختلف سطحوں پر گفت و شنید کی ہے ۔ ہمارا تجربہ یہ رہا ہے کہ جب کبھی پاکستان کی حکومت کمزور ہوتی ہے تو ان کے دعووں میں سختی اور شدت پیدا ہو جاتی ہے اور جب پاکستان کی حکومت مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے تو ان کے دعوے مبہم ہو جاتے اور کمزور پڑ جاتے ہیں ۔ افغانوں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان کے ''پختونستان،،

کے مطالبے کی وضاحت نہ ہونے پائے - اب سے پہلے انھوں نے ایسے نقشے بھی پیش کئے جن میں دکھایا گیا تھا کہ دریائے سندھ تک کا علاقہ بلکہ کراچی تک ''پختونستان،، کا حصہ ہے - لیکن جب کبھی ہم ذرا سختی سے پوچھتے ہیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم کسی علاقے کے دعویدار نہیں - ہمیں تو بس ''پختونستان،، کے لوگوں کی بھلائی کی فکر ہے ، نیز یہ کہ ان لوگوں کو اپنی مرضی کے اظہار کا موقع ملنا چاہئے - جب ہم ان کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ پختون تو ملک کی تقسیم کے وقت ایک آزادانہ اور منصفانہ استصواب رائے کے ذریعے اپنی مرضی کا اظہار کر چکے ہیں ، بلکہ اس وقت تمام بڑے بڑے قبائل کی رائے معلوم کر لی گئی تھی - تو ان سے کچھ جواب بن نہیں پڑتا مگر وہ بدستور غیر مطمئن ہی رہتے ہیں -

جنوری سنہ ۱۹۵۹ء میں شہزادہ نعیم سے میری ایک طویل ملاقات ہوئی تھی - میں نے ان سے بیان کیا تھا کہ پاکستان کا قیام بر صغیر کے مسلمانوں کی اس جد و جہد کا نتیجہ ہے جو انھوں نے خود کو انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے کی تھی - برطانوی ہندوستان مذہبی اکثریت والے علاقوں کی بنیاد پر تقسیم ہوا تھا ، نسلی بنیاد پر نہیں - چنانچہ آزادی کے بعد ہماری نظریں مفاہمت ، دوستی اور دست گیری کے لئے قدرتی طور پر اسلامی دنیا اور خصوصاً مشرق وسطیٰ کے مسلمان ملکوں کی طرف اٹھی تھیں - مگر جب افغانستان نے ہماری آزادی کے روز اول ہی سے ہمارے ساتھ کھلے بندوں دشمنی کا رویہ اختیار کر لیا تو ہمیں بڑی مایوسی ہوئی تھی -

یہ کیسی ستم کی بات تھی کہ اقوام عالم میں افغانستان ہی وہ واحد ملک تھا ، جس نے اقوام متحدہ میں ہمارے داخلے کی مخالفت کی تھی - بس وہ دن اور آج کا دن افغانستان کے اخبارات اور افغانستان کے ریڈیو نے ہمارے خلاف الزام تراشی اور فتنہ انگیزی کی مہم شروع کر رکھی ہے - ایک موقع پر کابل میں ہمارے سفارت خانے کو ایک ہجوم نے تباہ کر دیا اور ہمارے آدمیوں کو افغانستان سے

نکال باھر کیا گیا ۔ افغانوں کے طرز عمل کو سمجھنا ھمارے بس کی بات نہیں ۔ وہ ''پختونستان،، کی مختلف توضیحات کرتے رہے ۔ کبھی ایک علیحدہ آزاد ریاست یا کبھی ایک خود مختار علاقہ ، کبھی یہ کہ پاکستان کے اندر ھی ایک امتیازی وحدت ھو جسے ''پختونستان،، کا نام دیا جائے ، اور کبھی صرف اتنا کہ پٹھانوں سے پوچھ لیا جائے کہ کیا وہ پاکستان میں خوش ھیں ۔ میں نے شہزادہ نعیم سے کہا کہ ھم جانتے ھیں کہ افغانی اپنی تجویز کو کیوں جان بوجھ کر مبہم رکھنا چاھتے ھیں ۔ ظاھر ھے وہ یہ چاھتے ھیں کہ کچھ اور اقدامات شروع کرنے سے پہلے پاکستان کے اندرونی معاملوں میں دخل دینے کا حق حاصل کر لیں ۔ یہ نہیں خیال کرتے کہ اس قسم کی باتیں صریحاً ناواجب ھیں ، اور ایک بین الاقوامی سرحد کے پار حملے کے مترادف ھیں ۔ ڈیورنڈ لائن وہ سرحد ھے جس کی افغانی حکام بڑی باضابطگی کے ساتھ بارھا تصدیق کر چکے ھیں ۔ اصل معاھدہ ۱۸۹۳ء میں ھوا تھا ، جس کی تصدیق ۱۹۰۵ء میں کی گئی ۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء کے انگریز افغان معاھدے میں دوبارہ تصدیق کی گئی ۔ آخری مرتبہ اس پر مہر تصدیق اس وقت ثبت ھوئی تھی جب افغانستان کا موجودہ حکمراں خاندان برسر اقتدار آیا تھا ۔

افغانستان کے طرز عمل کی صرف یہی تعبیر ھو سکتی ھے کہ یہ توسیع سلطنت کی ایک بالواسطہ کوشش ھے ۔ افغان حکمران جو لایعنی دعوے کر رھے ھیں ان کا نتیجہ سوائے فتنہ و فساد کے اور کچھ نہیں ھو سکتا ۔ پاکستان کے پٹھانوں کے لئے جو اظہار تشویش کیا جا رھا ھے ، اس کی بنیاد بس اس دعوے پر ھے کہ افغانستان کی تاریخ میں ایک دفعہ کچھ علاقوں پر جو اب مغربی پاکستان میں شامل ھیں افغانستان کی حکمرانی رہ چکی ھے ۔ لیکن اس کے برعکس ایسے زمانے بھی گزرے ھیں اور ان کی مدت کہیں زیادہ لمبی ھے جب دھلی کے حکمرانوں کا کابل بلکہ اس سے آگے تک سکہ چلتا تھا ۔ اگر پرانی فتوحات ھی کو رھبر بنانا ھے تو پھر پاکستان کو افغانستان میں رھنے والے پٹھانوں کے مستقبل کی زیادہ فکر ھونی چاھئے ۔ دنیا پرانے تاریخی احوال سے کہیں آگے نکل چکی ھے ۔ عہد جدید کی زندگی عظمت رفتہ

کے قصے کہانیوں پر مبنی نہیں ہوسکتی - پاکستان کے صبر کو کمزوری یا عزم کی کمی نہ سمجھنا چاہئے - میں نے شہزادہ نعیم سے درخواست کی کہ آپ پاکستان دشمنی کی پالسی ترک کر دیں - میں نے کہا : ''اگر ہم دو دوست ہمسایوں کی طرح رہیں گے تو اس سے ہم دونوں کو بڑا فائدہ ہوگا،،

میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں اسی صورت حال سے نباہ کرنا ہوگا - اس عرصے میں ہمارا صبر و تحمل قائم رہنا چاہئے - خیر سگالی اور مفاہمت کی فضا پیدا کرنے میں وقت لگتا ہے ، اور ایسے معاملوں میں جلد بازی سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا - شاہ افغانستان نے پچھلے چند برس سے حکومت کے انتظام میں کسی حد تک ایسے افراد کو شامل کرنا شروع کر دیا ہے جو شاہی حلقے سے تعلق نہیں رکھتے - اگر عام آدمیوں کو یوں ہی حکومت کے ذمہ داری کے کام سپرد کئے جاتے رہے تو افغانستان اور پاکستان کے درمیان جو مصنوعی اختلافات ہیں وہ مٹ جائیں گے اور افغانوں کو ہم سے تعاون کرنے کے فوائد کا احساس ہو جائے گا - افغانستان کو بھی دوسرے ملکوں کی طرح جمہوریت کے ابتدائی تجربات کرتے وقت ایک عبوری دور سے گزرنا پڑے گا - اور وہاں کے عوام کو اور ملکوں کے عوام کی طرح جمہوری نظام کے طریق کار اور اس کی روح کو سمجھنا ہوگا - جوں جوں عوام کو ملکی انتظام میں دخل حاصل ہوگا ، میرے خیال میں اتنے ہی وہ حقائق امروز کو تسلیم کرنے پر مائل ہوں گے اور عظمت رفتہ کی یاد میں مبتلا نہ رہیں گے -

میں ذاتی طور پر افغانستان کے حکمراں خاندان اور اس کے بادشاہ کا بڑا مداح ہوں - شاہ افغانستان بڑے دانا آدمی ہیں - انھوں نے عوام کو حکومت میں شامل کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے بڑی بصیرت کا ثبوت دیا ہے - ہمارے عقائد بھی وہی ہیں جو افغانستان میں ہمارے بھائیوں کے ہیں - فقط یہی امر موجودہ مشکلات کو ختم کرنے اور خوش گوار ہمسایگی کے تعلقات قائم کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے - اسی میں ان قبائل کی خوش حالی مضمر ہے جو ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف بستے ہیں - پاکستان کے اس طرف جو قبائل رہتے ہیں انہیں

اپنے علاقے کو ترقی دینے کے مناسب مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں - ان کی زراعت کو ترقی دی گئی ہے اور وہاں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں قائم کی گئی ہیں - اس معاملے میں ہمارا طرز عمل یہ رہا ہے کہ قبائلیوں کو خود یہ فیصلہ کرنے دیا جائے کہ وہ اپنے علاقے میں کس قسم کی ترقیاتی سکیم جاری کرنا چاہتے ہیں - ان باتوں سے ان علاقے کے لوگوں کو باقی ملک کے لوگوں سے متحد ہونے میں بڑی مدد ملی ہے- وہ ملک کی خوش حالی میں مساویانہ حصہ رکھتے ہیں- اور اپنے مستقبل کو پورے طور پر پاکستان کے مستقبل سے وابستہ کئے ہوئے ہیں -

(۸)

میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی گروہ بندیوں کا ذکر کر چکا ہوں- ایک طرف مغربی طاقتیں ہیں جن کا سربراہ امریکہ ہے - دوسری طرف کمیونسٹ بلاک ہے جس کی سرداری سوویٹ یونین اور چین کو حاصل ہے - اور ہماری سرحدوں پر ہندوستان ہے جو بجائے خود ایک برّاعظیم ہے- لیکن ان کے علاوہ افریقہ ، مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے بیسیوں ممالک کی گنجان مگر کم و بیش بے زبان آبادیاں ہیں جن کو نئی نئی آزادی ملی ہے -

دوسری عالمی جنگ سے پہلے دنیا کے چھٹے حصے میں سوشلسٹ طاقت کا ذکر سنا جاتا تھا جس سے مراد روس تھا - پھر جب چین نے سر اُبھارا تو دنیا پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ دنیا کا ہر چوتھا آدمی چینی ہے - لیکن ابھی تک امریکہ ہی کا بھاری تھا جو جوہری ہتھیاروں سے لیس تھا - مگر آخر روس کے فنی ماہر اور سائنس داں اُس کے مقابلے میں اس میدان میں اُتر آئے -

اسی کے ساتھ کاسا بلانکا سے لے کر جکارتا تک اور قاہرہ سے لے کر نیروبی بلکہ اس سے بھی آگے تک نئی نئی قوموں میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی- ایشیا اور افریقہ کی تیسری دنیا ''اھورو'' ، ''اللہ اکبر'' اور ''مردیکا'' کے نعروں سے گونج رہی تھی - یہ تیسری دنیا جس میں کالی اور گندمی نسلوں کے ستر کروڑ سے زیادہ آدمی آباد ہیں ، اور جہاں نئی نئی قومیں اُبھر رہی ہیں ، کیا ہے؟ ناداروں کی اس دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں جو دوسروں کو مرعوب کر سکے - آبادی

ے لحاظ سے سب سے بڑا ملک پاکستان ہے جس کے باشندوں کی تعداد گیارہ کروڑ ہے ۔ اس سے کچھ ہی کم درجے پر انڈونیشیا ہے جس کی آبادی دس کروڑ ستر لاکھ ہے ۔ اس کے بعد تھائی لینڈ ہے جس کی آبادی دو کروڑ اسّی لاکھ ہے ۔ اور اس کے بعد ترکی، متحدہ عرب جمہوریہ اور فلی پین ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی دو کروڑ ستر لاکھ ہے ۔

یہ تیسری دنیا کیا ہے؟ یہ کوئی جغرافیائی تصور نہیں ہے اور نہ کوئی معاشری حقیقت ہے ۔ یہ تو کوئی سیاسی نظریہ بھی نہیں جس کی توضیح کی جا سکے یا جسے کسی باضابطے نظام کی صورت میں پیش کیا جا سکے ۔ یہ تو بس مختلف بر صغیروں کے کثیر التعداد عوام کے اجتماعی شعور کا ایک عکس ہے ، ان ملکوں کے عوام کا جو آزادی اور ترقی کی مختلف منزلیں طے کر رہے ہیں ۔ یہ ترقی پذیر دنیا کی للکار ہے کہ اسے گردانا اور خاطر میں لایا جائے ۔ یہ اپنے وجود کو منوانے کی پکار ہے ۔

دس برس ہوئے یہ دنیا دو عظیم صنعتی ترقی یافتہ قوموں کی ملکیت تھی ، ایک امریکہ اور دوسرا روس ۔ اس وقت دنیا کے سامنے بس ایک ہی مسئلہ تھا کہ دونوں طاقتوں میں اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر و اقتدار کے بارے میں کوئی سمجھوتا ہو جائے ۔ اس وقت درحقیقت دنیا سے مراد امریکی دنیا اور سوویٹ دنیا تھی ۔ مگر ان دونوں دنیاؤں میں سخت تضادات پیدا ہوگئے ، اور عالم پر چھا جانے کی کوشش میں ایک طویل سرد جنگ شروع ہوگئی ۔ اس اثنا میں دنیا کے مختلف حصوں کی ستم رسیدہ اور محکوم اقوام نے اپنی آزادی کے لئے بڑی سرگرمی سے ہاتھ پیر مارنے شروع کئے ۔ ان دونوں بڑی طاقتوں کے اندرونی اختلافات سے ان اقوام کو اپنا حق آزادی منوانے میں مدد ملی اور وہ ایک ایک کر کے صدیوں کی تاریکی سے نکل کر سورج کے اجالے کی طرف لپکیں ۔

یہ قومیں ایک تیسری دنیا کا تصور لئے ہوئے اٹھی تھیں ، ان میں اگر کوئی بات مشترک تھی تو یہ کہ وہ اپنے آقاؤں کی لوٹ کھسوٹ ، ظلم و ستم کا یکساں تجربہ رکھتی تھیں ۔ ان کی بالادستی

کے باعث انھیں جو طرح طرح کے دکھ اٹھانے پڑے تھے ان کا بھی سب کو یکساں شعور تھا ، اس کے ساتھ ھی وہ آئندہ خوش و خرم اور آبرومندانہ زندگی گزارنے کی بھی آس لگائے ھوئے تھیں ، کیونکہ وہ زندگی کی آسائشوں میں بجا طور پر اپنا حق چاھتی تھیں - لیکن ان کا یہ نیا تصور کچھ کٹا پھٹا اور داغ دار تھا ، کیونکہ انھوں نے جو مسائل ورثے میں پائے تھے وہ محض آزادی کا پرچم لہرا دینے ھی سے حل نہ ھو سکتے تھے - ابھی تو یہ مسائل خود ھی کھلنے شروع ھوئے تھے اور ان کا حل صرف جذبات کی لہر سے کچھ زیادہ کا طلب گار تھا - انھوں نے دیکھا کہ ان کے آقا انھیں تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ گئے ھیں - ثقافتی ربط اور میل جول کے سارے روایتی بندھن ٹوٹ چکے ھیں ، پرانی تجارت کے تمام راستے اور تبادلۂ علم کی تمام راھیں بند ھو چکی ھیں -

ایشیا کے ملک دوسری عالمی جنگ کی المناکیوں کے بعد سنبھل رھے تھے - ان میں آپس میں کافی تلخی پائی جاتی تھی جو انھیں صدیوں تک اپنے اندرونی جھگڑوں میں الجھائے رکھ سکتی تھی - افریقی ملکوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی - یوروپین طاقتوں نے میز پر افریقہ کا نقشہ رکھ کر اور اس پر سیدھی لکیریں کھینچ کھینچ کر اسے بہت سے ملکوں میں تقسیم کر دیا تھا اور آپس میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کون سا ملک کس یورپی طاقت کے زیر فرمان ھو - جیسے کہ مال غنیمت کے حصے بخرے کئے جا رھے ھوں - ان کو فکر تھی تو بس اتنی کہ لکیریں بالکل سیدھی رھیں تا کہ حد بندی کے نشانوں کا سلسلہ کم سے کم طول پکڑے - ان کو اس بات کا نہ غم تھا نہ پروا کہ یہ سیدھی لکیریں کن کن روایتوں ، رابطوں، ثقافتوں یا کن کن نسلی اور لسانی وحدتوں کو کاٹ کر رکھ دیں گی - ادھر افریقہ کے لوگوں کو جیومٹری کی اس کٹھور مشق پر کچھ چوں و چرا کرنے کی مجال نہ تھی - وہ تو بس سیدھی لکیروں کا شکار ھو کے رہ گئے تھے - جب ان ملکوں کو آزادی ملی تو ان میں سے بہتوں نے دیکھا کہ ان کے پاس نہ تو کوئی انتظامی ڈھانچا ھے اور نہ سول ملازموں کی کوئی جماعت ھے - ان میں سے بیشتر تو تربیت یافتہ یا

منظم فوج بھی نہ رکھتے تھے - وہ تو صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ بھی نہ تھے - انھیں ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جس کی ایک آزاد ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے ان سے توقع کی جاتی تھی ذرا بھی تیار نہیں کیا گیا تھا -

جب پہلی عالمی جنگ کے بعد سلطنت عثمانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تو مغربی طاقتوں کو اپنا فائدہ اس میں نظر آیا کہ مشرق وسطیٰ میں چھوٹے چھوٹے ملک بنا دیئے جائیں - ان ملکوں کو اپنے قومی مفادات کا زبردست احساس پیدا ہو گیا جو اکثر آپس میں ٹکراتے تھے - مختلف ملکوں پر مختلف ڈھنگ کا نظم و نسق تھوپا گیا تھا - بڑی طاقتوں کا مقصد یہ تھا کہ یہ علاقے کمزور رہیں اور کوئی ملک اتنی طاقت نہ پکڑ لے کہ ان کے مفادات پر ضرب لگا سکے - انھوں نے اس امر کا بھی خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ ان ملکوں میں بہت سے اندرونی اختلافات پیدا کئے جائیں تاکہ ان میں متحد ہو کر سودا بازی کرنے کی اہلیت نہ پیدا ہو سکے -

جس وقت عرب لیگ قائم ہوئی تھی تو یہ امید بندھی تھی کہ اب شاید اقوام عرب میں کسی قسم کا اتحاد پیدا ہو جائے گا - مگر یہ امید پوری نہ ہو سکی - اسی طرح جب صدر ناصر برسر اقتدار آئے تو یہ توقع ہونے لگی تھی کہ وہ شاید عرب ملکوں کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئیں گے - اگر وہ غیر عرب مسلم ملکوں کے ساتھ نہ بھی ملتے مگر خود عربوں میں یک جہتی پیدا ہو جاتی تو یہ ان کے لئے بڑی رحمت کا باعث ہوتی اور اس سے اس سارے علاقے میں بڑا استحکام پیدا ہو جاتا، لیکن بدقسمتی سے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے باھمی اختلافات اتنے گہرے تھے کہ مٹائے نہ مٹ سکتے تھے - علاوہ ازیں اس امر نے صورت حال کو اور بھی پیچیدہ کر دیا تھا کہ ان ملکوں نے چوری چھپے اور ہیر پھیر کے ساتھ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی -

ان طبیعی رکاوٹوں اور میل جول کی کمی اور قومی اختلافات کے علاوہ تیسری دنیا کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی تھا ، یعنی اپنے لئے ایک فلسفۂ حیات تلاش کرنا اور اپنے مسائل کے حل کے لئے خود

اپنے انتظامات کرنا - ان ملکوں کو اپنے پرانے آقاؤں سے جو علم و فن ورثے میں ملا تھا ، وہ ان کی ثقافتی ضرورتوں سے لگا نہ کھاتا تھا - یہ سب بیرونی خیالات اور غیروں کے سجھائے ہوئے مقاصد کی جستجو کرتے رہے - ایسا تو نہیں کہ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے تحت جو علم حاصل کیا تھا وہ محض بے کار تھا ، بلکہ ان کو بہت سے معاملوں میں اس علم سے اپنی آزادی کی جد و جہد میں مدد ملی تھی ، البتہ اس تعلیم کے طریقے اور ضابطے ایسے تھے جو اکثر حالات میں غیر موزوں ثابت ہوئے تھے - یہ طریقے اور ضابطے بعض مخصوص مسائل کے حل کے لئے وضع کئے گئے تھے ، لیکن ان نئے آزاد ملکوں کے مسائل اور حالات بالکل مختلف تھے -

یہ بڑی طاقتیں اپنے پیچھے اپنی ذہنی فوقیت اور برتری کی ایسی بوجھل فضا چھوڑ گئی تھیں کہ اگر ان نئے ملکوں کے لوگ اپنے مسائل کو اپنے نقطہٗ نگاہ یا اپنے طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے تو ان کی یہ کوشش مہذب اور تعلیم یافتہ حلقوں میں رجعت پسندی یا قدامت پرستی تصور کی جاتی - حکومت کا واحد مہذب طریقہ مغرب والوں کا طریقہ سمجھا جاتا - اس طریق سے کسی قسم کا انحراف شک کی نظروں سے دیکھا جاتا - جمہوری نظام کے طریق ہی کو جسے مغرب والوں نے پروان چڑھایا تھا آزادی اور ترقی کا واحد ضامن سمجھا جاتا - مغربی ملکوں کی زندگی میں جمہوریت نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اور یہ لوگ اپنی جمہوریت کے سانچے کی ایسے مجنونانہ جوش و خروش سے حفاظت کر رہے تھے جس طرح مذہبی دیوانے اپنی رسموں ریتوں کو سینوں سے لگائے رکھتے ہیں - ان کو جمہوریت کی روح اور اصل سے زیادہ اُس کے ڈھانچے کی فکر تھی ، کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُصول ایک مخصوص ڈھانچے ہی میں جو ان کا اپنا ہوتا ہے، پنپ سکتے ہیں -

ان تمام مسئلوں اور پابندیوں نے تیسری دنیا کو پروان چڑھنے سے روک رکھا ہے اور مجھے فکر ہے کہ کہیں ان کی نشوونما ایک خواب بن کر ہی نہ رہ جائے - یا زیادہ سے زیادہ ایک ایسا عظیم سیاسی مقصود جس کے حصول میں مدتیں صرف ہو جائیں -

تیسری دنیا کی صحیح ترین ترجمانی افریقی ایشیائی تحریک کے ذریعے ہوئی - ہم پاکستانیوں نے پورے طور پر اس افریقی ایشیائی تحریک کا ساتھ دیا اور دوسری افرایشیائی کانفرنس کی تیاری میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - بدقسمتی سے بعض اسباب کی بنا پر جو اس کانفرنس کے اہتمام کرنے والوں کے قابو سے باہر تھے ، یہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکی یہ سخت مایوسی کی بات تھی ، اور مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ ایک خواب تھا جو پارہ پارہ ہو کر رہ گیا ، اور ان پاروں کو پھر سے اکٹھا کرنے میں نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے -

اس کانفرنس کی ناکامی کا ایک سبب ، اور میرے خیال میں قطعی سبب یہ تھا کہ سیاسیات اور اس کے لوازمات یعنی اختلافات و تنازعات کا بہت سا عنصر اس تحریک میں آ گھسا تھا - ترقی پذیر ملکوں کے سامنے اصلی مسئلہ تو یہ تھا کہ بڑی طاقتوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کا کوئی طریقہ سوچا جائے - مگر اس کے بجائے ان کا سارا زور اپنے اندرونی اختلافات و تنازعات طے کرنے ھی میں صرف ھو گیا -

ھر چند دوسری افرایشیائی کانفرنس منعقد نہ ھو سکی مگر اس سے ھمیں چند مفید سبق ملے ، یعنی افریقہ و ایشیا کی چھوٹی قومیں جب کبھی مل بیٹھنے کی کوشش کریں گی تو اس کی مخالفت صرف بڑی طاقتیں ھی نہیں کریں گی بلکہ وہ بھی جو خود بڑی طاقت بننے کے خواب دیکھ رھی ھیں - ھندوستان کے معاملے ھی کو لیجئے - سنہ ۱۹۵۵ء میں جب پہلی افرایشیائی کانفرنس منعقد ھوئی تھی تو ھندوستان نے اس کے اھتمام میں بڑی سر گرمی دکھائی تھی ، مگر اس کے انعقاد سے ھندوستان کو بڑی مایوسی ھوئی ، اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ مسٹر نہرو ایشیا کے لیڈر کی حیثیت حاصل نہ کر سکے - اس کے دس برس بعد جب دوسری افرایشیائی کانفرنس کی تیاریاں ھونے لگیں تو ھندوستان کا رویہ مخاصمانہ ھو گیا ، کیونکہ اس خطے کی اور قومیں ھندوستان کو اپنا سربراہ ماننے پر تیار نہ ھوئیں ، بلکہ وہ اس کے ارادوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگیں - اس پر ھندوستان نے افریقی ایشیائی ملکوں کے اتحاد کی بیخ کنی شروع کر دی اور اس مجوزہ کانفرنس کو چین و روس کے مجادلے کا اکھاڑا بنا ڈالا -

سنہ ۱۹۵۵ء میں مسٹر نہرو نے پہلی کانفرنس میں روس کی شمولیت کو یہ کہہ کر بڑی کامیابی کے ساتھ رکوا دیا تھا کہ چونکہ سوویٹ یونین یورپ کا ایک حصہ ہے اس لئے اسے کانفرنس میں مدعو نہیں کیا جا سکتا - لیکن اب دس برس کے بعد ہندوستان نے قلابازی کھائی ، اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ دوسری کانفرنس میں سوویٹ یونین کی شرکت افریقی ایشیائی دنیا کو بڑی تقویت بخشنے کا باعث ہوگی - یہ خیال افریقی ایشیائی ملکوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے پیش کیا گیا تھا ، تاکہ وہ ترقی یافتہ ملکوں کی دراز دستیوں کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکیں - ہندوستان نے خود ارادیت کے بارے میں اپنی تشریح بھی اس کانفرنس پر مسلط کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ خودارادیت ہر اس ملک کا حق ہے جس پر کسی دوسرے ملک کا قبضہ ہو اور وہ آزاد ہونا چاہتا ہو - لیکن کسی آزاد و خود مختار ملک کی حدود کے اندر مختلف خطّوں اور علاقوں کے لوگوں کو یہ حق حاصل نہ ہوگا ، کیونکہ اس سے وہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور اس طرح کسی بھی ملک کی سالمیت محفوظ نہ رہ سکے گی - ظاہر ہے اس کا مقصد محض یہ تھا کہ کشمیر پر کسی قسم کی بحث نہ ہونے پائے - لیکن ہندوستان کا اصلی مقصد تو افریقی و ایشیائی دنیا میں پھوٹ ڈلوانا تھا - اس نے اپنے اس مطالبے سے کہ ملیشیا کو کانفرنس میں بلوایا جائے ، انڈونیشیا اور ملیشیا کے طرف داروں میں سرپھٹول کرانے کی کوشش بھی کی -

اس تیسری دنیا کے بارے میں میرا تصور ترقی پذیر ملکوں کی ایک ایسی کائنات کا ہے، جس میں ستاروں کے جھرمٹوں کی طرح کئی کئی ملکوں کے گروہ ہوں - ہر ایک گروہ اندرونی توازن کے ذریعے اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہو اور مشترک خیالات، مشترک تجربات اور مشترک مسائل کی بنیاد پر منظم ہو - یہی وہ واحد طریقہ ہے جس پر عمل کر کے ترقی پذیر دنیا ترقی یافتہ دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے -

ظاہر بات یہ ہے کہ پاکستان کو اس بڑے گروہ سے وابستہ ہونا چاہئے جو کاسا بلانکا سے لے کر جکارتا تک پھیلا ہوا ہے - اس خطّے کے ملکوں میں کسی قسم کا ربط اور مفاہمت ہونی چاہئے - سیاسی یا

فوجی ربط نہیں بلکہ اقتصادی اور ثقافتی ربط - ہماری ضرورتیں ایک سی ھیں ، اور ہم مل جل کر ایک دوسرے کے فائدے کے بہت سے کام کر سکتے ھیں - اتحاد سے ہم سب کا فائدہ ہوگا - ہمارا یہ بلاک اپنے اندر زبردست قوت رکھے گا اور اس کی آواز دنیا میں بڑی مؤثر ہوگی- آج دنیا کی چھوٹی چھوٹی قوموں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا ، لیکن اگر ہم یک زبان ہو کر بات کریں گے تو دنیا ضرور چونکے گی اور ہماری بات کان دھر کر سنے گی - مثال کے طور پر ترکوں ، ایرانیوں ، افغانوں اور پاکستانیوں کی اصل کیا ھے؟ ہمارے آبا و اجداد ایک ھی جگہ کے رہنے والے تھے اور وہ بھی وسطی ایشیا کے گیاھستان کے - پھر یہ کیسے ہوا کہ ہم نے اپنے مشترک آبا و اجداد کو فراموش کر دیا ، اور اس حد تک فراموش کر دیا کہ ھمیں احساس تک نہیں کہ ہماری سلامتی بڑی بڑی طاقتوں کی غیر دنیا اور غیر نظریات کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے ھی میں ھے؟

اگر ہم اپنا یہ مخصوص گروہ قائم کر سکیں (جس کی داغ بیل علاقائی تعاون برائے ترقی کے ذریعے ڈال دی گئی ھے) تو یہ دوسرے گروہوں کے لئے ایک تابناک مثال ثابت ہوگی - خاص کر عرب گروہ کے لئے جس کا مرکز متحدہ عرب جمہوریہ ہوگا - میں سمجھتا ہوں کہ صدر ناصر کی ذات اس مقصد کے حصول کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ھے - میرے خیال میں وہ آج اس خطے کی نہایت اہم شخصیت ھیں - اور میں بڑے خلوص اور جذبے کے ساتھ یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ تاریخ کے دھارے صحیح سمت موڑنے میں مدد دیں گے - جب تک اس خطے کے ملک جن کا ماضی و حال میں اس قدر گہرا ربط و ضبط رہا ھے ، اپنے اندر گہرائی اور گیرائی پیدا نہ کریں گے ، انھیں خطرات لاحق رھیں گے ، اور یہ سارا خطہ بین الاقوامی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا اکھاڑا بنا رہے گا -

شاید موجودہ حالات میں تمام ترقی پذیر ملکوں کو ایک سلسلے میں منسلک کرنے کا تصور زیادہ قابل عمل ثابت نہ ہو - لیکن اگر ایک مرتبہ بنیادی خیال کو قبول کر لیا جائے تو کئی اور طرح کے اتحاد آزمائے جا سکتے ھیں ، جن کا مقصد آپس میں زیادہ سے زیادہ

یک جہتی پیدا کرنا ہو ، تاکہ ایک مشترک پلیٹ فارم کے ذریعے بیرونی دنیا کا مقابلہ کیا جا سکے ۔ علاقائی تعاون بھی بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے لئے میدان بھی بڑا وسیع ہے ۔ مثال کے طور پر ''المغرب،، کے تین یا چار ملکوں جیسے لیبیا ، ٹیونیشیا ، مراقش اور الجیریا کا تعاون ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا مذہب بھی ایک ہے ، اور ماضی بھی ایک سا ہے ۔ ان کا گروہ جس کی آبادی تین کروڑ ہے اور چوبیس لاکھ مربع میل رقبے میں پھیلا ہوا ہے، ہر لحاظ سے محکم اور عملی طور پر کامیاب ثابت ہوگا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ ملک آپس میں مل کر کچھ مشترکہ انتظامات کر لیں جس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکیں تو یہ بڑی درست بات ہوگی ۔ اسی طرح میرے خیال میں مصر اور سوڈان کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے، کیونکہ یہ دونوں پانی اور مواصلات کے معاملے میں ایک ہی ذریعے پر انحصار رکھتے ہیں، ان کے ڈانڈے بھی ملے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سارے جزیرہ نمائے عرب کا مستقبل بھی مشترک ہی نظر آتا ہے ۔

میں ذاتی طور پر ایسے تمام علاقائی اشتراکوں اور ان کے بعد بین العلاقائی گروہ بندیوں کے حق میں ہوں ، تاکہ اجتماعی سودے کے ذریعے معاملات بہتر طریق پر طے کئے جا سکیں ۔ بہ صورت دیگر ہم میں سے ہر ایک کو فرداً فرداً بڑی طاقتوں سے نمٹنا ہوگا اور ہم سب زبردست گھاٹے میں رہیں گے ۔ ہمارا خطہ ہمیشہ کمزور رہے گا اور جس کسی کو موقع ملے گا وہ اسے ہڑپ کر لینے میں پس و پیش نہ کرے گا ۔ اور ہم بس دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے ۔ ہم اس وقت تک جو بچے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بڑی طاقتیں باہمی رقابت میں مبتلا ہیں ۔ اگر ہم متحد ہو کر بڑی طاقتوں کے دباؤ کا مقابلہ نہ کریں گے تو ہماری حیثیت ہمیشہ پست اقوام کی رہے گی ۔

کاسابلانکا سے لے کر جکارتا تک کے اس علاقے کے ملک بڑی طاقتوں کی نظروں میں کھٹکتے ہیں، کیونکہ ان میں سے بیشتر کا مذہب اسلام ہے ۔ اسلام کے بارے میں ان ملکوں میں خواہ کتنے ہی

اختلاف کیوں نہ ہوں ، اور خواہ ہر ایک ملک اسلام کے بارے میں کتنا ہی مختلف نظریہ کیوں نہ رکھتا ہو ، لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کمیونسٹ دنیا ، عیسائی دنیا اور ہندو ہندوستان انہیں مسلم ممالک ہی تصور کرتے ہیں ۔

ہندوستان کو تو مسلمانوں سے ازلی بیر ہے اور اس کی پاکستان سے دشمنی اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے پڑوس میں ایک مسلم طاقت کو پروان چڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اپنی سرحدوں سے قریب یا دور مسلم ملکوں کی گروہ بندی کو کبھی برداشت نہ کرے گا ۔

بڑی بڑی طاقتوں کی ایک دوسرے سے رقابتیں ، چین کے سربلند ہونے سے دنیا میں طاقت کے تصور کا دھندلا جانا ، عالمی اقتدار کے لئے امریکہ اور روس کے تنازعے کا خاتمہ ، یہ سب ٹھوس حقیقتیں ہیں لیکن اگر چھوٹی قومیں آپس میں متحد ہو جائیں اور جو قدم اٹھائیں مل کر اٹھائیں تو وہ ان کا بخوبی مقابلہ کر سکیں گی ۔ تھوڑی سی دور اندیشی کے ساتھ طاقت کے ایسے گروہ بنا لینا کچھ مشکل نہ ہوگا جو ایک دوسرے سے منسلک ہوں ، اور باہم مل کر ترقی پذیر ملکوں کی ایک پوری کائنات بن جائیں اور غیر موافق اجرام کی غارت گری کا مقابلہ کر سکیں ۔

(۹)

جب سے سوویٹ یونین اور امریکہ میں زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول کو ماننے پر اتفاق ہوتا جا رہا ہے، انہیں اب اس کی زیادہ ضرورت نہیں رہی کہ وہ چھوٹے ملکوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کی دلداری کریں ۔ امداد سرد جنگ کے دوران میں ایک مفید مطلب چیز تھی ، لیکن اس نئی صورت حال کے پیش نظر شاید اب چھوٹے ملکوں کے لئے بڑے ملکوں سے وسیع پیمانے پر امداد حاصل کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا ۔ حقیقت میں مجھے کبھی کبھی ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید امداد امداد ہی نہ رہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خالص تجارتی لین دین کی شکل اختیار کر لے ۔ صنعتی ملکوں نے جان لیا ہے کہ علاقائی استعمار کا نہ تو زمانہ رہا ہے اور نہ

اسے قائم رکھنا آسان ہے۔ ان کے پاس مجتمع صورت میں زبردست اقتصادی قوت موجود ہے جس سے کام لینا وہ کہیں زیادہ مفید سمجھتے ہیں ۔

ادھر ترقی پذیر ملکوں کو اپنی نشوونما کے لئے اقتصادی امداد کی ضرورت ہے ۔ وہ اپنے کارخانوں کے لئے باہر سے مشینیں خریدنے پر بھی مجبور ہیں تاکہ اپنے خام مال کو کام میں لا سکیں ۔ انہیں امداد یا قرض کے طور پر جو کچھ ملتا ہے اسے وہ جبھی لوٹا سکتے ہیں کہ وہ اپنا تیار مال غیر ملکی منڈیوں میں بیچ کر کافی غیر ملکی زر مبادلہ کما سکیں ۔ لیکن ان منڈیوں میں، ان کی رسائی بڑی محدود ہے کیونکہ ترقی یافتہ ملک پختہ مال کے بجائے خام مال خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں، تاکہ وہ اس سے خود اپنے ہاں اشیا تیار کر سکیں ۔ ادھر خام مال کی قیمتیں اکثر بدلتی رہتی ہیں ، اور تجارت کی شرائط ہمیشہ ترقی پذیر ملکوں کے خلاف ہی پڑتی ہیں ۔ اس کے علاوہ مقدار کے بارے میں بھی طرح طرح کی پابندیاں ہیں ۔ پھر محصولات کی رکاوٹیں ایسی ہیں کہ ان سے گزرے بغیر مال مغربی منڈیوں میں پہنچ ہی نہیں سکتا ۔ جب تک ترقی پذیر ملک اجناس اور مال آزاد منڈیوں کی شرائط کے تحت خریدنے اور بیچنے کے قابل نہ ہو سکیں گے، تجارتی حالات ان کے لئے ناموافق ہی رہیں گے ۔

ان حالات کے باعث اور ملکوں کی طرح ہم پاکستان والے بھی سخت گھاٹے میں ہیں ۔ ہمیں دو باتوں کی وجہ سے غیر ملکی زر مبادلہ کمانے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ پہلی یہ کہ ہم درآمد کے ذریعے اپنی تجارتی اور صنعتی ضرورتوں کو پورا کر سکیں اور دوسری یہ کہ اپنے قرضے چکا سکیں ، جو ہم بیشتر ترقی پذیر ملکوں کی طرح لینے پر مجبور ہوئے ۔ ان میں سے بعض قرضے بہت بھاری ہیں، جن پر سود کی شرح چھ فی صد ہے ۔ میرے خیال میں وہ دن دور نہیں جب ترقی پذیر ممالک کو ان قرضوں کی ادائیگی کے کامل التوا کی درخواست کرنی پڑے گی ۔ اگر ترقی یافتہ ملک ہم سے تجارت کرنے پر تیار نہ ہوں اور ہمارا پختہ مال نہ خریدیں تو ہم کیا کریں؟ ضرورت کا غیر ملکی مال منگانا تو الگ رہا ہم اپنے موجودہ قرضے ہی کس طرح چکا سکیں گے؟ عالمی پیمانے پر مفادات کا تصادم عمل میں آنا لازمی ہو جائے گا ۔ میں

سمجھتا ہوں کہ اگر مغرب کے سرمایہ‌دار ملک اپنی منڈیوں کے دروازے ہم پر نہ کھولیں اور اپنے صنعتی نظام میں ایسی تبدیلیاں نہ کریں جس سے چھوٹے ملکوں کے لئے نیم پختہ یا نسبتاً آسان ساخت کا مال بنانے اور بیچنے کی گنجائش نکل سکے ، تو شاید آخرکار سب ان سے پہلو تہی کر لیں گے ۔

اقوام متحدہ کے ایک حالیہ جائزے میں بتایا گیا ھے کہ اگر ترقی یافتہ ملک ترقی پذیر ملکوں سے دس ارب ڈالر کی مالیت کی مصنوعات سنہ ۱۹۸۰ء تک خرید لیں ، تو ہرچند اس سودے سے دنیا میں اشیا کی مانگ صرف ایک فی صد بڑھے گی ، مگر اس سے ترقی پذیر لکوں کو بڑا معقول فائدہ پہنچ سکے گا ۔ کیا یہ ملک ایسا کریں گے؟ مجھے تو یہ نظر نہیں آتا ۔ مثال کے طور پر امریکہ پاکستان کو سال بھر میں صرف ڈھائی کروڑ گز کپڑا اپنے ھاں درآمد کرنے کی اجازت دیتا ھے ۔ یہ مقدار مضحکہ خیز حد تک کم ھے ۔ پارچہ بافی پاکستان کی بڑی بڑی صنعتوں میں سے ھے، جس کی برآمد سے اس نے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ھیں اور یہی حال بعض دوسری اشیا کا بھی ھے ۔

اب برطانیہ کو لیجئے جسے چند سال ھوئے بقایا جات کی ادائگی کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا ۔ اس نے پاکستان سے آنے والے سوتی کپڑے اور سوت کا کوٹا مقرر کر دیا ۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں جب میں نے اس معاملے کا ذکر تعلقات دولت مشترکہ کے سکرٹری مسٹر ڈنکن سینڈیز سے کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ مانچسٹر کی صنعت پارچہ بافی پر سخت ضرب پڑی ھے، نیز یہ کہ حکومت کو مانچسٹر کے رائے دھندگان کی خوشنودی کا بھی خیال رکھنا تھا ۔ جب میں نے وزیر اعظم میکملن سے یہی ذکر چھیڑا تو وہ بولے کہ ''یہ ووٹوں کا مسئلہ ایسا ھے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔،، یہ حال ھے ان ترقی یافتہ قوموں کے اخلاق اور ان کی خیر سگالی کا ۔ جب ہم کہتے ھیں کہ آپ سادہ اور معمولی اشیا بنانے کا کام ہم پر چھوڑ دیجئے اور خود اعلیٰ اور نفیس اشیا بنائیے ، تو وہ کہتے ھیں کہ کہنا آسان ھے اور کرنا مشکل ۔ یہ اشیا ہم سے خریدے گا کون! تجارت کو آزاد

بنانے میں جو پس و پیش ہو رہی ہے، اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ان لوگوں کو آسان اور نفع بخش اشیا کی منڈیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہے ۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ چیزیں تیار کرنے پر بہت سا سرمایہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان صنعتی ملکوں کی اپنی الجھنیں بھی ہیں، مگر وہ ہمارے ہاں سے صدیوں ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے ہیں ۔ اس کی تلافی تو کیا ہوگی وہ کم ازکم ہمارے ساتھ جائز تجارت کرنے ہی پر آمادہ ہو جائیں ۔ ان ملکوں کی حالت یہ ہے کہ نئے صنعت کاروں کا ذکر آتے ہی وہ فوراً اپنی منڈیوں کے چاروں طرف کوٹا ، ترجیحات اور محصولات کی حفاظتی دیواریں کھڑی کر لیتے ہیں ۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ترقی پذیر ملکوں کو ، خصوصاً ان ملکوں کو جو آئندہ ہلکی پھلکی مصنوعات بنانے کی سوچ رہے ہیں ، جلد کوئی فیصلہ کر کے متحدہ اقدامات کرنے ہوں گے ۔ سیاسی میدان کی طرح اقتصادی میدان میں بھی نجات کی صرف ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان ملکوں کو آپس میں منسلک ہو جانا چاہئے اور جلد سے جلد تر ۔ وہ ملک جو ایک ہی قسم کی اجناس پیدا کرتے ہیں ، ان میں تعاون بڑا لازمی ہے ۔ مثال کے طور پر چائے ، پٹ سن یا چاول کوئی بھی بڑی جنس لے لیجئے ۔ اگر اس جنس کے پیدا کرنے والے ملک آپس میں کوئی ایسا انتظام کر لیں جس سے دنیا الگ الگ ملکوں کی بجائے ایک مشترک ادارے کے ساتھ تجارت کرنے پر مجبور ہو جائے ، تو اس سے سب ملکوں کو اس جنس کے اچھے دام مل سکیں گے ۔ اور اگر آپس میں معقول سمجھوتا ہو جائے تو ہر ایک ملک اپنی پیداوار کی مقدار کے تناسب سے نفع کما سکتا ہے ۔ ممکن ہے کہ ہمارے پاس بہت سا مال پڑا رہ جائے ۔ پھر کیا ہوا؟ اس اسٹاک کو یونہی پڑا رہنے دیا جائے مگر کسی ملک کو موقع نہ دیا جائے کہ وہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھائے یا دوسروں کو نیچا دکھانے کے لئے سستے داموں مال بیچے ۔ اور پھر ہماری تجارت یورپ اور امریکہ ہی سے کیوں وابستہ رہے ۔ ہمیں جہاں کہیں بھی موقع ملے ایک دوسرے سے تجارت کرنی چاہئے ، اور ہم جو اجناس پیدا کر

رہے ہیں ان کی تجارت کے لئے مشترکہ انتظامات ہونے چاہئیں ۔ میں اس دلیل سے بخوبی واقف ہوں کہ افریقہ میں بین العلاقائی تجارت وہاں کی کل تجارت کا صرف ایک سے لے کر پانچ فی صد ہوا کرتی تھی ، کیونکہ افریقی معاشیات کے تحت ہر ملک میں مختلف یا امدادی مال یا اجناس پیدا کرنے کی بجائے ایک ہی قسم کی اشیا یا مقابلے کی اشیا پیدا کی جا رہی تھیں ۔ اس کا علاج موجودہ زمانے اور مستقبل کے لئے بس ایک ہی ہے ، جس پر ہم سب کو کاربند ہونا چاہئے ۔ وہ یہ کہ ہم سب مل جل کر کام کریں اور اس بات پر غور کریں کہ کیا ہم اپنی اپنی پیداوار کی اقسام بدل سکتے ہیں ، اور ان میں تال میل پیدا کر سکتے ہیں ۔ میں نے جو افریشیائی ملکوں کی دوسری کانفرنس کی شد و مد سے حمایت کی تھی اس کی ایک بڑی اہم وجہ یہ بھی تھی ۔

آپ جس پہلو سے بھی نظر ڈالئے تیسری دنیا کی نجات کا دار و مدار بس اس امر پر ہے کہ ملتے جلتے ملکوں کے گروہ بنا لئے جائیں ، تاکہ مشترکہ مفادات کی حفاظت ہو سکے اور مشترک مسئلے حل کئے جا سکیں ۔

گیارھواں باب

آئین اور نظریۂ حیات

پاکستان کے آئینی مسئلے کی بابت میرے طرز فکر کی وضاحت کے لئے کچھ عرصے پیچھے کی طرف لوٹنا پڑے گا - ۴-اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء کو میں لندن کے ایک ھوٹل میں ٹھہرا ھوا تھا - میں امریکہ جاتے ھوئے دو دن کے لئے لندن رک گیا تھا - رات گرم گرم سی تھی - مجھے نیند نہ آئی ، لیکن اس کی وجہ محض گرمی نہ تھی - وطن سے بڑی بڑی خبریں آ رھی تھیں - شگون کچھ اچھے نہ تھے - میں مضطرب تھا ، کیونکہ میں نے سنا تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد ، خدا جانے کیا کر بیٹھنے والے ھیں - ان میں اور وزیر اعظم محمد علی بوگرا میں ٹھن گئی تھی - میرا دل گواھی دے رھا تھا کہ غلام محمد مجھے سیاسیات میں گھسیٹنا چاھیں گے ، جس سے میں خاص طور پر بچنا چاھتا تھا -

میں کمرے میں ٹہل رھا تھا کہ میں نے اپنے آپ سے کہا ''آؤ ذرا فوجی طریق پر اپنے خیالات تو قلمبند کریں - ملک میں کیا خرابی پیدا ھو گئی ھے اور اس کا علاج کیا ھے؟'' میں نے اس معاملے کو اس انداز سے دیکھا جس طرح کوئی فوجی صورت حال کا جائزہ لیتا ھے - مسئلہ کیا ھے؟ کن عناصر نے اسے اُلجھا رکھا ھے ، اور اگر اس کا کوئی حل ھو سکتا ھے تو وہ حل کیا ھے؟ چنانچہ میں اپنے کمرے میں میز کے پاس بیٹھ گیا - اور لکھنا شروع کر دیا - شروع شروع میں میرے خیالات الجھے الجھے سے تھے - لیکن جلد ھی ھر بات روشن ھو گئی - چند گھنٹوں میں میں نے ایک دستاویز تیار کر لی ، جس

میں میں نے ملک کے موجودہ مسائل پر خیال آرائی کی تھی اور اپنا نقطہ نگاہ پیش کیا تھا - میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملک کے حالات ابتر ضرور ہیں، لیکن نہ ایسے کہ ان کی اصلاح ہی نہ ہو سکے - وہ دستاویز یہ ہے :—

پاکستان کے موجودہ اور آئندہ مسائل کا جائزہ

مقصد :

۱ - پاکستان کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک مضبوط، ٹھوس اور متحد قوم بنے تاکہ تاریخ عالم میں جو کام اس کے مقدر ہو چکا ہے اسے بجا لا سکے - یہ مقصد جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے ایک ایسا آئین وضع کیا جائے جو عوام کے مزاج کے مطابق اور ان حالات پر مبنی ہو جن سے وہ دوچار ہیں تاکہ وہ یک جہتی، اتحاد عمل اور تخلیقی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں -

۲ - ظاہر ہے کہ ایسا آئین وضع کرنے سے پہلے بعض ابتدائی اقدامات کرنے ضروری ہوں گے تاکہ یہ آئین بلا کسی رکاوٹ کے پروان چڑھ سکے - چنانچہ ایسے ابتدائی اقدامات کرنا پاکستان کا فوری مقصد ہے۔

عناصر :

عام

۳ - (الف) پاکستان کے باشندے طرح طرح کی نسلوں کے ہیں۔ ہر نسل کا تاریخی پس منظر اور تمدن جداگانہ ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کا ہے۔ یہ لوگ غالباً ہندوستان کی قدیم ترین نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے انہیں حقیقی معنوں میں کبھی آزادی اور خود مختاری نصیب نہ ہوئی تھی - ان پر کبھی ذات پات والے ہندو حکمراں تھے، کبھی مغل اور پٹھان اور کبھی انگریز - علاوہ ازیں ان پر ہندوؤں کے تہذیب و تمدن اور زبان کا خاصا اثر رہا ہے، جو ابھی تک زائل نہیں ہوا - ان کی ذہنی کیفیت بالکل ویسی ہے جیسی ستم زدہ اور مظلوم اقوام کی ہوتی ہے۔ اور وہ ابھی تک نئی حاصل شدہ آزادی کے تقاضوں کے مطابق خود کو

نفسیاتی طور پر ڈھال نہیں سکے۔ ان کی عام ذہنی الجھنیں یہ ہیں: کم آمیزی، شک و شبہ اور ایک قسم کی مدافعانہ جارحیت پسندی۔ ان کا باعث غالباً ان کا یہی تاریخی پس منظر ہے۔ چنانچہ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ان عناصر کو تسلیم کر کے ان کا تدارک کیا جائے، اور مشرق پاکستان والوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ حکومت میں برابر کا ساجھا رکھتے ہیں، تاکہ وہ ملک کے لئے قیمتی سرمایہ ثابت ہوں۔ یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ انہیں اس ساجھے داری میں معقول حصہ دیا جائے۔

(ب) اس کے برعکس مغربی پاکستان کے باشندے بہت سی مخلوط نسلوں کے ہیں۔ اس قسم کی آبادی کی نظیر دنیا میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ چونکہ یہ خطہ بر صغیر ہند و پاکستان کے دروازے پر واقع ہے، اس لئے یکے بعد دیگرے جو فاتح قوم بھی ادھر آئی وہ لازمی طور پر اپنے نشان چھوڑتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسلوں کے اس جبری اختلاط کے باعث خیالات، نقطہ نگاہ اور تہذیب و تمدن میں بھی اختلاط پیدا ہوا، حالانکہ یہاں اب بھی مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جنگی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اس سارے خطے کا مستقبل ایک ہی ہے، ابھرے یا ڈوبے۔ چونکہ یہ دریائے سندھ کے طاس اور اس کے معاونوں کے درمیان واقع ہے، اس لئے اس کی آئندہ اقتصادی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اسے ایک سالم خطہ قرار دیا جائے تاکہ بہتر سے بہتر نتائج حاصل ہو سکیں۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کو ایک وحدت میں سمو دینا لازمی ہے، اور تمام مصنوعی حد بندیاں کسی قسم کی مخالفت کی پروا کیے بغیر ختم کر دی جائیں۔ کیونکہ یہ حد بندیاں قدرتی نہیں بلکہ سیاست دانوں کی قائم کردہ ہیں۔ اس طرح ایک تو یہ پورا خطہ مناسب طور پر ترقی کر سکے گا، دوسرے شمال یا جنوب سے حملے کی صورت میں دفاع کی پشت پناہ ثابت ہوگا۔ لیکن اس خطے کو ایک وحدت قرار دیتے وقت لوگوں کے تعصبات، ان کے اندیشوں اور ان کی آئندہ متوازن ترقی کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ چنانچہ اس وحدت کو مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر ایک حصہ علیحدہ

نسلی گروہ یا گروہوں کا حامل ہو ، جو مشترکہ معیشت ، مواصلات اور ترقی کے مشترکہ امکانات رکھتے ہوں اور ہر حصے کو زیادہ سے زیادہ انتظامی اختیارات تحویل کر دیے جائیں ۔

(ج) مغربی پاکستان میں ایک یونٹ کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہاں کا سب سے بڑا صوبہ سب کی بھلائی کے لئے فراخ دلی دکھانے اور ایثار کرنے پر آمادہ ہو جائے ۔ مغربی پاکستان میں پنجاب سب سے بڑا اور اہم صوبہ ہے جس کی آبادی پورے مغربی پاکستان کی نصف آبادی سے بھی زیادہ ہے ۔ اگر پنجاب نے اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی پر اصرار کیا ، تو دوسرے صوبے فوراً پیچھے ہٹ جائیں گے ۔ علاوہ ازیں اگر کسی ساجھے داری میں کوئی فریق غالب حیثیت رکھتا ہو تو وہ چل نہیں سکتی ۔ چنانچہ اپنی بقا اور پاکستان کی عظمت کے لئے پنجاب سے درخواست کی جائے کہ وہ اس یونٹ کی مجلس قانون ساز میں چالیس فی صدی نمائندگی منظور کر لے مگر دوسرے صوبوں کی نمائندگی اپنی اپنی آبادی کے تناسب ہی سے ہو ۔ لیکن ایسا ایک یونٹ قائم کرنے سے پہلے موجودہ صوبائی اور مرکزی قانون ساز مجلسوں اور وزارتوں کو توڑ دینا ہوگا تاکہ وہ نئی تنظیم کے اس کام میں نہ تو دخل دے سکیں اور نہ روڑے اٹکا سکیں ۔

مندرجہٴ بالا تنقیحات سے نتائج :

(۱) مشرقی بنگال کو ایک وحدت قرار دیا جائے ، اور ملک کے انتظام میں اس کا زیادہ سے زیادہ ساجھا رکھا جائے ۔

(۲) مغربی پاکستان کو تنظیم نو کے ذریعے ایک وحدت بنایا جائے اور اس کا بھی ویسا ہی ساجھا رکھا جائے ۔

(۳) نئی تنظیم کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے موجودہ وزارتیں اور مجالس قانون ساز توڑ دی جائیں ۔

(۴) ہر ایک وحدت کو سہولت کے لئے تحتی وحدتوں میں تقسیم کر دیا جائے ۔ ہر ایک تحتی وحدت ایک یا ایک سے زیادہ ایسے نسلی گروہوں کی حامل ہو جو مشترکہ معیشت ، مواصلات اور ترقی کے مشترکہ امکانات رکھتے ہوں ۔ ان تحتی یونٹوں کو زیادہ سے زیادہ انتظامی اختیارات دے دیے جائیں ۔

(۵) پنجاب سے کہا جائے کہ وہ وحدت مغربی پاکستان کی مجلس قانون ساز میں چالیس فی صد نمائندگی منظور کر لے تاکہ دوسروں پر حاوی ہونے کا اندیشہ دور ہو جائے۔

(۶) مشرق اور مغربی دونوں وحدتوں کی اپنی اپنی الگ مجلس قانون ساز ہو۔

۴ - مندرجۂ بالا امور پر عمل کرنے سے کسی فریق کے دوسروں پر غالب آنے یا تفریق پیدا کرنے کا اندیشہ نہ رہے گا۔ ہر ایک یونٹ یک جہتی کے ساتھ اور بلا روک ٹوک ترقی کر سکے گا۔ صوبائی عصبیت انتہائی طور پر کم ہو جائے گی۔ صوبائی انتظامیہ کے بہت سے بھاری بھرکم عملے ختم ہو جائیں گے۔ اس سے آدمیوں کی بھی بچت ہوگی اور اخراجات کی بھی۔ مقامی منتظمین کے کاموں میں سیاست دانوں کی دخل اندازی کا خدشہ دور ہو جائے گا۔ غرض اس نئی تنظیم سے ہر طرح فائدے ہی فائدے ہوں گے۔

ہر ایک یونٹ کا انتظامی ڈھانچا:

۵ - پاکستان میں دو صوبائی یونٹ قائم کر دینے کے بعد ہر ایک یونٹ کے لئے انتظامی ڈھانچا تجویز کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے اس بات کو جتا دینا مناسب ہوگا کہ ہمارا مقصد بہر صورت پاکستان میں جمہوریت کا قیام ہونا چاہئے، لیکن ایسی جمہوریت جو عوام کی افتاد طبع کے مطابق ہو۔ ہمارے عوام کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہے اور ہمارے سیاست داں کچھ زیادہ محتاط واقع نہیں ہوئے ہیں۔ عوام بڑے بڑے کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، مگر وہ آسانی سے گمراہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسی جمہوریت جس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، خاص طور پر آج کل جبکہ اشتراکیت ملک کے اندر اور باہر سے جمہوریت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگی رہتی ہے۔ چنانچہ ہمیں ایک منضبط جمہوریت اور اس کے ساتھ روک رکاؤ کا ایک سلسلہ قائم کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجلس قانون ساز کابینہ کو چنے گی، کابینہ کی کارروائیوں پر گورنر قابو رکھے گا، اور گورنر پر ملک کا سربراہ یعنی صدر قابو رکھے گا۔ بعض حالات میں گورنر

کو اختیار ہوگا کہ وہ وزیروں یا وزارتوں کو برطرف کر سکے ۔ اسے یہ حیثیت بھی حاصل ہوگی کہ سروسوں کے حقوق کی نگرانی کرے اوران سے ان کے فرائض کی بجا آوری کا مطالبہ کر سکے ۔

۶ ۔ مجالس قانون ساز کے انتخابات کے سلسلے میں حق رائے دھی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمہ گیر حق رائے دھی کا جو قاعدہ بن چکا ہے ، اس کی خامی کے باوجود اس سے رو گردانی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی بھی نگرانی کی جائے تاکہ یہ غیر ذمہ دارانہ نہ ہو جائے ۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جمہوریت ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے بطور خود مقصد نہیں ہے۔ اور جمہوریت کا ایسا کوئی مستقل ڈھانچا نہیں ہے جو بغیر ترمیم و اصلاح کے ہر ملک میں اپنا لیا جائے ۔ چنانچہ یہ بات قرین مصلحت ہوگی کہ پہلے ہر تحتی یونٹ میں عوام ایک انتخابی ادارہ منتخب کریں ، اور پھر وہ انتخابی ادارہ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبروں کو چنے ۔ انتخاب کے اس طریقے کا انتظام آسانی سے ہو سکے گا ، اور اس سے ذمہ داری کا احساس بڑھے گا ۔

۷ ۔ رہا یہ سوال کہ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبروں کی تعداد کتنی ہو اور یہ مجالس کس ڈھب کی ہوں ، ممکن ہے اس معاملے میں کچھ اختلاف رائے ہو ، لیکن افراد اور اخراجات کی بچت کا تقاضا ہے کہ ہر ایک صوبے کی مجلس قانون ساز کے لئے ڈیڑھ سو سے زیادہ ممبر نہ ہوں ۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے لئے بھی جس کا ذکر بعد میں آئے گا ممبروں کی اتنی ہی تعداد کافی ہوگی ۔

۸ ۔ اب ملکی انتظام کو لیجئے ۔ ہمارا قانونی نظام بڑا پیچیدہ ، مہنگا ، غیر مؤثر ، سست رفتار ، ظالمانہ اور ہمارے عوام کے مزاج کے سخت منافی ہے ۔ ضرورت ہے کہ اس کی از سر نو تنظیم کی جائے ، اور اسے انسان دوست ، زود حرکت اور سستا بنایا جائے ۔ شاید اس کا علاج جرگے اور عدالت کا ملا جلا طریق رائج کرنے سے ہو سکے ۔ گواھی اور عدالتی کارروائیوں کے طریق کی اصلاح کی جائے اور صرف ایک اپیل کا حق دیا جائے ۔ ہر ایک تحتی یونٹ میں اعلیٰ ترین عدالت قائم کی جائے جس میں آئینی مقدموں کو چھوڑ کر دوسرے

مقدمے پیش کئے جائیں - فیڈرل یا صوبائی کورٹ صرف آئینی نوعیت کے مقدموں کا فیصلہ کریں -

مندرجۂ بالا تنقیحات سے نتائج :

(۱) ہر صوبے میں ایک مجلس قانون ساز ہو جس کے تقریباً ڈیڑھ سو ممبر ہوں - ہر ایک صوبے کا ایک گورنر ہو جس کا تقرر صدر کرے - گورنر کو کابینہ اور سروسوں کی نگرانی کا اختیار حاصل ہو -

(۲) ہمہ گیر حق رائے دہی کے طریقے سے انتخابی ادارے چنے جائیں - پھر یہ ادارے صوبائی مجلس قانون ساز اور مرکزی مجلس قانون ساز کے ممبروں کا انتخاب کریں ، نیز یہ ادارے صدر کا انتخاب بھی کریں جس کا ذکر آگے آئے گا -

(۳) قانونی نظام کو آسان بنایا جائے اور اس کے اختیارات ابتدائی یونٹوں کو تفویض کر دیے جائیں - جرگے اور عدالت کے ملے جلے طریق کی آزمائش کی جائے -

(۴) سرکاری ملازموں کی شرائط ملازمت میں ایسی ترمیم کی جائے کہ ان کے انعام یا سزا کے معاملوں کا فیصلہ فوری طور پر کیا جا سکے -

مرکزی ڈھانچا :

۹ - ملک کو دو یونٹوں میں تقسیم کر دینے کے بعد ان کا وفاق بنانا آسان کام ہوگا - یہ وفاق مساویانہ بنیاد پر ہونا چاہئے تاکہ ایک حصے کے دوسرے حصے پر غلبہ پانے کا اندیشہ باقی نہ رہے - یہ وفاق ایک مجلس قانون ساز پر مشتمل ہو جس کے ممبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہو - اس میں نصف ممبر مشرقی پاکستان کے ہوں اور نصف مغربی پاکستان کے اور اس کی ایک کابینہ ہو ، جس کو مجلس قانون ساز کی تجویز کے مطابق صدر کی نگرانی میں منتظمانہ اختیارات حاصل ہوں - صدر بذریعۂ انتخاب چنا جائے - صدر ملک کا سب سے بڑا عہدہ دار ہو جس کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہوں - جب کبھی صوبوں یا مرکز میں حالات قابو سے باہر ہوجائیں تو ان کو درست کرنا صدر ہی کا کام ہو - قوانیں اس وقت تک نافذ نہ ہو سکیں جب تک صدر انھیں منظور نہ کر لے - البتہ ایسے قوانین اس قاعدے سے مستثنیٰ رہیں جن کو مجلس قانون ساز کی تین چوتھائی اکثریت پاس

کر چکی ہو ۔ صدر کی منظوری کے بغیر آئین میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے ۔ اگر صدر اور مجلس قانون ساز میں سخت اختلاف پیدا ہو جائے تو کسی ایک یا دونوں کے تازہ انتخابات کرانے کی شرط رکھی جائے ۔ صدر کے انتخاب اور قوانین کی منظوری کے بارے میں شاید محمد علی والے فارمولے کو منظور کر لینا ضروری ہو ۔

۱۰ - اوپر بیان کردہ وجوہات کی بنا پر صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن محکموں کے اختیارات انہیں پہلے سے حاصل ہیں ان میں مواصلات (بین صوبائی مواصلات کے علاوہ) ، صنعت و حرفت ، تجارت ، صحت وغیرہ کا اور اضافہ کیا جائے ۔ دفاع ، امور خارجہ اور کرنسی مرکزی حکومت کے پاس رہے ۔

۱۱ - اپنے وسائل کو جلد تر ترقی دینا اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جسے پاکستان کو حل کرنا ہے ۔ یہ مؤثر طریق پر جبھی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں مناسب اصلاح کریں تاکہ موزوں آدمی مہیا ہو سکیں ۔ نیز ہمارے پاس اچھی تنظیم اور اچھے سرمائے والے ادارے بھی ہونے چاہئیں تاکہ وہ ترقی کے بڑے بڑے منصوبوں کو ہاتھ میں لے سکیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک صوبے میں پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی طرز کے ترقیاتی ادارے ، تعلیم ، گھریلو صنعت و حرفت ، اراضی ، بجلی وغیرہ بیسیوں اور کاموں کے لئے بھی بنائے جائیں ۔ اس طرح مقامی انتظامیہ کو بہت سی درد سری سے چھٹکارا مل جائے گا اور ملک جلد جلد ترقی کرے گا ۔

۱۲ - تاہم جب تک ہم سائنسی طریق سے زرعی اصلاحات نافذ نہ کریں کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوگا ۔ صرف چند افراد کے بڑی بڑی اراضی کے مالک ہونے کا اب کوئی جواز نہیں رہا ۔ انہیں معاوضہ دے کر یہ زمینیں حاصل کی جائیں ۔ اس سلسلے میں مصریوں کی مثال بہت عمدہ ہے ۔ وہ زمیندار کے پاس ایک مقررہ حد تک زمین رہنے دیتے ہیں ، باقی خرید کر کاشت کاروں میں تقسیم کر دیتے ہیں ، اور کاشت کار اس زمین کی قیمت ستّر (۷۰) سالانہ قسطوں میں ادا کرتے ہیں ۔

۱۳ - پہلے بیان ہو چکا ہے کہ صدر کے ہاتھ میں کل اختیارات دے دینے چاہئیں - صدر اپنے فرائض جبھی ادا کر سکتا ہے کہ سروسیں براہ راست اس کے ماتحت ہوں - اس مقصد کے لئے ایک سپریم کمانڈر کی سربراہی میں جوائنٹ سٹاف کا طریقہ رائج کرنا پڑے گا - اس سپریم کمانڈر کا تقرر صدر کرے - سپریم کمانڈر کو علاوہ اور فرائض انجام دینے کے ڈیفنس ممبر اور از روئے عہدہ کابینہ کا ممبر بھی ہونا چاہئے - اس سے سروسوں میں یک جہتی پیدا ہوگی اور سروسوں کی مشترکہ ضرورتوں کا کفایت کے ساتھ یکجا انتظام ہو سکے گا - نیز اس کی وجہ سے سیاست داں اپنے ذاتی مفاد کے لئے سروسوں کے اندرونی معاملوں میں دخل بھی نہ دے سکیں گے -

۱۴ - پچھلے سات سال کے تجربے سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ مبہم اور فرسودہ نعروں کا استعمال کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے - ہر شخص کہتا رہا کہ ملک میں اسلامی جمہوریت رائج کی جائے، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی اور وہ عام جمہوریت سے کن باتوں میں مختلف ہوگی - شاید اس کی وضاحت ممکن ہی نہ ہو - تو پھر کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ کوئی بھی جمہوریت جس پر قرآن کی روح کے مطابق عمل کیا جائے اسلامی ہو سکتی ہے - ہم اسلامی جمہوریت کا یہ تصور قبول کر لیں تو شاید بہتر ہو اور ہم بہت سی اونچ نیچ سے بچے رہیں -

منصوبے کا خاکہ:

۱۵ - پہلے مغربی پاکستان میں صوبائی وزارتوں اور مجالس قانون ساز کو منسوخ کر دیا جائے اور ایک گورنر کے ماتحت ضروری عملے کے ساتھ ایک صوبہ قائم کر دیا جائے -

۱۶ - مشرق بنگال اور مغربی پاکستان میں تحتی یونٹ قائم کئے جائیں جو کمشنر کے ڈویژن کے مساوی ہوں - ہر ڈویژن میں ایک یا ایک سے زیادہ مشترک نسلی گروہ شامل ہوں جو مشترک زبان، مشترک معیشت اور مواصلات اور ترقی کے مشترک امکانات رکھتے ہوں - ہر ڈویژن کو انتظامی اختیارات تحویل کر دیے جائیں تاکہ ڈویژن کا سربراہ نظم و نسق کا مختار اعلیٰ بن سکے -

۱۷ - قانونی نظام میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یہ سستا اور تیز رفتار بن سکے - ہر ڈویژن میں اعلیٰ ترین عدالت قائم کی جائے جو اپیلیں سننے کا اختیار رکھتی ہو - اس عدالت میں ان مقدموں کو چھوڑ کر جو آئینی قانون کے نکات سے تعلق رکھتے ہوں ، دوسرے تمام مقدمے پیش کئے جائیں - آئینی نوعیت کے مقدموں کے لئے ہر صوبے میں ایک فیڈرل کورٹ یا ھائی کورٹ بنا دینا کافی ہوگا - جرگہ اور عدالت کا ملا جلا طریق وضع کیا جائے - عدالتی کارروائیوں کو آسان بنایا جائے -

۱۸ - ہر صوبے میں تعلیم ، پانی اور بجلی ، زرعی اصلاحات اور ترقی ، گھریلو صنعتوں وغیرہ کے بارے میں ترقیاتی بورڈ قائم کئے جائیں -

۱۹ - تینوں سروسوں کے لئے ایک سپریم کمانڈر کی سربراھی میں ایک جوائنٹ سٹاف قائم کیا جائے - سپریم کمانڈر کے دیگر فرائض کے علاوہ اسے ڈیفنس ممبر اور از روئے عہدہ مرکزی کابینہ کا ممبر بھی بنایا جائے - وہ براہ راست صدر کے ماتحت ہو -

۲۰ - مرکزی حکومت ایک مجلس قانون ساز ، ایک کابینہ اور صدر پر مشتمل ہو - مجلس قانون ساز کے ممبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہو - اس میں نصف مشرق پاکستان کے ہوں اور نصف مغربی پاکستان کے - صدر کو اختیارات کلّی حاصل ہوں تاکہ جب کبھی صوبوں اور مرکز میں حالات قابو سے باھر ہو جائیں تو وہ انتظام اپنے ھاتھ میں لے سکے - ایک صوبے کو دوسرے صوبے پر بے جا غلبہ حاصل کرنے سے روکنے کے لئے صدر کے انتخاب اور مسودۂ قوانین کی منظوری کے بارے میں محمد علی کے فارمولے پر عمل کیا جائے -

۲۱ - مشرق پاکستان کی صوبائی حکومت ایک مجلس قانون ساز پر مشتمل ہو ، جس کے تقریباً ڈیڑھ سو ممبر ہوں - اس کی سربراہ کابینہ ہو - صوبے کا ایک گورنر ہو ، جس کا تقرر صدر کرے - گورنر کو کابینہ اور سروسوں پر کسی حد تک اختیار حاصل ہو - اسی قسم کا انتظام مغربی پاکستان میں بھی کیا جائے ، مگر اس فرق کے ساتھ کہ پنجاب کو مجلس قانون ساز میں چالیس فی صد نمائندگی دی جائے اور باقی کی نشستیں دوسرے صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کر دی جائیں -

۲۲ - صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختار بنایا جائے - مرکز کے پاس صرف دفاع ، امور خارجہ ، کرنسی اور صوبوں کے درمیان مواصلات کے محکمے رہیں -

۲۳ - سرکاری ملازموں کے قواعد ملازمت میں ایسی ترمیم کی جائے کہ ان کے انعام یا سزا دینے کے معاملوں کا فوری طور پر فیصلہ کیا جا سکے -

۲۴ - انتخاب بالغ رائے دھندگان کے ذریعے ہو ، رائے دھندگان ہر ڈویژن میں انتخابی ادارے منتخب کریں ، اور پھر یہ انتخابی ادارے صدر اور مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز کے ممبر چنیں -

۲۵ - آخر میں دعا کی جائے کہ اس آئین پر قرآن کی روح کے مطابق عمل کیا جاسکے - اگر ایسا ہوا تو ہماری یک جہتی اور طاقت مسلّم اور ہمارا مستقبل شاندار ہوگا -

(۲)

جب گورنر جنرل غلام محمد نے مجھے ملک کا انتظام سنبھالنے کی پیش کش کی تھی اور میں نے منظور نہ کیا تھا ، اس کے کچھ ہی دن بعد انھوں نے مجھ سے کہا : ''اچھا تو تمھیں ایک کام ضرور کرنا چاہئے - تم کابینہ میں شامل ہو جاؤ -'' چنانچہ میں کابینہ میں شامل ہو گیا - میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گورنر جنرل اور اپنے کابینہ کے رفقا سے کہا کہ ہمیں تعمیری کام کرنا ہے - انھوں نے پوچھا : ''کیسا تعمیری کام؟'' میں نے سنہ ۱۹۵۴ء کی دستاویز پیش کردی - میں نے کہا : ''یہ ہے میرا پروگرام ، ہمیں اسی پر عمل کرنا ہے - ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ مغربی پاکستان کو متحد کیا جائے -''

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ''ون یونٹ'' کا خیال میرے ہی فکر کا نتیجہ تھا - بے شک دوسرے لوگ بھی اس کا چرچا کرتے رہے تھے - البتہ اس کو بروئے کار لانے میں میری کوششوں کو بھی دخل تھا - جب میں کابینہ میں شامل ہوا تو میرے سامنے دو واضح مقصد تھے اول یہ کہ مسلح افواج کو سیاست دانوں کی دخل اندازی سے محفوظ رکھا جائے ، اور دوسرا یہ کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ملا کر ایک یونٹ بنا دیا جائے - میں نے اس مقصد کے لئے بڑی جد و جہد

کی اور صوبوں کو ایک وحدت میں مدغم کرنے کی ابتدا کرا دی ۔

مجھے اپنا ذاتی تجربہ بخوبی یاد ہے جس سے مغربی پاکستان کو ایک صوبے میں سمو دینے کی ضرورت کا مجھے شدت سے احساس ہوا تھا ۔ ہم واہ آرڈننس فیکٹری میں کچھ مصنوعات کی مشینیں لگانا چاہتے تھے ۔ جب میں معائینے کے لئے وہاں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ مشینیں تو سب لگ چکی ہیں مگر کام بند پڑا ہے ۔ وجہ یہ تھی کہ مالا کنڈ کے پن بجلی گھر کی بجلی دریائے سندھ کے اس پار نہیں آ سکتی تھی ۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی ۔ معلوم ہوا بجلی اس وجہ سے نہ آ سکتی تھی کہ شمال مغربی صوبۂ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ اچھے نہ تھے ۔ یہ صورت حال بڑی مضحکہ خیز تھی اور حد درجہ پریشان کن بھی ۔ سارے ملک میں کسی شخص کے پاس یہ اختیار نظر نہ آتا تھا کہ وہ سب صوبوں پر قابو رکھ سکے یا ان کے کام میں تال میل پیدا کر سکے ۔

ہمارے سیاسی نظام میں بنیادی کمزوری یہ تھی کہ اختیار کا مرکز کہیں تھا ہی نہیں ۔ ہم نے غیر ملکی پارلیمانی نظام حکومت کو اپنا تو لیا تھا مگر نہ تو اس کے تقاضوں کو سمجھ سکے تھے اور نہ ہمارے ہاں ایسے حالات تھے کہ ان میں یہ نظام پنپ سکتا ۔ پاکستان کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے پارلیمانی نظام کی کوتاہیاں صرف مجھی کو دکھائی نہ دی تھیں بلکہ اور لوگوں نے بھی انہیں محسوس کیا تھا ، جن میں پروفیسر رش بروک ولیمز بھی شامل ہیں ۔ جس زمانے میں قائداعظم دھلی میں ہندوستانی مجلس قانون ساز کے ممبر تھے ، تو ان میں اور پروفیسر رش بروک ولیمز میں بڑا ربط تھا ۔ پروفیسر صاحب کا بیان ہے کہ قائداعظم اکثر ان سے کہا کرتے :
”یہ پارلیمانی نظام ہمارے لئے ٹھیک نہیں ۔ لیکن ہمیں اس کی پیروی کرنی ہوگی تاکہ برطانیہ کو شکست دی جا سکے اور تم لوگوں کو اس ملک سے نکالا جا سکے ۔ یہی دلیل ہے جو تمھاری سمجھ میں آ سکتی ہے ۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظام ہمارے ہاں ہمیشہ کام نہ دے سکے گا ۔“

اس مختصر سے زمانے میں جب قائداعظم پاکستان کے گورنر جنرل تھے ، ہمارے ہاں فی الحقیقت ایک طرح کی صدارتی حکومت قائم تھی - قائد اعظم گورنر جنرل تھے اور ساتھ ہی مجلس آئین ساز کے صدر بھی - اس زمانے میں کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت وزیر اعظم نہیں بلکہ گورنر جنرل کیا کرتے تھے - یہ تجویز خود کابینہ ہی نے پیش کی تھی - شروع شروع میں قائد اعظم کو کچھ تامل ہوا تھا کیونکہ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی - مگر پھر انھوں نے غور کر کے کہا کہ میں ان اجلاسوں میں شرکت کیا کروں گا اور کابینہ سے مشورہ بھی کروں گا - مگر اس کو ماننے یا نہ ماننے کا مجھے اختیار ہوگا -

مجھے آغا خان مرحوم سے اپنی ایک دل چسپ ملاقات اب تک یاد ہے ، جو لیاقت علی خان کے قتل کے کچھ ہی دن بعد ہوئی تھی - میں جب کبھی کسی کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان جاتا تھا تو آغا خان مجھے خط لکھا کرتے تھے - اس موقع پر میں نیس گیا اور یاکی مور میں جو سمندر کے کنارے ایک پرفضا مقام ہے ان کے ہاں مہمان ٹھہرا - آغا خاں کو ان دنوں دل کا مرض تھا - وہ ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے - انھیں واقعات عالم پر بڑا عبور حاصل تھا - میں ان کی معلومات اور دوراندیشی سے بڑا متاثر تھا - مجھے ان سے بارہا گفتگو کرنے کا موقع ملا - میں یہاں کچھ باتیں یاد کر کے لکھتا ہوں -

میں نے ان سے کہا : ''جناب والا! اگر آپ کی عمر ذرا کم ہوتی تو آپ ہمارے لئے بڑے مفید ثابت ہوتے-،،

انھوں نے جواب دیا : ''کاش ایسا ہی ہوتا - پاکستان میرا ایک خواب تھا اور اب جبکہ یہ خواب حقیقت بن گیا ہے تو مجھے حسرت آتی ہے کہ اس کی کچھ خدمت کرتا-،، آگے چل کر انھوں نے کہا : ''آپ لوگوں نے بڑی قربانیوں کے بعد پاکستان حاصل کیا ہے - آپ ہرگز اسے گنوانا نہ چاہیں گے - لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے پارلیمانی نظام اختیار کیا تو اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے - دراصل میں نے یہی بتانے کے لئے تمھیں یہاں بلوایا ہے - اور تنہا تم ہی وہ شخص ہو جو پاکستان کو بچا سکتے ہو-،،

میں نے پوچھا: ''آپ کے خیال میں میں کس طرح بچا سکتا ہوں؟''
وہ بولے: ''اس نظام کو بدل دو - کوئی ایسا نظام سوچو جو تمھاری تاریخ، تمھاری روایات اور تمھارے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہو - اور یہ کام حقیقت میں تم ہی کر سکتے ہو-''

میں نے کہا: ''دیکھئے آغا'' — میں ایک عرصے کی ملاقات کے بعد انھیں ''آغا'' کہنے لگا تھا— ''میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں پاکستان کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھنے کی آرزو تڑپ رہی ہے، لیکن ذرا صبر کیجئے حالات ضرور سدھر جائیں گے-''

انھوں نے جواب دیا: ''نہیں تم ابھی نادان ہو- تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے - حالات یوں نہیں سدھرا کرتے-''

اس کے بعد ایک دن آغا خان نے قائد اعظم سے اپنے مراسم کا ذکر شروع کیا - انھوں نے کہا: ''ان میں اور مجھ میں ہمیشہ اختلاف رائے رہتا تھا، لیکن میں فی الحقیقت انھیں ایک عظیم انسان سمجھتا تھا - میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ انسان کو زندگی میں دو ایک ہی بار ایسے موقعے ملتے ہیں جب اسے کوئی بڑا فیصلہ کرنا پڑتا ہے - قائد اعظم کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان حاصل کرنا چاہئے یا نہیں - اور قائداعظم نے کہا: ''انھیں پاکستان کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے-'' انھوں نے ٹھیک وقت پر ٹھیک فیصلہ کیا - تم قائداعظم کی وسعت نظر دیکھ سکتے ہو- وہ سچ مچ ایک عظیم انسان تھے - زبردست عزم اور ارادے کے انسان! وہ جب کبھی کوئی بات دل میں ٹھان لیتے تو دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے وہ اسے کر گزرتے - کاش وہ زندہ رہتے!''

میری دلی تمنا بھی یہی تھی - اگر قدرت قائداعظم کو زندہ رکھتی تو وہ اپنی شخصیت اور اپنے اقتدار کی بدولت کوئی قابل عمل آئین بنا لیتے - عوام ان کی ہر بات کو بسر و چشم قبول کر لیتے - وہ ان کے مانے ہوئے رہنما تھے - اور عوام اب بھی ان کے پرستار ہیں - اگر وہ ملک کے لئے کوئی آئین بنا جاتے تو معاملات شاید مناسب موقع پر سلجھ جاتے اور ملک میں وہ تفرقے جو بعد میں پڑے شاید قوم ان سے محفوظ رہتی-

سنہ ۱۹۵۸ء میں جب میں نے ملک کا انتظام اپنے ھاتھ میں لیا تو لوگوں کی کیفیت مزاج بدل چکی تھی - شروع شروع میں ان کے دل میں جو ولولہ اور جوش تھا ، اس کی جگہ کاھلی اور بے ھمتی نے لے لی تھی - ابتدائی دنوں کی تنومند آرزوئیں خواب و خیال معلوم ہونے لگی تھیں - بہت سے چھپے ہوئے تنازعات اور اختلافات آبھر آئے تھے ، قومی یگانگت کے شجر کو صوبائی عصبیت اور تنگ نظری کا گھن لگ چکا تھا ، علاقائی تعصب اور تفرقے زوروں پر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری قوم اپنے آپ سے بر سر پیکار ہو -

ہم پاکستانی نسل اور وضع کے اعتبار سے ایک مخلوط قوم ہیں ، شہری زندگی میں ہم الگ الگ نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں ، اس لئے ہم میں آسانی سے یک جہتی پیدا نہیں ہوتی ، لیکن جب فوجی ضبط و نظم کے تحت ہماری تربیت ہوتی ہے تو ہم اعلیٰ درجے کے سپاہی بن جاتے ہیں - اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ہر نوخیز لیڈر کو اپنی الگ تھلگ جماعت بنانے کی سوجھتی ہے - ہم آسانی سے جذباتی بن جاتے ہیں اور حالات کو ہمیشہ حقیقت پسندانہ نظر سے نہیں دیکھتے - چنانچہ کوئی بھی لیڈر جو لچھے دار تقریر کر سکتا ہے ہمارے جذبات سے کھیلنے اور ہمیں گمراہ کرنے کی ترغیب سے خود کو بچا نہیں سکتا - ہم اپنے سوا ہر ایک پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور چونکہ قابل اور تجربہ کار لوگوں کی سخت کمی ہے اس لئے عہدوں کے لئے آپا دھاپی مچی رہتی ہے - یہ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ آزادی کے ابتدائی چند ہی برس کے بعد ملک نے خود کو مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا پایا - تاہم مجھے یقین تھا کہ ہمارے عوام دل و جان سے ملک کی ترقی کے خواہاں ہیں ، وہ محنتی اور جفا کش ہیں اور ہنسی خوشی مصیبتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں - وہ ضرورت پڑنے پر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے ، مصیبت کے وقت ہمت نہیں ہارتے - انہیں ایک ایسا دین عطا ہوا ہے جو اتحاد اور اخوت کا سبق پڑھاتا ہے اور ان کے دلوں میں انصاف اور نوع بشری کی بھلائی کے جذبے کو آبھارتا رہتا ہے -

میں نے ضرورت محسوس کی کہ ایسی راہیں پیدا کی جائیں جو پاکستان کے عوام کو اپنے مادی ، اخلاق و ذہنی وسائل اور صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترق دینے کے قابل بنا سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پہلی ضروری بات یہ تھی کہ قومی مسائل کی جانچ پڑتال حقیقت پسندانہ انداز سے کی جائے ۔ مجھے اطمینان نہیں تھا کہ ہم حقیقی معنوں میں ایک قوم بن گئے ہیں، کیونکہ جدھر دیکھو نااتفاق اور انتشار ہی نظر آتا ۔ ہم دو نصف نصف حصوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ہر نصف حصے کا لسانی اور تہذیبی خاکہ جداگانہ تھا ۔ ان دونوں کے درمیان جغرافیائی فاصلہ بجائے خود تفریق کا باعث بنا ہوا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کئے جا سکتے تھے ۔ ہمیں ایک گہرا افتراق اور بھی ورثے میں ملا تھا ، جو دیہاتی اور شہری طبقوں کے درمیان پایا جاتا تھا ۔ ہرچند ملک کی کل آبادی میں شہر کے بسنے والوں کی تعداد بڑی تھوڑی تھی ، مگر یہ اقلیت بڑی مؤثر آواز رکھتی تھی اور دیہات کے لوگوں میں یہ احساس پایا جاتا کہ مہذب شہری لوگ ان پر چھائے ہوئے ہیں اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔

علاوہ ازیں علاقائی امتیازات تھے جو اکثر قومیت کے جذبے پر غالب رہتے تھے ۔ مختلف علاقے قومی وسائل پر نت نئے حق جتاتے اور چونکہ ملک میں سرمائے کی کمی تھی اس لئے کوئی علاقہ بھی منہ مانگی مراد نہ پا سکتا تھا ۔

مگر جس چیز نے سب سے زیادہ لوگوں میں تفرقہ پیدا کو رکھا تھا وہ ایک طرف سائنس اور استدلال اور دوسری طرف کٹر عقائد پرستی اور رجعت پسندی کی قوتوں کی باہمی آویزش تھی ۔ حکومت اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کر دی گئی اور تمام پرانے تنازعات یعنی دین بمقابلۂ دنیا اور مذہب بمقابلۂ لادینی ازسرنو اٹھ کھڑے ہوئے ۔ صحیح معنوں میں کش مکش علما اور تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان تھی ۔ ہر مادی ، دنیاوی اور غیر مذہبی چیز کا ناتا تعلیم یافتہ طبقے سے جوڑا جاتا تھا ، اور ہر وہ چیز جو دینی اور روحانی

تھی علما کی میراث بن گئی تھی ۔ تعلیم یافتہ طبقوں کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ انھیں مغربی خیالات اور مغربی اثرات نے گمراہ کر دیا ہے ۔ علما جن میں سے بعض عربی سے بہرہ مند ہوتے تھے اور جنھوں نے مذہبی مسائل کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا ، اسلام کے محافظ سمجھے جاتے تھے ۔ ان علما میں بہت سے ایسے بھی تھے جو اپنے اس اثر کو جو وہ عوام کے دلوں پر رکھتے تھے ، سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے ۔ انھوں نے رفتہ رفتہ معاشرے کے مغربی تعلیم یافتہ گروہوں کے خلاف ایک زبردست سیاسی محاذ قائم کر لیا تھا ۔ ان دونوں طبقوں کی یہ کش مکش بہت پرانی ہے جس کا مختصر طور پر ذکر میں آگے چل کر کروں گا ۔ مجھے جس بات سے تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ جب ان دونوں طبقوں میں اصولی طور پر پورا پورا اتفاق پایا جاتا ہے ، تو پھر اس شدید اختلاف کی کیا وجہ ہے ۔ دونوں گروہ اسلام کے والہ و شیدا ہیں اور دونوں پاکستان کو ایک مضبوط اور پرُ شکوہ قوم بنانے کے آرزومند ہیں ، اس کے باوجود وہ مثبت اور متفقہ انداز میں قومی مسائل کے حل نہ ڈھونڈ سکے ۔ اس کے برخلاف تعلیم یافتہ طبقہ علما کو آثار قدیمہ تصور کرتا رہا ، اور علما تعلیم یافتہ طبقے کو بے دین اور حقیر گردانتے رہے ۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہ اختلافات کیونکر مٹائے جا سکتے ہیں ۔ اسلام زندگی کو ایک وحدت تصور کرتا ہے اور اسلامی ضابطہ ایک مکمل تہذیبی نظام ہے ۔ زندگی مذہب اور مادیت کے جدا جدا خانوں میں کیونکر تقسیم کی جا سکتی ہے ، جن میں سے ہر خانہ ایک جداگانہ قانون کا تابع ہو؟ اسلام میں تمام انسانی اعمال ایک ہی اصول کے تابع ہیں ۔ زندگی ایک ہے اور وہ قوانین بھی ایک ہی ہیں جن کی زندگی پر عمل داری ہے ۔ انسان گھر پر ہو یا باہر ، کام دھندے میں مصروف ہو یا عبادت میں مشغول ، اس کا رہبر ایک ہی ضابطۂ اخلاق ہے ۔ جو اصول ہم اپنے خاندانی معاملات میں برتتے ہیں ، انھی پر ہم دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات میں کاربند ہوتے ہیں ۔ روحانی ضوابط روزمرہ زندگی کے ضوابط سے مختلف نہیں ۔ انسان کلّی حیثیت سے جانچا

جاتا ہے اور اس کے اعمال کا محاسبہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کیا جاتا ہے۔
یہ سب سچ تھا مگر مجھے اپنے معاشرے کی جو تصویر نظر آئی وہ اس سے کہیں مختلف تھی۔ عملی طور پر ہماری زندگی دو مخصوص دائروں میں بٹی ہوئی تھی، اور ہر ایک دائرے میں ہم مختلف اصول و قواعد کی پابندی کر رہے تھے۔ ہم اس دلدل سے کیونکر نکلیں اور زندگی کی بابت ایک جامع نظریے کو کیونکر اپنائیں، یہی سارا مسئلہ تھا۔ اگر ہم اس کوشش میں ناکام رہتے تو ہماری ترقی رک جاتی، ہم پس ماندہ رہ جاتے اور پس ماندگی کا مطلب تھا غلامی۔ یہ ہماری آزمائی ہوئی بات تھی۔ دوسروں نے ترقی کی جستجو میں مذہب کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ہم نے ایک ایسے دین کا دامن تھام رکھا تھا جو ہماری ترقی کا وسیلہ بن سکتا تھا، لیکن توہم اور کوری رسم پرستی نے ہمیں تقدیر پرست بنا دیا تھا۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی تھی۔ مسلم معاشرہ اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا، جب تک کہ اسلام کو ان تمام مانع ترقی اور بیگانہ اثرات سے پاک نہ کر دیا جائے جنھوں نے اس کی اصل صورت کو مسخ کر رکھا تھا۔
مجھے اس امر کی بڑی تشویش تھی اور مندرجۂ ذیل نوٹ میں نے اسی کے بارے میں ۱۲-اپریل سنہ ۱۹۵۹ء کو لکھا تھا:-
جب سے میں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ہے، مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ لوگوں کو کس طرح متحد کیا جائے اور ملک کے اندرونی و بیرونی مسائل کیونکر حل کئے جائیں۔ آج ہم جن مسائل سے دوچار ہیں وہ بڑے زبردست ہیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہم انھیں اگر کلّی طور پر نہیں تو جزوی طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ البتہ لوگوں کو متحد کرنے کا مسئلہ ایمانی و روحانی دائرے سے تعلق رکھتا ہے جس کا میں ابھی تک کوئی حل تلاش نہیں کر سکا۔ لیکن اس کا جلد سے جلد کوئی حل تلاش کرنا ازحد ضروری ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں دوسری طاقتیں ہم پر غلبہ نہ پا لیں اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمارا وجود باقی نہ رہے۔ بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ ہم

پاکستان ھی کو گنوا بیٹھیں۔ یہ صورت کسی حالت میں بھی پیدا نہ ہونے دینی چاہئے - یہی وجہ ھے کہ ھمیں ایک جامع اور واضح حل تلاش کرنے کی اشد ضرورت ھے۔ ایک ایسا حل جو قابل فہم، ٹھوس اور واضح ھو اور لوگوں کے دلوں میں خود بخود ایک پائیدار ولولہ پیدا کر دے، اور جو نئی زندگی کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے - میرے احساسات یہ ھیں:

انسان بہ حیثیت حیوان بقائے حیات اور افزائش نسل کی بنیادی جبلتوں کے تابع ھے۔ لیکن چونکہ اسے سوچنے اور سمجھنے کی قوت عطا ہوئی ھے اس لئے اس کو اپنی جبلتوں پر قابو بھی حاصل ھے - اس کی بڑی سے بڑی خواھش یہ ھے کہ اس کا کوئی نظریۂ حیات ھو، جس کے لئے وہ اپنی جان قربان کر ڈالے - اس کا مطلب یہ ھے کہ جس قدر ارفع و اعلیٰ نظریۂ حیات ھوگا، افراد اور معاشرے کا کردار بھی اتنا ھی بلند ھوگا - لوگوں کی زندگی زیادہ بھرپور اور زیادہ تخلیقی ھوگی اور ان میں یک جہتی اور مدافعت کی زبردست قوت ھوگی - ایسا معاشرہ مڑ تو سکتا ھے مگر ٹوٹ نہیں سکتا -

ھمیں ایک ایسا ھی نظریۂ حیات حاصل ھے اور وہ اسلام ھے - اسی بنیاد پر ھم نے پاکستان کے لئے جد و جہد کی، اور اسے حاصل کیا - لیکن پاکستان کے حصول کے بعد ھم اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھال نہیں سکے - اس کی بڑی وجہ یہ ھے کہ ھم اپنے اس نظریۂ حیات کو سادہ اور قابل فہم شکل میں پیش نہ کر سکے - اس کے ساتھ ھی ھم اپنی لاعلمی کے باعث اسلامی نظریۂ حیات کو تعصب اور ملائیت کے ھم معنی تصور کرنے لگے اور ھمیں درپردہ اس سے حجاب آنے لگا - لیکن اب وقت آگیا ھے کہ اس کیفیت سے نجات حاصل کر لیں، جرأت اور صفائی کے ساتھ مسئلے سے دوچار ھوا جائے - سادہ اور زمانۂ حال کے لئے قابل فہم اصطلاحات میں اس نظریۂ حیات کی صراحت کی جائے اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اس سے ایک ضابطۂ حیات کے طور پر ھدایت حاصل کر سکیں -

اسلام کے نظریۂ حیات کی وضاحت کے لئے نیز زمانۂ حال کے کوائف بالخصوص پاکستان کے کوائف پر اس کا اطلاق کرنے کے لئے

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے مختصر نکات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے:۔

(الف) توحید الٰہی: انسان میں فکر و عمل کے ذریعے خدائی محبت کے اظہار کا جذبہ۔

(ب) سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں، لہٰذا انسان کی اس بنیادی مساوات کو بلا امتیاز رنگ و نسل و ملک تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(ج) یہ صحیح ہے کہ ایسے معاشرے میں علاقائی وطنیت کی کوئی جگہ نہیں تاہم ایک خاص علاقے کے رہنے والے اس کی حفاظت، سلامتی اور ترقی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جہاں سے ہم روزی حاصل کرتے ہیں اس سے وابستگی لازمی ہے۔

(د) اگر مذہب کے لازمی اجزا یہی ہیں تو مذہب کو دنیوی اور دینی دونوں معاملوں میں دخل ہوگا۔ تشریح کی جائے کہ کس طرح۔

(ہ) یہ دنیا اس لئے بنائی گئی ہے کہ ہم اس میں تعمیری طور پر اور سودمندی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ اس لئے نہیں کہ اس سے حذر کیا جائے۔ لہذا اپنی تخلیقی قوتوں کی نشوونما کے لئے علوم جدیدہ کی تعلیم ہماری لازمی ضرورت ہے۔

(و) ریاست اور فرد کے فرائض کی وضاحت کی جائے۔ مومن کی تعریف بیان کی جائے۔

(ز) فرد کے بنیادی حقوق بیان کئے جائیں، جو فرد اور ریاست دونوں کے لئے فائدہ مند ہیں۔

(ح) موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس فلسفے سے روشناس کرانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟

(ط) اس امر کے پیش نظر کہ پاکستان کے لوگ بہت سی نسلوں کا مجموعہ ہیں، جن کا پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہے، انھیں ایک وحدت میں کس طرح سمویا جائے کہ یہ ایک بھی ہو جائیں اور ان کا علاقائی افتخار، ان

کی تہذیب اور ان کی روایات برقرار رہیں ؟
ضرورت اس بات کی ہے کہ مندرجۂ بالا امور کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔
اس کام کا ذمہ کون لیتا؟ مجھے تو اس کی ہمت نہ پڑ سکتی تھی؛ کیونکہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس تھا ۔ میں تو صرف معاشرے میں یک جہتی اور توازن کی ضرورت ہی پر زور دے سکتا تھا ۔ ہمارے لئے لازمی تھا کہ تقاضائے ایمان اور تقاضائے وقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں ۔ کوئی قوم محض اپنی عظمت رفتہ کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔
ہر شخص متفق تھا کہ ملک کا آئین جمہوری ہونا چاہئے ، ایک ایسا آئین جس کی مدد سے قوم اسلام کے لازمی اُصول و ضوابط کے مطابق اپنی تنظیم کر سکے اور وقت کے ساتھ ساتھ نشو و نما پا سکے ۔ سوال یہ تھا کہ آئین کے جمہوری لوازم کا فیصلہ اور اسلام کے ضروری اُصول و ضوابط کی تشریح کس کو کرنی چاہئے ۔ اس کے دو طریقے ہو سکتے تھے ۔ ایک تو یہ کہ ہم علما کی مدد سے یا اس کے بغیر ہی ان اُصول و ضوابط کا تعین کر دیتے اور پھر انہیں حکماً نافذ کر دیتے۔ دوسرا یہ کہ قوم کو مخصوص اداروں کی مدد سے جو مشاورتی حیثیت رکھتے ہوں ان اُصول و ضوابط کا فیصلہ خود کرنے دیا جائے ۔ میں نے دوسرا طریقہ پسند کیا ۔ بعد ازاں آئینی کمیشن نے سفارش کی کہ ہمیں ایک بین الاقوامی اسلامی کمیشن مقرر کرنا چاہئے ، جو مشورہ دے کہ ہمارے قوانین کو کس طرح کتاب و سنت کے احکام کے مطابق بنایا جا سکتا ہے ۔ مجھے اس قسم کے کمیشن کی افادیت کے بارے میں شبہ تھا ۔ میں نے اس زمانے میں بعض اسلامی ملکوں کے سربراہوں سے اس کا ذکر کیا ، مگر انہوں نے کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا ۔ ظاہر تھا کہ ہمیں اپنے معاملات سے خود ہی نبٹنا اور اپنے مسائل کو خود ہی حل کرنا ہوگا ۔ غور و فکر کی ذمہ داری خود قوم پر ہونی ضروری تھی ۔
ملک کے آئین کو اسلامی حیثیت دینے کے بارے میں میں نے جو

لازمی فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ ان آصول و ضوابط کے تعین کی ذمہ داری، جن کے تحت قومی معاملات کو منظم کرنا اور سرانجام دینا ہوگا، قوم ھی کو سونپ دینی چاھئے - آئین ایک ایسا ڈھانچا مہیا کرے، جس کی بنیاد اسلامی تاریخ اور تجربے پر ھو اور جو قوم کے خیالات، مزاج اور روایات سے مطابقت رکھتا ھو - لیکن اس ڈھانچے کی حدود میں رہ کر قوم کو پوری آزادی ھو کہ وہ اپنے لئے کتاب و سنت سے آصول اور ضابطے اخذ کر سکے، اور موجودہ حالات میں ان اصول و ضوابط کو برتنے کے طریقے خود سوچے - آصول جمہوریت اور آصول اسلام میں ھم آھنگی پیدا کرنے کی یہی ایک صورت تھی -

یہاں یہ سوال پیدا ھوا کہ قوم اسلام کے آصول و ضوابط کی تفہیم و تشریح کیونکر کرے - اس کا کوئی گھڑا گھڑایا جواب موجود نہ تھا - اسلامی آئین کی کوئی نظیر موجود نہ تھی - قرآن حکیم میں رشد و ھدایت کے احکامات تو ھیں مگر کوئی مفصل آئین نہیں، جس کے مطابق ملک کا انتظام چلایا جا سکے - آنحضرت صلعم کے اسلامی ریاست بنانے کی مثال البتہ موجود ھے - آنحضرت صلعم کے بعد خلفائے راشدین نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اسلامی آصول و ضوابط کو کام میں لا کر حکومت کا کاروبار چلایا - ان میں سے ھر ایک خلیفہ نے اپنے اپنے حالات اور وقت کے مطابق اسلام کے آصول اور آنحضرت صلعم کی تعلیمات کا اطلاق کیا لیکن حکومت کا کوئی خاص سانچا یہاں تک کہ حکومت کے سربراہ کے انتخاب تک کا کوئی قاعدہ مقرر نہ ھو سکا - اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ اسلام نے انتظام حکومت کا کوئی معیّن خاکہ وضع نہیں کیا، بلکہ یہ کام ملّت پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے حالات کے مطابق خود حکومت کا خاکہ بنائے بشرطیکہ کتاب و سنت کے آصول و ضوابط پیش نظر رکھے جائیں -

زمانۂ حال میں متعدد اسلامی ملکوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق آئین وضع کئے، لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ آئین اسلامی ھیں جنھیں تمام اسلامی ملک اپنا سکتے ھیں - مجھ پر یہ بات واضح تھی کہ پاکستان کو اسلام کے آصول و ضوابط کا اپنے حالات کے مطابق اطلاق کرنا ھی ھوگا - نیز یہ بات بھی کہ یہ کام مسلمہ جمہوری

آصول کی حدود میں ہونا چاہئے ، جن میں سے ایک نہایت اہم آصول ملکی معاملات میں عوام کی شرکت ہے - ملک کے کاروبار کے چلانے میں مجموعی حیثیت سے عوام کے حق کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں تخفیف ہو سکتی ہے - کسی شخص یا گروہ کو خواہ وہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو ، یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پوری قوم کی مرضی کے خلاف کوئی فتویٰ دے جس کا اظہار قوم نے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے کیا ہو - اس سے مقنّنہ کی برتری مسلم ہو جاتی ہے جو قوم کی جانب سے اور قوم کے لئے عمل پیرا ہو - اور یہ امر بھی مسلم ہو جاتا ہے کہ قوم کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمائندوں اور ارکان حکومت کو چننے کی آزادی ہونی چاہئے - اس بات کے اطمینان کے لئے کہ عاملہ اور منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے آصول کے مطابق انجام دے رہی ہیں، ایک آزاد عدلیہ کا وجود لازم آتا ہے - ظاہر ہے کہ انتظامات کے اس تمام منصوبے میں علمائے دین کی کسی جماعت اعلیٰ کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی جو مقنّنہ اور عدلیہ پر ویٹو کی طاقت استعمال کرے -

ان امور میں میں نے ''اجماع،، کے مسئلے سے استفادہ کیا ہے جو اسلام کا خاص آصول ہے - ایک مدرسۂ فکر کے قول کے مطابق اجماع کا مطلب، ایسے معاملوں میں جن میں رائے زنی یا فیصلے کی ضرورت ہو ، مجتہدین کا اتفاق رائے ہے - مجتہدین وہ اشخاص ہیں جنہیں اپنے اسلامی علم کے باعث صاحب الرائے ہونے کا حق پہنچتا ہے - دوسرا مدرسۂ فکر اجماع سے تمام مسلمانوں کی کثرت رائے مراد لیتا ہے - ایک اور نظریہ یہ ہے کہ زمانۂ جدید میں اجماع کا مطلب مقنّنہ کی رائے سے ہے، کیونکہ اس جماعت میں قوم کے انتخاب کردہ نمائندے شامل ہوتے ہیں - نیز یہ کہ ایسے معاملات میں جو قوم کی زندگی پر اثر انداز ہوں آزاد فیصلے کا حق مقنّنہ کو پہنچتا ہے، عالموں کی کسی جماعت کو نہیں - میں اس مسئلے پر قبل از وقت کوئی حکم لگانا نہیں چاہتا تھا ، چنانچہ میں نے جو آئینی انتظامات کئے ان میں یہ بات قوم کے نمائندوں ہی پر چھوڑ دی گئی کہ وہ کتاب و سنت سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اپنی رائے کس طرح قائم کریں گے - میں نے ضروری سمجھا کہ

مقننہ کے مشورے کے لئے ایک اسلامی مشاورتی کونسل بنائی جائے جس کی پشت پر تحقیقات اسلامی کا ادارہ ہو ، جو مقننہ کو اسلامی نظریوں کی بنیاد پر قوانین وضع کرنے میں مدد دے سکے ۔ اس کونسل میں صرف عالمان دین ہی کو شامل نہیں کیا گیا ، بلکہ ایسے اشخاص کو بھی جو ملک کے اقتصادی ، سیاسی ، قانونی اور انتظامی مسائل کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں ، تاکہ اسلام کے مطالبوں اور وقت اور حالات کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے ۔

میں جانتا تھا کہ علما اس انتظام سے مطمئن نہ ہوں گے ، وہ اسلامی امور کی تشریح کرنے اور فیصلے دینے کا حق بلا شرکت غیرے خود رکھنا چاہتے تھے ۔ وہ اس حق کے دعویدار تو تھے لیکن وہ کوئی تفصیلی آئینی دستاویز مرتب کرنے سے گریز کرتے تھے ، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تو ان کے اندرونی اختلافات منظر عام پر آجائیں گے ۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو بس اسلامی آئین اختیار کرنے پر رضامند ہو جانا چاہئے اور اس امر کا فیصلہ علما پر چھوڑ دینا چاہئے کہ کونسا قاعدہ قانون اسلامی ہے کونسا نہیں۔ میں یہاں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سیاسی زندگی میں علما کا کردار کیا رہا ہے۔

بر صغیر ہند و پاکستان میں علما کا ماجرا یہ رہا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ طبقوں سے برابر الجھتے رہے ہیں۔ یہ تنازعہ حصول پاکستان کی جد و جہد کے زمانے میں فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گیا ۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ متعدد علما کھلے بندوں قائداعظم کی مخالفت اور نظریہٗ پاکستان تحقیر کرتے تھے ۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ جو علما قیام پاکستان کے مخالف تھے وہ سب کے سب ضمیر فروش تھے ۔ ان میں جوہر قابل بھی تھے اور صاحب یقین بھی ۔ مگر ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو سمجھتے تھے کہ اگر پاکستان وجود میں آ گیا تو انہیں اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے ۔ ان میں جو بہترین لوگ تھے وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد عمل پیدا نہ ہوا تو آزادیٔ ہند کی تحریک کمزور پڑ جائے گی ۔ ان میں سے کچھ

کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان محض ایک علاقائی تصور ہے اور عالمی اخوت اسلامی کے فلسفے کے خلاف ہے - یہ دونوں دلیلیں الجھی ہوئی فکر کا نتیجہ تھیں اور اس افسوس ناک حقیقت کو ظاہر کرتی تھیں کہ بر صغیر کے مسلمانوں کو جن حقیقی مسائل کا سامنا ہے ، علما ان سے کس قدر بے خبر ہیں۔ آزادی ملنے ہی والی تھی ، یہ رک نہیں سکتی تھی - مسلمانوں کو اس بات کی تشویش نہ تھی کہ آزادی کتنی جلد ملے گی ، انھیں فکر یہ تھی کہ جب انھیں آزادی ملے تو وہ اپنی زندگی کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھال سکیں۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں انگریزوں کے تسلط کا اختتام ھندوؤں کے تسلط کا آغاز نہ بن جائے - وہ آقاؤں کی تبدیلی کے خواھش مند نہ تھے - پچھلے تجربات کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ ھندو ایک ھی سیاسی ڈھانچے میں مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ حیثیت میں زندگی گزارنے پر آمادہ نہ ہوں گے - وہ علما جو انڈین نیشنل کانگرس کے ممبر تھے ، اس سادہ سی بات کی اھمیت کو نہ سمجھ سکے ، اور بالآخر مسلمانوں کی تحریک آزادی سے بالکل کٹ کر رہ گئے -

وہ پاکستان کی تحریک کو علاقائی قومیت متصور کر کے اس کی جو مخالفت کر رہے تھے وہ بھی وقتی حالات سے ان کی لاعلمی کا نتیجہ تھی - بھلا دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبۂ وطن سے عالمگیر اخوت اسلامی کے نظریے کی تکذیب کیونکر ہو سکتی تھی؟ وطن شناخت کے لئے ہوتا ہے - اس انفرادیت سے بر صغیر کے مسلمانوں کی محرومی یقیناً عالمی اخوت کو کوئی نفع نہ پہنچا سکتی تھی - ھاں اگر وہ ھندوؤں کے سیاسی غلبے کو ماننے پر مجبور ہو جاتے تو ان کو یہ انفرادیت کبھی نصیب نہ ہوتی - علما کی نظریں ایک دھندلائی ہوئی دور کی روشنی کی طرح اسلام کی عظمت رفتہ پر تھیں اور مستقبل میں اخوت اسلامی کے ایک ھمہ گیر مگر مبہم تصور کی طرف - مسلم قومیت کی نشو و نما کو سب سے زیادہ نقصان اسی امر سے پہنچا اور بر صغیر کے مسلمانوں کی ترقی رک گئی - ایک مضبوط اساس کے بغیر بر صغیر کے مسلمانوں کی حیثیت خدائی فوجداروں کی ایک جماعت سے زیادہ نہ تھی ، جو عالمگیر اخوت اسلامی کے نام پر دوسروں کے معاملوں

میں دخل اندازی کریں - وہ دوسرے اسلامی ملکوں کے کیا کام آسکتے تھے جبکہ ان کے پاس اپنا وطن تک نہ تھا - وہ علما جو قومیت کے نظریے کو عالمگیر اخوت کے تصور کے منافی سمجھتے تھے ، ان کا درحقیقت مدعا یہ تھا کہ بر صغیر کے مسلمانوں کو اپنا الگ وطن بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہئے ، کیونکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کے بہت سے وطن موجود ہیں۔ آپ کو اپنا گھر بنانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ مشرق وسطیٰ میں اتنے بہت سے اسلامی گھر موجود ہیں ؟ اسی قسم کے دلائل تھے جنھوں نے تحریک خلافت کو جو بڑے ارفع و اعلیٰ مقاصد لے کر اٹھی تھی ایک بھول بھلیاں میں پہنچا دیا تھا - ہندوستان کے بعض قابل ترین علما کہا کرتے تھے کہ مغربی طاقتیں خصوصاً انگریز سلطنت عثمانی کو تباہ کر رہے ہیں ، لیکن ان کو یہ خیال نہ آیا کہ عرب اور ترک خود اپنی اپنی انفرادیت کے قیام کے لئے سر توڑ جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔ ترکوں نے ترک قومیت کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور اس نظریے کا شدت سے پرچار کر رہے تھے کہ ''ترکی ترکوں کے لئے ہے۔،، ادھر عربوں کا قومی جذبہ یہ مطالبہ کرتا تھا کہ ترکوں سے آزادی حاصل کر کے اپنی انفرادیت قائم کی جائے - انگریزوں نے ان کے قومی احساسات سے فائدہ اٹھایا - ہمارے علما کو جنھوں نے ترکی میں دوبارہ خلافت کے قیام کی تحریک شروع کر رکھی تھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ترک تو خود ھی خلافت کے خیال کو ترک کر چکے ہیں۔ ان کے دلوں کو اسلامی اخوت کا تصور ایسا بھا گیا تھا کہ انھوں نے ایک طویل جد و جہد پر کمر باندھ لی - وہ سمجھتے تھے کہ اگر خلافت دوبارہ قائم ھوگئی تو مشرق وسطیٰ کی ساری اسلامی دنیا ترکوں کے جھنڈے تلے جمع ھو جائے گی اور پھر ایک دن وہ اس قدر طاقت پکڑ لے گی کہ ہندوستان آ کر انگریزوں کو نکال باھر کرے -

لیکن اکثر علما جو پاکستان کی مخالفت کرتے تھے اس کی وجہ محض ان کی پریشان دماغی یا اسلامی مسائل سے بے خبری نہ تھی اس کے پیچھے اپنے اقتدار کا شعور بھی کار فرما تھا -

میں یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ھوں کہ میرا روئے سخن علما

کے اس طبقے کی طرف ہے جو کھلے بندوں سیاسیات میں حصہ لے رہا تھا ، ان نیک بندوں کی طرف نہیں جو بے غرضانہ اور مخلصانہ طریق پر قرآن حکیم کی تعلیم کی اشاعت اور اسلام کے پیغام کی تبلیغ کر رہے تھے ۔ میں ان سیاسی علما کا ذکر کر رہا ہوں جو مسلم نیشنلسٹوں کے مقابلے میں خود کو انڈین نیشنلسٹ مسلم کہتے تھے ۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس یا ایسے اداروں کے ممبر تھے جنھوں نے کانگرس سے اشتراک عمل کر رکھا تھا ۔ وہ کانگرس سے تعلق رکھنے کے باعث بڑی طاقت رکھتے تھے ، کیونکہ کانگرس بر صغیر کی سب سے بڑی جماعت تھی ۔ ہرچند قائد اعظم نے دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ بر صغیر کے مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ ہے اور کسی اور جماعت کو بر صغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں پہنچتا ، مگر حکومت برطانیہ ملک میں جو سیاسی انتظام بھی تجویز کرتی ، کانگرس اپنے مسلمان ممبروں کو اس میں شامل کرنے پر اصرار کرتی ۔ کانگرسی مسلمانوں کا خیال تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں حکمراں پارٹی یعنی کانگرس کے تحت مسلمانوں کی قیادت ہمارے ہی ہاتھ میں رہے گی ۔ علما جانتے تھے کہ بر صغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی رفتہ رفتہ جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو حاصل ہوتی جا رہی ہے ۔ ان لوگوں کو قائد اعظم کی ذات میں ایک شیوا بیان اور طاقتور لیڈر مل گیا تھا ۔ قائد اعظم انگریزوں اور ہندوؤں سے جس اٹل ارادے کے ساتھ مصروف جنگ تھے ، اس سے ان علما کا اقتدار سخت خطرے میں پڑ گیا تھا ۔ قائد اعظم کی خدمت ملّی ، ان کی کامل بے لوثی اور اخلاص و ایثار نے لوگوں کے ایک ہجوم کو جو ڈانواں ڈول پھر رہا تھا ، ایک طاقتور اور حقیقی قوم بنا دیا تھا ۔ یہی وہ نئی قیادت تھی جس سے علما خائف تھے اور اسی کی مخالفت میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس سے ناتا جوڑ لیا تھا ۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں اور علما کا اختلاف کوئی نیا اختلاف نہ تھا ۔ انگریزی راج کے ابتدائی برسوں ہی سے اس کی بنا پڑ گئی تھی اور یہ پاکستان کی جد و جہد کے دوران اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا ۔ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے قدم جما لینے کے بعد برسوں تک علما

نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے الگ رکھا ۔ مسلمانوں کا یہ تعصب اور علم سے دانستہ محرومی کا یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا ۔ مسلمانوں میں احیائے علوم کا آغاز شاہ ولی اللہ کے زمانے سے ہوا ، جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کے ماضی کو کھنگالا اور دوسری طرف ان کے مستقبل کی فکر کرنی شروع کی ۔ ان کے بعد سر سید احمد خاں اپنا یہ پیغام لے کر آٹھے کہ مسلمان مغربی علوم اور جدید فنون حاصل کئے بغیر ترقی نہیں کر سکتے ۔ ان کا قول تھا اور یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ علم پر کسی قوم کی اجارہ داری نہیں ، یہ تمام بنی نوع انسان کی ملکیت ہے ۔ پھر کیا تھا، علما کا ایک طبقہ پکار اٹھا کہ یہ شخص کافر ہے ۔ مگر اس سارے لعن طعن کے باوجود سر سید ہار ماننے والے آدمی نہ تھے ۔ وہ جرأت کے ساتھ قدم جمائے رہے، بڑی کوشش سے قوم کی ذہنی قوتوں کو ابھارا ۔ جوں جوں مسلمان مغربی علوم سے بہرہ مند ہوتے گئے مسلم قوم پر علما کا تسلط کمزور پڑتا گیا ۔

پاکستان کا قیام علما کی زبردست شکست تھا ۔ لیکن علما کا طبقہ بڑا سخت جان واقع ہوا ہے اور طاقت ایک ایسا نشہ ہے جس کی ترغیب سے بچنا محال ہے ۔ جیسے ہی پاکستان وجود میں آیا اس طرح کے علما نے از سر نو اپنی قوتوں کو منظم کرنا شروع کر دیا ۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اب جبکہ پاکستان قائم ہو ہی گیا ہے، تو ہمارے سوا اس بات کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ اس نئی اسلامی مملکت کا انتظام کس طرح چلایا جائے ۔ بعض نیشنلسٹ علما نے ہندوستان ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا ۔ مگر بعض دیگر حضرات جلدی سے پاکستان کی مدد کے لئے دوڑ آئے کہ مسلمانوں کو تو پاکستان سے نہ بچا سکے تھے ، اب پاکستان کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچا لیں ۔ آنے والوں میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے ، جو پاکستان کے زبردست مخالف رہ چکے تھے۔ موصوف نے آخر وہیں آ کر پناہ لی اور پھر جلد ہی پاکستان کے بدنصیب عوام کو ''مسلمان بنانے،، کی مہم شروع کر دی ۔ ان بزرگ نے پاکستان میں جو کچھ دیکھا بڑا روح فرسا تھا ۔ غیر اسلامی ملک ، غیر اسلامی

حکومت اور غیر اسلامی لوگ! بھلا کوئی سچا مسلمان ایسی حکومت سے کیونکر تعاون کر سکتا تھا - چنانچہ انھوں نے لوگوں کو ان کی خامیوں ، کوتاھیوں اور ان کی عام پستی کا احساس دلانے کی مہم شروع کر دی -

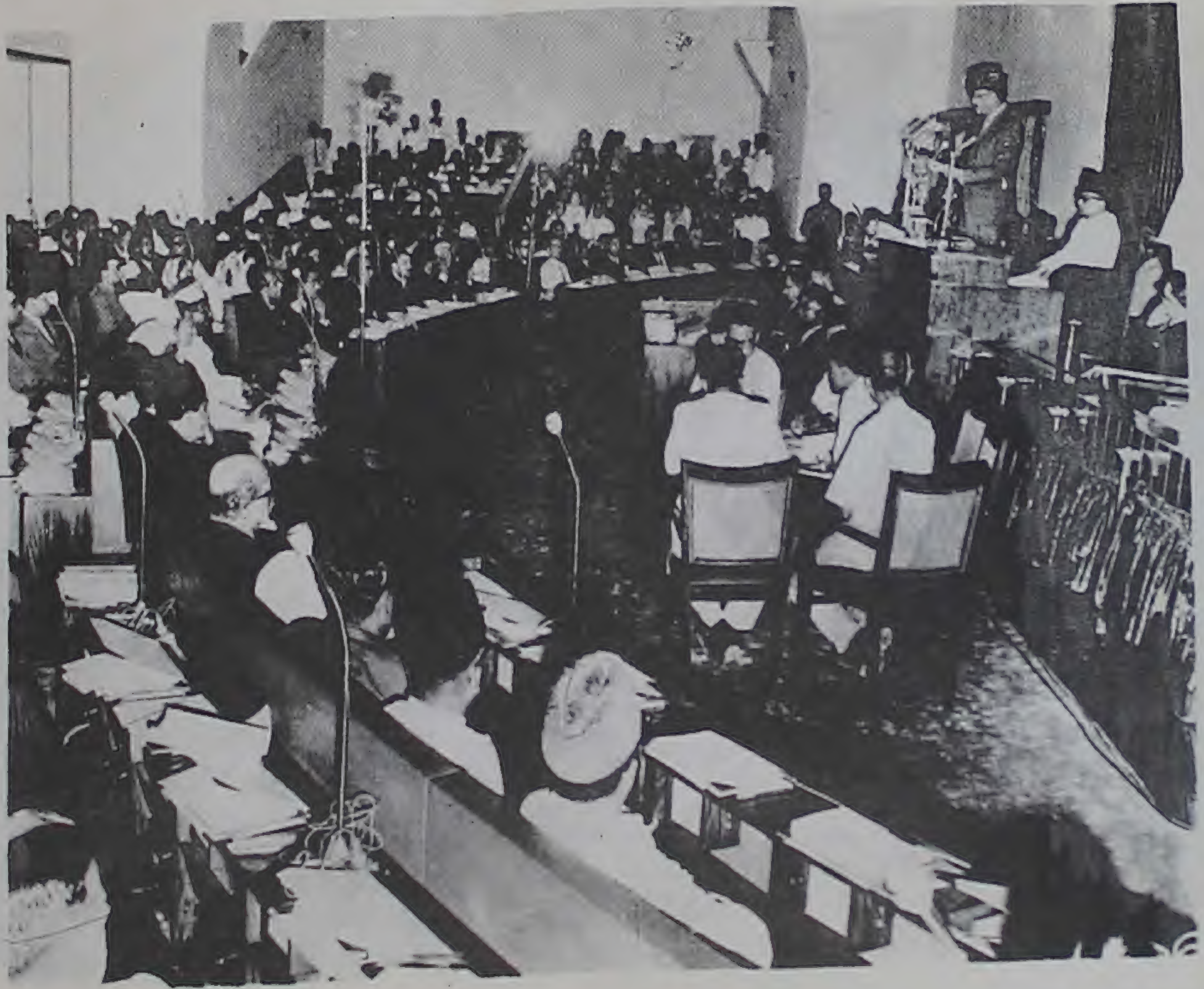
یہ محض دکھاوا تھا ، اصل مقصد تھا علما کی برتری کو از سر نو بحال کرنا اور اپنے لئے قوم کی رہنمائی کا حق منوانا - چونکہ تحریک پاکستان کی قیادت تعلیم یافتہ طبقے نے ایک ایسے شخص کی سر کردگی میں کی تھی ، جو مغربی تعلیم کا نمونہ تھا ، اس سے علما کے وقار کو سخت ٹھیس لگی تھی ، اس کی تلافی ضروری تھی - سیاسی علما کے سامنے دو راستے تھے - ایک تو یہ کہ وہ اپنی حالت کا از سر نو جائزہ لیں اور اپنے طرز نظر کو بدلیں ، تاکہ لوگ دینی و دنیوی معاملات میں ان کے علم سے فائدہ اٹھا سکیں - دوسرا یہ کہ خدا ترس مگر ناخواندہ عوام کی نظروں میں تعلیم یافتہ طبقوں کے وقار کو گرا دیں - انھوں نے لازماً دوسرا راستہ اختیار کیا - ظاہر ھے کہ ایک معاشرہ جو ایک صدی کی غلامی کے بعد تازہ تازہ آزاد ھوا تھا اور جس کو ملکی تعمیر کے سلسلے میں بیسیوں مسائل سے دوچار ھونا پڑ رہا تھا ، اس میں بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ھوں گی - علما نے اپنی توجہ ان ھی پر مرکوز رکھی - وہ ملک بھر میں پھیل کر لوگوں کو سمجھانے لگے کہ تمھاری زندگی کتنی مصیبت زدہ ھے اور تمھاری حکومت کیسی نکمی ھے - انھوں نے ایک آمید پرست اور جوش عمل سے سرشار قوم کو ایک تلخ مزاج اور حرماں زدہ قوم بنا دیا - علما نے دعویٰ کیا کہ ھم ھر مرض کی دوا اور ھر درد کا علاج جانتے ھیں - ھمارے لئے ملکی مسائل کو حل کرنا کچھ مشکل نہیں ، لیکن بے بس ھیں کہ ملک پر جدید تعلیم یافتہ طبقوں کا قبضہ ھے ، جو اسلام کو خیر باد کہہ چکے ھیں اور مغرب زدہ ھو کر رہ گئے ھیں - چونکہ کوئی قیادت بھی پلک جھپکتے میں قوم کی ساری مصیبتیں دور نہ کر سکتی تھی اس لئے ان علما کی خوب بن آئی اور انھوں نے بہت لوگوں کو اپنا پیرو بنا لیا -

یہی حالات تھے جن کے سبب علما نے اتنی شد و مد کے ساتھ ایک اسلامی آئین کا مطالبہ کیا - چونکہ کسی عالم نے اسلامی آئین کے

بنیادی عناصر کی صراحت نہیں کی تھی ، اس لئے کوئی آئین بھی اس وقت تک اسلامی کہلانے کا مستحق نہ ہو سکتا تھا ، جب تک کہ تمام علما اس پر اپنی اپنی مہر ثبت نہ کر دیں - اسلامی آئین بنانے کا بس ایک ھی طریقہ تھا کہ ملک کو علما کے حوالے کر دیا جاتا اور ان سے استدعا کی جاتی کہ ''بسم اللہ ! ہمیں نور ھدایت بخشیں -،، علما بعینہ یہی بات چاہتے تھے - آئین اس وقت تک اسلامی نہیں کہلا سکتا تھا ، جب تک کہ علما کے ھاتھوں سے نہ بنے اور ان کو حکم لگانے اور حکم چلانے کا اختیار نہ سونپے - اس صورت حال کو نہ تو عوام ماننے کے لئے تیار تھے اور نہ میں ، کیونکہ یہ اس بنیادی جمہوری اصول کی نفی کرتی تھی کہ اقتدار عوام ھی کے ھاتھ میں ہونا چاہئے -

رفتہ رفتہ آئین کے خاکے ابھرنے شروع ہوئے - تمام حاکمیت اللہ ھی کو حاصل ھے ، لیکن اس کے فضل و کرم سے ایک اسلامی ریاست کے عوام کو یہ توفیق حاصل ھے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کر سکیں - اللہ تعالیٰ نے انہیں ھدایت اور عقل کے سرچشموں تک رسائی بخشی تھی اور یہ فہم بھی کہ ان کے مقاصد و مطالب کو سمجھ سکیں اور بیان کر سکیں - انہیں ان صلاحیتوں سے کام لے کر اصول ھدایت متعین کرنے چاھئیں اور ضرورت ہو تو ماھرین سے بھی مدد لینی چاہئے - یہ اصول متعین کر لینے کے بعد وہ ایسے طریقے سوچیں جن سے انہیں اپنے مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکے - ان کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے منظم طریق پر رفاہ عامہ کے لئے قوانین وضع کر سکیں اور ان کے پاس مناسب منتظمہ ہونی چاہئے جو ان قوانین کو نافذ کرا سکے اور قوم کی جانب سے انتظامی فرائض کی انجام دھی پر مامور ہو ، نیز ایک آزاد عدلیہ جو حکم لگا سکے کہ مقننہ اور منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے مندرجات کے مطابق انجام دے رہے ھیں یا نہیں -

جب ان بنیادی باتوں کا فیصلہ ہو گیا تو میں نے حکومت کا ایک ایسا طریقہ متعین کرنے کی کوشش کی ، جو عوام کے مزاج کے



(۲۱) راولپنڈی میں قومی اسمبلی سے خطاب



(۲۲-ا) قاہرہ میں جمال ناصر، صدرِ
جمہوریہ متحدہ عرب کے ساتھ۔
۵ نومبر ۱۹۶۰ سنہ ع



(۲۲-ب) واشنگٹن میں صدر
جانسن کے ساتھ۔
۱۴ دسمبر ۱۹۶۵ سنہ ع

موافق ہو اور اسلامی تعلیمات اور تاریخ اسلام سے بھی مطابقت رکھتا ہو - تاریخ اسلام اور مختلف اسلامی ممالک کے آئین کا بغور مطالعہ کیا گیا - اس سے دو باتیں ظاہر ہوئیں - اول یہ کہ اسلام میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں اور جانشینی میراث کی بنیاد پر متعین نہیں کی جا سکتی - دوسرے یہ کہ عوام کو من حیث القوم اپنا سربراہ خود چننے اور خود اسے برطرف کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے - تاریخ اسلام کی رو سے ایک اور تسلیم شدہ امر یہ ہے کہ جب قوم اپنا سردار چن لے تو اسے معقول اختیار حاصل ہو کہ وہ حکومت کے کاروبار میں ہم آہنگی پیدا کر سکے ، اس کی نگرانی کر سکے اور اس پر قابو رکھ سکے - اختیارات کی منتقلی کی اجازت ہے ، مگر مرکزی اقتدار منتخب شدہ سربراہ ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہئے ، تاکہ یک جہتی کے ساتھ ملک اور اس کے نظم و نسق کی نگرانی کی جا سکے - ہمارے سماجی اور سیاسی حالات میں ایسا مرکزی اقتدار اور بھی ضروری معلوم ہوتا تھا - ایک مضبوط مرکزی اقتدار کے بغیر ملک کو قائم اور متحد رکھنا دشوار تھا - بر صغیر میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد جب مسلمانوں کی حکومت میں زوال آیا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ مرکزی اقتدار کمزور پڑ گیا تھا - یہی بات دوسرے اسلامی ادوار پر بھی صادق آتی تھی -

پاکستان کے اہل دانش کا طبقہ ایک قسم کی پارلیمانی جمہوریت کا عادی ہو چکا تھا - لیکن تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یہ نظام حکومت ، عوام کے لئے مفید ہونے کی بجائے تفرقے کا باعث ہوا ، اور ملک کو تباہی کے قریب لے آیا تھا - ہم اس کی بدولت ماضی میں خاصا نقصان اٹھا چکے تھے اور دوبارہ وہی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے - اس کی بجائے دوسرا نظام جو ہماری ضرورتوں کے مطابق معلوم ہوتا تھا ، صدارتی نظام تھا -

ضرورت تھی ایک منتخب شدہ صدر کی جو اپنی کابینہ آپ چننے کا اختیار رکھتا ہو اور ایک مقننہ کی جو ایک یا دو ایوانوں پر مشتمل ہو ، مگر اس کی تعداد ، موزوں آدمیوں کی قلت کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی - صدر اور مقننہ کے روابط اس طرح متعیّن ،

کئے جائیں کہ صدر کو ملک کا استحکام برقرار رکھنے اور گھڑی گھڑی کے تعطل کو روکنے کا پورا اختیار حاصل رہے - یا یوں کہئیے کہ منتظمہ اور مقننّہ حتی الوسع اس انداز کی بنائی جائیں جیسی خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ محاسبے اور توازن کا بھی معقول انتظام ضروری تھا ، تاکہ صدر اور مقننّہ دونوں مناسب، معقول اور ذمہ دارانہ طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیں اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک اپنے فرائض کی انجام دھی میں ناکام رہے تو ایک یا دونوں کو برطرف کیا جا سکے -

صوبائی گورنروں کو صدر نامزد کرے تاکہ صوبوں میں اسی کا اقتدار قائم رہے ، ورنہ ساری تعمیر کے ڈھے جانے کا خطرہ ھوگا - صوبوں کو بہت سے امور سونپے جائیں تاکہ انھیں معقول حد تک ذمہ داری ، خود مختاری اور آزادیٔ عمل حاصل رہے -

میری رائے میں یہ اس آئین کی جو میں نے ملک کے لئے سوچا تھا ، کم سے کم بنیادی ضرورتیں تھیں - مگر جو لوگ پارلیمانی نظام کے عادی ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ اس سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا ھے ، ان کو میری رائے سے اتفاق کرنے میں بڑی دقت محسوس ھوئی - ایک دفعہ میں نے مشرق پاکستان میں چند آدمیوں کو ملاقات کے لئے بلوایا - ان میں مولوی تمیز الدین خاں مرحوم اور مسٹر نورالامین بھی شامل تھے - میں نے ان سے آئینی مسائل کے تمام پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا -

مولوی تمیزالدین نے کہا : ''میں صدارتی نظام حکومت کے سخت خلاف ہوں،، میں نے پوچھا : ''آپ کو کیا اعتراض ھے؟،، بولے : ''مجھے یہ اعتراض ھے کہ تاریخ اسلام میں اکثر و بیشتر شخصی حکومت نظر آتی ھے اور ہمارا اپنا سیاسی تجربہ بھی اسی قسم کا ھے- مجھے اندیشہ ھے کہ ھم آزادی اور جمہوریت کے باوجود پھر اسی طرف لوٹ جائیں گے،، میں نے کہا : ''اگر یہ بات مسلمانوں کے خون میں رچی ھوئی ھو تو آپ اسے کیسے نکال سکتے ھیں ؟ بہر صورت کیا آپ ایک مطلق العنان حکمراں اور ایک منتخب شدہ صدر میں فرق محسوس نہیں کرتے؟ کیا ریاست ھائے متحدہ امریکہ میں صدر نہیں

ہوتا اور کیا امریکہ میں جمہوری حکومت نہیں ہے؟ پھر اس ملک میں جہاں دس یا پندرہ سیاسی پارٹیاں موجود ہیں، جن میں مسلم لیگ کو چھوڑ کر نہ تو کسی کا کوئی قومی نقطۂ نگاہ ہے اور نہ کوئی قومی منصوبہ، آپ پارلیمانی نظام جمہوریت کو کیسے قائم رکھ سکتے ہیں؟"

ان کی رائے تھی کہ ہمیں ایسا قانون بنا دینا چاہئے کہ ملک میں دو سے زیادہ پارٹیاں نہ بننے پائیں - میں نے جواب دیا: "تمیزالدین صاحب! اگر آپ قانون کے ذریعے لوگوں کے ضمیر پر قابو پا سکتے ہیں، تو مسلمانوں کو ایک ہی فرقے کا پیرو کیوں نہیں بنا لیتے؟ اسلام میں بہتر (۷۲) فرقے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک قرآن ہی کو اپنا سرچشمۂ فکر و عمل سمجھتا ہے - یاد رکھئیے کہ آپ قانونی تدابیر سے لوگوں کے ضمیر کو قابو میں نہیں کر سکتے۔"

وہ بولے: "میں پھر بھی پارلیمانی نظام ہی کو پسند کروں گا۔" مایوس ہو کر اور زچ آ کر میں نے ان کو ذرا آڑے ہاتھوں لیا - بڑے میاں نے بُرا نہ مانا -

مسٹر نورالامین خاموش رہے - میرا خیال ہے وہ اس مباحثے سے الگ رہنا چاہتے تھے - لیکن مولوی تمیزالدین بڑے یقین کے ساتھ بولتے رہے اور یہ ان کا سچا خیال تھا، گو غیر حقیقت پسندانہ ہی سہی - میں ان کی جرأت کا ہمیشہ معترف رہا ہوں -

اس طرح ایک زبردست بحث چھڑ گئی کہ پارلیمانی نظام حکومت اور صدارتی نظام حکومت میں سے کونسا بہتر ہے - مولوی تمیزالدین خاں کی طرح بعض کا کہنا تھا کہ پارلیمانی نظام کو کافی مہلت دئیے بغیر رد کر دیا گیا ہے - غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ اس نظام کی رسی اتنی دراز نہ ہونے پائی کہ اچھی طرح ملک کا گلا گھونٹ دیتی - سچ یہ ہے کہ اگر ہم پانچ دس برس اور اس رستے پر چلتے رہتے تو ہمارا خدا ہی حافظ تھا -

بات یہ ہے کہ پارلیمانی نظام اسی وقت پنپ سکتا ہے جب ملک میں بڑی منظم جماعتیں ہوں اور ان کی تعداد تھوڑی ہو، اور ان میں سے ہر ایک کوئی واضح سماجی اور اقتصادی منصوبہ رکھتی ہو -

بعض لوگ کہتے ہیں، اگر ملک میں پانچ یا دس پارٹیاں ہوں تو حرج ہی کیا ہے، ہم ملی جلی حکومت تو بنا ہی سکتے ہیں۔ لیکن کیا یہی ملک کی بہترین خدمت ہے؟ کیا ملی جلی حکومتیں ایک ترقی پذیر ملک میں مضبوطی کے ساتھ بڑے بڑے فیصلے کر سکتی ہیں اور کیا یہ فیصلے کسی صورت میں ملکی روایات اور رسم و رواج کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں؟ ایک ذمہ دار حکومت رائے عامہ کی تلون مزاجی کی جکڑ بند میں نہیں رہ سکتی۔ آپ کو رائے عامہ سے آگے بڑھ کر سوچنا پڑتا ہے اور لوگوں کو اپنی راہ پر لانا پڑتا ہے۔ میرے سامنے دو مقصد تھے۔ قوم کو متحد کرنا اور ملک کو ترقی دینا۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک مضبوط، نمائندہ اور دیر پا حکومت اور ملکی ترقی کے منظم منصوبوں کی ضرورت تھی۔ قوم کو عزم راسخ کے ساتھ سائنس اور فنی مہارت کے عہد میں داخل ہونا تھا اور اپنے عقیدے اور نظریۂ حیات کے لازمی ارکان پر بھی مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا تھا۔

یہ کہہ دینا آسان ہے کہ ہمیں ماضی کے مانع ترقی اثرات کو دور کر دینا چاہئے، لیکن عملی زندگی میں ان اثرات سے بچنا دشوار امر ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے جب ملک میں بڑے بڑے زمیندار موجود ہوں جو ہزاروں رائے دہندگان پر اثر ڈال سکتے ہوں؟ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے، جب یہاں پیروں فقیروں کی بہتات ہو جو لوگوں کو ورغلا سکتے ہوں؟ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے، پائیدار حکومت کیونکر بن سکتی ہے، جب یہاں دس یا پندرہ یا اس سے بھی زیادہ سیاسی جماعتیں ہوں جن میں سے کسی کا بھی کوئی قومی منصوبہ نہ ہو؟ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے، جب یہاں ابتدائی تعلیم عام نہ ہونے پائی ہو؟

ایک نیا نظام قائم کرنے کے سلسلے میں یہ بڑی آسان بات ہے کہ کوئی انگریزی، امریکی یا روسی کتاب اٹھا لی جائے اور کہا جائے کہ دیکھو ان لوگوں نے یوں کیا تھا، ہم بھی کیوں نہ ایسا ہی کریں! سوال یہ ہے کہ کیا یہ کوشش کامیاب ہوگی؟ کیا اس سے لوگوں کی دل جمعی ہو سکے گی؟ کیا وہ اسے اپنا کہہ سکیں گے؟ اگر نہیں تو پھر یہ ساری کوشش بے کار ثابت ہوگی۔

ایک دفعہ مجھ سے پوچھا گیا : ''اس آئین کی بنیادی باتیں آپ کو کس کتاب سے حاصل ہوئیں ؟''، میں نے کہا : ''پاکستان کی کتاب سے - اس کی بنیاد وہ علم ہے جو میں پاکستان کے عوام اور پاکستان کی خاک پاک کے بارے میں رکھتا ہوں۔''

میں نے مقامی حکومتوں کا جو نظام سوچا تھا ، میں نہیں کہہ سکتا کہ ''بنیادی جمہوریتوں'' کی اصطلاح سے اس کا مفہوم ٹھیک یا پورے طور پر ادا ہو جاتا ہے - یہ بنیادی ان معنوں میں ہے کہ سارے ڈھانچے کی تعمیر نیچے سے شروع ہوتی ہے - اور جمہوری ان معنوں میں کہ ایک آئینی ڈھانچے کے تحت ملکی معاملات عوام ھی کو سونپے گئے ھیں۔ میرے سامنے دو عمومی مقصد تھے - پہلا یہ کہ لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں کے مسائل خود حل کرنے کے لئے منظم کیا جائے اور ان میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے - اور دوسرا یہ کہ صدر اور اسمبلیوں کے ارکان کو چننے کا کوئی معقول طریقہ دریافت کیا جائے -

سیاست دانوں نے جمہوری طریق کار کو اس طرح برتا تھا کہ اس کی صورت ھی مسخ ہو گئی تھی - ۱۹۵۶ء میں جو آئین بنایا گیا تھا ، اس کی حیثیت ناقابل عمل سمجھوتوں کے ایک پلندے سے زیادہ نہ تھی - ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک میری کوشش یہ رہی کہ ملک کے مختلف شعبوں میں اصلاحات جاری کر کے قوم کی نئے سرے سے تنظیم کی جائے - ان تمام اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ قوم کو مختصر سے مختصر وقت میں ایک نمائندہ حکومت کے لئے تیار کر لیا جائے - ان پر اوپر سے کوئی خاص نظام مسلط کرنا ہرگز مقصود نہ تھا ، بلکہ ایک ایسے نظام کو تعمیر کرنا جو سماجی ، معاشی ، تعلیمی اور اخلاقی حقائق کا لحاظ رکھتے ہوئے ، بنیاد سے ابھرنا شروع ہو - تمام تبدیلیاں اور اصلاحیں نافذ کرنے کا ایک ھی مقصد تھا ، وہ یہ کہ ایک ایسی کرسی اٹھائی جائے جس پر ایک ٹھوس سیاسی نظام کا مینار کھڑا کیا جا سکے -

پچھلے تجربے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مغربی قسم کی پارلیانی

جمہوریت پاکستان کے عوام پر نہیں تھوپی جا سکتی - مغربی نظام کے پنپنے کے لئے کئی بنیادی باتوں کا ہونا ضروری تھا ، جو یہاں نہیں تھیں - اعلیٰ پیمانے پر سماجی اور سیاسی شعور ، ہمہ گیر تعلیم اور عوامی رابطے کا ایک ترقی یافتہ نظام ، جس سے انفرادی اور اجتماعی دل چسپی کے مختلف موضوعات کے بارے میں جلد سے جلد اور صحیح طور پر اطلاعات پھیلائی جا سکیں، یہ وہ لوازمات ہیں جن کے بغیر یہ نظام پروان ہی نہیں چڑھ سکتا - ہمارے ہاں ان ابتدائی شرطوں کے نہ ہونے کی صورت میں بھلا عوام سے یہ کیسے توقع رکھی جا سکتی تھی کہ وہ وسیع قومی پالسیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنا ووٹ صحیح طور پر استعمال کر سکیں گے - وہ آدمی جو بیمار، اَن پڑھ اور نان شبینہ کی فکر میں مبتلا ہو، قومی پالسیوں کے بارے میں کیا سر کھپا سکتا ہے -

ہم اس انتظار میں بھی نہیں رہ سکتے تھے کہ پہلے قوم کو یہ لوازمات میسر آ جائیں پھر جمہوریت قائم کی جائے - ہمیں تو کوئی نہ کوئی نظام جاری کر ہی دینا تھا جسے لوگ ان کوتاہیوں کے باوجود سمجھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں- اس کے معنی تھے قوم کے سواد اعظم تک پہنچنا - ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت دیہات میں رہتی ہے ، ان میں زیادہ تر لوگ اَن پڑھ ہیں، لیکن وہ اپنے مسائل کی ، وجہ بوجھ رکھتے ہیں- ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے مسائل کو ان کے سامنے سیدھے سادے طریقے سے پیش کیا جائے تاکہ وہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکیں - نیز جب ان سے کہا جائے کہ تم اپنا نمائندہ چنو تو وہ جن لوگوں میں سے انتخاب کریں انھیں ذاتی طور پر یا شہرت کی بنا پر جانتے ہوں -

اگر ملک میں منظم سیاسی جماعتیں ہوں جن کے پاس مواصلات کے ترقی یافتہ ذریعے ہوں تاکہ وہ اپنے مقاصد کی تشریح کر سکیں تو عوام کے لئے اپنے مسائل کو سمجھنا اور افراد کو جاننا آسان ہو سکتا ہے - لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں قابل ذکر سیاسی جماعتیں موجود نہ تھیں اور جو تھیں ان کے پاس کوئی قومی منصوبہ نہ تھا - لوگوں کو ملک گیر پیمانے پر ووٹ دینے کی رسم میں شامل ہونے

کی ترغیب دینا اور ایسے لوگوں کو ووٹ دلوانا جن کو نہ تو انھوں نے کبھی دیکھا ہو اور نہ ان کے بارے میں کوئی واقفیت رکھتے ہوں، ایسا ہی ہے جیسے بھلا پھسلا کر یا ڈرا دھمکا کر ان سے ان کے ووٹ کا حق چھین لیا جائے۔ یہ صورت حالات تو بس لچھے دار تقریریں کرنے والے گندم نما جو فروش لیڈروں ہی کے لئے سازگار تھی۔ چونکہ ان کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام پیش کرنے کے لئے نہیں ہوتا اس لئے وہ عوام کے دلوں میں طرح طرح کے ولولے پیدا کرنے اور ان کے جذبات سے کھیلنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عوام جو معاشی اور سماجی مسائل میں گھرے ہوئے تھے ان کے فریب میں آ جاتے تھے۔ انھیں سبز باغ دکھائے جاتے اور وہ تھوڑی دیر کے لئے پسیج جاتے اور چکر میں آ جاتے۔ اکثر اوقات لیڈروں کی اپیل منفی اور تخریبی رنگ لئے ہوتی تھی۔ ان باتوں سے صرف ہیجان پیدا ہوتا، شک شبہے ابھرتے اور ملک میں تفرقے پیدا ہوتے۔ سچ پوچھئے تو اس نظام کے تحت عوام کو عوام ہی کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا تھا۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ اگر میں نے اس نظام میں کوئی بھی تبدیلی کی تو میری کتنی مخالفت ہوگی۔ اول اہل دانش کی طرف سے۔ یہ بہت چھوٹی اقلیت ہے، مگر مؤثر آواز رکھتی ہے اور مغربی خیالات پر پلی ہے۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ ہونے کی بدولت زعما میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے کو رائے عامہ کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ ان کو عوام کی فکر رہتی ہے اور اکثر خاصے خلوص کے ساتھ، لیکن ان میں سے کم ہی کسی کو صحیح معنوں میں عوام سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور ایسے تو اور بھی کم ہیں جنھوں نے عوام کے مسائل پر کبھی سنجیدگی سے دھیان دیا ہو۔ وہ تو بس اتنا ہی کہنا جانتے ہیں کہ تمام قوت کے مالک عوام ہیں۔ ان کو یہ فکر نہیں کہ اس قوت کو کس طرح یا کس صورت سے کام میں لایا جائے۔ وہ جہالت، غربت اور دکھ درد کے خلاف جہاد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر یہ جہاد تدبیر سے نہیں تقریر سے کیا جاتا ہے۔ ان کے دل میں جہالت کے خلاف بڑا درد اٹھتا ہے، مگر وہ جہلا کی

کوئی امداد کرنے کو تیار نہیں - وہ غربت کی مذمت کرتے ہیں، مگر غریب سے ہمدردی نہیں کرتے - وہ بھوک کو الزام دیتے ہیں، مگر بھوکے کو سہارا نہیں دیتے -

دوسرے درجے پر مخالفت کرنے والے وہ ہوں گے جو ذاتی مفاد رکھتے ہیں ، یعنی سیاست دان اور زمیندار - وہ اپنے علاقے کے لوگوں کی حمایت اور وفاداری کے عادی ہو چکے ہیں - ان کو بھلا یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت فیصلہ استعمال کرے اور ان کے اقتدار کو جھٹلائے - اور آخر میں میرے مخالف قدامت پرست اور تنگ خیال طبقے ہوں گے جو مذہب کی آڑ لے کر ہر قسم کی ترقی کی کوششوں کو ناکام بنا دینا چاہتے ہیں -

یہ تمام لوگ انتخابی نظام میں ہر اس تبدیلی کے خلاف جنگ کریں گے جو عام آدمی کو اپنی مرضی کا مالک بنانا چاہے - لیکن نتائج کچھ بھی ہوں ملک کی بھلائی کے لئے صحیح قدم اٹھانا ہی چاہئے -

میں نے دیہاتی علاقوں میں ایک ایک گاؤں اور شہروں میں ایک ایک محلے کو لیا - یہی وہ سطح ہے جہاں لوگ براہ راست ایک دوسرے سے واقف ہو سکتے ہیں اور یہی وہ مقام ہیں جہاں حقیقی مسائل پائے جاتے ہیں - میں نے اندازہ کر لیا کہ دیہات کے لوگ خواہ ناخواندہ سہی ، اپنے انفرادی اور اجتماعی مفادات اور ان کے فوری حل کی ضرورت کا شعور رکھتے ہیں - اسی سطح پر لوگ یہ جان سکتے ہیں کہ وہ اپنی مدد اور رہبری اور خدمت کے لئے کن کن اشخاص پر بھروسا کر سکتے ہیں - جس نظام حکومت کی جڑیں اس حد تک پہنچتی ہوں وہی بارآور ہو سکتا تھا -

میں نے بنیادی جمہوریتوں کے آئندہ منصب کے لئے ذیل کے اصول وضع کئے : اول یہ کہ وہ انتہائی براہ راست طریقے پر اپنے اپنے علاقے کے چنے ہوئے نمائندوں پر مشتمل ہوں - دوسرے یہ کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں قلب کی حیثیت حاصل کریں ، جہاں ترقی اور شہری ذمہ داری کے تمام مقامی مسائل کا گہرا مطالعہ کیا جائے ، ان کے حل تلاش کئے جائیں اور ان پر پورا پورا عمل کیا جائے -

تیسرے یہ کہ وہ رفتہ رفتہ سرکاری کارکن اداروں کو اپنے اندر جذب کر لیں، اور عوامی جماعتوں کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیں - اور آخری بات یہ کہ وہ لوگوں میں توانائی اور ولولہ پیدا کریں اور ان اخلاق اور ذہنی قوتوں کو بیدار کریں جو ملک میں باعمل اور پرُخلوص رہنمائی کی روایات کو پروان چڑھانے کے لئے لازمی ہیں -

مارشل لا جاری کرنے کے دو دن بعد ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میں نے ایک اخباری کانفرنس میں کہا تھا کہ اقتدار عوام کو لوٹا دیا جائے گا - اس کے تین مہینے کے بعد میرا ایک اور بیان بھی موجود ہے کہ جیسے ہی ضروری اصلاحات زیر عمل آ جائیں گی ملک کو ایک ایسا آئین دے دیا جائے گا جو لوگوں کی خواہشات پر مبنی ہو اور ان کے مفاد کو پورا کر سکے - میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ پاکستان کسی اور ملک کے آئین کی نقالی نہیں کرے گا، بلکہ ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات کو دیکھتے ہوئے اپنا آئین آپ بنائے گا -

بنیادی جمہوریتوں کا قیام اس مقصد کے حصول کی طرف پہلا قدم تھا، اور جیسا کہ بعد کے تجربے نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے، ہم نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے ذریعے عوام میں اتنی بیداری اور تنظیم پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی معاملات میں پورا پورا حصہ لے رہے ہیں اور یہ احساس رکھتے ہیں کہ اپنی مدد آپ کی جائے اور اپنا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہیں - سرکاری عہدہ داروں اور عوام کا درمیانی فاصلہ کم رہ گیا ہے -

بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا فیصلہ گورنروں کی اس کانفرنس میں کیا گیا تھا جو تیس اپریل سے لے کر یکم مئی ۱۹۵۹ء تک کراچی میں منعقد ہوئی تھی - اسی سال بارہ سے تیرہ جون تک نتھیا گلی میں پھر گورنروں کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں اس نئے نظام کے بارے میں زیادہ تفصیلی فیصلے کئے گئے - بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا باضابطہ حکم ۲۶ اکتوبر کو جاری کیا گیا، جس میں مقامی کونسلوں سے لے کر صوبائی ترقیاتی مشاورتی کونسلوں تک کے ادارے قائم کرنے کا فیصلہ مندرج تھا -

بنیادی جمہوریتوں کے یونٹوں کے انتخابات جنوری ۱۹۶۰ء کے اوائل تک مکمل ہو چکے تھے ۔ مارشل لا کے ضابطے کے تحت سیاسی اجلاس کی تنظیم کرنے ، اجلاس بلوانے یا اجلاس میں شرکت کرنے پر جو پابندی عائد تھی وہ آنے والے انتخابات کی بنا پر کھول دی گئی تھی ۔ تقریباً ایک ہزار ووٹروں (بالغ مردوں اور عورتوں) کے ایک حلقے کو اپنا ایک نمائندہ چننا تھا ۔ ان واحد ممبر والے یونٹوں کو ، جن کی تعداد کوئی اسّی (۸۰) ہزار تھی (ہر صوبے میں تقریباً چالیس (۴۰) ہزار) بعد ازاں ایک دوسرے سے ملا کر مقامی نظم و نسق کے حلقوں کا نظام قائم کیا گیا ۔ ہر ایک صوبے میں ابتدائی درجے کے حلقوں کی تعداد چار (۴) ہزار تھی ۔ ان کو دیہات میں یونین کونسل اور شہروں میں ٹاؤن یا یونین کمیٹی کا نام دیا گیا ۔

اس مرحلے پر میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنا کام جاری رکھنے کے لئے لوگوں سے باقاعدہ اختیار حاصل کر لینا چاہئے ، چنانچہ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابی نتائج کے اعلان سے پہلے فیصلہ کیا گیا کہ میں اسّی (۸۰) ہزار بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لوں تاکہ عوام کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت ملک کے لئے آئین بنا سکوں ۔ اعتماد کے ووٹ کے نتائج کا اعلان الیکشن کمیشن نے ۱۵فروری ۱۹۶۰ء کو کیا ۔ نتائج یہ تھے : پچھتّر ہزار دو سو تراسی اثباتی ووٹ میرے حق میں جو تقریباً اسّی (۸۰) ہزار جملہ ووٹروں میں ۹۵ء۶ فیصد کا تناسب رکھتے تھے ۔ میں نے ۱۷فروری ۱۹۶۰ء کو پاکستان کے پہلے منتخب شدہ صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا ۔ اس کے بعد فوراً ہی میں نے ایک آئینی کمیشن بنایا جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس شہاب الدین تھے ۔ ان کے علاوہ ہر صوبے سے پانچ پانچ ممبر لئے گئے ۔ اس کمیشن کے ذمے حسب ذیل فرائض کئے گئے :

۱ ۔ پاکستان میں پارلیمانی حکومت کی تدریجی ناکامی کا جائزہ لینا جو ۱۹۵۶ء کے آئین کی تنسیخ کا موجب ہوئی ، اور ایسی تدابیر تجویز کرنا کہ یہ اسباب دوبارہ پیدا نہ ہونے پائیں ۔

۲ ۔ لوگوں کے مزاج ، اہل ملک کے عام تعلیمی معیار اور سیاسی

شعور ، قومیت کی موجودہ صورت ، لگاتار ترقی کی ضرورت ، اور پچھلے چند ماہ کی آئینی اور انتظامی تبدیلیوں کو مدِنظر رکھ کر آئین کے لئے تجاویز پیش کرنا۔

۳ - تجاویز میں ایسی سفارشات شامل ہوں جن میں بتایا گیا ہو کہ مندرجۂ ذیل مقاصد کس طرح بطریق احسن حاصل کئے جا سکتے ہیں :

(الف) ایک جمہوریت جو خود کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال سکے اور جو اسلامی اصول انصاف ، مساوات اور روا داری پر مبنی ہو۔

(ب) قومی یکانگت کا استحکام اور

(ج) ایک مضبوط اور پائدار نظام حکومت۔

اس زمانے میں بہت سے لوگوں کو خیال ہوا کہ میں جلد بازی سے کام لے رہا ہوں ، نیز یہ کہ مجھے اصلاحات کی جڑیں مضبوط ہو جانے کے لئے کافی وقت دینا چاہئے - ہم نے ان اصلاحات کے نفاذ اور ان کے معقول نتائج کی بنا پر دنیا کی نظروں میں خاصا احترام اور وقار حاصل کر لیا ہے - اگر ہم جلد ہی آئینی حکومت کی طرف لوٹ پڑے تو اس ساری ترقی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا - ایک انگریز دوست نے مجھ سے پوچھا : ''تم آئین رائج کرنے میں اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے کہا : ''میں سمجھتا تھا کہ تم لوگ ایک جمہوریت پسند قوم ہو۔'' اس نے جواب دیا : ''ہاں ، مگر تم موجودہ نظام کے تحت ملک کا انتظام بہت اچھی طرح چلا رہے ہو اور ٹھوس ترقی کر رہے ہو ، اگر تم نے احتیاط نہ کی تو پھر مشکلات میں پڑ جاؤ گے۔''

اپنے ملک میں بھی بعض لوگوں کو جن میں میری کابینہ کے کچھ ممبر بھی شامل تھے ، یقین تھا کہ ہماری اصلاحات سے زمینداروں ، سیاست دانوں اور اسی قسم کے دوسرے گروہوں کے ذاتی مفادات کو سخت نقصان پہنچا تھا - یہ لوگ مجھے ہٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے ، اور پچھلے چند برس میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کو سب مل کر خاک میں ملا دیں گے۔

میں عام آدمیوں کے احساسات سے بھی بخوبی واقف تھا ۔ بعض نے کہا کہ میں انھیں دوبارہ انسان نما بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں ، اور یہ کہ لوگوں کے دلوں سے قانون کا احترام پھر اٹھ جائے گا ۔ بدعنوانی اور حصول اقتدار کی دوڑ پھر شروع ہو جائے گی ، اور ماضی میں سیاست دانوں نے جو گل کھلائے تھے ویسی ہی صورت پھر پیدا ہو جائے گی ۔ میں خود بھی سمجھتا تھا کہ ذرا ڈھیل دے دی گئی تو سیاست داں باؤلے ہو کر نکل پڑیں گے اور میرے سب کئے دھرے کو ملیا میٹ کر دیں گے ۔ اخبارات بھی ساتھ ہو جائیں گے کیونکہ جو اخبارات غیر ذمہ داری کی تلقین کرتے ہیں اور گورنمنٹ کے مخالفوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں ان کی اشاعت خوب بڑھتی ہے ۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جن لوگوں نے اصلاحات سے فائدے اٹھائے ہیں وہ نہ اتنے طاقت ور ہیں نہ اتنے منظّم کہ اپنی نئی حیثیتوں پر جمے رہیں ۔ چنانچہ دباؤ ڈالنے والے گروہوں اور اہل غرض کی دستبرد سے ان کی اور نئے قوانین کی حفاظت میرا ہی کام ہوگا ۔

تاہم میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہرچند ابھی ہماری تمام اصلاحات کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئیں ، بہتر ہے کہ ایک آزمائش کر لی جائے ، اور اس سے آگے لوگوں کو اپنا کام خود جاری رکھنے کا موقع دیا جائے ۔ یہ لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اصلاحات کو اپنائیں اور آگے بڑھائیں ۔ اس فیصلے پر پہنچنے میں مجھ پر کوئی اندرونی یا بیرونی دباؤ نہیں پڑا ، لیکن مجھے اس اہم ذمہ داری کا زیادہ احساس تھا جو میں نے ملک کو صحیح قسم کا آئین دینے کے لئے لے رکھی تھی ۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے پاس مسئلے کا حل موجود ہے اور میں اسے بروئے کار لانا چاہتا تھا ۔

میں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اعلان کیا تھا کہ میں ۱۹۵۶ء کے آئین سے ''ضروری حد تک قریب رہ کر'' عمل کرنا چاہتا ہوں ۔ اگرچہ مارشل لا ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت جاری کیا گیا تھا مگر اس کے مؤثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مارشل لا نے اقتدار کا ایک مرکز پیدا کر دیا تھا جو خود ۱۹۵۶ء کے آئین میں موجود نہ تھا ۔

میں نے آئندہ آئین کے لئے کئی قطعی تجاویز سوچ رکھی تھیں، لیکن میں نے کہا کہ ''میں کمیشن کی سفارشات کو پورے طور پر ماننے کے لئے تیار ہوں خواہ میرے خیالات سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں ان کا میری تجاویز سے بہتر اور ملک کے لئے مفید ہونا شرط ہے۔''[1] علاوہ ازیں کمیشن کو ''پوری آزادی اور پورے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ ایسی سفارشات کرے جنہیں وہ ملک کے لئے موزوں تصور کرتا ہو۔ اس کام میں سوائے اس کے اپنے ضمیر اور پاکستان سے اپنی محبت کے اور کوئی عنصر اس پر اثر نہ ڈال سکے گا۔''[2]

کمیشن کے قیام کے بعد اس کی رپورٹ کا انتظار کیا گیا۔ یہ رپورٹ مجھے ٦-مئی ١٩٦١ء کو پیش کی گئی۔ کمیشن نے پاکستان میں پارلیمانی نظام حکومت کی ناکامی کی بڑی وجہ قرار دی تھی: ''رہنمائی کا فقدان جس کی بنا پر منظم اور باضابطہ پارٹیاں نہ بن سکیں، اس کے علاوہ سیاست دانوں میں بلند سیرتی کی کمی، اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کی بے جا دخل اندازی۔'' ان حالات کے تحت کمیشن نے سفارش کی تھی کہ پاکستان میں ''حکومت کی کوئی ایسی شکل ہونی چاہئے جس میں ایک شخص پوری طرح بااختیار ہو اور ایک آزاد مقنّنہ ہو جو مؤثر طور پر اس کی نگرانی کرے۔ مقنّنہ کے ممبر ایسی پوزیشن نہ رکھتے ہوں کہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لئے سیاسی دباؤ ڈال کر نظم و نسق میں مداخلت کر سکیں۔'' کمیشن نے ایک نیم وفاق ڈھانچے کے ماتحت ایک مضبوط مرکز کی بھی پُرزور سفارش کی۔

کمتر افراد کے اس خیال کے پیش نظر کہ مرکز کو صرف تین محکمے دئیے جائیں، یعنی دفاع، معاملات خارجہ اور کرنسی، آئینی کمیشن نے لکھا:

یہ خیال جن وجوہ کی بنا پر ظاہر کیا گیا تھا، ان میں سے ایک

١- کراچی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب، ١٥ - جنوری ١٩٥٩ء
٢- کانسٹی ٹیوشن کمیشن رپورٹ (کراچی ١٩٦١ء) صفحہ ٢ و ٣ -

یہ تھی کہ چونکہ ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور میں آزاد ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس لئے تمام صوبے خود مختار ہونے چاہئیں، لیکن قرار داد لاہور میں مشرق پاکستان کو ایک ایسا صوبہ متصور کیا گیا تھا جس میں پورا بنگال اور آسام شامل تھے۔ اس صوبے میں صنعتیں بھی تھیں اور اسے وسیع اقتصادی ذرائع بھی حاصل ہوتے، اس لئے اسے خود مختار صوبہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس وقت یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ سابق بنگال اور پنجاب کے صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے گا، اور پاکستان کو بنگال کا جو نصف مشرق حصہ ملے گا وہ صنعت و حرفت سے عاری ہوگا۔ ان صوبوں کی تقسیم بعد کو ظہور میں آئی، جو غیر منقسم ہندوستان کی اکثریت والی قوم کی اس بالکل آخری کوشش کا نتیجہ تھی کہ بر صغیر کی تقسیم رک جائے۔ اگر قرار داد لاہور کے وقت یہ پتہ چل جاتا کہ ان صوبوں کو تقسیم کیا جائے گا، نیز یہ کہ پاکستان مشرق میں صرف موجودہ مشرق پاکستان پر مشتمل ہوگا تو مسلم لیگ اسے کبھی خود مختار صوبہ تصور نہ کرتی، کیونکہ صنعتی ترقی کی عدم موجودگی میں ممکن ہی نہ تھا کہ مشرق پاکستان ایک خود مختار یونٹ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ جس وقت قرار داد لاہور منظور کی گئی تھی اس وقت بر صغیر کو دو خود مختار ملکوں میں تقسیم کرنے کا خیال عملی طور پر محال سمجھا جاتا تھا۔ ہماری رائے میں متذکرۂ بالا قرار داد کی لفظی پابندی پر اصرار کرنا اور اس امر کو نظر انداز کرنا کہ پاکستان کے موجودہ بازو بغیر ایک مضبوط مرکز کے ترقی بھی کر سکتے ہیں اور اپنے معاملات کو سنبھال سکتے ہیں یا نہیں، نہایت غیر دانشمندانہ اور غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی۔[1]

کمیشن نے ایک دو ایوانی مقننہ، ایک نائب صدر، محدود بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر براہ راست انتخاب، اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی سفارش کی۔

کمیشن نے صدارتی نظام حکومت، وفاقی ڈھانچے اور مضبوط مرکز

۱- کانسٹی ٹیوشن کمیشن رپورٹ (کراچی ۱۹۶۱ء) صفحہ ۳۰ تا ۳۱

کے قیام کی جو تجاویز پیش کی تھیں ان کو تو میں نے منظور کر لیا ، لیکن میں دو ایوانی مقننہ اور نائب صدر کے عہدے کی سفارش کو منظور نہ کر سکا ۔ حق رائے دہی کا مسئلہ مقننہ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ، جس نے اپریل ۱۹۶۴ء میں فیصلہ کیا کہ بنیادی جمہوریتیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور صدر کے عہدے کے انتخابات کے لئے انتخابی ادارے کے بطور کام کریں گی ۔

میں آئینی کمیشن کے کام سے یقیناً بڑا متاثر ہوا ۔ اس نے ایک ایسی دستاویز تیار کی تھی جو پوری توجہ کی مستحق تھی اور مجھے یاد ہے کہ میں نے کیبنٹ کمیٹی کی رہنمائی کے لئے جو اس رپورٹ کا جائزہ لے رہی تھی اس پر تفصیلی تبصرہ کیا تھا ۔

میں نے بذات خود جو تجزیہ کیا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پاکستان کو ایک مضبوط حکومت کی ضرورت ہے جو ایسے فیصلے کرنے پر قادر ہو جنھیں شاید عام طور پر پسند نہ کیا جائے ، لیکن جن کی ملک کی سلامتی، سالمیت اور بالخصوص ترقی کے لئے اشد ضرورت ہے ۔ ہم اس تعیش میں کہاں پڑ سکتے تھے کہ کوئی ایسا نظام بنائیں جو حکومت کے وجود کو دباؤ ڈالنے والے گروہوں کی من مانی کارروائیوں کا تابع کر دے ۔ اس بات پر میں کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھا ۔

ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی حالات کا مقابلہ کر کے اکثر کہا جاتا ہے کہ کیا وجہ ہے ہندوستان والے تو پارلیمانی جمہوریت کو چلا سکیں اور ہم اس میں ناکام رہیں ۔ اول تو قومی شعور ہندوؤں میں بر صغیر کے مسلمانوں سے بہت عرصے پہلے پیدا ہو گیا تھا ۔ انڈین نیشنل کانگرس بہت عرصے پہلے قائم ہو چکی تھی ۔ ہندوؤں میں وہ اختلافات نہ تھے جو مسلمانوں میں پائے جاتے تھے ۔ ہندوؤں کی کئی جماعتیں تھیں مگر وہ سب بنیادی باتوں پر متفق تھیں ۔ مسلمان آپس میں بٹے ہوئے تھے ۔ بعض مسلمان ہندوؤں کے ساتھ نبھانے کی کوشش کرنا چاہتے تھے ، گویا کہ انہیں ہندو قومیت کے حلقے میں کوئی مقام مل سکتا تھا ، مگر مسلمانوں کی اکثریت جانتی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندو اکثریت

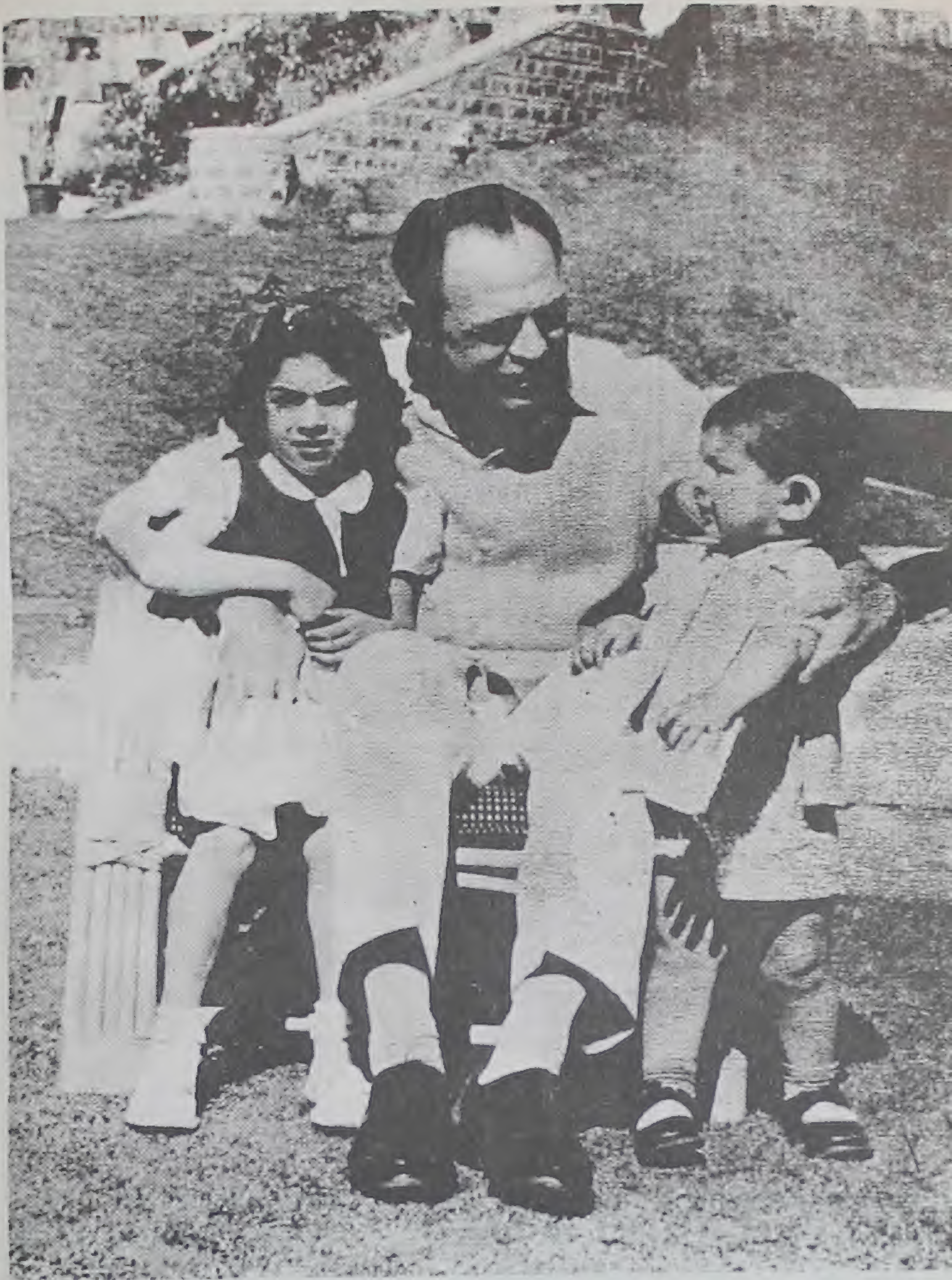
ان پر غلبہ پا لے گی ۔ ہندوؤں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو یہ خیال کرتے ہوں گے کہ مسلمانوں کو گوارا کر لیا جائے ، لیکن ان کی اکثریت یا تو مسلمانوں کو ملک بدر کر دینا چاہتی تھی یا ان کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی تھی ۔ رہی یہ بات کہ ہندو اب تک پارلیمانی نظام کے تحت جمہوری حکومت کو قائم رکھے ہوئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ نظام ہندوستان میں ہمیشہ قائم رہے گا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں تبدیلیاں آئیں گی ۔ تحریک آزادی نے وہاں کے لوگوں میں جو ولولہ اور اتحاد پیدا کر رکھا تھا وہ زائل ہوتا جا رہا ہے ۔ ذاتی مناقشات ، علاقائی تنازعات اور لسانی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کانگرس پارٹی کا ٹوٹنا لازمی ہے ۔ جس وقت ایسا ہوگا تو ہندوستان کو بھی قدرے بعد وہی صورت حال درپیش ہوگی جو ہمیں اس سے پہلے درپیش ہوئی ۔

اب پھر آئینی کمیشن کی رپورٹ کی طرف آئیے ۔ حق رائے دہی اور ووٹنگ کے طریق کے سوال پر میں نے کمیشن کے خیالات سے اختلاف کیا تھا ۔ کمیشن نے محدود حق رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات کے طریق کی سفارش کی تھی ۔ اس نے کہا تھا کہ حق رائے دہی کی توسیع اور تعلیم کی اشاعت پہلو بہ پہلو ہونی چاہئے اور ہمارے موجودہ حالات کے تحت حق رائے دہی کو پاکستان کے صرف ان شہریوں تک محدود کر دینا چاہئے جو یا تو اتنے پڑھے لکھے ہوں کہ وہ سیاسی مباحث کو سمجھ سکیں ، یا کافی جائداد رکھتے ہوں کہ ''ملک کے ساتھ ان کا مفاد وابستہ ہو۔،، کمیشن نے سفارش کی کہ حق رائے دہی کی ایک کمیٹی قائم کی جائے جو ایک سال کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کرے ۔ اس رپورٹ میں مطلوبہ معیار کا تعین کیا جائے ۔ تاکہ اگلی میعاد کے براہ راست انتخابات کے لئے وقت پر انتخابی فہرستیں تیار کی جا سکیں ۔

میں یہ بات نہ سمجھ سکا کہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو انتخابی ادارہ کیوں قرار نہ دیا جائے ۔ ہمارے پاس بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب شدہ قوم کے اسی (۸۰) ہزار نمائندے موجود تھے، جو فی الحقیقت پاکستان کی مجلس عظمیٰ کا درجہ رکھتے تھے ۔ یہی لوگ



(۲۳) جلالۃ الملک سلطان فیصل
والیِ سعودی عرب کے ساتھ
راولپنڈی میں۔
۲۱ اپریل سنہ ۱۹۶۶ء



(۲۴) اپنے پوتے پوتی کے ساتھ مری میں ۱۱ جون ۱۹۶۱ء

صدر اور مقننہ کے اراکین کا انتخاب کیوں نہ کرتے؟ ان کو اس بنا پر خارج کرنا کہ ان میں سے کچھ لوگ غیر تعلیم یافتہ تھے، اپنی علمیت کا بے جا زعم ہی کہا جا سکتا تھا۔ یہ اسّی (۸۰) ہزار ممبر سابقہ اسمبلیوں کے ان اسّی (۸۰) ممبروں سے یقینی طور پر بہتر تھے جو پارلیمانی حکومتوں کے زمانے میں حکومتوں کو بناتے اور بگاڑتے رہے تھے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو انتخابی حلقہ قرار دینے کے خلاف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ ان کی تعداد محدود ہے اس لئے ان پر بآسانی رشوت اور دوسرے ناجائز ذرائع سے اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ بیشک یہ درست ہے کہ بعض انتخابی حلقوں میں خصوصاً بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں جہاں مالدار لوگوں کی کثرت ہے ان ممبروں کو روپے سے ورغلایا جاتا ہے، مگر اس کے قصوروار فقط بنیادی جمہوریت کے ممبر ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ صاحب ثروت امیدوار ہیں جو ان کو غیر دیانت دار بناتے ہیں اور رشوت دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں۔ مجھے کراچی کے ایک حالیہ ضمنی انتخاب کا حال معلوم ہوا ہے جس میں ایک امیدوار کے مخالفین نے اسے شکست دینے کے لئے ایک سیدھا سادا مگر نہایت مؤثر نسخہ استعمال کیا۔ یہ لوگ ووٹروں کے حلقے میں پھرتے اور ان سے کہتے کہ فی ووٹ اتنا روپیہ طلب کرو۔ بعض لوگ اس قسم کی ترغیب سے بچ نہیں سکتے۔ اگر انتخابات براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جاتے تب بھی یہی صورت پیش آتی۔ اس وقت انتخاب لڑنا اور بھی مہنگا سودا بن جاتا، اور صرف کروڑ پتی ہی اس کی جرأت کر سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انتخابات میں جو غیر دیانت‌داری برتی جاتی ہے اس کو مٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔ مشکل یہ ہے کہ جب تک لوگ سیاسی شعور نہ رکھتے ہوں اور حق رائے دہی کو کسی اصول پر استعمال کرنے کی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں، آپ کتنی ہی قانونی پابندیاں لگا دیجئے غیر دیانت داری باقی رہے گی۔

میرے دماغ میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ جب تک ہمارا تعلیمی و اقتصادی معیار اور سیاسی ذمہ داری کی سطح خاصی حد تک بلند نہ ہو جائے، بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے بالواسطہ انتخابات کا

طریقہ ھی زیادہ مفید ثابت ہوگا ۔ علاوہ ازیں اگر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کی اہمیت کو کسی صورت سے بھی کم کیا گیا تو ملک میں سخت ابتری اور گڑبڑ پھیل جائے گی ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قوم کے نمائندوں نے نظم و نسق کی مختلف سطحوں پر سرکاری افسروں کے مساوی درجہ اور حکومت کا کاروبار چلانے میں براہ راست دخل حاصل کیا تھا ۔ اگر نمائندہ حکومت کی بالائی سطح کی تشکیل میں ان ممبروں کو نظر انداز کیا گیا تو اس کی سخت مخالفت ہوگی ۔ یہ نظام ملک میں بڑی تیزی سے جڑ پکڑ رہا تھا اور سرکاری اداروں اور قوم کے نمائندوں میں اشتراک عمل پیدا ہو رہا تھا ۔

میں کمیشن کی اس سفارش سے بھی متفق نہ ہو سکا کہ نائب صدر کا عہدہ رکھا جائے جسے صدر اپنے کچھ فرائض تفویض کر دے ۔ کمیشن کا خیال تھا کہ نائب صدر ملک کے ایک بازو کی اور صدر دوسرے بازو کی نمائندگی کرے ۔ یہ خیال کہ صدر کے مشکل فرائض کی انجام دہی میں نائب صدر اس کا ھاتھ بٹا سکے گا درست نہ تھا ۔ اس کے سامنے صورت حال کا پورا نقشہ نہ آسکتا تھا ۔ بڑے بڑے مسائل صدر ھی کے پاس جاتے اور نائب صدر کی ذمہ داری کو دفتر کی دستوری کارروائیوں تک محدود رکھنا مناسب نہ تھا ۔ یہ خیال کہ نائب صدر کی حیثیت انتخابی ساتھی کی ہو خود بھی دراصل کچھ معنی نہ رکھتا تھا ۔ سب سے اہم ضرورت بہرحال یہ ہوتی کہ صدر کے عہدے کے لئے قابل ترین آدمی تلاش کیا جائے کیونکہ اسی پر بہت سی باتوں کا دار و مدار ہوتا ۔ اگر اسے کسی دوسرے درجے کے آدمی کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا تو وہ نقش جو انتخابی فیصلے کا سرچشمہ تھا دھندلا جاتا ۔

اسی طرح یہ دلیل بھی کچھ جان نہ رکھتی تھی کہ انتخابی ساتھی اپنے صوبے میں صدر کے لئے ووٹ حاصل کرے گا ۔ صدارت کے امیدوار کو ایک قومی شخصیت ہونا چاھئے جسے ملک کے تمام علاقوں کے لوگوں کا اعتماد حاصل ہو ۔ اگر وہ ملک کے ایک حصے میں سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لئے نائب صدر کا محتاج ہوگا تو وہ کبھی اعلیٰ درجے کا صدر نہ بن سکے گا ۔ علاوہ ازیں ملک کے

ایک بازو کی نائب صدر کے ذریعے نمائندگی لازمی طور پر مشرق و مغربی صوبوں میں تنازعات پیدا کر دیتی اور خود صدارتی کابینہ میں پھوٹ پڑ جاتی - البتہ ضرورت ایک ایسے قائم مقام کی تھی جو صدر کی وفات یا ملک سے اس کی غیر حاضری کی صورت میں ملک کا انتظام سنبھال سکتا - یہ مقصد اس قسم کی رسم قائم کرنے سے حاصل ہو سکتا تھا کہ اگر صدر ایک بازو سے تعلق رکھتا ہو تو قومی اسمبلی کا سپیکر دوسرے بازو سے، اور وہ صدر کی غیر موجودگی میں اس کی قائم مقامی کرے -

آئینی کمیشن نے میزانیہ اور مطالبات زر کے سلسلے میں صدر اور مقننّہ میں اختلاف پیدا ہو جانے کی صورت میں ایک بڑے الجھے ہوئے طریق کار کی سفارش کی تھی - میں نے کمیشن کے اس خیال سے تو اتفاق کیا کہ صدر کو ویٹو کا حق جزوی طور پر حاصل ہونا چاہئے ، مگر دوسری سفارشات کو منظور نہ کیا ، جن میں کہا گیا تھا کہ اگر صدر اور مقننّہ کے اراکین کا اختلاف مٹ نہ سکے تو ان کا از سر نو انتخاب کرایا جائے - میں نے محسوس کیا کہ اگر ہم اس طریق پر کاربند ہوئے تو حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکے گا - کمیشن کا کہنا تھا کہ مقننّہ کے ممبر تازہ انتخابی مقابلے کے ڈر سے غیر ذمہ دارانہ طور پر صدر سے اختلاف نہ کو سکیں گے - لیکن اگر ہم بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو انتخابی ادارہ قرار دیں، جیسا کہ ہونا چاہئے، تو مقننّہ کے ایک عام رکن کے لئے دوبارہ انتخاب لڑنا کوئی بڑی بات نہ ہوگی - اس کے برعکس صدر کے سر پر یہ زبردست مہم آ پڑے گی کہ وہ ملک بھر میں انتخابی دورے کرتا پھرے کیونکہ اس کا حلقۂ انتخاب اسّی ہزار ووٹروں کی پوری جمعیت پر مشتمل ہوگا -

اس کا علاج یہ تھا کہ صدر اور مقننّہ کے درمیان اختلاف کی وجوہ کو کم سے کم کر دیا جائے - میزانیہ کے دو حصے ہوں ایک حصے میں نظم و نسق اور ترقیاتی منصوبوں کے مسلسل اخراجات جو پچھلے سال سے چلے آ رہے ہوں شامل ہوں ، اور دوسرا حصہ اخراجات کی نئی مدّوں پر مشتمل ہو - پہلے حصے کے اخراجات میں کمی کرانے

کے لئے صدر کی منظوری ضروری ہو اور دوسرا حصہ مقننّہ کے اراکین کی رائے پر موقوف ہو۔

(۵)

آئینی کمیشن کی تجاویز کا جائزہ راولپنڈی میں چوبیس سے لے کر اکتیس اکتوبر ۱۹۶۰ء تک گورنروں کی کانفرنس میں لیا گیا۔ میں نے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اس آئین کا اعلان کیا، میں نے کہا: ''نیا آئین جمہوریت اور نظم و ضبط کی آمیزش ہے۔ اور یہ دونوں ایک آزاد معاشرے کو چلانے کے لئے جو مستحکم حکومت اور ٹھوس نظم و نسق رکھتا ہو دو قابل عمل شرطیں ہیں۔''

نئے آئین کو عام طور پر بحسن و خوبی قبول کر لیا گیا۔ اگرچہ بعض اخبارات نے اس پر بڑی نکتہ چینیاں بھی کیں۔ بعض پرانے سیاست دانوں نے سوچا کہ اگر یہ نیا آئینی منصوبہ رواج پا گیا تو ہماری کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ چودھری محمد علی جو اُنیس سو چھپّن (۱۹۵۶ء) کے آئین کے خالق تھے، شدید ترین نکتہ چینی کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کو محسوس ہوا کہ ان کی ابدی شہرت چھینی جا رہی ہے۔ آئین کے جاری ہونے پر ملک کا رویہ ایک ایسے گھوڑے کا سا تھا جو قابو میں آ گیا ہو مگر سدھایا نہ گیا ہو۔ جب آپ اسے چمکاریں یا دانہ دیں وہ کاٹنے کو دوڑے گا اور دولتیّاں چلائے گا۔ اول اول یہی صورت حالات رہی اور کوئی سال بھر قائم رہی۔ اس کے بعد حالات پُرسکون ہو گئے اور استحکام کی خوبی کو تسلیم کیا جانے لگا۔

ابتدائی دو ایک سال کے دوران میں قومی اسمبلی کے اندر اور باہر، اخبارات کے ذریعے، سابق سیاست دانوں یا ایبڈو زدہ[1] سیاست دانوں کی زبانی مجھ پر جو نکتہ چینیاں کی گئیں ان کا مقصد محض یہ تھا کہ میرے عزم کو توڑا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اپنے مقصد

۱- وہ سیاست داں جنھوں نے آرڈی ننس برائے مجالس منتخبہ (نا اہلیت) ۱۹۵۹ء کے تحت سیاست سے کنارہ کشی منظور کی تھی۔

میں کامیاب ہو گئے تو میرے لئے ان کا تابع فرمان بن جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا - وہ اپنے اقتدار کو از سر نو استوار کرنا چاہتے تھے اور اگر بادشاہ نہیں تو بادشاہ گر تو ضرور ہی بن جانا چاہتے تھے - وہ ملک میں ایسی صورت حال پیدا کرنا چاہتے تھے جس سے نہ صرف میری پوزیشن (جو چنداں اہم بات نہ تھی) بلکہ ملک کی بقا ہی ان کی خوشنودی پر منحصر رہ جاتی - وہ مجھ کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ میں ان کے بغیر ملک کے انتظام کو نہ چلا سکوں گا - بس یہی ان کی چال تھی -

جس زمانے میں آئین کے خلاف تحریک زوروں پر تھی ، مجھے ایک سیاست داں کے خیالات کا علم ہوا ، جن کا لبّ لباب یہ تھا : ”یہ صدر بڑا عجیب آدمی ہے - اسے معلوم ہے کہ سب کے سب لوگ اس کے خلاف ہیں ، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں ہی تنہا وہ شخص ہوں جو اس شور شرابے کو روک سکتا ہوں اور کوئی سمجھوتا کرا سکتا ہوں ، مگر دیکھو ، اس کو ولایت سے آئے دو ہفتے ہو چکے ہیں اور اس نے مجھ سے کوئی پیغام سلام نہیں کیا - اس کے دماغ میں ضرور کچھ خلل ہے-،، ان کا خیال یہ تھا کہ میں گھٹنے ٹیک دوں گا اور کہوں گا کہ اچھا بھئی آپ جیتے اور میں ہارا-

عجیب بات یہ تھی کہ ان کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ملک کا انتظام میرے بغیر نہیں چلا سکتے - وہ مجھے اس وقت تک شہ نشیں پر بٹھائے رکھنا چاہتے تھے جبتک کہ میں انہیں من مانی کرنے کی آزادی دوں - وہ اپنے بقول ، ذاتی طور پر میرے مخالف نہ تھے لیکن وہ میرا زور توڑنا چاہتے تھے - وہ مجھے ایسی پوزیشن میں رکھنا چاہتے تھے کہ میں انہیں ملک کو تباہ کرنے سے روک نہ سکوں - وہ لچھّے دار تقریروں اور کھوکھلی نعرہ بازیوں کے ذریعے قوم تک رسائی چاہتے اور اسے خود غرضانہ مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے درپے تھے - ادھر میں ہر قیمت پر ان کو روکنے کا تہیہ کر چکا تھا - مجھے خداوند کریم اور اپنی قوم پر بھروسا تھا جس نے مجھے اپنے عزم پر قائم رکھا - میں جانتا تھا کہ ہمارے لوگ نیک دل ہیں ، مگر بھولے بھی ہیں اور آسانی سے بہکائے

جا سکتے ہیں۔ یہ میرا عقیدہ تھا جس نے میری ڈھارس بندھائے رکھی، لیکن بڑی آزمائش کے موقعے بھی آئے میں اپنے دل میں کہتا: ”نیا آئین جاری کرنے پر اس قسم کا غیر ذمہ دارانہ ہیجان قدرتی بات ہے۔ مارشل لا کی بندشیں اٹھ گئی ہیں، لوگوں کو اپنے دل کا بخار نکال لینے دیا جائے۔“ میں جانتا تھا کہ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آجائیں گے، لیکن اس کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ میں اپنے ارادے پر قائم رہتا ہوں یا نہیں۔ اس آئین کا آخری امتحان ۱۹۶۵ء کا صدارتی انتخاب ہوگا۔ ملک کی تمام بالغ آبادی پہلی مرتبہ اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے ملک کے سربراہ کا انتخاب کرے گی۔ اس انتخاب کے نتائج سے پتہ چل سکے گا کہ قوم اس آئین کی حامی ہے یا نہیں۔ اس وقت تک لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور ان کی ذہنی تربیت کا کام جاری رہنا چاہئے۔

لوگوں کو ”سمجھوتے“ کا اصول سیکھنا چاہئے کہ کچھ لو اور کچھ دو۔ اس کے بغیر کوئی جمہوری نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنی ساری باتیں نہیں منوا سکتا۔ اقلیت کو اکثریت کا فیصلہ قبول کرنا چاہئے۔ نکتہ چینی کا حق ضرور دیا جانا چاہئے، لیکن تخریب کا نہیں۔ میرے مخالف بعض اوقات کہا کرتے ہیں: ”یہ شخص ڈکٹیٹر بن گیا ہے۔ اس نے ساری طاقت اپنے ہاتھ میں رکھ لی ہے۔“ کس طرح؟ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔ بہرحال ہر نظام کے تحت پارلیمانی ہو یا صدارتی، شہنشاہی ہو یا ڈکٹیٹری، کوئی نہ کوئی شخص تو ایسا ہوگا ہی جسے بااختیار ٹھہرایا جائے۔ حکومت کا انتظام چلانے میں کئی لوگوں کی امداد شامل ہوتی ہے، لیکن آخری فیصلہ تو ایک ہی شخص کو کرنا پڑتا ہے۔ تمام تاریخ میں ایسا ہی ہوا ہے اور آج کل بھی دنیا میں ایسا ہی ہے۔ اگر کسی شخص کو قوم نے چنا ہے اور وہ اچھا آدمی ہے تو اس پر بھروسا اور اس سے پورا پورا تعاون کرنا ہی پڑتا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس ملک میں اتنی آزادی کبھی نہ تھی جتنی آج ہے۔ متعدد بار مجھ پر الزامات لگائے گئے، برا بھلا کہا گیا، بدنام کیا گیا اور میرے متعلق طرح طرح کی افواہیں

پھیلائی گئیں ، بالکل جھوٹ اور بلاوجہ اور یہ ایسے لوگوں کی طرف سے ہوا جن میں بعض ملک بھر کے چھٹے ہوئے بدباطن لوگ تھے ، اور میں نے اسے برداشت کیا ، محض اس وجہ سے کہ میں اس نظام کو پروان چڑھانا اور اس کی حفاظت کرنا چاہتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ یہ برباد ہو کر رہ جائے ۔

میرا خیال ہے کہ اگر لوگ اپنے سربراہ کی عزت کرتے ہوں تو اس کو ڈکٹیٹر بننے کی ضرورت نہیں ۔ لوگ اپنا بھلا اسی میں دیکھتے ہیں کہ اس کی پیروی کریں ، کیونکہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے اور اس کے بغیر زندگی محال ہے کہ ان کا کوئی رہنما بھی ہو ۔ کوئی اپنے لیڈر کو پسند کرتا ہو یا ناپسند فطرت اسے اس کی حمایت پر مجبور کر دیتی ہے ، کیونکہ انسان غیر شعوری طور پر جانتا ہے کہ اس کی سلامتی اور مستقبل کا انحصار اسی پر ہے ۔ لیکن قوم کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لئے رہنما کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ پُر خلوص ہو ، بے لوث ہو اور دل میں خدا کا خوف رکھتا ہو ۔

سابقہ تجربے کو نظر میں رکھتے ہوئے ، میں نے آئین میں کچھ احتیاطی دفعات رکھ لی تھیں کہ منتظمہ اندرونی دباؤ کی روک تھام کر سکے اور مقننہ کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ بھی نہ پڑے ۔ حزب اختلاف یہ بات مزے سے بھول گئی کہ خود قوم نے مجھے مختار بنایا تھا ، وہ برابر کہے جاتی ہے کہ یہ آئین اس کے سر تھوپا گیا ہے ۔ وہ قوم کے نمائندوں سے کہہ سکتے ہیں کہ اس آئین کو بدل دیا جائے ۔ آئین میں اس امر کی واضح گنجائش موجود ہے کہ اگر کوئی بات لوگوں کی خواہشات کے خلاف ہو تو مقننہ کے ممبر اس میں ترمیم کر سکتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ صدر سے باضابطہ مواخذہ کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں ۔ لیکن اس خیال سے کہ ان گنجائشوں کا فضول استعمال نہ کیا جائے ، ان کو عمل میں لانے کے لئے کچھ پابندیاں رکھی گئی ہیں ۔

آئینی کمیشن نے صدر ، گورنروں ، وزیروں ، چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے ججوں سے باضابطہ مواخذہ کرنے کی بھی گنجائش رکھی تھی ۔ اگر صدر سنگین بد اعمالی یا آئین کی دانستہ

خلاف ورزی کا مرتکب ہو تو مقننّہ کے منتخب شدہ ممبروں کی ایک چوتھائی کی تحریک پر صدر سے مواخذہ کیا جا سکتا تھا ۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کی قرار داد کی تحریک پر قومی اسمبلی کے کل ممبروں کی ایک تہائی کے دستخط ہونے ضروری ہیں ۔ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ اگر مقننّہ کے ممبروں کی دو تہائی تعداد صدر کو قصوروار پائے تو صدر کو اپنے عہدے سے دست بردار ہونا پڑے گا ۔ ہم نے اس میں یہ ترمیم کی کہ تین چوتھائی تعداد ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ صدر کو غیر ذمہ دارانہ اور انتقامی الزامات سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ اگر قومی اسمبلی کے ممبروں کی کل تعداد کا نصف صدر کی برطرفی کی قرار داد کی حمایت نہ کرے تو مواخذے کی قرار داد پیش کرنے والے تمام ممبر اسمبلی کی رکنیت سے محروم ہو جائیں گے۔

میری رائے تھی کہ مواخذہ کئے جانے والے عہدوں کی فہرست سے گورنروں اور وزیروں کو نکال دیا جائے ، کیونکہ ان کا تقرر صدر کے ہاتھوں ہوتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے کہ اگر صدر مقننّہ میں گورنروں اور وزیروں کی مخالفت دیکھے گا تو خود ہی ان کو برطرف کر دے گا ، تاکہ اسے مقننّہ کا اعتماد حاصل رہے ۔ صدر کے نامزدگان کی حیثیت سے ان کو مقننّہ کے فیصلے پر چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی ۔

آئینی کمیشن نے آئین میں ترمیم کرنا بڑا آسان بنا دیا تھا ۔ اس نے سفارش کی تھی کہ ہر ایک ترمیم کے لئے صدر کی منظوری اسی طرح ضروری ہوگی جس طرح مقننّہ کے اور فیصلوں کے لئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ترمیم کے حق میں دو تہائی اکثریت کی حمایت ضروری ہوتی۔ اگر صدر منظوری نہ دیتا اور بل کو مقننّہ میں واپس بھیج دیتا تو اس کے ویٹو کے اثر کو زائل کرنے کے لئے تین چوتھائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ۔ اس پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ترمیمی بل کو صدر کے پاس منظوری کے لئے بھیجنے سے پہلے اس کو دو تہائی اکثریت کی حمایت حاصل ہونی چاہئے ، لیکن اگر صدر اس بل کو مقننّہ میں واپس بھیج دے تو اس کو منظور کرانے کے لئے تین چوتھائی اکثریت کی حمایت ضروری ہوگی ۔ تاہم جب بل دوبارہ

صدر کی منظوری کے لئے آئے تو صدر اسے ایک بار پھر مقننہ میں بھیجنے کا مجاز ہوگا ۔ اور اگر مقننہ کو اب بھی اس بل پر اصرار ہو تو صدر اسے پورے انتخابی ادارے کے پاس استصواب رائے کے لئے بھیج سکتا ہے کہ اس بل کو منظور کیا جائے یا نہیں ۔

قومی اسمبلی آئین کے بارے میں کسی ایسے ترمیمی بل کو جس سے کسی صوبے کی حدود بدل جاتی ہوں اس وقت تک پاس نہیں کر سکتی جبتک کہ متعلقہ صوبے کی اسمبلی کے کل ممبروں کی دو تہائی تعداد ایک قرار داد کے ذریعے اسے منظور نہ کر چکی ہو ۔

آئین کی عمارت متعدد ستونوں پر کھڑی کی گئی ہے جو یہ ہیں : صدارتی نظام ، صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات کی تفویض ، صدر کے ذریعے صوبائی گورنروں کا تقرر ، بنیادی جمہوریتوں کا انتخابی ادارے کی حیثیت سے قیام ، وضع قوانین میں مشاورت کے لئے مشاورتی کونسل برائے اسلامی نظریۂ حیات اور آخر میں منتظمہ اور مقننہ اور منتظمہ اور عدلیہ کے باہمی روابط ۔ ان میں سے اگر کوئی ستون بھی تبدیل کر دیا جائے یا اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو ساری عمارت کمزور ہو جائے گی ۔ آئین کا ڈھانچا اگر قائم رہے گا تو تمام و کمال قائم رہے گا ۔ انتخابی ادارے کے قیام سے بس اتنا ہوا ہے کہ عوام اور صوبائی و مرکزی اسمبلیوں اور صدر کے درمیان ایک اور وسیع اسمبلی قائم کر دی گئی ہے ۔

بات یہ ہے کہ نئے خیالات کو مقبولیت حاصل کرنے میں وقت لگتا ہے ۔ جب ان خیالات سے فوائد حاصل ہونے شروع ہوتے ہیں تبھی ان کے حامی پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ حامی پھر ان خیالات کے مبلغ اور محافظ بن جاتے ہیں ۔ انسانی معاملات میں یہی ہوتا ہے کہ نئے تصورات نئے مفادات کو جنم دیتے ہیں اور اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیتے ہیں ۔

میں نے جو اصلاحات نافذ کیں وہ زبردست مفادات پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہیں ۔ ہرچند ان کو منظم نہیں کیا گیا ۔ ملک میں کروڑوں زن و مرد کھیتی باڑی کرتے ہیں اور زرعی اصلاحات کے ذریعے معقول فائدے اٹھاتے ہیں ۔ ان کے بعد تجارتی ، کاروباری اور

تعلیم یافتہ طبقوں کا نمبر آتا ہے جن کو تعلیم اور ملازمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو رہے ہیں - آج سرکاری ملازمتوں کے لئے موزوں نوجوانوں کا ملنا ایک مسئلہ بن گیا ہے، حالانکہ چند سال پہلے سرکاری ملازمت حاصل کرنا زندگی کی سب سے بڑی تمنا سمجھا جاتا تھا - اب زندگی کی نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں، نئی نئی باتیں ہو رہی ہیں، نئے نئے مقاصد پیدا ہو رہے ہیں، اور ایک وسیع تر نیا متوسط طبقہ ابھر رہا ہے - یہی وہ لوگ ہیں جو آگے چل کر اس آئین کے قائم کردہ نئے نظام کی دیکھ بھال کریں گے - مگر اس کے لئے ایک مدت درکار ہوگی -

میری کوشش یہ رہی ہے کہ اس نئے فلسفے کی نشاندھی کروں جو ہمارے لوگوں کو ایک زیادہ کامل اور زیادہ ترقی پسندانہ زندگی کی طرف لے جائے - یہ فلسفہ ایسا ہونا چاہئے جس پر لوگوں کو یقین ہو اور جس کی حمایت و حفاظت پر وہ دل و جان سے آمادہ ہوں - لوگوں کو ایک ایسے نظام سے ہٹانا جو مدت سے چلا آ رہا ہو اور جس سے لوگوں کو وابستگی ہو، چاہے وہ نظام زندگی کے لئے ناکافی ہی کیوں نہ ہو، بڑا مشکل کام ہوتا ہے - لوگ نئی آزمائشوں کا خطرہ مول لینے کی بجائے سہل انگاری کی وجہ سے پرانے طور طریقوں کو گلے سے لگائے رہتے ہیں - اس کی سب سے نمایاں مثال پارلیمانی نظام حکومت ہے - جیسے ہی میں نے ایک نیا اور زیادہ عملی نظام پیش کیا بعض لوگوں نے یہ ہنگامہ شروع کر دیا کہ میں دائمی اقتدار کے لئے کوشش کر رہا ہوں، حالانکہ یہ بات میرے وہم و خیال سے بہت بعید ہے - البتہ میں جس بات کو دوام دینا چاہتا ہوں وہ ہے ترقی اور نشو و نما کی نئی روایت - مجھے امید ہے کہ میں کچھ لوگوں کو اپنے اس طریق فکر اور طریق حیات کا ہم خیال بنا رہا ہوں - میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس طریق حیات کو دراصل نئی پود ہی سر بلند کر سکتی ہے - ضرورت ہے کہ نئی اور جواں سال قیادت پرانی رہنمائی کی جگہ لے لے - میں ایسے حالات پیدا کر رہا ہوں کہ ہمارے نوجوان اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں، کیونکہ تنہا وہی اس روایت کو آگے بڑھائیں گے اور اس کی اصلاح کریں گے -

میرا بس ایک ہی ذاتی مفاد ہے، اور وہ ہے اس نظام کی حمایت اور حفاظت کرنا جس کے لئے میں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور میں یہ گوارا نہ کروں گا کہ اسے محض ایک کھیل سمجھ لیا جائے۔ آپ اس میں ترمیم کر سکتے ہیں، اس کو بدل سکتے ہیں، لیکن تجربے کی روشنی میں، عقیدہ و یقین کے جذبے کے ساتھ، اور عوام کی بھلائی کے لئے مگر کسی اور سبب سے نہیں۔ صدارتی نظام میں اگر صدر کا عہدہ کسی ایسے شخص کو ملتا ہے جو ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کر سکتا ہو تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ پانچ یا دس برس کے اندر نئے ادارے اچھی طرح جڑ پکڑ لیں، تعلیم اور زیادہ پھیل جائے اور ایک وسیع تر متوسط طبقہ وجود میں آ سکے۔ اس وقت تک ان نئے اداروں کی حفاظت کے لئے خاصے لوگ پیدا ہو جائیں گے۔ آج پاکستان کو بس یہی مسئلہ درپیش ہے۔

پچھلے پارلیمانی نظام اور موجودہ نظام میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ ہرچند موجودہ قومی اسمبلی قوانین وضع کرنے میں خود مختار ہے، مگر وہ حکومت کو بدل نہیں سکتی۔ یہ سچ ہے کہ حزب مخالف کا جوڑ توڑ میں لگے رہنا اور کیچڑ اُچھالنا پہلے کی طرح آج بھی جاری ہے، مگر یہ لازمی بات ہے، خصوصاً اس لئے بھی کہ ہماری نئی پارلیمنٹ کے ممبر ناتجربہ کار ہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ انھیں تقریر اور اظہار خیال کی پوری آزادی حاصل رہے۔

میں یہاں آئین کے بارے میں اپنے ایک غلط اندازے کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نام نہاد سیاسی پارٹیوں کے ارکان کی غداری کے نقصانات دیکھنے کے بعد مجھے امید تھی کہ ہم پارٹی بازی کے بغیر اپنی سیاست کو قائم رکھ سکیں گے۔ چنانچہ اس آئین کا ڈھانچا ایسا بنایا گیا تھا کہ نظریاتی طور پر وہ سیاسی پارٹیوں کے ساتھ بھی کام کر سکے اور ان کے بغیر بھی۔ لیکن آئین رائج کرنے کے بعد جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ سیاسی پارٹیوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مقننہ کے اندر اراکین کو صرف پارٹی کے نظم و ضبط کے تحت ہی منظم کیا جا سکتا تھا۔ مقننہ کے باہر بھی ایک ایسے

ادارے کا ہونا ضروری تھا ، جو لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھ سکے۔ علاوہ ازیں اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ دیہات کے لوگوں پر حکومت کی پالسیوں کی وضاحت کی جائے - یہ کام ایک سیاسی پارٹی ہی کر سکتی تھی - چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ حالات میں ہم سیاسی پارٹیوں کے بغیر اس نظام کو نہیں چلا سکتے - اور میرے خیال میں آئین کے اعلان کے بعد پہلے سال اس لئے ابتری پھیلی رہی کہ مسلم لیگ پارٹی کو از سر نو منظم کرنے میں وقت لگا ، خصوصاً مرکزی اور صوبائی مقننّہ میں - یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ مقننّہ کے ممبر شخصی اوصاف کی بنا پر چنے گئے تھے اور میں ان میں سے بہت کم کو جانتا تھا - میں نے انتخابات سے پہلے صوبائی گورنروں اور سرکاری عہدہ داروں سے کہا تھا کہ یہ انتخابات ہر قسم کے اثرات اور دخل اندازیوں سے پورے طور پر آزاد رہنے چاہئیں - میں نے ان کو تنبیہ کی تھی کہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی شخص نے کسی طریق سے بھی ان انتخابات میں دخل دیا ہے تو مجھے سخت شکایت ہوگی - اگر ہم انتخابات سے پہلے سیاسی پارٹیوں کو بحال کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو مجھے یقین ہے کہ حکومت کو مقننّہ میں بڑی پر زور حمایت حاصل ہو جاتی - مجھے پارٹیوں کو بحال کرنے کا مشورہ تو دیا گیا تھا مگر تاملّ کے ساتھ اور دبے دبے لفظوں میں - انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جس بات سے اسے ضرر پہنچا ہو اس سے حذر کرے اور ہم نے پارٹی سسٹم کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں -

جب میں پاکستان مسلم لیگ میں شامل ہوا تو اس پر ملک میں بڑے تعجب کا اظہار کیا گیا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری طرح اور بھی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہم آئین کو سیاسی پارٹیوں کے بغیر ہی چلا سکتے ہیں - لیکن میرے ایک سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے فیصلے پر سیاست دانوں کو بھی خاصی پریشانی ہوئی ، کیونکہ یہ لوگ مجھ کو الگ تھلگ اور بے آسرا ہی رکھنا چاہتے تھے - سوال یہ تھا کہ جب پارٹیوں کو قانونی طور پر قائم ہونے کی اجازت مل گئی تو کیا میں پارٹی سسٹم سے الگ رہ سکتا تھا؟

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ ایک حزب اختلاف کے قیام میں مدد دیں ۔ یہ درحقیقت بڑا غیر معمولی مطالبہ ہے ۔ میں بھلا یہ کیونکر کر سکتا ہوں جبکہ ہماری بیشتر مخالف پارٹیوں کا نصب العین شدید صوبائیت ، مذہب سے ناجائز فائدہ اندوزی اور غیر ملکی وفاداری پر مبنی ہو؟ ہاں اگر کوئی مخالف پارٹی پاکستان میں مسلم قومیت اور ایک مضبوط مرکز کے لئے کام کرے تو اس کو میری حمایت حاصل ہوگی ۔

بدقسمتی سے خود مقننّہ تک کے اندر حزب مخالف نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے جس سے میں تمام تر اپنی ہی پارٹی پر بھروسا کرنے پر مجبور ہوں ۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ ہونی چاہئے ۔ صدر کو اپنی کابینہ کے لئے مقننّہ کے اندر یا باہر سے لوگوں کو چننے کی پوری آزادی ہونی چاہئے ، اور یہ انتخاب ذاتی جوہر اور مقننّہ کے اندر یا باہر حمایت کی بنا پر ہونا چاہئے ، جماعتی روابط کی بنا پر نہیں ۔ صدر کی کابینہ کا ہمارے حالات کے تحت یک جماعتی کابینہ ہونا ضروری نہیں ، بلکہ غلط ہے ۔

(٦)

آئین پر یہ بحث ختم کرنے سے پہلے میں ایک غیر معمولی صورت حال کا ذکر اور کر دوں جو دونوں صوبوں میں خاصی کشیدگی اور غلط فہمی کا باعث ہوئی ۔ یہ ''عدم مساوات،، کا نعرہ ہے، جس نے بڑی سماجی اہمیت حاصل کر لی ہے اور جس سے عام طور پر یہ مراد لی جاتی ہے کہ دونوں صوبوں میں مساوات قائم نہیں ۔ اس لفظ کا استعمال بڑا غلط کیا جاتا ہے اور اس میں ہر قسم کی شکایتیں اور گلے شکوے آ جاتے ہیں جو اکثر ذاتی قسم کے ہوتے ہیں ۔ اگر کسی ملازمت کے امیدوار میں مطلوبہ صفات نہیں ہوتیں اور اس بنا پر اسے منتخب نہیں کیا جاتا تو وہ اس کا الزام ''عدم مساوات،، پر رکھتا ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی بیوپاری پٹ سن کا کارخانہ کھولنے کے لئے کافی سرمایہ اکٹھا نہیں کر سکتا تو اس کا باعث بھی ''عدم مساوات،، ہی ہوتا ہے ۔ پٹ سن کے کارخانے کا مالک بھی اپنے کاروبار میں نقلی مصنوعات اور ادویہ سازی کا اضافہ نہیں کر

سکتا ، تو وہ خود کو بھی ''عدم مساوات،، کا مارا ہوا قرار دیتا ہے ۔ سیاست دانوں نے اس عام بے صبری کو اپنی غرض کے لئے استعمال کیا اور اسے ایک مقبول سیاسی نعرے میں تبدیل کر دیا ۔ وہ مرکزی حکومت اور مغربی پاکستان کے خلاف اپنی ساری مہم کی بنیاد عدم مساوات پر رکھتے ہیں ۔

عدم مساوات کو سب تسلیم کرتے ہیں اور اس کے مٹانے کی ضرورت کو بھی ۔ لیکن جس بات کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ''عدم مساوات،، ترقی کے راستے کی ایک منزل ہے ۔ آزادی کے وقت پاکستان کے تمام حصے یکساں طور پر ترقی یافتہ یا پسماندہ نہ تھے ۔ مغربی پاکستان کے بعض حصے صنعتی ترقی میں نسبتاً آگے تھے ۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں جدید صنعت نہ ہونے کے برابر تھی ۔ جب برصغیر کے وسطی اور مشرقی علاقوں میں انگریزی حکومت نے اپنے قدم جمائے تو تمام تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کے مرکز کلکتہ میں فورٹ ولیم کے ارد گرد ہی تک رہے ۔ جب ہندوستان براہ راست برطانوی قلمرو میں آ گیا ، تب بھی صورت حال میں کوئی خاص فرق نہ پڑا ۔ مشرقی پاکستان کی حیثیت کلکتہ کے عقبی علاقے ہی کی رہی ۔ ہرچند یہ علاقہ دنیا بھر کے پٹ سن کا پچھتر (۷۵) فی صد حصہ پیدا کرتا تھا ، مگر وہاں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہ تھا ۔ ساری پیداوار خام گنٹھوں کی صورت میں کلکتے بھیج دی جاتی ، جہاں اسے صاف کر کے بیرونی ملکوں کو بھیجا جاتا ۔ نقل و حمل اور مواصلات کی سہولتیں بڑی ابتدائی شکل میں تھیں اور کوئلہ ، گیس ، تیل ، بجلی اور پانی وغیرہ قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوئی کوشش نہ کی گئی تھی ۔

جب مشرقی پاکستان کی نئی پود کو یہ باتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سمجھتی ہے کہ اس کی موجودہ مشکلات کا جواز پیش کرنے کے لئے گذشتہ تاریخ یاد دلائی جا رہی ہے ، ان لوگوں کو ایسے مطالبات پر اکسایا جاتا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں ساری ترقی روک دی جائے ، تاوقتیکہ یہ صوبہ ان کے برابر نہ آ جائے ۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترقی کا جو جذبہ ان کے اندر ہے ، وہ اِسی شدت

کے ساتھ ملک کے دوسرے لوگوں میں بھی موجود ہے۔

یہ بات گمان میں نہیں آ سکتی کہ کوئی حکومت ایک علاقے کے لوگوں کو اس وقت تک اپنی استعداد سے کم کام کرنے پر مجبور رکھے ، جب تک کہ دوسرے علاقے کے لوگ بھی اپنے اندر کام کرنے کی اتنی ہی استعداد پیدا نہ کر لیں ۔ ایک فلاحی ریاست کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ وہ فاصلوں کو کم کرے اور آونچ نیچ کو مٹائے ، لیکن اس طرح کہ جو علاقے پیچھے رہ گئے ہوں انھیں ترقی کے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں ، نہ یہ کہ جو علاقے نسبتاً ترقی یافتہ ہوں ، انھیں ترقی کے مواقع سے محروم کر دیا جائے ۔ یہ ایک فضول اور بے نتیجہ پالسی ہوگی کہ ملک میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ہر طرف ترقی کی سطح کو نیچا کر دیا جائے ۔

مغربی پاکستان میں علاقائی عدم مساوات کا مسئلہ بڑی حد تک اس طرح حل ہو گیا کہ سابق صوبوں کو ایک وحدت میں سمو دیا گیا ۔ اب وہاں تمام ذرائع کو ساجی ترقی کے کاموں میں استعال کیا جا رہا ہے، جس سے سابق صوبائی حدود کا لحاظ کیے بغیر سارے مغربی پاکستان کو یکساں فائدہ پہنچ رہا ہے ۔

مشرقی پاکستان کی اقتصادی ترقی سے مجھے خاص لگاؤ رہا ہے ۔ میں نے سنہ ۱۹۵۴ء والی دستاویز میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کو ایک برابر کے ساجھی کی حیثیت میں لے آنا چاہئے ۔ اس صورت میں یہ صوبہ قومی معاملات میں پوری طرح دوسروں کے ساتھ چل سکے گا ۔ ہرچند مسٹر سہروردی نے سنہ ۱۹۵۷ء میں جب وہ وزیر اعظم تھے ، اعلان کیا تھا کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان کے ساتھ بقدر ۹۸ فی صد مساوات حاصل کر لی ہے ، میں نے یہ امر ضروری سمجھا کہ بین العلاقائی یا علاقائی عدم مساوات دور کرنے کے لئے خود آئین کے اندر گنجائش رکھ دی جائے ۔ آئین میں قانون سازی کا یہ آصول بنایا گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ ہی نہ کیا جائے جس سے کسی خاص زبان ، رسم الخط یا تہذیب و تمدن کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ آئین سوچے سمجھے آصول کے طور پر حکومت کو ہدایت کرتا ہے کہ پس ماندہ طبقوں

اور پس ماندہ علاقوں میں عوام کے تعلیمی و اقتصادی مفادات کو بطور خاص ترقی دینے کا پورا خیال رکھا جائے۔

آئین میں یہ شرط بھی موجود ہے کہ لوگوں کو پاکستان کی ملازمت میں داخل کرتے وقت اس امر کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ ایک علاقے سے نسبت رکھنے والے کام اسی علاقے کے لوگ انجام دے سکیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مرکزی حکومت میں پاکستان کے تمام حصوں کے لوگوں کو اور صوبائی حکومتوں میں صوبوں کے تمام حصوں کے لوگوں کو سرکاری ملازمت مہیا ہو سکے۔

اس عام پاس و لحاظ کے علاوہ آئین میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کے تمام شعبوں میں مشرقی و مغربی صوبوں کے درمیان امکانی حد تک مساوات قائم رکھی جائے۔ اسی طرح آئین کا یہ بھی تقاضا ہے کہ پاکستان کے تمام حصوں کے لوگ پاکستان کی دفاعی سروسوں میں خدمات انجام دے سکیں۔

کم ترقی یافتہ علاقوں کی مخصوص اقتصادی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آئین کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت قومی اقتصادی کونسل کے ذمے یہ بات ڈالی گئی ہے کہ وہ ایسے منصوبے تیار کرے کہ صوبوں کے درمیان اور صوبوں کے مختلف علاقوں کے درمیان فی کس آمدنی غیر مساوی نہ رہے۔ کونسل اس بات کی بھی ذمہ دار ہے کہ پاکستان کے وسائل، جن میں غیر ملکی زر مبادلہ کے وسائل شامل ہیں، اس طریق سے استعمال اور تقسیم کئے جائیں کہ مختصر سے مختصر وقت میں صوبائی اور علاقائی عدم مساوات ختم ہو سکے۔ قومی اقتصادی کونسل کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر سال قومی اسمبلی میں اپنی رپورٹ پیش کرے اور بتائے کہ عدم مساوات دور کرنے کے سلسلے میں کیا نتائج رہے اور کیا ترقی ہوئی۔

میں نے آئین میں ان شرائط کو رکھنے کا اس لئے فیصلہ کیا کہ عدم مساوات دور کرنے کے مسئلے کو ذاتی یا تنگ نظری کی سطح سے بلند رکھا جا سکے۔ سیاسی طور پر مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی اور صدر کی وزارتی کونسل میں مغربی پاکستان کے مساوی نمائندگی دی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک اقتصادی رفتار ترقی کا

تعلق ہے اس میں مساوات پیدا کرنے کے لئے صرف آئینی دفعات کافی نہیں ہو سکتیں - حکومت مساوات کے اصول کو مانتی ہے ، مگر ضرورت ہے کہ عوام بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں - وسائل میں مساوات اور مواقع میں مساوات کے مطالبات کرنا ہی کافی نہیں ہے - بلکہ سعی و کوشش میں مساوات پیدا کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے - ترقی میں مساوات اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ سعی و کوشش میں بھی مساوات ہو لہذا عام مساوات کے نعرے کو ذاتی کوتاهیوں اور خامیوں کی آڑ نہیں بنانا چاہئے -

میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی اقتصادی استعداد کی تعمیر و ترقی میں اور اسے مغربی پاکستان کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کے ہم پلہ بنانے میں ہمیں اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے - سنہ ۱۹۵۷-۵۸ء تک مشرقی پاکستان کو اس مجموعی رقم میں سے جو مرکزی حکومت صوبوں کی اعانت کے لئے مختص کرتی تھی ، چالیس فی صد سے زیادہ حصہ نہیں ملتا تھا - تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء کے دوران میں مشرقی پاکستان کو مرکزی حکومت سے ایک ارب ۴۷ کروڑ ۶۲ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ ملے گا - اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے حصے میں ایک ارب ۲۰ کروڑ ۷ لاکھ کی رقم آئے گی - اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ مشرقی پاکستان کی زر مبادلہ کی آمدنی کو مغربی پاکستان پر خرچ کیا جاتا ہے - ۱۹۶۳-۶۴ء میں حالت یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کو غیر ملکی تجارت کے توازن میں ۲۲ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے کا اور بین الصوبائی تجارت کے توازن میں ۳۸ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے کا خسارہ تھا - سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں مشرقی پاکستان کے غیر ملکی تجارت کے توازن میں ۴۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی اور بین الصوبائی تجارت کے توازن میں ۳۸ کروڑ ۲۱ لاکھ روپے کی کمی تھی - یہ اعداد و شمار اس بات کا روشن ثبوت ہیں کہ مشرقی پاکستان کا سرمایہ مغربی پاکستان کو منتقل نہیں ہوتا ، اور نہ مشرقی پاکستان کی غیر ملکی زر مبادلہ کی آمدنی مغربی پاکستان پر خرچ کی جاتی ہے -

ضرورت ہے کہ سارا ملک قومی ترقی کی جد و جہد میں پورا پورا

حصہ لے - محض مساوات کے مطالبے ہی نہ کئے جائیں بلکہ سعی و کوشش میں بھی مساوی حصہ لیا جائے۔

(۷)

ہر صورت میں عوام کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی اعلیٰ درجے کا خیال ہو، لیکن وہ اسی صورت میں کارآمد اور مؤثر ہو سکتا ہے کہ اس کو عمل میں لایا جائے۔ اور خیال کو صرف عوام ہی عمل میں لا سکتے ہیں۔ جب تک لوگ کسی خیال کی خوبی پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اس پر عمل کے لئے تیار نہ ہوں، سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ میرا نقطۂ نگاہ اور میرا طریق عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں، میرے دل میں اپنے عوام کا اور اپنے ملک کا درد ہے۔ مجھے چند باتیں سوجھی ہیں جن کے لئے میرے دل میں لگن ہے۔ آپ ان باتوں کو آزما دیکھیے کہ شاید ان میں آپ کی بہتری ہو۔ میں نے کبھی کوئی ایسی بات جس سے عوام کو نقصان پہنچتا ہو، ان سے زبردستی منوانے کی کوشش نہیں کی۔

جو آئین میں نے تیار کیا ہے وہ کوئی باہر سے لائی ہوئی جڑی بوٹی نہیں، بلکہ گھر کا پروان چڑھا ہوا پودا ہے۔ یہ ملکی حالات، ملکی تقاضوں اور عوام کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں جمہوریت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ یہ قابل عمل ہے اور ملک کو استحکام بخشے گا۔ مجھے موجودہ نظام کی معقولیت پر پورا یقین ہے۔ لیکن اس کو منصفانہ طریق پر آزمانا عوام کا کام ہے، اور انہیں کو اس کی سلامتی کی حفاظت کرنی ہوگی۔ دنیا میں کوئی ادارہ یا نظام ایسا نہیں جس کو بگاڑا یا بدنام نہ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہوتے ہیں جو قوم کے وسیع تر مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اپنے چھوٹے موٹے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بار بار موقع نہ دے گی۔ ہمیں جو مواقع حاصل ہیں انہی سے پورا فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اگر ہم اپنے موجودہ نظام کو ترقی دینے میں ناکام رہے تو ہمارے لئے سوائے ایک تاریک اور درہم برہم مستقبل کے اور کیا رکھا

بارھواں باب

صدارتی انتخابات

(۱)

بنیادی جمہوریتوں کا تصور پیدا ہو چکا تھا اور اس کے خد و خال مرتب ہو چکے تھے - سنہ ۱۹۵۹ء کے آخر میں ملک کی بالغ آبادی نے اپنے نمائندے چننے کے لئے ووٹ ڈالے - یہ نمائندے بنیادی جمہوریتوں کے رکن کہلائے - انتخابی حلقوں کی حدود مقرر کی جا چکی تھیں اور مارشل لا کے ضابطوں میں ترمیم کر دی گئی تھی تا کہ امیدوار عام جلسے کر سکیں - انتخاب کے نتائج کا اعلان ۱۱- جنوری سنہ ۱۹۶۰ء کو کر دیا گیا -

اس سے چند روز پہلے کابینہ نے مجھے مشورہ دیا کہ بنیادی جمہوریتوں کی کونسلوں کے جو اسّی (۸۰) ہزار ممبر منتخب ہوئے ہیں، میں ان سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لوں - میں نے اس مشورے کو منظور کر لیا - میں نے محسوس کیا کہ مجھے قوم سے واضح طور پر مسندِ اختیار لے لینی چاہئیے تا کہ ملک میں آئین سازی کے کام کے انتظامات کئے جا سکیں - میں نے دونوں صوبوں کے طول و عرض کا دورہ کیا - مقصد یہ تھا کہ لوگوں سے ملوں اور ان پر اپنے خیالات واضح کر سکوں اور بتا سکوں کہ میں کن اصولوں پر آئین بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں - ان دوروں میں میری ملاقات لاکھوں ہی لوگوں سے ہوئی اور میں نے بے شمار عام جلسوں میں تقریریں کیں - بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں نے بھاری اکثریت سے مجھے اعتماد کا ووٹ دیا - ۱۴-فروری کو پرچیاں ڈالی گئیں اور ۱۵-فروری

کو نتائج کا اعلان کر دیا گیا ۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں تقریباً اسی (۸۰) ہزار ووٹ ڈالے گئے جن میں سے ۹۵۰۶ فی صد میرے حق میں تھے ۔ میں نے ۱۷-فروری سنہ ۱۹۶۰ء کو پہلے منتخب شدہ صدر کی حیثیت سے راول پنڈی میں اپنے عہدے کا حلف اٹھایا ۔ اس عہدے کی میعاد چار سال تھی ۔ اس کے بعد فوراً ھی میں نے ملک کا نیا آئین بنانے کے سلسلے میں ایک کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کر دیا ۔

فروری سنہ ۱۹۶۰ء سے لے کر مارچ سنہ ۱۹۶۲ء تک کے زمانے میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام نے نشو و نما پائی اور ترقی کی مختلف سطحوں پر قوم کے نمائندوں نے ایک منظم طریق پر اپنے اپنے علاقے کے حالات اور مسائل سے آگاھی حاصل کی ، اور انھیں ایک ایسا فورم یا پنچایت حاصل ھوئی ، جس میں شامل ھوکر وہ سرکاری محکموں کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعے اپنے مسائل کو حل کر سکیں ۔ لوگوں نے خود اسکیمیں اور منصوبے بنائے ، جنھیں سرکاری اقدامات اور تنظیم کے ساتھ ساتھ رضاکارانہ کوششوں کے ذریعے بروئے کار لایا گیا ۔

ان دو برس میں عوام نے دیکھ لیا کہ خود اپنوں میں سے نمائندے چننے اور پھر اپنے فوری توجہ طلب مسائل کے بارے میں ان نمائندوں کے کام اور ان کے طرز عمل کو قریب سے دیکھنے کا موقع کیا فوائد رکھتا ھے ۔ اسی کے ساتھ ایسے ادارے قائم کئے گئے جہاں بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو حکومت کے ترقیاتی کاموں کے اسلوب سکھائے جانے لگے ۔ سرکاری مشینری پر عوام کی نظر رھنے لگی ، اور سرکاری عملے رفتہ رفتہ عام آدمی کی ضرورتوں کو سمجھنے اور انھیں پورا کرنے لگے ۔ میری اس ساری کوشش کا مقصد یہ تھا کہ عوام کے دل میں اپنے نمائندوں پر اعتماد پیدا ھو تاکہ وقت آنے پر وہ ان نمائندوں کو زیادہ اھم سیاسی ذمہ داریاں سونپ سکیں ۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں میں نے بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے جو سند اختیار حاصل کی تھی وہ اس سلسلے کا پہلا قدم تھا ۔

میں نے اس سوال پر خاصا غور و خوض کیا کہ بنیادی جمہوریتوں کو سیاسی ذمہ داریاں دی جائیں، یا ان کی سرگرمیوں کو صرف اقتصادی اور سماجی کاموں تک محدود رکھا جائے۔ نظریات پر چلنے والوں نے مجھے مشورہ دیا کہ انہیں کوئی سیاسی ذمہ داری نہ دی جائے، بلکہ سرکاری اداروں سے ان کا تعلق بھی ختم کر دیا جائے۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی بات مان لیتا ہوں تو یہ سارا نظام ہی بے جان ہو کر رہ جائے گا۔ سرکاری افسروں کے ساتھ ربط و ضبط سے دو کارآمد باتیں حاصل ہوئی تھیں۔ اول یہ کہ اس سے حکومت کے کاموں کا محاسبہ ہوتا رہتا تھا اور دوسری زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس طرح بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو یہ سمجھنے کا موقع ملتا تھا کہ حکومت کا کاروبار کس طرح چلتا ہے، اور وہ اس کی نگرانی اور رہنمائی بھی کر سکتے تھے۔ اگر بالآخر حکومت کی تمام مقامی سرگرمیوں کو عوام کے نمائندوں کی براہ راست ذمہ داری بنانا مقصود تھا تو بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں اور سرکاری عہدہ داروں کے درمیان اس ربط و ضبط کو قائم رکھنا لازمی تھا۔ میری نظریں اس آنے والے دور کو دیکھ سکتی تھیں جب سرکاری عہدہ داروں کی حیثیت کارندوں کی ہوگی اور عوام کے نمائندوں کی حیثیت بجا طور پر منتظمین کی۔

اسی طرح یہ خیال بھی غیر حقیقت پسندانہ تھا کہ ملکی ترقی اور سیاسیات کو الگ الگ رکھا جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کی حیثیت خواہ مخواہ کے سماجی کارکنوں کی سی بن کے رہ جائے، جن کو نہ تو کچھ اختیار حاصل ہو اور نہ جن کا ملک کے سیاسی معاملات میں کوئی دخل ہو۔ ہمارے پاس اتنے آدمی ہی کہاں تھے کہ سربراہوں کے الگ الگ سلسلے قائم کئے جاتے۔ ایک ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے اور ایک سیاسی معاملات کے لئے۔ اگر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو سیاسی معاملات میں اپنے اپنے انتخابی حلقے کے حق نیابت سے محروم رکھا جاتا، تو ان کی ساری اہمیت ہی جاتی رہتی اور وہ یا تو دفتری حکومت کے تابع فرمان بن کے رہ جاتے، یا پھر ان لوگوں کے جو اپنی

دولت۔ یا دوسری قبائلی اور فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

میں اس مغالطے میں نہیں تھا کہ سنہ ۱۹۵۹ء میں عوام نے جن لوگوں کو بنیادی جمہوریتوں کا ممبر چنا تھا، وہ سب کے سب لائق فائق تھے یا ان سے بہتر لوگ موجود نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے سیاست دانوں نے اس نظام کے خلاف بڑا عیارانہ پروپیگنڈہ کیا تھا اور ان کی ہر طرح یہ کوشش رہی تھی کہ لائق لوگ ان کے علاقے سے منتخب نہ ہونے پائیں۔ بعض جگہ تو انھوں نے اپنے گھریلو نوکروں کو بنیادی جمہوریت کا ممبر منتخب کرا دیا تھا۔ ان کا مقصد اس نظام کو ناکارہ بنانا اور ''دیہاتیوں'' کا مذاق اڑوانا تھا۔ اس کام میں شہر کے اعلیٰ طبقے نے بھی ان کا خوب ساتھ دیا۔ یہ لوگ اکثر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کے علاقائی لباس اور ان کے ''دیسی'' طور طریقوں کی ہنسی اڑاتے تھے۔ نام نہاد اہل دانش کے نزدیک بنیادی جمہوریت کے کسی ممبر کا پکڑ ہی اس نظام کا سارا بھرم کھو دینے کے لئے کافی تھا۔ بھلا جو شخص انگریزی میں بات چیت نہ کر سکتا ہو وہ قوم کا نمائندہ کیسے بن سکتا تھا؟ بنیادی جمہوریتوں کے یہ ممبر جنھوں نے نہ تو کبھی شیکسپیئر کا کوئی ڈراما پڑھا تھا اور نہ وہ ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے کسی مصرعے کا حوالہ دے سکتے تھے، ان حضرات کو یوں معلوم ہوتے تھے جیسے کچھ وحشی لوگ ہیں جنھیں سرداری دے دی گئی ہے۔

اس سارے پروپیگنڈے کا مقصد عام آدمی کی قدر گھٹانا تھا۔ یہ ہمارے ذہین طبقے کا رد عمل تھا، اس نظام کے خلاف جس کے تحت قوم کے سب افراد کو بلا امتیاز ثروت و تعلیم، ترقی کی نئی نئی راہیں دکھائی گئی تھیں۔ انھوں نے نادانستہ طور پر میرے قول کو صحیح ثابت کر دیا، یعنی رہنمائی پر صرف چند افراد کا اجارہ نہیں ہو سکتا، جو اعلیٰ مغربی علوم یا معاشرت سے بہرہ مند ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک گھریلو نوکر اپنے آقا سے بہتر رہنما ثابت ہو، جس کے دل میں عوام کا زیادہ درد ہو اور جو عوامی مسائل کے لئے زیادہ وقت نکال سکے۔ پرانے سیاست دانوں اور شہری

معاشرے کے بعض حلقوں کا یہی رویہ تھا جس نے بالآخر میرے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اگر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو سیاسی ذمہ داری نہ سونپی گئی تو انہیں ختم ہوتے دیر نہ لگے گی اور ان کے ساتھ ھی یہ سارا نظام بھی بیٹھ جائے گا۔

سنہ ۱۹۶۲ء کے آغاز تک لوگوں کو بنیادی جمہوریتوں کی افادیت اور ان کے اثر کا اندازہ ھونا شروع ھو گیا تھا۔ ساتھ ھی یہ بات بھی روشن ھوتی جا رھی تھی کہ میں انہیں سیاسی فرائض سونپنے کا ارادہ رکھتا ھوں۔ نئے آئین کا اعلان یکم مارچ سنہ ۱۹۶۲ء کو کر دیا گیا۔ اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں نے اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی سنہ ۱۹۶۲ء میں صوبائی اسمبلیوں کے لئے قوم کے نمائندے چنے۔ ان انتخابات سے پہلے میں نے ایک حکم جاری کر کے انتخابی کمیشن کو اختیار دے دیا تھا کہ انتخابات دیانت داری، انصاف اور غیر جانب داری کے ساتھ عمل میں لانے کے لئے تمام ضروری تدبیریں کی جائیں اور کسی قسم کی دھاندلی یا بددیانتی کی باتیں نہ ھونے پائیں۔ پرانے سیاست دانوں نے سوچا کہ اگر ھم الیکشن میں کھڑے نہ ھوئے تو سیاسی زندگی سے ھمارا تعلق بالکل قطع ھو جائے گا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وھی لوگ جو بھرے جلسوں میں اس نظام کی برائیاں کرتے تھے، اب ایسے پلٹے کہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے حمایت کے طلب گار ھونے لگے۔ آقا اپنے گھریلو نوکروں کے پاس اور زعمائے شہر ان ھی ''پگڑ بند دیسیوں،، کے پاس ووٹوں کے لئے جا رھے تھے۔ یہ ان کے لئے عبرت کا بڑا اچھا سبق تھا۔

ابھی تک سیاسی پارٹیوں کو بحال نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے ۱۰مئی سنہ ۱۹۶۲ء کو اعلان کیا کہ قومی اسمبلی ''مفصل اور عمومی بحث کے بعد،، سیاسی پارٹیوں کے سارے مسئلے پر نئے سرے سے غور کرے گی۔

نئی قومی اسمبلی کا اجلاس ۸جون سنہ ۱۹۶۲ء کو راول پنڈی میں ھوا۔ میں نے دوسری جمہوری حکومت کے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا۔ اسی روز مارشل لا اٹھا دیا گیا اور اس کے بعد سے عام

ملکی قانون کے تحت حکومت کا کاروبار چلنے لگا - میں نے اسمبلی کے اراکین اور قوم سے اپیل کی کہ اس آئین کو منصفانہ طور پر آزمایا جائے - میری رائے میں قومی اسمبلی کے سامنے بڑے بڑے مقاصد یہ تھے :

۱- بیرونی خطرے اور اندرونی انتشار سے پاکستان کی سالمیت کو محفوظ رکھنا ،

۲- پاکستان کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانا اور دونوں بازوؤں کے باھمی شک و شبہ کی ساری علامتوں کو دور کر کے عوام میں قومی نقطۂ نگاہ کو ترقی دینا، اور

۳- لوگوں کی اخلاقی اور مادی خوشحالی کے لئے اقدامات کرنا اور ایک سماجی فلاحی مملکت کے لئے راہ ھموار کرنا -

یہ مقاصد ایک مضبوط اور مستحکم حکومت ھی کے ذریعے حاصل ہو سکتے تھے جو طویل عرصے کے منصوبے اور پالسیاں بنا سکے اور ان کو عمل میں لا سکے - اگر حکومت کو غیر دیانت دارانہ گٹھ جوڑ اور سیاسی پارٹیوں کے دباؤ سے سابقہ رہا تو ملک ھرگز ترقی نہ کر سکے گا -

دوسری اھم بات یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں پوری پوری مفاھمت اور یک جہتی پیدا کی جائے - چونکہ دونوں صوبوں کو فاصلے نے جدا کر رکھا ھے، اس لئے دونوں میں کچھ اختلاف یا غلط فہمیاں پیدا ھو جانا لازمی تھا - مگر اس بات کو یاد رکھنا ضروری ھے کہ اگر ان اختلافات کو بعض شعبوں میں زیادہ طول دیا گیا تو نتیجہ بربادی ھوگا - ھمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ملک کی یک جہتی ، سلامتی اور ترقی ایسی باتیں ھیں جن سے سبھی کا یکساں تعلق ھے - قومی اسمبلی میں میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا :

''آج سے ھم اپنی قومی زندگی اور عمل کے نئے دور میں داخل ھو رھے ھیں - مجھے امید ھے کہ اس قسم کی اھم تبدیلی کے موقع پر لوگ اپنے رویے سے پختہ کاری ، دانش مندی اور ضبط و نظم کا ثبوت دیں گے - اگر ھر طبقے کے عوام بالعموم اور اسمبلی کے اراکین

اور ارباب علم و دانش بالخصوص آئینی اداروں کی بحالی کی برکتوں کو محسوس اوز تسلیم کر لیں تو یہ امر ہمارے لئے بڑی تشفی کا موجب ہوگا - عوامی فکر کے رہنماؤں کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ وہ قوم کے سامنے حسن سلوک اور شائستہ برتاؤ کی مثال قائم کریں - ہم من حیث القوم فکر و عمل میں انتشار کے متحمل نہیں ہو سکتے -

میں آپ کو یہ بات جتا دینا چاہتا ہوں کہ آئینی نظام کی بحالی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سیاسی زندگی کا آغاز اس مقام سے کریں جہاں ۸-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو پہنچے تھے - پچھلے ساڑھے تین سال کے عرصے میں بہت کچھ سوچ بچار کیا گیا ہے اور بہت سے منصوبے بنائے گئے ہیں- یہ کام بڑی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے - اس عرصے میں عوام حکومت سے ٹھوس نتائج کی توقع رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں - ایسی ہی توقع وہ آپ سے بھی رکھیں گے - اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف تعمیری سعی و کوشش اور گہرا تدبر ہی عوام کے نکتہ رس شعور کو بیدار کر سکے گا ، جذباتی اور ہیجان انگیز تقریریں اور بیانات نہیں -

یہ آئین جس جذبے کے ساتھ وضع کیا گیا ہے، اس کو اسی جذبے کے ساتھ عمل میں لانا چاہئے - اس میں ہمیں جس قدر کامیابی ہوگی، اسی پر ہماری آئندہ نسلوں کی بھلائی کا دار و مدار ہوگا اور ان لوگوں کا عقیدہ اور یقین برحق ثابت ہو سکے گا جنھوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں قیام پاکستان کے لئے جد و جہد کی اور تکالیف آٹھائیں -،،

آئین پر جو لمبا چوڑا مباحثہ شروع ہوا تھا وہ قومی اسمبلی کے افتتاح کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گیا ، بلکہ اس سارے معاملے پر اسمبلی کے اندر شد و مد کے ساتھ بحث جاری رہی - میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ مجھے آئین میں ٹھوس اور تعمیری ترمیمیں منظور کر لینے میں عذر نہ ہوگا - آئین میں ترمیم کی شرط رکھی ہی اس لئے گئی تھی - لیکن اگر کسی بنیادی تصور میں تحریف کرنے کی کوشش کی گئی ، تو آئین کا سارا ڈھانچا ہی بیٹھ جائے گا - اور میں کسی ایسی کارروائی کا ساتھ نہیں دوں گا جس کا نتیجہ انتشار اور ابتری ہو -

قومی اسمبلی کو دو اہم معاملوں کا تصفیہ کرنا تھا - ان میں سے ایک کا تعلق سیاسی پارٹیوں کی بحالی سے تھا ، اور دوسرے کا ہمہ گیر حق رائے دہی کے دستور کے تحت ، جو آئین میں شامل تھا ، ووٹ دینے کے طریق سے - اسمبلی اس نتیجے پر پہنچی کہ سیاسی پارٹیوں کو بحال کر دیا جائے اور میں نے متعلقہ بل کی منظوری دے دی - رائے دہی کے کمیشن کی رپورٹ بھی اسمبلی میں پیش ہوئی اور ممبروں کی بھاری اکثریت نے فیصلہ کیا کہ قوم صدر مملکت، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کا انتخاب بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کے ذریعے کرے، جن کی حیثیت ایک انتخابی ادارے کی ہوگی۔ اسمبلی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ پہلے بنیادی جمہوریتوں کے ممبر انتخابی ادارے کے ممبروں کی حیثیت سے اپنے فرائض کی تکمیل کر لیں تب انہیں سماجی اور ترقیاتی کاموں کی ذمہ داریاں سونپی جائیں - میں نے اس کو بھی منظور کر لیا -

میرا خیال تھا کہ قومی اسمبلی ان دو اہم معاملوں کا فیصلہ کر لینے کے بعد اب قومی تعمیر کے کام میں مصروف ہو جائے گی - مگر اسمبلی کے باہر جو سیاسی گروہ اور ادارے تھے ، انہوں نے دباؤ ڈالنے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا اور ملک میں اختلافات اور رد و کد کی فضا قائم کئے رہے - حزب مخالف میں جو کئی گروہوں پر مشتمل تھا، سابقہ سیاسی پارٹیوں کی بحالی کے مسئلے پر سخت اختلاف تھا - ان کی ایک جماعت اس بات کی حامی تھی کہ سیاسی پارٹیوں کو بحال نہ کیا جائے اور ایک قسم کی متحدہ کمان کے تحت ''آئین کو جمہوری بنانے'' کی مہم شروع کی جائے - دوسرے گروہ زیادہ حقیقت پسند تھے - انہوں نے اپنی اپنی سیاسی پارٹیوں کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا ، تاکہ آئین کے تحت سنہ ۱۹۶۵ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کی تیاری کی جا سکے - جہاں تک میرا خیال ہے اول الذکر گروہ عام انتخابات کو ٹالنا چاہتا تھا - جس زمانے میں یہ لوگ برسر اقتدار تھے انہوں نے ہمیشہ انتخابات کے تمام پروگراموں کو ناکام بنا کر ھی اپنا اقتدار قائم رکھا تھا - عام انتخابات تو الگ رہے ان لوگوں نے ضمنی انتخاب تک میں شاذ ھی

کبھی کھڑے ہونے کی جرأت کی تھی - مجھے ان کی فکر نہ تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس نظام نے عوام میں اتنا اعتماد ضرور حاصل کر لیا ہے کہ ان لوگوں کے ارادوں کو نیچا دکھا سکے -

وہ گروہ جو سیاسی پارٹیوں کو استوار کرنے میں مصروف تھے مجھے ان پر کوئی اعتراض نہ تھا - میں جانتا تھا کہ آئندہ عام انتخابات کے موقع پر اس آئین کو ایک سیاسی آزمائش میں سے گزرنا ضروری ہے، اور میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ ملک کو قومی سطح پر انتخابات کا پورا پورا تجربہ حاصل ہونا چاہئے - میں نے محسوس کیا کہ آئین کی حمایت میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے مجھے کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کی ضرورت پڑے گی - پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو کے بعد میں نے اس کی صدارت قبول کر لی - مخالف پارٹیوں کے بارے میں مجھے جس بات کا اندیشہ تھا وہ یہ تھی کہ ان میں سے بیشتر نے ایسے سیاسی پروگرام بنا رکھے تھے، جو بنیادی طور پر منفی اور تخریبی قسم کے تھے - ان کا دار و مدار جذبات کو بھڑکانے اور شورش پھیلانے پر تھا - ان میں سے کوئی پارٹی بھی ایسی نہ تھی جو قومی فلسفے کی حامل ہو - بعض پارٹیاں خود مختاری کے بہانے دونوں صوبوں کو جدا جدا کرنے کے درپے تھیں - یہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بھی توڑنا چاہتی تھیں - اور کچھ قومی اصلاح و ترقی کے خلاف جد و جہد کر رہی تھیں اور مذہب کے نام پر ایک ایسی آمریت قائم کرنا چاہتی تھیں جو ہر قسم کی ترقی کی دشمن تھی -

اس زمانے میں مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ میں کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہ رکھوں اور اس میں میرا کچھ فائدہ بھی تھا، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ مخالف پارٹیاں شور و شر پھیلانے پر آدھار کھائے بیٹھی ہیں، میں نے اس واحد سیاسی پارٹی کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا جس نے قوم کے سامنے ایک تعمیری اور قومی پروگرام پیش کیا تھا، ایسا پروگرام جس میں پاکستان کا بنیادی نظریہ جھلکتا تھا اور جو قوم کو ترقی کی دعوت دیتا تھا -

جب سنہ ۱۹۶۴ء قریب آیا تو مخالف پارٹیوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور انہیں ایک صدارتی امیدوار کی جستجو ہوئی - وہ یہ

جانتے تھے کہ کوئی بھی ایک پارٹی ایسی نہیں ہے جو خود اپنا امیدوار کھڑا کرنے کے قابل ہو - ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ جیسے وہ انتخابات کو ٹالتے رہے تھے ویسے ہی شاید میں بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے کسی نہ کسی بہانے انتخابات ملتوی کرا دوں ، لیکن انتخابی کمیشن جس منظم طریق پر رائے دہندگان کی فہرستیں تیار کرا رہا تھا اور انتخاب کا سارا پروگرام جس ڈھب سے بنایا جا رہا تھا ، اس کو دیکھتے ہوئے مخالف پارٹیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اپنا معاملہ قوم کی مرضی پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے - بس اسی طریق سے میں ثابت کر سکتا تھا کہ آئین ایک حقیقی اور زبردست ادارہ ہے اور کوئی جعلی دستاویز نہیں جسے میرے ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے وضع کیا گیا ہو - یہ ایک قومی ادارہ ہے جسے قومی مقاصد کے حصول کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

مجھے مخالف پارٹیوں کی قوت کا اچھا خاصا اندازہ تھا - بہت سے عناصر ان اصلاحات کی وجہ سے ناخوش تھے جو میں نے جاری کی تھیں - بعض مذہبی گروہ عائلی قوانین کے آرڈیننس کے بارے میں شور شرابا مچا رہے تھے - پھر وہ لوگ تھے جنھیں زرعی اصلاحات سے نقصان پہنچا تھا - ان کا اقتدار چھن گیا تھا اور وہ خود کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال نہیں سکے تھے - علاوہ ازیں مشرقی پاکستان میں ایک عنصر ایسا تھا جو ایک کمزور اور غیر مؤثر مرکز کا خواہاں تھا - اس کا مقصد مرکزی حکومت اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانا اور اس طرح ملک کی یک جہتی کو نقصان پہنچانا تھا - میں یہ بھی جانتا تھا کہ مخالف پارٹیاں ملکی انتظام کی چھوٹی بڑی فروگزاشتوں اور بری بھلی سبھی باتوں کا مجھی کو قصور وار ٹھہرائیں گی - اگر کسی دور دراز گاؤں میں پولس کے کسی سپاہی سے ، یا کسی مجسٹریٹ کی عدالت کے کسی کلرک سے کوئی قصور سرزد ہوا ہوگا تو اس کا ذمہ دار بھی میں ہی ٹھہروں گا - چونکہ وہ کبھی اصول قاعدے کے پابند نہیں رہے ، اس لئے ہر بات کا الزام ایک ہی فرد کو دینے سے نہیں چوکیں گے -

ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء میں متحدہ مخالف پارٹیاں مس فاطمہ جناح کو صدر کے عہدے کے لئے اپنا امیدوار بنانے پر رضامند ہو گئیں - حقیقت یہ ہے کہ مس جناح اور مختلف پارٹیوں میں کوئی بات مشترک نہ تھی - پھر بھی ان پارٹیوں سے اپنی متفقہ حمایت کا اقرار حاصل ہونے پر وہ بلا تامّل مقابلے میں آگئیں - انھوں نے مخالف پارٹی کی اس پیش کش کو قبول کیا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوا - چونکہ مخالف پارٹی کی اس ساری مہم کی بنیاد ہی جذباتیت پر تھی ، اس لئے یہ نامزدگی بھی ایک منطقی سی بات معلوم ہوتی تھی - موصوفہ قائد اعظم رح کی ہمشیرہ تھیں ، اس لئے اور کچھ نہیں تو جذباتی وجوہ کی بنا پر ہی ان کا توجہ حاصل کرنا لازمی تھا - مخالف پارٹیوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان سے کام نکال لینے کے بعد انہیں راستے سے ہٹا دینا آسان ہوگا - ممکن ہے یہ ان کی بھول ہو ، لیکن اس وقت تو ان کا یہی خیال تھا -

میں نہیں جانتا کہ مس جناح نے کن امور کو نظر میں رکھ کر صدارت کا امیدوار بننا منظور کیا تھا - وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہی تھیں اور سیاسیات میں کچھ دلچسپی نہ لیتی تھیں ، سوائے اس کے کہ قومی دنوں پر اخبارات کے لئے کوئی بیان جاری کر دیں - جب سے قائد اعظم نے وفات پائی تھی ، انھوں نے ہر حکومت کی مخالفت اور اس پر نکتہ چینی کرنے کا وطیرہ اختیار کر لیا تھا - یہاں تک کہ لیاقت علی خاں مرحوم کے زمانے میں بھی وہ ایک فریق مخالف بنی رہیں - وہ عوام میں مایوسی و بد دلی پھیلانے اور انہیں حکومت وقت سے بدظن کرنے کا کوئی موقع ھاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں - اپنے گوشۂ تنہائی اور قائد اعظم کی یاد کی پناہ میں انھوں نے اپنی حیثیت ایک ثالث اور مشیر کی سی بنا لی تھی - جب مارشل لا جاری کیا گیا تو انھوں نے اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ، لیکن پھر جلد ہی اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا - ایک موقع پر میں نے انھیں لکھا کہ آپ حکومت کی پالسیوں پر اپنے فیصلے صادر کرنے سے پہلے جملہ حقائق سے آگاھی حاصل کر لیا کریں - میرا خیال ہے کہ ایسا مشورہ دینے پر انھوں نے مجھے کبھی نہیں بخشا -

ممکن ہے مس جناح نے ملک میں میری مخالفت کا اندازہ حقیقت سے کچھ زیادہ لگایا ہو - پھر انھوں نے دل میں یہ بھی سمجھا ہو کہ وہ قدیم رہنماؤں کی حمایت سے وہ پوزیشن حاصل کر لیں گی جس کی وہ متمنی تھیں - ایک لحاظ سے ان کی نامزدگی پر مجھے خوشی ہوئی - مخالف پارٹی نے میرے مقابلے میں ایک ایسا حریف کھڑا کیا تھا کہ اس سے زیادہ زبردست حریف ملنا ممکن نہ تھا - انتخابی معرکہ بڑے زور کا ہوگا اور اس سے میرے نظریات کی معقولیت ثابت ہو جائے گی جو حقیقت پسندی پر مبنی تھے ، جذباتیت اور ہیجان انگیزی پر نہیں ، جس کی مخالف پارٹی عوام سے اپیل کر رہی تھی -

صدارتی امیدواروں کے ناموں کا اعلان ، انتخابی ادارے کے نمائندوں کے انتخاب سے پہلے ھی ہو گیا تھا - معاشرے کا ہر بالغ ممبر جانتا تھا کہ بنیادی جمہوریت کے جس ممبر کو اس نے چنا ہے، وہ پاکستان کے آئندہ صدر کا انتخاب کرے گا - انتخابی ادارے کے قانون کے تحت° جو ۱۷-اپریل سنہ ۱۹۶۴ء کو منظور کیا گیا ، دونوں صوبوں کو چالیس چالیس ہزار علاقائی یونٹوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا - ان میں سے ہر ایک یونٹ کو بنیادی جمہوریت کا ایک ممبر چننا تھا - پھر یہ سب ممبر مل کر ایک انتخابی ادارہ بناتے جسے صدر مملکت اور مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کا انتخاب کرنا تھا - انتخابی کمیشن نے ان یونٹوں کی حدود متعیّن کرنے میں ان باتوں کا خیال رکھا تھا : ''علاقائی وحدت ، آبادی کی تقسیم اور انتظامی سہولت،، - گیارہ کروڑ کی کل آبادی میں سے رائے دہندگان کی تعداد تقریباً چار کروڑ پچاس لاکھ تھی جن کے نام رجسٹر میں درج تھے - اس بنیاد پر اوسطاً ہر ایک یونٹ کی آبادی ایک ہزار تہتّر مقرر کی گئی تھی - انتخابی حلقوں کی حدود کے تعیّن اور اعتراضات کے تصفیے کا کام ۲۰-جولائی سنہ ۱۹۶۴ء تک مکمل ہوگیا ، اور اگست کے وسط تک انتخابی یونٹوں کی تفصیلات اور اس کے ساتھ ہر ایک یونٹ کے رائے دہندگان کی فہرستیں شائع کر دی گئیں - پولنگ افسروں کی ایک کثیر تعداد کی ضرورت تھی - اس مطلب کے لئے

سرکاری عہدہ داروں، ڈاکٹروں اور اُستادوں کی خدمات حاصل کی گئیں -

عوام نے بنیادی جمہوریتوں کے ان تازہ انتخابات میں سنہ ۱۹۵۹ء کے انتخابات کی نسبت کہیں زیادہ دل چسپی لی - ہر شخص جانتا تھا کہ ملک کی جمہوری ہیئت کا فیصلہ ان انتخابات کے نتائج ہی پر مبنی ہوگا - مشرق پاکستان میں ایک لاکھ سے زیادہ اشخاص نے انتخابی مقابلوں میں حصہ لیا - مغربی پاکستان میں صرف چوالیس ضلعوں میں ایک لاکھ اٹھائیس ہزار سے زیادہ اشخاص نے نامزدگی کے کاغذات داخل کئے - مجموعی طور پر انتخابات کی کارروائی خوش گوار طریق پر عمل میں آئی البتہ بعض پولنگ اسٹیشنوں پر تشدد کے واقعات بھی ہوئے - بنیادی جمہوریتوں کے جو ممبر منتخب ہوئے ، ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کی عمر تیس سے چالیس سال تک تھی - مشرق پاکستان میں منتخب شدہ ممبروں میں سے ۵۴ فی صد نے ثانوی درجے تک تعلیم حاصل کی تھی - مغربی پاکستان میں منتخب شدہ ممبروں میں سے ۲۱ فی صد نے ثانوی درجے تک اور ۲۷ فی صد سے زیادہ نے ابتدائی درجے تک تعلیم پائی تھی - یہ تناسب صوبوں میں تعلیم کے اوسط سے اونچا تھا -

سیاسی پارٹیوں میں سے کوئی بھی اتنی منّظم نہ تھی کہ وہ اسی ہزار نشستوں کے انتخابات کے لئے اپنے اُمیدوار کھڑے کرتی - مخالف پارٹی نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا - وہ جس اُمیدوار کا بھی پلہ بھاری دیکھتی اسے اپنا اُمیدوار قرار دے دیتی -

جب اکتوبر اور نومبر سنہ ۱۹۶۴ء میں دونوں صوبوں کے انتخابات کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو اس سے بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی - ہر سیاسی پارٹی کا دعویٰ تھا کہ اس نے قریب قریب تمام نشستوں پر قبضہ کر لیا ہے - اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ان پارٹیوں نے اپنے اپنے اُمیدواروں کے ناموں کی فہرستیں مشتہر کرنی شروع کیں - اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ان میں سے اکثر نام سب فہرستوں میں مشترک تھے -

(۲)

مس جناح نے بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات سے بہت پہلے اکتوبر

کے تیسرے ہفتے میں اپنے صدارتی انتخاب کی مہم شروع کی ۔ انہوں نے کراچی سے آغاز کیا ۔ پہلے ہی عام جلسے میں وہ کھل کر سامنے آ گئیں ۔ گویا لگی لپٹی اٹھا نہ رکھیں گی ۔ فکر اور استدلال کا وہاں کام نہ تھا ۔ شروع سے آخر تک جذباتیت ہی پر انحصار تھا ۔ ان کے گرد کراچی میں بڑا بھاری مجمع اکھٹا ہو گیا تھا ۔ خوب خوب میزیں پیٹی گئیں اور نعرہ بازی ہوئی ۔

میں نے مس جناح کے پہلے عام جلسے کے نتائج پر غور کرنے کے لئے اپنے چند سیاسی رفقا کو بلوایا ۔ وہ افسردہ اور فکر مند نظر آتے تھے ۔ ان کو اندیشہ تھا کہ جس قسم کا حملہ مس جناح نے شروع کیا ہے ، اس کا توڑ مشکل ہوگا ، کیونکہ موصوفہ بہر صورت ایک معمر خاتون تھیں اور قائد اعظم کی ہمشیرہ کی حیثیت سے وہ ملک بھر میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں ۔ میں نے اپنے رفقا سے کہا کہ ہمیں ان کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے جس نظر سے ایک صدارتی امیدوار یا ایک مدّ مقابل کو دیکھا جاتا ہے ۔ ہمیں ان کا پورا پورا مقابلہ کرنا ہوگا ، لیکن شائستگی اور رکھ رکھاؤ بہر حال ملحوظ رہنا چاہئے ، خواہ وہ اور ان کے ہواہ خواہ کیسے ہی حربے استعمال کریں ۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں ہجوم کی کثرت پر نہیں جانا چاہئے ۔ ملک میں پہلی بار عام انتخابات ہو رہے ہیں ، عوام کے لئے دونوں امیدواروں سے ملنا اور ان کے خیالات سننا لازمی ہے ۔ انتظامیہ کو سخت تاکید کر دی گئی کہ مس جناح کے جلسوں میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور انہیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ۔ ملک بھر میں وہ جہاں بھی گئیں ان کو اطمینان اور آسائش سے سفر کرنے کی خاص سہولت دی گئی ۔

مجھے مشورہ دیا گیا کہ جہاں جہاں مس جناح جائیں ، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے جاؤں ۔ میں نے اسے منظور نہ کیا ۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک ہی شہر میں ایک ہی روز یا اس سے اگلے روز جلسے ہوئے تو دونوں طرف داروں میں جھڑپ ہونا لازمی ہوگا ۔ بہتر ہے کہ ہر ایک صوبے میں مس جناح پہلے دورہ کریں ۔ جب

وہ مغربی پاکستان کا دورہ ختم کر لیں اور مشرق پاکستان چلی جائیں تب میں اپنا دورہ شروع کروں -

چنانچہ مس جناح نے سارے مغربی پاکستان کا چکر لگایا اور کراچی ، پشاور، راول پنڈی ، لاہور وغیرہ اور کئی اور بڑے بڑے شہروں میں بھی عام جلسوں میں تقریریں کیں - ہر جگہ ان کا موضوع سخن ایک ہی تھا : ملک کا حال خراب ہے - کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی - کسی بات کی آزادی نہیں ہے - تقریر پر پابندی ہے - حکومت کی نہ کوئی بیرونی پالسی ہے نہ اندرونی - ایوب خاں ڈکٹیٹر ہے جو کسی قسم کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ - انھوں نے پرانے سیاست دانوں کی پرُ زور حمایت کی - وہ یہ بھول گئیں کہ جب وہ لوگ بر سر اقتدار تھے تو آپ ان پر بڑی سخت نکتہ چینیاں کیا کرتی تھیں - اب آنھوں نے دعویٰ کیا کہ ملک میں جس قدر ترقی ہوئی ہے اس کو انجام دینے یا اس کی ابتدا کرنے کا سہرا سیاست دانوں ہی کے سر ہے - انقلاب بہت بڑا ڈھونگ ہے - مس جناح نے سیاست دانوں کی ساری بد اعمالیوں کا ذمہ دار مجھی کو ٹھہرایا - مجھے ان سے اس امر کی آگاہی ہوئی کہ ہر کابینہ میرے ہی حکم سے بنائی یا توڑی جاتی رہی تھی - ہر وزیر اعظم اور گورنر جنرل میرے ہی حکم کا بندہ تھا - اخبارات نے ان کی تقریروں کو پہلے صفحوں پر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور جلد ہی سارا ملک صدارتی انتخاب کی لپیٹ میں آ گیا -

(۳)

میں نے اپنی مہم کا آغاز پشاور کے ایک عام جلسے سے کیا - میں نے زیادہ تر ان اصلاحات کا ذکر کیا جو انقلاب سے لے کر اب تک عمل میں آئی تھیں - وہ سہ پہر بڑی گھٹی گھٹی سی تھی اور بڑا بھاری مجمع اکھٹا ہو گیا تھا - مسلم لیگ کے رضاکار ھجوم کو قابو میں نہ رکھ سکے تھے اور بڑی دھکا پیل ہو رہی تھی - اچانک میری نظر ایک بڑے میاں پر پڑی جو اگلی صف میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے - ان کے ھاتھ میں ایک پنجرہ تھا جس میں ایک بٹیر تھا - پشاور میں بٹیروں کو لڑانا بڑا دلپسند مشغلہ ہے - سبھی جانتے ہیں

کہ بٹیروں کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے کہ خواہ کتنا ہی اچھا دانہ کھلاؤ اور دیکھ بھال کرو وہ بٹیر جیسے ہی اپنے حریف کو دیکھتا ہے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے - میں نے اس پنجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''متحدہ مخالف پارٹیوں،، کے لیڈروں کا حال بھی ''میدان سے بھاگے ہوئے،، بٹیروں کا سا ہے - انہوں نے اپنی ساری سیاسی زندگی میں کبھی جم کر حالات کا مقابلہ نہیں کیا - اس پر خوب ہنسی رہی - اور جب تک میری مہم جاری رہی ، انہیں ''بھاگے ہوئے بٹیروں،، کے لقب ہی سے یاد کیا جاتا رہا- میں نے ذاتیات سے گریز کیا اور اپنی مہم کو شائستگی کی حدود میں رکھنے کی کوشش کی -

پشاور کے بعد میں نے راول پنڈی میں ایک بھاری عام جلسے سے خطاب کیا - یہی وہ جگہ تھی جہاں بعض مخالف لیڈروں نے حکومت کے خلاف اور خود میری ذات کے خلاف افترا پردازی اور بدگوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی - میرے خیال میں متحدہ مخالف پارٹیوں کی یہ خواہش تھی کہ یہ ساری مہم ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا ایک سوقیانہ مشغلہ بن کر رہ جائے - لیکن میں نے ٹھان رکھی تھی کہ ایسا نہ ہونے پائے - میں جانتا تھا کہ مجھے بھی اپنی حریف کے بارے میں کچھ حقائق بیان کرنے ہوں گے، لیکن مجھے بہر صورت ان کا احترام ملحوظ رکھنا تھا، جس کی وہ مستحق تھیں -

راول پنڈی سے میں نے سڑک کے ذریعے لاہور کا سفر کیا اور راستے میں کئی جلسوں میں تقریریں کیں - مجھے کبھی خطیب ہونے کا دعویٰ نہ تھا اور مجھے روانی سے آردو بولنے میں کچھ وقت لگا - لیکن جس وقت میں لاہور پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میں یاد داشتوں پر نظر ڈالے بغیر گھنٹوں تقریر کر سکتا ہوں - اس سے مجھے حاضرین جلسہ سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے میں بڑی مدد ملی - لاہور کا جلسہ موچی دروازے کے باہر ہوا - یہ جگہ سیاسی معرکوں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتی ہے - بڑا زبردست اور پرُجوش مجمع تھا ، ہم نے کارروائی کے آغاز کے لئے کچھ شعرا اور مقامی مقررین کا انتظام

کر رکھا تھا ، لیکن لوگ ان میں سے کسی کو سننے کے لئے تیار نہ تھے - وہ میری تقریر سننے آئے تھے ، شعرا کا کلام یا پیشہ ور مقررین کی تقریریں سننے کے لئے نہیں - جس وقت میں تقریر کرنے کے لئے آٹھا تو سارا شور و غوغا تھم گیا اور سارا مجمع بڑا منظم نظر آنے لگا - میں نے بڑی مفصل تقریر کی - میں نے سادہ زبان میں سیدھی سیدھی باتیں کیں اور اصلاحات اور آئین کا بنیادی مفہوم بیان کیا - اس شام مجھے محسوس ہوا کہ میں نے مغربی پاکستان میں میدان مار لیا ہے -

ادھر مس جناح مشرقی پاکستان میں مصروف کار تھیں - ان کے جلسوں کی خبریں بڑا اثر پیدا کر رہی تھیں - انھیں مشرق پاکستان میں کچھ کامیابیاں تو حاصل ہوئی تھیں ، مگر ساتھ ہی وہ مخالف جماعتوں کی سخت باھمی رقابتوں اور کشیدگیوں کو بھی منظر عام پر لے آئی تھیں - خاص کر نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ کے باھمی تنازعے کو - عوامی لیگ کے ایک لیڈر نے خود کو مس جناح کے معاملات کا چودھری مقرر کر لیا تھا ، جس سے دوسری پارٹیوں کے لیڈروں کو بڑی مایوسی ہوئی تھی - ادھر مس جناح خود اپنے رضا کاروں سے بڑی ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے رھی تھیں - اس سے ان رضا کاروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کہیں مس جناح کو نامزد کرنے میں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی -

اس مہم کے دوران ھی میں خواجہ ناظم الدین وفات پا گئے ، جس سے مخالف گروہ کو سخت دھکا لگا - خواجہ صاحب بڑے کار آزمودہ سیاسی لیڈر تھے اور ان کی موجودگی سے مخالف گروہ میں اچھا خاصا وقار پیدا ہو گیا تھا - ستم یہ ھوا کہ مس جناح خواجہ ناظم الدین کے جنازے میں شمولیت کے لئے نہ ٹھہریں اور مشرق پاکستان سے رخصت ہو گئیں - میں اس شام سکھر میں تھا - ہم نے خواجہ ناظم الدین کی وفات پر تعزیت کی قرار داد منظور کی -

مخالف گروہ ''سی-او-پی،، (کمبائنڈ آپوزیشن پارٹیز) نے ایک نو نکاتی پروگرام اپنایا تھا - اس پروگرام کے مضمون نے ان کی اور بھی قلعی کھول دی - پروگرام کا مضمون تیار کرنے کا کام نظام اسلام

پارٹی کے چودھری محمد علی کے سپرد ہوا تھا - چودھری صاحب نے حسب معمول بڑی ہوشیاری سے کام لے کر اس پروگرام میں ہر قسم کے سمجھوتوں کو سمونے کی کوشش کی تھی - انھوں نے اس کی زبان جان بوجھ کر مبہم رکھی تھی تا کہ اس سے کوئی بھی جو چاہے مطلب نکال لے - جب اس پروگرام کا اعلان کیا گیا تو نیشنل عوامی پارٹی نے جو علانیہ طور پر بائیں بازو کا ادارہ ہے، یہ دیکھا کہ وہ ملائیت کے فلسفے کی حمایت کر رہی ہے - بنیادی اہمیت کے تمام مسائل سے پہلو تہی کی گئی تھی - پروگرام سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ معاملات خارجہ میں مخالف پارٹیوں کی پالسی کیا ہوگی - نہ یہ بتایا گیا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کس قسم کا سیاسی رشتہ ہوگا - کیا مخالف پارٹیاں ون یونٹ کے حق میں ہیں یا مغربی پاکستان کو تقسیم کرنا چاہتی ہیں؟ کیا مخالف پارٹیاں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی حمایت کرتی ہیں یا اس کی مخالفت؟ کوئی بات بھی صاف طور پر بیان نہ کی گئی تھی - اس پر لوگوں نے سوال کرنا شروع کیا کہ ''مخالف جماعتوں کا موقف کیا ہے؟،، میں نے اپنے ایک جلسے میں یہ رائے دی تھی کہ C.O.P. کا مطلب ہے Cult of Power یعنی مسلک اقتدار - ان میں ہوس اقتدار کے سوا اور کوئی بات مشترک نہ تھی - ان کی کیفیت ان بہت سی جنگلی بلیوں کی سی تھی جن کی دمیں ایک دوسری کے ساتھ باندھ دی گئی ہوں -

ہم نے تو اپنی طرف سے مخالف پارٹیوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں تا کہ وہ اپنے جلسے منظم اور پُر امن طریق پر منعقد کر سکیں، لیکن اس کے برعکس انھوں نے میرے جلسوں میں گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی - اعلان کیا گیا کہ عوامی لیگ کے بعض لیڈروں نے ''کوپ،، سے عہد کر رکھا ہے کہ وہ مجھے مشرق پاکستان میں کوئی عام جلسہ منعقد نہ کرنے دیں گے - مخالف سیاسی پارٹیوں میں سے عوامی لیگ سب سے زیادہ اس بات کی خواہش مند تھی کہ ملک میں بد نظمی اور ابتری پھیل جائے اور انتخابات نہ ہو سکیں - بعض ضلعوں میں مقامی شہرہ پشتوں کو بھرتی کر کے

رضا کاروں کی جماعت بنائی گئی تھی ، یہ لوگ دندناتے پھرتے اور ووٹروں کو ڈراتے دھمکاتے تھے - عوامی لیگ مشرق پاکستان میں صوبائی عصبیت کو ہوا دے رہی تھی اور اس کا بہت سا سیاسی زور مغربی پاکستان کے خلاف بے اعتمادی اور نفرت پیدا کرنے میں صرف ہو رہا تھا -

میری اپنی سیاسی پارٹی جو قومی بنیاد پر ایک تعمیری پروگرام کے لئے کام کر رہی تھی ، ان حالات سے بڑی پریشانی محسوس کر رہی تھی - ہم شورش انگیز حربے استعمال نہ کر سکتے تھے اور نہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے -

مشرق پاکستان میں میں نے اپنی مہم کا آغاز ڈھاکہ کے ایک جلسے سے کیا - یہ جلسہ پلٹن میدان میں منعقد کیا گیا ، جو ایسا ہی مشہور ہے جیسا لاہور کا موچی دروازہ - معلوم ہوتا تھا کہ مخالف پارٹی نے جلسے میں جگہ جگہ اپنے آدمی بٹھا رکھے ہیں تاکہ وہ جلسے کی کارروائی میں رکاوٹ پیدا کرتے رہیں - لیکن وہ باقی مجمع سے دب کر رہ گئے اور ان کی چلنے نہ پائی - جلسہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگوں نے بڑے سکون سے میری تقریر سنی - مجھے یقین ہو گیا کہ مخالف پارٹیوں کی حکمت عملی خواہ کچھ بھی ہو ، عوام دونوں طرف کے سیاسی فلسفے اور پروگرام سے براہ راست آگاہی حاصل کرنے کے دل سے مشتاق ہیں -

میں نے سارے مشرق پاکستان کا دورہ کیا اور بڑے بڑے مجمعوں میں تقریریں کیں - سب سے بڑا جلسہ رنگ پور میں ہوا - میرے چاروں طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا - دیہات میں جہاں کہیں میں گیا ، میں نے لوگوں کو خوش حالی کے آثار کی طرف توجہ دلائی ، جو وہاں نظر آتے تھے - جہاں چھکڑے چلا کرتے تھے وہاں پکی سڑکیں بن گئی تھیں - جنگل جو وحشی درندوں سے اٹے پڑے تھے انھیں صاف کر دیا گیا تھا اور آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں - لوگوں کو بجلی مہیا کی گئی تھی مواصلات کو بہتر بنایا گیا تھا اور منڈیوں میں مال کی نکاسی کا عمدہ انتظام کیا گیا تھا - عوام کی صحت بہتر ہو گئی تھی اور انھیں

اچھا کھانے اور اچھا پہننے کو ملتا تھا - دیہاتی کاموں کے پروگرام کے تحت بے شمار منصوبے تکمیل پا چکے تھے جن سے عوام کی فوری ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں - یہ حکومت کی وہ ٹھوس کامیابیاں تھیں جن کی وقعت کوئی مخالف پارٹی کا بڑے سے بڑا پروپیگنڈا بھی کم نہ کر سکتا تھا -

میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی مہم کے پہلے دور کے اختتام تک اپنے بنیادی خیالات لوگوں کے ذہن نشین کر دیئے تھے - دونوں صوبوں کی یک جہتی کے بغیر ملک زندہ نہیں رہ سکتا - ان کی سلامتی اور مستقبل کا انحصار ان کے باہمی اشتراک پر ہے - ملک کے لئے یہ لازمی امر ہے کہ اس کا مرکز مضبوط ہو تاکہ پالسیوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے ، اور قومی پیمانے پر ہدایات جاری کی جا سکیں - اگر مرکز کمزور ہوگا تو صوبے ٹوٹ کر جدا جدا ہو جائیں گے - سات برس کے استحکام کی بنا پر زندگی کے ہر شعبے میں غیر معمولی ترقی ہوئی تھی - ہمیں جو کچھ امداد ملی تھی اسے مفید کاموں میں لگایا گیا تھا - پاکستان دنیا کی نظروں میں ترقی کا نمونہ بن گیا تھا - ملک کا وقار بڑھ گیا تھا - ہم اپنے بڑے بڑے ہمسایوں سے اپنے تعلقات خوش گوار بنانے میں کامیاب رہے تھے -

اس دوران میں بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کے انتخابات کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا - اب مس جناح نے مغربی پاکستان کا ایک اور دورہ کیا - ان میں اور ان کے رفقا میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا ، لیکن اب ان کی کوشش محض یہ تھی کہ صوبائی اور فرقہ وارانہ بنیاد پر لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا جائے - وہ جہاں کہیں جاتیں قومی پس منظر کو نظر انداز کر کے مقامی شکایات کا دکھڑا لے بیٹھتیں - شروع شروع میں لوگوں کو ان کے دیکھنے کا جو اشتیاق پیدا ہو گیا تھا ، وہ بھی اب کم ہونے لگا تھا - مخالف گروہ کے لیڈر انھیں جگہ جگہ گھسیٹے لئے پھرتے تھے اور یہ منظر بڑا افسوس ناک تھا - وہ ان کے کانوں میں یہ بات ڈالے جا رہے تھے کہ سارا ملک ان کی پشت پر ہے اور بنیادی جمہوریتوں

کے جو ممبر چنے گئے ہیں وہ سب کے سب مخالف پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں -

میں نے اپنا انتخابی منشور جاری کیا ، جس میں میں نے اپنے اعتقادات اور اپنا پروگرام درج کر دیا - اس منشور میں قومی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی - اور میرے فکر اور لائحہ عمل کا واضح خاکہ پیش کر دیا گیا تھا - مخالف پارٹی نے اس منشور کو انتخابی کرتب کے نام سے یاد کیا ، لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس میں خرابی کیا ہے -

انتخابات کے لئے مارچ کا مہینہ مقرر کیا گیا تھا - مخالف پارٹیوں نے مطالبہ کیا کہ انتخابات جلد کرائے جائیں - ان کا خیال تھا کہ اگر بنیادی جمہوریتوں اور عام انتخابات میں تین چار مہینوں کا وقفہ پڑ گیا تو ممکن ہے کہ انتظامیہ ووٹروں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے - میں نے ان کی بات رکھ لی اور انتخابات کی تاریخ تقریباً تین ماہ پہلے مقرر کر دی - اس پر یہ لوگ بھونچکے رہ گئے - اس سے ان کے انتظامات میں اچھی خاصی بدنظمی پیدا ہو گئی -

اب صدارتی انتخاب کی مہم اپنے آخری دور میں داخل ہوئی بلکہ صدارتی امیدواروں کو اپنے چننے والوں یعنی بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے ملاقات کرنی تھی - ان ملاقاتی جلسوں کا انتظام انتخابی کمیشن نے کیا تھا اور ان کی صدارت ہائی کورٹ کے جج کر رہے تھے - ان ہی جلسوں میں رائے دہندگان کا امیدواروں سے براہ راست سامنا ہوا - ان جلسوں کی کارروائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ پہلے امیدوار نے اپنا افتتاحی بیان دیا - اس کے بعد رائے دہندگان نے اس پر سوالات کرنے شروع کئے - ان ہی جلسوں میں مس جناح نے قومی مسائل سے اپنی پوری بے خبری کا ثبوت دیا - ہرچند ان کے رفقا نے انھیں خوب سکھا پڑھا رکھا تھا ، مگر وہ شاذ ہی کسی سوال کا سیدھا سیدھا جواب دے سکیں - آخر بات عقل و دانش کی سطح پر آ پہنچی تھی -

خیبر سے لے کر کاکس بازار تک انتخاب کا جوش و خروش پھیلا ہوا تھا - گھر گھر اس کا چرچا تھا - اخبارات دو گروہوں

میں بٹ گئے تھے - ایک گروہ مخالف جماعتوں کے امیدوار کا حامی تھا اور دوسرا پاکستان مسلم لیگ کے امیدوار کا - انتخابی مسائل پر بحث مباحثے ہو رہے تھے اور قریب قریب سبھی لوگ یہ جاننے لگے تھے کہ ہر ایک امیدوار کا مسلک کیا ہے -

عوامی لیگ نے انتخابات کو درہم برہم کرنے کے لئے اپنا آخری حربہ استعمال کیا - ان کے رضاکار بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے فرداً فرداً ملنے اور ان کو ڈرانے دھمکانے لگے - مس جناح عملاً یہ کہہ رہی تھیں کہ اگر ملک میں ابتری پیدا ہوتی ہے تو پیدا ہونے دو -

(۴)

۲-جنوری سنہ ۱۹۶۵ء کی صبح کو آٹھ بجے ملک بھر میں پرچیاں پڑنی شروع ہوئیں - دوپہر کے قریب اولین نتائج نکلنے شروع ہو گئے - انتخابی کمیشن نے ریڈیو پاکستان سے ان نتائج کے اعلان کا انتظام کیا تھا - جیسے جیسے پولنگ اسٹیشنوں سے نتائج آتے جاتے تھے ان کو نشر کر دیا جاتا تھا - سہ پہر کو چار بجے کے قریب رائے عامہ کا رجحان معلوم ہوگیا تھا - مس جناح کو قریب قریب ہر جگہ ہزیمت اٹھانی پڑی تھی - ملک کے بڑے بڑے شہروں میں مخالف پارٹیوں کے جتنے گڑھ تھے وہ ایک ایک کر کے ڈھئے جا رہے تھے - چٹاگانگ ، کھلنا ، راج شاھی ، سلہٹ ، حیدرآباد ، پشاور ، لاھور نے مس جناح کے خلاف فیصلہ صادر کیا تھا - ان کو صرف دو شہروں میں اکثریت حاصل ہوئی تھی ، ایک ڈھاکہ اور دوسرا کراچی - مغربی پاکستان میں کراچی کے سوا باقی ہر ایک ڈویژن اور ڈسٹرکٹ میں میرا پلہ بھاری رہا - مشرقی پاکستان میں سترہ میں سے تیرہ ضلعوں میں مجھے اکثریت حاصل ہوئی - رائے دھندگان کی مجموعی تعداد میں سے ۹۹٫۶۲ فی صد ووٹ ڈالے گئے - مس جناح کے ۳۶ فی صد کے مقابلے میں مجھے ۶۳ فی صد کی اکثریت حاصل ہوئی -

قوم نے آئین کے حق میں اپنا واضح اور آخری فیصلہ سنا دیا تھا - اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی عام انتخابات عمل میں نہ آئے تھے - قوم نے اس سلسلے میں جس دل چسپی اور آمادگی کا

اظہار کیا ، وہ نہایت حوصلہ افزا تھی - ملک نے ابتری کے مقابلے میں استحکام ، نااتفاقی کے مقابلے میں سلامتی اور جمود کے مقابلے میں ترقی کو پسند کیا تھا -

مس جناح کی انتخابی حکمت عملی کا منصوبہ بڑی خوبی سے بنایا گیا تھا - میرے خیال میں ان میں سے بعض عناصر ان کے رفقا کے شامل کردہ تھے ، جو اس کھیل کے پرانے کھلاڑی تھے - مس جناح جانتی تھیں کہ ان کی بڑی جاذبیت قائد اعظم سے ان کا رشتہ ہے - چنانچہ انھوں نے دل میں سوچا کہ انھیں جذباتیت ھی کی بنا پر انتخاب لڑنا چاھئے - بعض اوقات ان کی کوشش یہ معلوم ہوتی تھی کہ مجھے ذاتی طور پر بدنام کیا جائے اور واقعات کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا جائے - انھوں نے حیرت انگیز توانائی کا ثبوت دیا تھا اور بڑی کٹھن لڑائی لڑی تھی - ایک ہفتاد سالہ خاتون کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے - میں ان کی جرأت و ہمت پر آفریں کہتا ہوں - میرے خیال میں انھیں اپنے ذاتی اثر کے بارے میں مغالطہ ہوا تھا - لوگوں کو جلد ھی احساس ہو گیا تھا کہ قائد اعظم کی ہمشیرہ ہونے کی حیثیت سے وہ لائق صد تکریم ہیں ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صدر کی حیثیت سے ملک کا انتظام سنبھال سکیں گی - آخری مقابلہ تعصب اور حقیقت پسندی کے درمیان تھا جس میں حقیقت پسندی کی جیت ہوئی -

میں نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے میری حمایت کی تھی اور ان لوگوں کا بھی جو مجھ سے اختلاف رکھتے تھے - انھوں نے بھی جمہوریت کے مقاصد کو فائدہ پہنچایا - میں چاہتا تھا کہ تائید و حمایت کا یہ لمحہ پائیدار یک جہتی کی علامت بن جائے - کینہ یا تاسف کا کوئی نشان کسی کو عوام کی سربلندی پر خوشیاں منانے سے نہ روک سکے - میں نے پاکستان کے نصب العین کی تکمیل کے لئے قوم سے سرگرم عمل ہونے کی درخواست کی -

"آئیے مل جل کر تعمیر کریں ، مل جل کر تکمیل کریں ، تاکہ پاکستان ہمیشہ قائم رہے اور فروغ پائے۔"

پاکستان پائندہ باد!

ضمیمہ-۱

جموں و کشمیر : وزیر اعظم انڈیا کے تاروں سے اقتباسات

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پنڈت نہرو کے ساتھ میری ملاقاتیں بڑی مایوس کن ثابت ہوئیں - ان کے انداز میں ایک بے پروائی تھی غالباً اس کلیے کی بنا پر کہ قبضہ سچا اور دعوی جھوٹا ، خواہ قبضہ اخلاق اور قانونی اعتبار سے کتنا ہی غلط سہی - میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک ملک کا سربراہ اتنی بے باکی کے ساتھ معاہدات کی خلاف ورزی کر سکتا ہے - میں صرف ان کی ذاتی یقین دہانیوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو انہوں نے براہ راست یا دوسرے ذرائع سے کیں ، بلکہ ان باضابطہ عہد و پیمان کا جو انہوں نے جموں و کشمیر کی بابت رسمی طور پر پوری سنجیدگی کے ساتھ حکومت پاکستان کے ساتھ کئے -

ذیل میں ان تاروں کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو انڈیا کے وزیر اعظم نے اس سلسلے میں بھیجے :—

(الف) بجانب وزیر اعظم پاکستان از طرف وزیر اعظم انڈیا ، مورخہ ۲۷-۱ اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء :

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامی صورت حال میں کشمیر کی مدد کرنے کا مدعا کسی طرح بھی یہ نہیں ہے کہ ریاست کے ہندوستان میں شامل ہونے کے معاملے پر اثر ڈالا جائے - ہمارا نظریہ اس معاملے میں یہ ہے جسے ہم بار بار علانیہ طور پر دھرا چکے ہیں کہ کسی بھی متنازع فیہ علاقے یا ریاست کی شمولیت کا فیصلہ عوام کی رائے پر موقوف ہونا چاہئے اور ہم اس نظریے پر قائم ہیں -"

(ب) وزیر اعظم انڈیا کی طرف سے وزیر اعظم پاکستان کے نام ، مورخہ ۳۱-۱ اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء :

"ہماری یہ یقین دہانی کہ جونہی امن و امان بحال ہو گیا ، ہم کشمیر سے اپنی فوجیں ہٹا لیں گے اور ریاست کے مستقبل کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دیں گے ، ایک ایسا وعدہ ہے جو ہم نے صرف آپ کی حکومت کے ساتھ نہیں بلکہ کشمیر کے عوام اور دنیا بھر کے ساتھ کیا ہے -"

(ج) جواہر لال نہرو کی طرف سے لیاقت علی خاں کے نام ، مورخہ ۴-نومبر سنہ ۱۹۴۷ء :

"میں آپ کی توجہ کشمیر پر اپنی نشری تقریر کی جانب مبذول کرانا

چاھتا ھوں جو میں نے کل شام کی ھے - میں نے اپنی حکومت کی پالسی کو بیان کیا اور یہ واضح کر دیا کہ ھم کشمیر پر اپنی مرضی مسلّط نہیں کرنا چاھتے - میں نے یہ بھی کہا کہ ھم اس بات کا اقرار کر چکے ھیں کہ کوئی غیر جانب دار فریق مثلاً اقوام متحدہ رائے شماری کی نگرانی کرے -،،

د جواھر لال نہرو کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے نام، مورخہ ۴-۱ کتوبر سنہ ۱۹۴۸ء :

"ھم اپنے اس موقف سے کبھی منحرف نہیں ھوئے کہ جموں اور کشمیر میں حالات جونہی اعتدال پر آئیں ، آزادانہ اور منصفانہ رائے شماری ھونی چاھئے -،،

ر) جواھر لال نہرو کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے نام ، مورخہ ۴-۱ کتوبر سنہ ۱۹۴۸ء :

"میں یہی کہہ سکتا ھوں کہ میں اس خواھش میں آپ کا شریک ھوں کہ کشمیر کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کا معاملہ عوام کی مرضی ھی پر موقوف ھونا چاھئے ، نیز یہ کہ میں اس مسئلے کا امن پسندانہ اور آبرومندانہ حل تلاش کرنے میں ھمیشہ تعاون کے لئے تیار رھوں گا -،،

ضمیمہ-۲

صدر مملکت کا هنگامی فرمان

اعلامیہ جو ۷- اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو صدر پاکستان نے جاری کیا
نمبر ایف ۸۱/پریز/۵۸، ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء، گزٹ
مورخہ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء

حسب ذیل اعلان جو صدر نے ۷- اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو ساڑھے دس بجے جاری کیا ، عام اطلاع کے لئے شائع کیا جاتا ھے :

پچھلے دو سال سے میں گہری تشویش کے ساتھ مشاهدہ کر رها هوں کہ اقتدار کے لئے بے تحاشا رسّہ کشی جاری ھے ، بدعنوانیاں هیں ، سادہ ، نیک و محب وطن اور محنتی عوام سے بے شرمی کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھایا جا رها ھے ، شائستگی کا فقدان ھے اور اسلام کو سیاسی مقاصد کا آلۂ کار بنایا جا رها ھے۔ فقط چند قابل قدر لوگ اس سے مستثنیٰ هیں ، لیکن ایسے لوگ چونکہ اقلیت میں هیں اس لئے وہ ملک کے معاملات میں اثر انداز نہیں هو سکے .

ان مذموم حرکتوں کا نتیجہ پست ترین درجے کی آمریت کی شکل میں ظاهر هوا - اهل هوس اور اهل غرض ، عوام کو نقصان پہنچا کر ناجائز فائدہ حاصل کرتے رهے اور اپنی بد کرداریوں کی بدولت اور زیادہ دولت مند هوتے گئے -

میری مسلسل کوششوں کے باوجود غذائی مسئلے کو حل کرنے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں کی گئی - خوراک هماری زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ھے ، حالانکہ همارے ملک کو در حقیقت خوراک میں خود کفیل هونا چاهئے تھا - زراعت اور انتظام اراضی کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا رها ، جس کا نتیجہ یہ ھے کہ همارے موجودہ نظام حکومت کے تحت کوئی سیاسی جماعت خوراک کی پیداوار بڑھانے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کے قابل نہ هوگی - دوسری طرف مشرق پاکستان میں سمگلر بڑے منظم طریقے سے غلے ، ادویات اور دوسری ضروریات زندگی سرحد پار پہنچا رهے هیں ، اس بنا پر جو قلت پیدا هوئی ھے اور قیمتوں میں اضافہ هوا ھے وہ عام لوگوں کی مصیبت کا باعث بن گیا ھے - غلے کی درآمد کی وجہ سے گزشتہ چند برس سے هماری بیرونی زر مبادلہ کی کمائی پر مستقل اور شدید بار پڑ رها ھے ، جس کا نتیجہ یہ ھے کہ حکومت نہایت ضروری ترقیاتی منصوبوں میں تخفیف کرنے پر مجبور هو گئی ھے -

ہمارے کچھ سیاست داں چند دنوں سے خونی انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں ۔ ان میں سے بعض ہنگامہ پسند بیرونی ملکوں میں جا کر براہ راست ان سے اتحاد عمل کی پیش کش کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے ، جسے کھلی بغاوت ہی قرار دیا جا سکتا ہے ۔

چند روز پہلے مشرقی پاکستان اسمبلی میں جو شرمناک مناظر دیکھنے میں آئے ، ان سے سب آگاہ ہیں ۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس قسم کی باتیں غیر منقسم بنگال میں اکثر ہوتی رہی ہیں ۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو ، لیکن بہر صورت یہ کوئی مہذب طریق عمل نہیں ہے ۔ اسپیکر کو زد و کوب کرنا ، ڈپٹی اسپیکر کو قتل کرنا اور قومی پرچم کی توہین کرنا ملک کے وقار کو بڑھانے کی صورتیں نہیں ہیں ۔

سیاسی جماعتوں کی ذہنیت اتنی پست ہو گئی ہے کہ مجھے اس بات کا کوئی بھروسا نہیں رہا کہ انتخابات ملک کے موجودہ داخلی انتشار کو سدھار سکتے ہیں یا ان کے ذریعے ایک ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت بنائی جا سکتی ہے ، جو ان بے شمار پیچیدہ مسائل کو حل کر سکے جو ہمیں درپیش ہیں ۔ آسمان سے نئے لوگ اتر کر نہ آئیں گے ۔ وہی گروہ جس نے پاکستان کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے، انتخابات کو محض اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرے گا ۔ بلکہ یہ لوگ بڑے انتقامی جذبے کے ساتھ دوبارہ بر سر اقتدار آئیں گے ،کیونکہ مجھے یقین ہے کہ انتخاب ذاتی ، علاقائی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر لڑا جائے گا ۔ جب وہ انتخاب میں کامیاب ہو کر آئیں گے تو انہی طریقوں کو استعمال کریں گے جنھوں نے جمہوریت کو ایک ڈھونگ ، ایک المناک تماشا بنا کر رکھ دیا ہے، اور جو دراصل ہر طرف پھیلی ہوئی حرماں زدگی کا باعث ہیں ۔ بدلتی ہوئی وفاداریوں اورکرسیوں کے لئے مچی ہوئی افراتفری کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ انتظامیہ خواہ کتنی بھی کوشش کرے انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہ ہوں گے ۔ انتخابات ہماری مشکلات کو حل نہ کریں گے، اس کے برعکس زیادہ بد دلی اور مشکلات پیدا کریں گے جو آخر ہمیں ایک خونریز انقلاب کی جانب لے جائیں گی ۔ حال ہی میں کراچی کارپوریشن کے انتخابات ہوئے تھے ۔ پورے حلقے سے صرف بیس فی صد ووٹ ڈالے گئے اور ان میں سے تقریباً پچاس فی صدی ووٹ جعلی تھے ۔

ہم ایک یونٹ توڑنے اور پرائیویٹ رضاکار تنظیموں کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں سول نافرمانی کی دھمکیاں سن رہے ہیں ۔ ان انتشار پسند رجحانات سے ان لوگوں کی حب الوطنی کی قلعی کھل جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ سیاست باز اور حالات سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے اپنے اپنے تنگ دلانہ مقاصد کے حصول کے لئے کس حد تک بڑھ سکتے ہیں ۔

ہماری خارجہ پالسی پر غیر ذمہ دارانہ اور بلا سوچے سمجھے نکتہ چینی کی جاتی ہے ۔ حب الوطنی کے نظریے سے نہیں بلکہ محض ذاتی اغراض کے لئے اور وہی لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں جو خود اس پالسی کے ذمہ دار تھے ۔

ہم تمام قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں ، لیکن سیاسی موقع پسند روس ، متحدہ عرب جمہوریہ اور عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب کرنے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بھارت کے خلاف بیشک وہ جنگ کے نعرے بلند کرتے ہیں ، مگر یہ جانتے ہوئے کہ خود کبھی میدان جنگ کے آس پاس نہ ہوں گے ۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی سیاسی جماعتیں خارجہ پالیسی کے ساتھ اس طرح کا مذاق نہیں کرتیں جیسے کہ پاکستان میں کیا جاتا رہا ۔ اس خلجان کو دور کرنے کے لئے میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ ہم اس خارجہ پالیسی پر عمل کریں گے جس کا ہمارا قومی مفاد اور جغرافیائی محل وقوع مطالبہ کرتا ہے ۔ ہم اپنے تمام بین الاقوامی معاہدات پر کاربند رہیں گے جو بلاشبہ ہم نے پاکستان کی سلامتی کی خاطر کئے ہیں ، و علیٰ ہذا القیاس ایک امن پسند قوم کی حیثیت سے ہم اس آفات زدہ دنیا سے جنگ کا خطرہ دور کرنے کے لئے اپنے مقدور بھر کوشش کرتے رہیں گے ۔

گذشتہ تین برس سے میں جمہوری طریقوں سے دستور پر عمل درآمد کرانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں ۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی مخلوط حکومتوں کے قیام کے لئے کوشش کی ، اس توقع میں کہ شاید نظم و نسق میں استواری پیدا ہو سکے اور ملک کی حکومت اس طرح چلے کہ عوام کو فائدہ پہنچے ۔ مجھے رسوا کرنے والوں نے بد نیتی سے ہمیشہ ان تبدیلیوں کو محلاتی سازشوں کا نام دیا ۔ سارا الزام صدر کے سر تھوپنا ایک فیشن سا بن گیا ہے ۔ کسی خوش طبع نے چند روز ہوئے کہا : ’’اگر ملک میں بارش زیادہ ہو جائے تو یہ صدر کا قصور ہے اور اگر نہ ہو تو یہ بھی صدر کا قصور ہے ۔،، اگر معاملہ صرف میرا ہی ہوتا تو میں ان ملامتوں کو برابر نظر انداز کئے جاتا اور ان کی مطلق پروا نہ کرتا ، لیکن ان غداروں اور ملک دشمن عناصر کا مقصد صدر مملکت پر حملہ کر کے پاکستان اور حکومت کا وقار گرانا تھا ۔ وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں اور اگر اس صورت حال کو برقرار رہنے دیا جائے تو وہ اپنے اصل مقصد میں بالآخر کامیاب ہو جائیں گے ۔

داخلی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عوام کی اکثریت کا اعتبار موجودہ طرز حکومت پر سے بالکل اٹھ گیا ہے اور وہ روز بروز اس کی بابت زیادہ ناامید ہوتے جا رہے ہیں ۔ ان کو جس طرح جبر و استحصال کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کی بنا پر ان میں خطرناک حد تک تلخی پیدا ہوگئی ہے ۔ سیاسی رہنماؤں نے ان کی خدمت کا حق ادا نہیں کیا ، عوام نے ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے ۔

آئین جو اتنی دشواریوں کے بعد ۲۳۔ مارچ سنہ ۱۹۵۶ء کو نافذ کیا گیا تھا ناقابل عمل ہے ۔ اس میں مصالحتیں ہی مصالحتیں ملتی ہیں جو بڑی خطرناک ہیں اور اگر اس کی خرابیوں کو دور نہ کیا گیا تو جلد ہی

داخلی طور پر پاکستان کی جمعیت بکھر کر رہ جائے گی - ان حالات کو درست کرنے کی غرض سے پر امن انقلاب کے ذریعے ملک کو ہوشمندی کی طرف لے جانے کی ضرورت ہے، اس کے بعد میرا ارادہ یہ ہے کہ بعض محب وطن افراد کو جمع کروں تاکہ وہ سیاسی شعبے میں ہمارے مسائل کا جائزہ لے کر ایک ایسا موزوں آئین مرتب کریں جو مسلم عوام کے مزاج کے مطابق ہو - جب یہ تیار ہو جائے گا تو اسے مناسب وقت پر عوام سے استصواب رائے کے لئے پیش کیا جائے گا -

کہا جاتا ہے کہ آئین ایک مقدس چیز ہے - لیکن آئین اور ہر دوسری چیز سے زیادہ مقدس ملک اور اس کے عوام کی خوش حالی اور بہبود ہے - سربراہ مملکت کی حیثیت سے خدا اور عوام کے روبرو میرا اولین فریضہ پاکستان کی سالمیت ہے - اسے غداروں اور سیاسی زمانہ سازوں کی بے دردی سے سخت خطرہ لاحق ہے، جن کی خود غرضی ، ہوس اقتدار اور غیر محب وطن رویے کو روکنا موجودہ نظام کے تحت قائم ہونے والی حکومت سے ممکن نہیں- نہ میں ملک کو تباہ کرنے کی کوششوں کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا گوارا کر سکتا ہوں - میں بڑے گہرے تفکر اور اضطراب کے بعد اس افسوس ناک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر میں نے پاکستان کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے ایسے اقدام نہ کئے جو موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں، تو میں اپنے فرض سے کوتاہی کروں گا - اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ :—

(الف) ۲۳-مارچ سنہ ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کر دیا جائے -

(ب) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو فوری طور پر برطرف کیا جائے -

(ج) قومی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے -

(د) تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جائے -

(و) جب تک متبادل انتظامات نہ ہوں پاکستان میں مارشل لا نافذ رہے گا - میں جنرل محمد ایوب خاں ، کمانڈر انچیف پاکستان آرمی کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کرتا ہوں اور پاکستان کی تمام افواج کو ان کی کمان میں دیتا ہوں -

پاکستان کی بہادر افواج سے مجھے یہ کہنا ہے کہ قیام پاکستان کے وقت سے میرا ان سے گہرا ربط رہا ہے، جس کے باعث میں ان کی وفاداری اور جذبۂ حب الوطنی کا معترف اور مداح ہوں - میں ان پر بڑا بار ڈال رہا ہوں - مجھے اس کا پورا احساس ہے لیکن افواج کے افسرو اور جوانو! تمہاری ہی خدمت پر اس بات کا دار و مدار ہے کہ پاکستان بحیثیت ایک آزاد قوم کے برقرار رہے اور آزاد دنیا کے اس علاقے میں ایک مضبوط قلعے کی حیثیت سے قائم رہے - بلا خوف و خطر اور بلا رو رعایت اپنا فرض ادا کیجئے - خدا آپ کی مدد کرے -

پاکستانی عوام سے میں ایک بھائی اور ہم وطن کی حیثیت سے مخاطب ہوں -

موجودہ اقدام بڑے افسوس کے ساتھ کیا جا رہا ہے ، لیکن یہ مجھے ملک کے مفاد اور عوام کی خاطر کرنا پڑا ، ایسے عوام جن سے بہتر انسانوں کا تصور محال ہے ۔ محب وطن اور قانون پسند لوگوں سے میں یہ کہوں گا کہ آپ آئندہ زیادہ آزاد اور خوش حال ہوں گے ۔ سیاسی موقع پرستوں ، سمگلروں ، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے لئے برا وقت ہوگا اور ان کی سرگرمیوں کو سختی سے دبایا جائے گا ۔ جہاں تک غداروں کا تعلق ہے ، بہتر ہوگا کہ موقع پائیں تو ملک سے بھاگ جائیں ۔

ضمیمہ-۳

حکومت پاکستان کا اعلان نمبر ۵۸/۹۷۷ مورخہ ۷-اکتوبر ۱۹۵۸ء
غیر معمولی گزٹ مجریہ ۱۰-اکتوبر ۱۹۵۸ء

(۱) ہرگاہ کہ میں قومی تقاضوں کے پیش نظر یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی بین الاقوامی سرحدات کے اندر اختیارات حکومت سنبھال لوں ، لہذا میں افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر کی حیثیت میں حسب ذیل اعلان کرتا ہوں :

(۲) مارشل لا کے ضوابط اور احکام حسب سہولت شائع کئے جائیں گے۔ جو شخص ان ضوابط یا احکام کی خلاف ورزی کرے گا وہ مارشل لا کے تحت اس سزا کا مستحق ہو گا جو ان ضوابط میں مذکور ہے۔

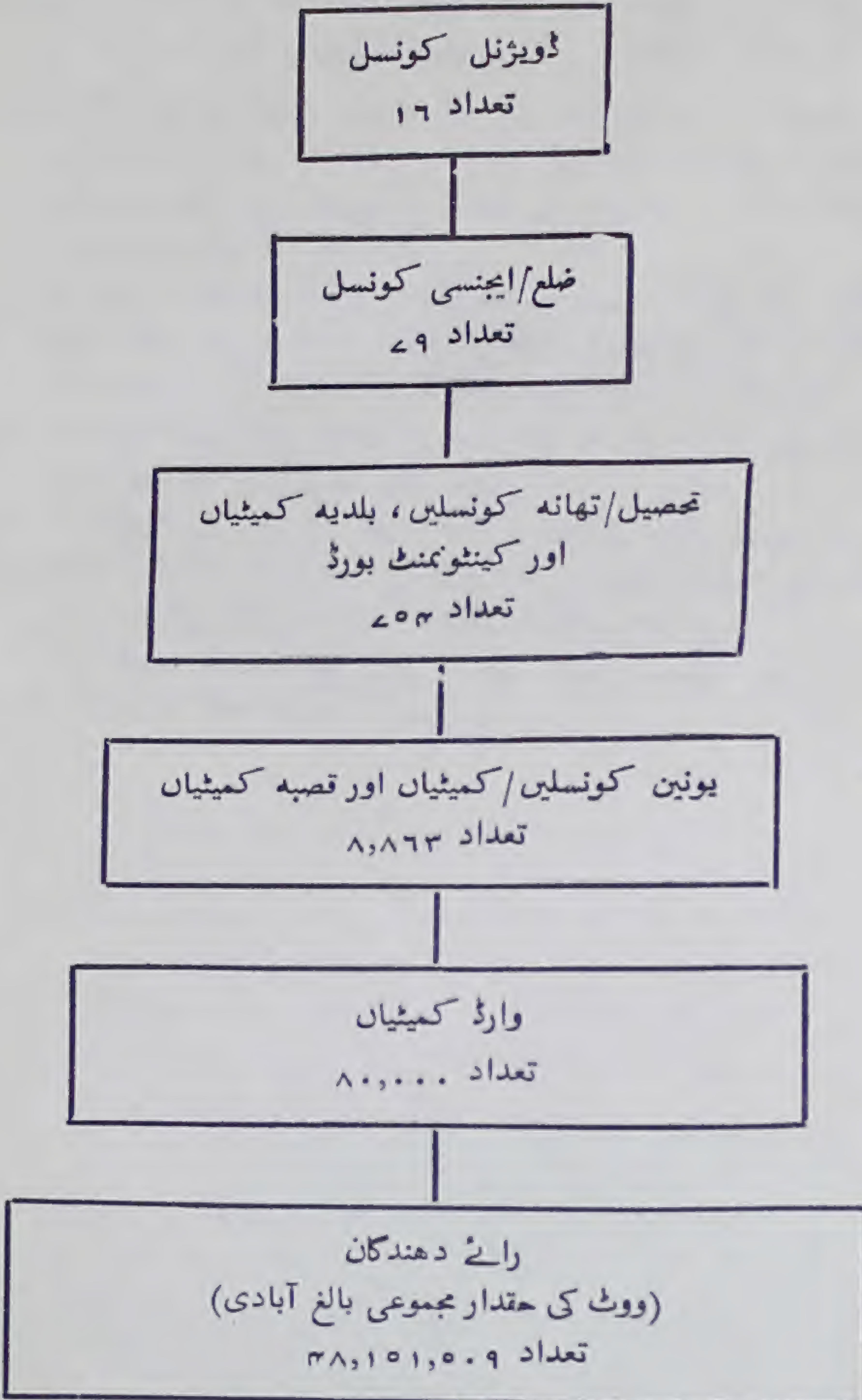
(۳) ان ضوابط میں عام قوانین کے تحت کئے جانے والے جرموں کے لئے بھی خاص سزائیں مقرر کی جا سکتی ہیں۔

(۴) ان ضوابط کے تحت ان ضوابط اور احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں نیز عام قوانین کے تحت کئے جانے والے جرموں پر مقدمہ چلانے اور سزا دینے کے لئے خاص عدالتیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

محمد ایوب خان۔ ایچ۔ پی ، ایچ۔ جے ، جنرل ، سپریم کمانڈر و چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پاکستان۔

ضمیمہ-۴

بنیادی جمہوریت کا ڈھانچا



ضمیمہ — ۵

اصلاحی کمیشنیں

نام	تقرر	رپورٹ کب پیش کی گئی
(۱) زرعی اصلاحات کمیشن	۳۱-۱۰-۵۸	۲۰-۱-۵۹
(۲) جہازرانی کمیشن	۱۹-۱۱-۵۸	۸-۴-۵۹
(۳) اصلاح قانون کمیشن	۲۳-۱۱-۵۸	۲۷-۱۲-۶۱
(۴) انتظامیہ کی تنظیم نو کے لئے کمیٹی	۲-۱۲-۵۸	۲۵-۴-۶۲
(۵) کمیشن برائے قومی تعلیم	۳۰-۱۲-۵۸	۲۶-۸-۵۹
(۶) صدر مقام کے محل وقوع کی کمیٹی	۲۱-۱-۵۹	۱۲-۶-۵۹
(۷) تحقیقاتی کمیشن برائے قرضہ جات	۲۴-۲-۵۹	۱۰-۹-۵۹
(۸) غذائی و زرعی کمیشن	۸-۷-۵۹	۲۹-۱۱-۶۰
(۹) سائنس کمیشن	۱۵-۷-۵۹	۸-۹-۶۰
(۱۰) تنخواہ و ملازمت کمیشن	۳۱-۸-۵۹	۱-۶-۶۲
(۱۱) کمپنی قانون کمیشن	۱۵-۱۰-۵۹	۲۷-۱۲-۶۱
(۱۲) طبی اصلاحات کمیشن	۱۹-۱۱-۵۹	۱۶-۴-۶۰
(۱۳) کھیل ، ثقافت و نژاد نو کی کمیٹیاں	۱۰-۱۲-۵۹	۶-۸-۶۰
(۱۴) پولیس کمیشن	۲-۱-۶۰	۱۹-۵-۶۱
(۱۵) آئین کمیشن	۱۷-۲-۶۰	۶-۵-۶۱
(۱۶) قیمتوں کی تعین کا کمیشن	۱۸-۲-۶۰	۳-۷-۶۰
(۱۷) فلمی معلوماتی کمیٹی	۱۰-۳-۶۰	۲۸-۴-۶۱
(۱۸) فالتو افرادی طاقت کا کمیشن	۱۸-۱۰-۶۰	۷-۷-۶۱
(۱۹) سماجی برائیوں کا کمیشن	۱۳-۱-۶۱	۱۸-۶-۶۳
(۲۰) برقی طاقت کا کمیشن	۱۲-۵-۶۱	۸-۸-۶۲
(۲۱) مالیاتی کمیشن	۱۲-۱۲-۶۱	۱۵-۱-۶۲
(۲۲) قرضہ جاتی کمیٹی	۱۰-۵-۶۲	۷-۱۱-۶۲
(۲۳) رائے دہی کی کمیٹی	۴-۸-۶۲	۱۸-۲-۶۳
(۲۴) قومی آمدنی کمیشن	۴-۴-۶۳	۱۳-۱۱-۶۴

(۲۵) قومی مالیات کمیشن	۲۵-۳-۶۴	۲۰-۵-۶۰
(۲۶) اقلیتوں کا کمیشن	۴-۵-۶۵	زیر تکمیل ہے
(۲۷) نشریاتی کمیٹی	۲۹-۷-۶۵	زیر تکمیل ہے
(۲۸) پریس کمیشن*	۵-۹-۵۸	۴-۵-۵۹
(۲۹) شکر کمیشن*	۳۰-۹-۵۷	۴-۸-۵۹
(۳۰) شادی و عائلی قانون کمیشن*	۴-۸-۵۴	۱-۶-۵۶ رپورٹ پر عمل درآمد ہو گیا ۲-۳-۶۱

* کمیشن بہت پہلے قائم کیا جا چکا تھا لیکن رپورٹ اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ کے بعد پیش کی گئی پر عمل درآمد بعد میں ہوا ۔

ضمیمہ—٦

صدر کا منشور

(جو صدر محمد ایوب خاں نے صدارت کے عہدے کے لئے دوسری بار انتخاب سے قبل جاری کیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو شائع ہوا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ

مجھے یقین ہے :

۱- کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل و کرم سے اس علاقے کے مسلمانوں کو پاکستان اس لئے عطا فرمایا کہ وہ اس سر زمین میں اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲- پاکستان کے لئے مقدر ہے کہ تاریخ انسانی میں عموماً اور مسلمانان عالم کی ترقی و سربلندی میں خصوصاً انتہائی شاندار کام سر انجام دے۔

۳- پاکستان کے عوام کی مرضی سب پر مقدم ہے اور اس کو مملکت کے ہر کام اور ہر معاملے میں فوقیت حاصل ہے۔

۴- جمہوریت ہی وہ یقینی طریقہ ہے جس سے عوام اپنے ملک کے معاملات میں پوری طرح شریک ہو سکتے ہیں۔

۵- پاکستان میں جمہوریت چاہے جو شکل اختیار کرے، مگر اس کی بنیاد نظریات کی محض اندھی تقلید کی بجائے حقیقت، تجربے اور مشاہدے پر ہونی چاہئے اور اس کے اصول یہ ہوں :

انفرادی رائے کی آزادی
اشتراک عمل کی آزادی
اجتماع کی آزادی
اور قانون کی حکمرانی

۶- یہ حق صرف پاکستان کے عوام کو حاصل ہے کہ وہ ملک میں جس طرح کی حکومت چاہیں، قائم کریں مگر لازم ہے کہ وہ پاکستان کے بنیادی نظریے کے مطابق ہو اور ملک کی آزادی، سلامتی اور وحدت کی ضامن ہو۔

۷- پاکستان کے عوام کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی احکام سے انحراف کئے بغیر عصر حاضر کی سائنسی اور تکنیکی ترقیوں کو جلد سے جلد اپنائیں تاکہ اُن کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔

۸- ہر قسم کا طبقاتی امتیاز دور ہو جانا چاہئے تاکہ پاکستان کے عوام ایک ایسی مثالی قوم کی طرح خوش حالی سے زندگی گزاریں جس کی معاشرت اسلامی اخوت اور انسانی مساوات کا زندہ نمونہ ہو۔

۹- پاکستان کے ہر شہری کے لئے ترقی اور خوش حالی کے یکساں مواقع مہیا ہونے چاہئیں۔

۱۰- پاکستان کو ایک ایسی فلاحی مملکت بننا چاہئے جس میں زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہر شخص کو میسر ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ:

۱- کہ گزشتہ چھ برس میں جو اصلاحات ، زرعی ، تعلیمی ، آئینی اور انتظامی شعبوں میں نافذ کی گئی ہیں ، ان کا سب سے بڑا مقصد یہ رہا ہے کہ پاکستانی معاشرے کو ماضی کی غلامانہ ذہنیت اور طبقاتی آویزش اور کشمکش سے آزاد کرایا جائے۔

۲- مذکورہ شعبوں میں مزید ترقی ، صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اتنی خود اعتمادی پیدا کر لیں کہ اپنے مسائل پر خود غور کرنے اور انہیں اپنے طریقے سے سلجھانے کے قابل ہو جائیں۔

۳- روشن خیالی کا تقاضا ہے کہ ہمارا چلن، فرسودہ نظریات کی اندھی تقلید کی بجائے زندہ حقائق پر مبنی ہو ، کیونکہ صرف اسی طرح ہم رجعت پسندی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر کے صحیح اور سچی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی، اقتصادی اور ذہنی آزادی سے ہم کنار ہو سکیں گے۔

۴- تمام سیاسی اور اقتصادی امور میں ہمارا رویہ اور انداز فکر، محض نظریاتی نہیں بلکہ حالات اور تقاضائے وقت کے مطابق ہونا چاہئے۔

۵- ایک مضبوط مرکز ہی پاکستان کی آزادی اور سالمیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہ مرکز اتنا مستحکم ہونا چاہئے کہ وہ ایک طرف تو مختلف صوبوں کو ان کے معاملات میں پوری آزادی دے سکے اور دوسری طرف مرکز سے فرار کے کسی رجحان کو پیدا نہ ہونے دے۔

۶- دوسرے ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کا دار و مدار صرف پاکستان کے مفاد پر ہونا چاہئے اور ہمیں دنیا کے ہر ملک اور خصوصاً اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ دوستی اور سمجھ بوجھ کا دائرہ وسیع کرنے کی لگاتار کوشش کرنی چاہئے۔

۷- ہمیں عالم گیر امن ، اور انسانی خوش حالی کے قیام کے لئے ہمیشہ جد و جہد اور ہر ممکن طریقے سے عالم انسانیت کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میرا وعدہ ہے :

۱- کہ ملک کے وسائل سے مکمل ترین استفادہ کیا جائے گا ۔

۲- ملکی دولت کی وسیع ترین اور نہایت منصفانہ تقسیم کی تدبیر کی جائے گی ۔

۳- عام آدمی کی آمدنی میں اضافے کے لئے ہر ممکن ذریعے سے کام لیا جائے گا تاکہ غریب اور امیر کے درمیان فرق کم ہو سکے ۔

۴- ٹیکسوں کو اس طرح عائد کیا جائے گا کہ ہر ایک پر منصفانہ اور متوازن بار پڑے ۔

۵- اجارہ داریاں اور کاروباری تسلط ختم کر دیے جائیں گے ۔

۶- مالیے کے نظام میں ایسی معقول اصلاحات کی جائیں گی کہ چھوٹے زمینداروں کے ساتھ انصاف برتا جائے گا ۔

۷- مشرقی پاکستان میں سیلابوں کا سد باب کیا جائے گا اور سیلاب سے متاثر لوگوں کو دوبارہ آباد کرنے کی تمام مناسب سہولتیں دی جائیں گی ۔

۸- مغربی پاکستان میں سیم اور تھور پر قابو پانے کی ہر تدبیر اختیار کی جائے گی اور متاثر شدہ زمین کی بحالی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی ۔

۹- عوام کی اشیائے صرف کی قیمتوں میں استحکام پیدا کیا جائے گا اور جہاں تک ہو سکے گا افراط زر کی روک تھام کی جائے گی ۔

۱۰- بے گھر لوگوں کو بسانے اور بہتر اقامتی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں گے ۔

۱۱- آبادی میں اضافے کی روک تھام کی جائے گی تاکہ عوام کے معیار زندگی کو نقصان نہ پہنچے ۔

۱۲- انتظامی معاملات میں مقامی لوگوں کو شامل کیا جائے گا اور انتظامی امور کی ذمہ داری حسب امکان بنیادی جمہوریتوں کو بتدریج منتقل کر دی جائے گی ۔

۱۳- دیہی تعمیراتی پروگرام کو مالی اور عملی اعتبار سے وسیع تر کیا جائے گا ۔

۱۴- ایک ایسا مستحکم دیہی معاشرہ تشکیل دیا جائے گا جو اپنی ضروریات خود پوری کر سکے ۔

۱۵- تیسرے پنج سالہ منصوبے کے خاکے کے مطابق ملک بھر میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں گی ۔

۱۶- پریس کے لئے ایک ضابطۂ اخلاق تیار کیا جائے گا ، اور اخبارات ہی میں ایک ایسا اندرونی نظام قائم کیا جائے گا کہ اخبارات خود اپنے عمل کو اس ضابطے کے تابع رکھ سکیں گے ۔

۱۷- انتظامیہ کے ہر شعبے میں بدعنوانی ، رشوت ستانی اور دوسری خرابیوں

کا قلع قمع کرنے کے لئے مزید اقدامات کئے جائیں گے اور سرکاری محکموں میں کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنایا جائے گا۔

۱۸- ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ، ہر ممکن طریقے پر مساوات کے حصول کے لئے مؤثر کارروائی کی جائے گی جیسا کہ آئین کی رو سے لازم ہے، اور اس بات کا بھی خیال رکھا جائے گا کہ مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کی ترقی کو ایک واحد اور ناقابل تقسیم یونٹ کی حیثیت سے فروغ دیا جائے تاکہ ملک بھر کی ترقی توازن کے ساتھ ہو سکے۔

۱۹- ثقافتی ہم آہنگی اور تخلیقی فکر کی نشو و نما کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

۲۰- مسلم قومیت کے بنیادی مسلک کی ترویج کی جائے گی تاکہ اس مضبوط بنیاد پر دوسرے مسلم ممالک کے درمیان بخوبی اشتراک عمل کیا جا سکے۔

۲۱- آزادی کی ہر تحریک کی حمایت کی جائے گی اور ایسی قوموں اور آبادیوں کی ہر ممکن امداد کی جائے گی جو کسی قسم کے سیاسی غلبے کا شکار ہوں۔

۲۲- جموں و کشمیر کے عوام کو حق خود اختیاری دلانے کی مسلسل جد و جہد کی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ وہ اپنا یہ حق اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاکستان و ہندوستان کی قرار دادوں کے مطابق استعمال کر سکیں نیز کشمیر کے مجاہدین آزادی کی اخلاقی حمایت کی جائے گی۔

۲۳- پاکستان کی اقلیتوں کو مکمل تحفظ دیا جائے گا اور ان کو مساوی مواقع ، مساوی حقوق اور مساوی مراعات دی جائیں گی۔

میری تاکید ہے کہ:

۱- ہمیں صبر سے کام لینا چاہئے — ترقی اور خوشحالی کے لئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ ایک ہی نسل ہر قسم کے فائدوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتی۔ ہمیں صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے بھی کام کرنا ہے۔ ہمیں اپنی کوششوں میں اسی خیال سے تقویت حاصل کرنی چاہئے کہ ہماری جد و جہد کا ثمرہ آنے والی نسلوں کو نصیب ہوگا۔

۲- یقین اصل حیات ہے— ہمیں اپنے آپ پر ، اپنے مستقبل پر ، اور اپنی تقدیر پر پورا بھروسا رکھنا چاہئے۔ ہمارا معاشرہ مل جل کر جس کام کا بھی بیڑا اٹھائے وہ ہم سب کے لئے باعث فخر و اطمینان ہونا چاہئے۔

۳- اعتدال روح عمل ہے— اصلاحات داد پانے کے لئے نہیں بلکہ خدمت

کے جذبے کے ساتھ نافذ ہونی چاہئیں اور اس کا منشاء موجودہ حالت کی تعمیر ہونا چاہئے نہ کہ تخریب -

۴- ہمیں قومی نقطۂ نظر ، اختیار کرنا چاہئے — ہماری قوم علاقائی یا صوبائی تعصب کی متحمل نہیں ہو سکتی - حالیہ اقتصادی ترقی نے ہمیں اس مرحلے پر پہنچا دیا ہے کہ مزید ترقی کا دار و مدار قومی نقطۂ نظر کو اپنانے اور قومی اتحاد پر ہے -

۵- محنت عمل کی بنیاد ہے — خالی نعرے بازی اور خوش فہمیوں سے کچھ حاصل نہ ہو گا - صرف بے لوث اور انتھک محنت ہی کی بدولت ہمیں مطلوبہ نتائج حاصل ہوں گے -

ان تمام مقاصد کے حصول کی خاطر میں نے اپنا نام صدر پاکستان کے دوبارہ انتخاب کے لئے پیش کیا ہے — میرا واحد مقصد یہ ہے کہ :

عوام کی حاکمیت قائم ہو

پاکستان ترقی کرے

پاکستان کے عوام خوشحال زندگی بسر کر سکیں

پاکستان پائندہ باد!

۱۹۶۵ء کے الیکشن کا گوشوارہ

جو ریٹرننگ آفیسر کی طرف سے الیکشن کمیشن کو پیش کیا جاتا ہے

	صوبہ	نمبر شمار	امیدواروں کے نام	ڈالے ہوئے صحیح ووٹوں کی تعداد	ساقط ووٹوں کی تعداد	ڈالے ہوئے صحیح و ساقط ووٹوں کی مجموعی تعداد	ہر امیدوار کے حاصل کردہ ووٹوں کی فی صد شرح
مجموعی تعداد	مشرقی پاکستان میں	(۱)	فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۲۱,۰۱۲	۲۷۴	۳۹,۸۲۴	۵۳٫۱۲
		(۲)	جناب کے۔ ایم۔ کمال	۹۳			۰٫۲۳
		(۳)	میاں بشیر احمد	۱۱			۰٫۰۲
		(۴)	محترمہ فاطمہ جناح	۱۸,۴۳۴			۴۶٫۶۰
				۳۹,۵۵۰	۲۷۴	۳۹,۸۲۴	
مجموعی تعداد	مغربی پاکستان میں	(۱)	فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۲۸,۹۳۹	۵۳۶	۳۹,۸۷۶	۷۳٫۵۶
		(۲)	جناب کے۔ایم۔ کمال	۹۰			۰٫۲۳
		(۳)	میاں بشیر احمد	۵۴			۰٫۱۴
		(۴)	محترمہ فاطمہ جناح	۱۰,۲۵۷			۲۶٫۰۷
				۳۹,۳۴۰	۵۳۶	۳۹,۸۷۶	

کل تعداد تمام پاکستان میں	(۱) فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں	۴۹,۹۵۱	۸۱۰	۷۹,۷۰۰	۹۳۴۳۱
	(۲) جناب کے۔ایم۔کمال	۱۸۳			۴۲۳
	(۳) میاں بشیر احمد	۶۵			۴۰۸
	(۴) محترمہ فاطمہ جناح	۲۸,۶۹۱			۳۶۴۳۶
		۷۸,۸۹۰	۸۱۰	۷۹,۷۰۰	

میں صدارتی انتخاب کے قانون مجریہ ۱۹۶۴ء کی دفعہ ۳۸ (۵) کے تحت اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں جنہوں نے سب سے زیادہ تعداد میں ووٹ حاصل کئے ہیں، اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت کے عہدے پر منتخب ہوگئے۔ ۲۱۱

انتخاب کا یہ گوشوارہ الیکشن کمیشن کے پیش خدمت ہے۔

مقام : راولپنڈی
تاریخ : ۸-جنوری سنہ ۱۹۶۵ء

دستخط
(جی - معین الدین)
ریٹرننگ آفیسر

ضمیمہ--۸

سوانحی اشارات

نورالامین (سنہ ۱۸۹۷ء—) : سنہ ۱۹۴۸ء میں مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۵۴ء میں مخالف متحدہ محاذ کی زبردست کامیابی کے بعد انھیں مجلس قانون ساز میں اپنی نشست سے ھاتھ دھونے پڑے - سنہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن اور مخالف پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے -

مولانا عبد الحمید خاں بھاشانی (سنہ ۱۸۸۵ء—) : بنگال اور آسام میں کسانوں کی تحریک کی قیادت کے باعث شہرت پائی - سنہ ۱۹۵۴ء کے انتخاب میں، ۲۱-نکاتی پروگرام کی بنیاد پر دوسری مخالف پارٹیوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ قائم کیا - سنہ ۱۹۶۲ء میں جب مارشل لا اٹھ گیا، تو نیشنل عوامی پارٹی کو ازسر نو منظم کیا، جس کے آپ صدر ھیں -

محمد علی بوگرا (سنہ ۱۹۰۱ء — سنہ ۱۹۶۳ء) : سنہ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے - اس عہدے پر اگست سنہ ۱۹۵۵ء تک فائز رہے - اگست سنہ ۱۹۵۵ء میں بنڈونگ کی افریشیائی کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت کی - سنہ ۱۹۶۲ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن اور مخالف پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے - بعد ازاں قومی اسمبلی کے قائد ایوان اور وزیر خارجہ مقرر ہوئے - آخری عہدے پر وہ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء میں اپنی وفات تک فائز رہے -

چودھری محمد علی (سنہ ۱۹۰۵ء—) : تقسیم کے بعد اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں حکومت پاکستان کے سکرٹری جنرل مقرر ہوئے - اس عہدے پر وہ سنہ ۱۹۵۱ء تک مامور رہے - اگست سنہ ۱۹۵۵ء میں محمد علی بوگرا کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء تک اس عہدے پر فائز رہے - آج کل مخالف پارٹی نظام اسلام کے سربراہ ھیں -

حمید الحق چودھری (سنہ ۱۹۰۳ء—) : سنہ ۱۹۴۸ء میں خواجہ ناظم الدین کی کابینہ میں مشرقی بنگال میں بحیثیت وزیر شامل ہوئے - سنہ ۱۹۴۹ء میں پاکستانی وفد کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شمولیت کے لئے گئے - ۲۶- ستمبر سنہ ۱۹۵۵ء سے ۱۲- ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء تک پاکستان کے وزیر خارجہ کا عہدہ سنبھالا - انگریزی روزنامہ ”پاکستان ابزرور،، ڈھاکہ کے مالک ھیں -

چودھری خلیق الزماں (سنہ ۱۸۸۹ء —) : دس برس (۱۹۳۷ء—۱۹۴۷ء) تک یو-پی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر رہے - سنہ ۱۹۵۳ء میں مشرق پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے - نومبر سنہ ۱۹۵۴ء میں انڈونیشیا اور فلپائین میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے -

ابراهیم اسمٰعیل چندریگر (سنہ ۱۸۹۹ء—سنہ ۱۹۶۰ء) : سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت لیاقت علی خاں کے تحت پاکستان کی پہلی کابینہ میں شامل ہوئے - جب سہروردی چودھری محمد علی کی جگہ وزیر اعظم مقرر ہوئے تو چندریگر مخالف پارٹی کے لیڈر بن گئے - سہروردی کے بعد تین مہینے تک (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۷ء) وزیر اعظم پاکستان کے عہدے پر مامور رہے-

میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ (سنہ ۱۹۱۶ء —) : تقسیم کے بعد ممدوٹ کے تحت پنجاب کی پہلی کابینہ میں وزیر خزانہ کی حیثیت سے شامل ہوئے - اپریل سنہ ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور احمدیت کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات کے بعد اپریل سنہ ۱۹۵۳ء میں مستعفی ہو گئے - اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء میں چندریگر کے تحت پاکستان کی کابینہ میں شامل ہوئے-

ابو القاسم فضل الحق (سنہ ۱۸۷۳ء — سنہ ۱۹۶۲ء) : سنہ ۱۹۳۷ء میں بنگال کے وزیر اعظم مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۴۰ء میں مشہور قرار داد لاہور آپ ہی نے پیش کی تھی - اپریل سنہ ۱۹۵۴ء میں مشرق پاکستان کے وزیر اعلیٰ اور متحدہ محاذ کی کابینہ کے سربراہ مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۵۵ء میں چودھری محمد علی کے ماتحت مرکزی کابینہ میں وزیر داخلہ بنائے گئے - سنہ ۱۹۵۶ء میں مشرق پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۵۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے - مسلمانان بنگال کے حقوق کی حمایت کے باعث ''شیر بنگال'' کہلائے -

هز رائل ھائی نس سلطان محمد شاہ آغا خان (سنہ ۱۸۷۷ء—سنہ ۱۹۵۷ء) : اسماعیلی فرقے کے روحانی پیشوا ، آغا خاں مسلمانوں کے اس تاریخی وفد کے سربراہ تھے جو سنہ ۱۹۰۶ء میں شملہ گیا تھا اور جس نے مسلمانان ھند کے حقوق کے لئے خاص تحفظات کا مطالبہ کیا تھا - اس وفد میں ھندوستان کے تمام حصوں کے بڑے بڑے لیڈر شامل تھے - آپ نے جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) کی جنرل اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے لیگ میں مصر ، عراق ، ترکی اور دوسری مسلم اقوام کی شمولیت کا خیر مقدم کیا تھا -

عطاء الرحمٰن خاں (سنہ ۱۹۰۷ء —) : ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء میں مشرق پاکستان میں عوامی لیگ کابینہ کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے - اپریل سنہ ۱۹۵۸ء میں دوبارہ عوامی لیگ کابینہ کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے اور دو مہینے تک بر سر اقتدار رہے - اگست سنہ ۱۹۵۸ء میں مشرق پاکستان کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۷-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو مارشل لا جاری ہونے تک اس عہدے پر مامور رہے -

خان عبدالغفار خاں (سنہ ۱۸۹۱ء —) : ''سرحدی گاندھی،، کے نام سے مشہور ھیں - سنہ ۱۹۴۶ء میں پنڈت نہرو آپ ھی کی دعوت پر شمال مغربی صوبۂ سرحد کے دورے پر آئے تھے - سنہ ۱۹۶۰ء میں علاج کے لئے لندن گئے اور واپسی پر افغانستان ٹھہر گئے - اس وقت سے وھیں سے آپ نے نام نہاد ''پختونستان،، کی مہم شروع کر رکھی ھے -

خان عبدالقیوم خاں (سنہ ۱۹۰۱ء —) : اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ھوا تو آپ کو شمالی مغربی صوبۂ سرحد کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا - سنہ ۱۹۵۳ء میں محمد علی بوگرا کی کابینہ میں بحیثیت وزیر خوراک ، زراعت و صنعت شامل ھوئے -

لیاقت علی خاں (سنہ ۱۸۹۵ء — سنہ ۱۹۵۱ء) : سنہ ۱۹۴۶ء میں ھندوستان کی عارضی مخلوط حکومت کے وزیر خزانہ مقرر ھوئے - سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے - ۱۶-اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی مں شہید کر دئے گئے -

مولوی تمیزالدین خاں (سنہ ۱۸۸۹ء — سنہ ۱۹۶۳ء) : سنہ ۱۹۳۸ء میں بنگال کی کابینہ مں زراعت ، صحت ، صنعت اور تجارت کے وزیر مقرر ھوئے - سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے نائب صدر منتخب ھوئے ، جس کے صدر قائد اعظم تھے - قائد اعظم کی وفات کے بعد دستور ساز اسمبلی کے صدر چنے گئے - جب گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو منسوخ کر دیا ، تو آپ نے اس اقدام کے خلاف سندھ ھائی کورٹ مں دعویٰ دائر کر دیا اور مقدمہ جیت گئے ، مگر سپریم کورٹ میں ھار گئے - سنہ ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ھوئے اور سنہ ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت متفقہ طور پر اسمبلی کے اسپیکر منتخب کئے گئے -

ڈاکٹر خان صاحب (سنہ ۱۸۸۲ء — سنہ ۱۹۵۸ء) : ۱۴-اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء کو وحدت مغربی پاکستان کی اسکیم کے تحت متحدہ مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ مقرر ھوئے - اپریل سنہ ۱۹۵۶ء میں ری پبلی کن پارٹی کی بنا ڈالی اور اس کے سربراہ بنے - مئی سنہ ۱۹۵۸ء میں قتل کر دئے گئے -

خواجہ ناظم الدین (سنہ ۱۸۹۴ء — سنہ ۱۹۶۴ء) : تقسیم سے پہلے بنگال کی کابینہ میں وزیر داخلہ اور پھر وزیر اعظم رھے - سنہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مقرر ھوئے - سنہ ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم محمد علی جناح رح کی وفات کے بعد ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل بنے - اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء میں آپ نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا - ۱۷-اپریل سنہ ۱۹۵۳ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے انھیں برطرف کر دیا -

محمد ایوب کھوڑو (سنہ ۱۹۰۱ء —) : تقسیم کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں سندھ کے پہلے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۵۷ء میں نون کے ماتحت پاکستان کی کابینہ میں وزیر دفاع بنائے گئے -

میاں افتخار حسین خان ممدوٹ (سنہ ۱۹۰۶ء —) : تقسیم کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۵۱ء کے انتخاب کے بعد پنجاب اسمبلی میں مخالف پارٹی کے لیڈر بنے - اپریل سنہ ۱۹۵۴ء میں سندھ کے گورنر مقرر کئے گئے -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (سنہ ۱۹۰۳ء —) : روزنامہ ''الجمعیت دھلی'' کے اڈیٹر کی حیثیت سے پبلک زندگی کا آغاز کیا - سنہ ۱۹۵۳ء میں لاھور میں احمدیت کے خلاف فسادات کے دوران فوجی عدالت نے انھیں سزائے موت کا حکم سنایا ، لیکن بعد ازاں یہ سزا قید میں تبدیل کر دی گئی - آپ نے اسلام اور تاریخ اسلام پر متعدد کتابیں تصنیف کیں - آپ داھنے بازو کے مخالف لیڈر ھیں -

میاں افتخارالدین (سنہ ۱۹۰۸ء — سنہ ۱۹۶۲ء) : تقسیم سے پہلے لاھور سے انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز جاری کیا - تقسیم کے بعد ممدوٹ کے ماتحت پنجاب کی کابینہ میں وزیر مہاجرین و بحالیات مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں بھاشانی اور عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر مخالف نیشنل عوامی پارٹی قائم کی -

اسکندر مرزا (سنہ ۱۸۹۰ء —) : سنہ ۱۹۵۴ء میں مشرق پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے - محمد علی بوگرا کے ماتحت پاکستان کی کابینہ میں وزیر داخلہ و سرحدی علاقہ جات بنائے گئے - سنہ ۱۹۵۵ء میں غلام محمد کی جگہ پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے - سنہ ۱۹۵۶ء میں جب پہلا آئین منظور ہوا تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر منتخب ہوئے - ۷-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو مارشل لا جاری کیا اور ۲۷-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو اختیارات فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو سونپ دئے -

ملک فیروز خان نون (سنہ ۱۸۹۳ء —) : دسمبر سنہ ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ۷-اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کو مارشل لا جاری ہونے پر اپنے عہدے سے برطرف کر دئے گئے -

عبدالستار پیر زادہ (سنہ ۱۹۰۷ء —) : سنہ ۱۹۴۱ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک سندھ کی کابینہ میں وزیر رھے - لیاقت علی خان کی سربراھی میں پاکستان کی پہلی کابینہ میں وزیر خوراک ، زراعت و صحت مقرر ہوئے - سندھ کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے اور نومبر سنہ ۱۹۵۴ء تک بر سر اقتدار رھے -

فضل الرحمٰن (سنہ ۱۹۰۵ء — سنہ ۱۹۶۶ء) : سنہ ۱۹۴۷ء میں

شہید ملت لیاقت علی خاں کے ماتحت پاکستان کی پہلی کابینہ میں وزیر تجارت و صنعت مقرر ہوئے اور ۱۶-اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء تک اس عہدے پر مامور رہے - اس کے بعد ۱۹-اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ۱۷-اپریل سنہ ۱۹۵۳ء تک خواجہ ناظم الدین مرحوم کے ماتحت وزیر تجارت و تعلیم کے عہدے پر فائز رہے -

ابو حسین سرکار (سنہ ۱۸۹۴ء —) : جون سنہ ۱۹۵۵ء میں متحدہ محاذ کی کابینہ میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور اگست سنہ ۱۹۵۶ء تک برسر اقتدار رہے - جون سنہ ۱۹۵۸ء میں دوبارہ دو دن کے لئے وزیر اعلیٰ بنے - نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کے لیڈر ہیں -

شیخ مجیب الرحمٰن (سنہ ۱۹۲۰ء —) : سنہ ۱۹۵۴ء میں فضل الحق کے ماتحت مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ کی وزارت میں وزیر بنائے گئے - سنہ ۱۹۵۵ء میں دوبارہ عطاء الرحمن خاں کے ماتحت عوامی لیگ کی کابینہ کے ممبر مقرر ہوئے - اس وقت مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے صدر ہیں اور اسی حیثیت سے صوبوں کو وسیع تر علاقائی خود مختاری دینے کے بارے میں چھ نکاتی تحریک شروع کر رکھی ہے -

حسین شہید سہروردی (سنہ ۱۸۹۳ء — سنہ ۱۹۶۳ء) : سنہ ۱۹۴۶ء میں بنگال کے وزیر اعظم مقرر ہوئے - بنگال پروانشل مسلم لیگ کے سکرٹری منتخب ہوئے ، جس نے سنہ ۱۹۴۵ء میں انتخابی مہم چلائی اور پاکستان کی حمایت میں بھاری اکثریت حاصل کی - ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے - آپ عوامی لیگ اور ری پبلی کن پارٹی کی ملی جلی حکومت کے سربراہ تھے اور ۱۷-اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء تک برسر اقتدار رہے -

اشاریہ

ابراہیم، محمد ۱۷۶
اتمان زئی ۴
اٹک فورٹ ۱۱۱
اختر حسین ۱۴۵
ادارۂ تحقیقات اسلامی ۳۳۰
اراکان ۲۳
ارباب، کرنل ۶۱
اردو ۶، ۱۰، ۳۰، ۶۹، ۱۶۷
استنبول ۱۰۹، ۱۱۰
اسٹریچی ہال ۱۳
اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ۱۰۰، ۲۳۲، ۲۴۷،
۲۵۰، ۲۶۳
اسرائیل ۲۵۷
اسکندر مرزا ۶۲—۶۰، ۶۷، ۸۸—۸۶،
۹۵—۹۱، ۹۷، ۹۹، ۱۸—۱۱۶،
۱۲۱
اسکندر مرزا، بیگم (ناہید) ۱۲، ۲۲
اسلام ۳۲۳، ۳۲۵، ۳۱—۳۲۷، ۳۳۳
اسلامک - ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۶
اسلامی اصول و عقائد ۵
اسلم صاحب ۱۰
اسمبلی (صوبائی) ۹۵، ۱۱۷
اسمبلی (قومی) ۸۵، ۹۰، ۱۱۷، ۳۶۱،
۳۶۸، ۷۸—۳۷۵
اسمبلی (مشرق پاکستان) ۵۰—۴۸
اسمبلی دستور ساز (نیز رک: مجلس) ۹۰
نئی دستور ساز ۹۱
اشتراکیت (نیز رک: کمیونزم) ۲۵۶
۳۱۱
اصلاحات تعلیمی ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۶،
زرعی ۴۵—۱۴۲، ۱۴۷، ۱۵۰،
۵۳—۱۵۲، ۱۵۶، ۱۶۲، ۳۱۹،
۳۸۰، قانونی ۱۷۳، ۱۷۵
اعظم، جنرل محمد ۱۰۲، ۱۲۵
افتخار، جنرل ۵۸
افریشیائی (افریقی ایشیائی) برادری ۱۹۲،
۲۷۳، ۲۷۸، پہلی کانفرنس ۹۹—۲۹۸
دوسری کانفرنس ۲۹۸، ۳۰۶، فورم
۲۷۳
افضل بیگ، مرزا ۲۱۲
افغانستان ۲، ۲۱۳، ۹۲—۲۸۸، ۳۹۰
افغانستان، شاہ (ہز میجسٹی محمد
ظاہر شاہ) ۲۹۲
اقوام متحدہ ۹۲—۱۹۱، ۲۰۸، ۲۱۹،
۲۴۷، ۲۵۸، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۸،
۲۹۰، ۳۰۴
اکبر خاں ۴۳، ۶۰، ۶۶—۶۴
اکرم، جسٹس محمد ۵۱
اکرم خان، مولانا ۴۳
الہ آباد ۴
الجزائر (الجیریا) ۳۰۱ کانفرنس: ۲۷۴
الطاف قادر ۳۰
الیکشن کمیشن ۳۴۶
امجد علی ۱۰۱
امرت بازار پتریکا ۱۹۱
امرتسر ۲۶، ۲۷، ۳۰
امریکہ (ریاستہائے متحدہ امریکہ)
۸۶، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۱۴، ۱۸۰،
۱۸۶، ۱۹۲، ۹۸—۱۹۵، ۱۶—۲۱۳،
۲۳—۲۱۸، ۲۹—۲۲۶، ۳۲—۲۳۱،

۲۲۴، ۲۲۷، ۲۳۹، ۲۴۱—۴۳،
۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۳-۵۷،
۲۶۱—۶۵، ۲۶۸، ۳۳۸—۳۹
امور خارجہ (نیز رک : خارجہ پالیسی)
۱۰۰
الہالہ ۲۰، ۲۷، ۳۰
انتخابات عام ۹۵-۹۶ صوبائی ۸۸۲
صدارتی ۳۷۱، ۳۸۲، ۳۸۴
انتخابی کمیشن ۳۷۵، ۳۸۰، ۳۸۲،
۳۹۱-۹۲، ۳۹،
انتخابی منشور ۳۹۱
انٹیلی جنس بیورو ۱۲۱
الہرون روس (تصنیف گنتھر) ۱۰۸
انڈونیشیا ۲۱۴، ۲۹۹
انڈیا آفس ۱۹
انڈین آرمی (برٹش) ۲۰—۲۲، ۲۵،
۳۴، ۷۳
انڈین انڈی پینڈنس ایکٹ ۸۴
(نیز رک قانون آزادیٔ ہند)
انڈین فوجی قانون ۵۳
انڈین نیشنل آرمی ۲۴
انڈین نیشنل کانگریس ۲۲، ۱۹:،
۳۳۱، ۳۳۳، ۳۵۱
الصار (تنظیم الصار) ۵۱
انقرہ ۱۱۰
انقلاب (اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء) ۱، ۱۱۶،
۱۱۸—۲۳، ۱۲۶، ۱۲۸—۳۵،
۱۳۲، ۱۳۴، ۱۶۹، ۱۸۰، ۱۹۱،
۲۰۰، ۳۸۵ طویل المیعاد مقاصد
۱۲۹، ۱۳۲
انگریز ۴، ۱۶، ۱۷، ۲۸، ۵۸، ۱۵۰،
۲۶۸، ۳۰۸، ۳۳۲
انگریز افغان معاہدہ ۱۹۱۹ء ۲۹۱
انگریزی ۶
انگلستان ۱۵، ۱۶، ۵۹، ۱۰۱، ۱۲۵،
۱۲۶، ۳۱۹
او-ٹی-ایس (آفسرز ٹریننگ سروس) ۱۱۴
اورنگ آباد ۲۰
اورنگ زیب ۳۳۷
اہل سیاست (نیز رک : سیاستدان)
۱۱۲، ۱۵۵
اے-اے آرٹلری ۱۰۱
ایبٹ آباد ۸۵، ۱۰۲، ۱۰۳
ایڈجوٹنٹ جنرل ۳۲، ۵۲، ۵۶، ۵۸
ایران ۱۰، ۴۵، ۱۶۷، ۲۱۴، ۲۱۵،
۲۶۰
ایراودی ۲۳
ایسٹ بنگال رجمنٹ ۵۲، ۷۷
ایسٹ پاکستان رائفلز ۵۲
ایشیا ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۱۴، ۲۱۵،
۲۴۰، ۲۵۶، ۲۶۳—۶۶، ۲۷۶،
۲۷۸، ۲۸۶، ۲۹۳، ۲۹۵، ۲۹۸
ایشیا جنوب مشرق، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۲۶
ایشیا، وسطی ۲۷۹، ۳۰۰
ایل پاسو (فورٹ بلس) ۱۰۰
ایلیٹ، ٹی ایس ۳۷۴
ایمرجنسی کمیشن ۵۵
اینڈریوز ایر فورس بیس ۲۲۶
ایوان صدارت ۶۳
ایوب خاں، محمد (نیز رک فہرست
مضامین)
کیڈٹ ۱۷، جنرل: ۵۸، ۸۸،
۱۲۱، ۱۲۲، ۲۳۹
فیلڈ مارشل ۲۴۸، ۲۵۳، ۳۸۵
افواجِ پاکستان کی اعلیٰ کمان
ضمیمہ ۳
افواج کی تربیت میں حصہ ۷۳—۸۰
ایڈجوٹینٹ جنرل ۳۳
آئین بنانے کی فرمائش گورنر جنرل
کی جانب سے ۸۸
تعلیم: ۵—۱۴
جنگی خدمت پر ۲۰—۲۳
چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ۱۱۷
خاندانی حالات: ۲—۵

دستاویز (پاکستان کے مسائل پر)
۱۷-۳۰۷
ڈائری ۱۱۰—۹۹، ۱۳۱—۱۳۷
صدر پاکستان ۱۲۰، انتخاب ۳۹۲
مشرق پاکستان میں ۵۲—۳۸
ولادت، طفلی، ۸—۱
ایوب خاں، بیگم ۱۰۲
آٹومیٹک رائفل آرڈی ننس کا عائلی
قوانین ۱۷۷، ۲۶۷
آرمی ڈی ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۰۰
آرمی سلکشن بورڈ ۲۵، ۴۴
آزاد (روزنامہ) ۴۳
آزاد فوج (آزاد کشمیر) ۵۲، ۵۳
آزاد کشمیر ۵۲، ۵۳، ۶۵، ۱۰۷
آسام ۲۳۲، ۲۳۶، ۲۴۵، ۲۶۶، ۳۵۰
آسام رجمنٹ ۲۳
آسٹریلیا ۲۴، ۱۸۶، ۲۴۴
آغا خان (سلطان محمد شاہ) ۳۱۹، ۳۲۰
آفسرز ٹریننگ اسکول ۵۵
آکن لیک، جنرل ۵۷
آنحضرت صلعم ۳۲۸
آئلف ۱۸۵-۸۶
آئین ۹۰—۸۸، ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۸،
۱۳۸-۳۰، ۱۷۶، ۳۰۷-۲۸، ۳۳۶
(۱۹۵۶ء) ۹۱، ۹۵-۹۶، ۳۴۱،
۳۴۸، ۳۵۶
کا اجرا ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۸، ۱۳۹
کی منسوخی ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۳۸—
۴۱، ۱۷۶
کے مسئلے پر غور ۱۷—۳۰۷،
۳۲۰، ۳۲۷-۲۸،
نئے آئین کا خاکہ ۳۳۶—۳۸
آئین سازی کا اختیار ۳۴۶
اسمبلی میں مباحثہ ۳۴۹، ۳۵۶
کے خلاف تحریک ۵۹
ترمیم کا مسئلہ ۳۶۰-۶۱، ۳۶۱،
۳۶۳—۶۵، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۷۰،
۳۷۱، ۳۷۵
نئے آئین کا اعلان ۳۷۷—۸۰،
۳۸۷، ۳۹۲
اسلامی ۳۳۵-۳۶، ۳۴۱، ۳۴۸
آئینی کمیشن ۳۲۷، ۳۴۶، ۳۴۹،
۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۹،
۳۶۰

ب

بارک پور ۲۷
باری دوآب، سنٹرل/مرکزی ۱۷۸،
۱۸۴
بایار، جلال ۱۱۰
بدھ مت ۱۶۰
برٹش انڈین آرمی ۲۱، ۲۵، ۳۴
برٹش آرمی ایکٹ ۵۳
برج گروو ۲۲۳
برسلز ۱۰۱
برطانیہ ۱۲، ۵۳، ۷۳، ۱۵۷، ۲۱۵،
۲۲۱—۲۳، ۲۳۶، ۲۴۸، ۲۵۱،
۲۵۳، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۷۲، ۳۰۴،
۳۱۸، ۳۳۳
برطانوی افسر ۲۰
برطانوی افواج/فوج ۷۳، ۷۶
برطانوی بریگیڈ ۲۴
برطانوی رجمنٹ ۲۰
برطانوی ہند/ہندوستان ۳۳، ۲۹۰
برکی، جنرل ۱۲۵
برما ۲۳، ۲۱۴، ۲۳۶، ۲۴۵، ۲۶۶
برننگ ٹری گوف کورس ۹۹
بری فوج ۸۰
بریزی نوف ۲۴۸، ۲۸۵
بریگیڈ، تجرباتی ۱۰۴
بغداد پیکٹ/معاہدۂ بغداد ۱۰۹، ۱۱۰،
۱۳۰، ۱۹۱، ۲۱۰، ۲۵۶—۶۱،
۲۷۸ مشترکہ دفاعی تنظیم ۲۱۵
بلتستان ۲۶۷
بلوچ رجمنٹ ۷۷

بلوچستان ۳، ۹۱، ۱۷۳
بلیک، یوجین ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۶
بمبئی ۱۵، ۲۰، ۳۱، ۱۵۸، ۲۳۷
بنگال (سابق بنگال) ۳۰، ۳۵۰
بنگالی زبان ۱۶۷، ۱۶۸
بنگلور ۲۱۰
بنوں ۲۳، ۳۰، ۶۱
بنیادی جمہوریت ۱۷۲، ۳۳۱، ۳۳۴، ۳۴۵، ۳۵۱—۵۵، ۳۷۱—۷۵، ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۸، ۳۹۰—۹۲
بوگرا، محمد علی ۵۰، ۵۱، ۸۴، ۸۷—۹۰، ۲۰۹، ۲۱۶-۱۷، ۳۰۷
بولٹ ایکشن رائفل ۲۶۷
بونڈری فورس ۲۹—۶۰
بونڈری کمیشن ۲۷
بہاولپور ۲۸
بہاولپور رجمنٹ ۷۷
بیاس ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۴
بی-او-اے-سی ۲۷۲-۷۳
بی-بی-سی ۲۴۹
بھوٹان ۲۲۱، ۲۶۵
بھونسلے ۱۸

پ

پارلیمانی نظام ۱۳۱، ۲۱۹، ۳۱۸، ۳۸، ۳۳۹، ۳۴۹۳، ۳۶۲
پارلیمانی جمہوریت ۳۳۷، ۳۳۹، ۳۴۱—۴۲، ۳۵۱، ۳۶۳
پاکستان ۲۱، ۲۶-۲۷، ۳۱—۳۷، ۴۵، ۶۲، ۶۶، ۷۰، ۷۹-۸۲، ۸۶، ۸۹، ۹۷، ۹۹-۱۰۰، ۱۰۵، ۱۰۷-۸، ۱۱۶-۱۷، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۳۱، ۱۳۶، ۱۵۳-۵۴، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰-۶۱، ۱۶۷-۶۸، ۱۷۰، ۱۷۶—۸۱، ۱۸۴-۸۵، ۱۸۷، ۱۸۹—۹۳، ۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۹—۲۱۱، ۲۱۳—۲۰، ۲۹—، ۲۲۵، ۲۳۱-۳۲، ۲۳۴-۳۵، ۲۳۷، ۲۴۲—۴۴، ۲۴۶—۴۸، ۲۵۰—۵۸، ۲۶۱—۶۴، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۸—۸۶، ۲۸۸—۸۹، ۲۹۱—۹۴، ۲۹۹، ۳۰۲—۴، ۳۰۷-۸، ۳۱۰-۱۱، ۳۱۴، ۲۰—، ۳۱۸، ۳۳۴-۳۵، ۳۳۷، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۵-۴۶، ۳۴۹—۵۲، ۳۶۳، ۳۶۵-۶۶، ۳۶۸، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۹، ۳۸۲، ۳۹۰، ۳۹۳
پارلیمنٹ ۱۵۴
پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز ۲۷۲
پاکستان ایئر فورس ۸۰
پاکستان آرمی/فوج ۵۴، ۵۷، ۶۶، ۷۹، ۱۹۱
پاکستان آرمی ایکٹ ۵۳
پاکستان نیوی ۸۰
پالم ۲۰۳
پبلک اسکول ۲۳
پبنا ۳۹
پٹیل، سردار ولبھ بھائی ۱۹۱
پٹھان ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۱، ۳۰۸
پٹھان رجمنٹ ۷۷
پختون ۲۸۹، ۲۹۰
پختونستان ۲۸۸—۹۱
پروڈا ۸۲
پشاور ۶۱، ۱۰۶، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۹۲
پشین ۴
پلاننگ بورڈ ۲۷، ۴۷
پلٹن میدان (ڈھاکہ) ۳۸۹
پنجاب/سابق پنجاب ۲۶، ۲۸، ۳۲، ۶۸، ۸۲، ۹۱، ۱۴۳، ۳۵۰
پنجاب باؤنڈری فورس ۲۷، ۴۴، ۱۴۴، ۱۷۹، ۳۱۰، ۳۱۸
پنجاب رجمنٹ ۱۱۱

پنجاب رجمنٹ، پہلی چودھویں ۲۱، ۲۴
پنجاب رجمنٹ، آٹھویں ۷۷
پنڈی (نیز رک : راولپنڈی) ۲۰۱، ۲۰۲
پوٹھوار ۱۶۰
پولس ۴۷، ۵۰، ۱۰۷، ۱۱۳
پولینڈ ۲۳
پولی بن سکی ۲۷۹
پی-ایل ۴۸۰، ۲۴۳
پی-ایم-اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول) ۱۱۳
پیٹرن فور لیٹڈ نیوکلیئر وار (مضامین کپتان وائنز) ۱۰۸
پیر زادہ، میجر ۴۹، ۵۰
پیر زادہ، عبدالستار ۸۴
پینٹاگن ۲۵۰

ت

تائیوان ۷۷-۲۷۶
تبت ۲۲۳، ۲۳۲، ۲۳۶، ۲۴۵، ۲۴۶، ۶۷—۲۶۵
تحریک آزادی ۳۵۲
تحریک پاکستان ۳۵—۳۳۱
تحریک ترک قومیت ۳۳۲
تحریک خلافت ۳۳۲
تربیلا ڈیم ۱۸۳
ترک ۱۱-۱۱۰، ۳۳۲
ترکی ۱۶۷، ۱۵-۲۱۴، ۲۲۹، ۲۶۰، ۲۹۴
ترین (قبیلہ) ۴
ترین ، سردار محمد خاں ۴
ترین ، سردار نجیب اللہ خاں ۴
تعلیمی کمیشن ۱۶۲ ، ۱۶۳
تمیزالدین خاں، مولوی ۸۵، ۸۶، ۳۳۸، ۳۹
تہران ۱۰۹-۱۱۰
تھائی لینڈ ۲۱۵، ۲۹۴
تھل ۶۱
تیج کاول ۳۸
تیز پور ۲۵۰
تیزگام ۱۰۱

ٹ

ٹاسک فورس ۲۵۴
ٹائمز آف انڈیا ۲۰۹
ٹوائننگ، جنرل ناتھن ۹۹، ۱۰۰
ٹیکساس ۱۷۸
ٹیکسلا ۱۶۰
ٹیونیشیا ۳۰۱

ج

جانسن ۲۸۱
جاپان ۳۴، ۱۶۷، ۲۱۴، ۲۷۲
جاپانی ۲۳، ۲۴
جالندھر ۲۶
جرمنی ۲۳، ۵۹، ۲۷۴
جکارتا ۲۷۴، ۲۹۳، ۳۰۲
جماعت اسلامی ۳۳۴
جموں و کشمیر ۱۹۰، ۱۹۲، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۳۰، ۲۵۲، ۲۵۴
جمہوری ۲۸۹
جمہوریت اسلامی ۳۱۲
جمہوریت ۱۰۳، ۱۴۴، ۲۹۲، ۲۹۷، ۳۱۲—۳۱۱، ۳۱۵، ۳۴۲، ۳۵۶، ۳۷۰، ۳۹۳
جمہوری نظام ۱۳۹، ۱۴۵، ۲۹۷، ۳۵۸
جناح (نیز رک : قائد اعظم) ۲۹، ۳۳
جناح ، مس فاطمہ ۱۳۸، ۸۵-۳۸۱، ۳۸۷، ۹۳-۳۹۰
جنرل ہیڈ کوارٹرز ۵۴-۵۲، ۵۴، ۶۴، ۱۲۴، ۲۶۱
جنگ (ستمبر ۱۹۳۹ء) ۲۳
جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ۲۰۱، ۲۰۴-۵

جنگ عظیم (پہلی) ۱۱۱، ۱۷۰
جنگ، دوسری عالمگیر ۲۹۵
جنگ شاہی ۵۸، ۱۱۹
جنیوا، معاہدہ ۲۸۱
جودون ۴
جورہاٹ ۲۰۰
جونا گڑھ ۲۳۸، ۲۴۱
جہلم ۱۰۲، ۱۸۰، ۱۸۴، ڈیم: ۱۸۴
جیسور ۳۹
جیمز، کرنل ۱۷۰

چ

چٹاگانگ ۳۹۲
چراٹ ۱۱۱
چناب ۱۷۹، ۱۸۴
چندریگر، اسمٰعیل ابراہیم ۶۰، ۶۱، ۹۳
چندون (دریا) ۲۳
چودھری (کیڈٹ) ۱۸
چودھری، ایڈمرل حاجی محمد صدیق
۱۰۹
چیف آف جنرل اسٹاف ۶۴، ۶۵
چو این لائی ۲۳۲
چیانگ کائی شک ۲۷۷
چین ۱۰۰، ۱۹۲، ۱۹۸، ۲۰۵—۲۲۲،
۲۳۶—۲۳۲، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۵۲،
۲۵۳، ۲۸۰، ۲۸۴، ۲۸۶، ۲۸۸،
۲۹۳، ۲۹۸
چین، عوامی جمہوریہ ۹۶، ۱۹۴،
۱۲۳، ۲۱۴، ۲۳۱، ۲۶۴، ۲۷۷،
۲۸۱
چھانگلا گلی ۵۹

ح

حامد ۱۱۷
حمید الحق، ۴۰
حزب مخالف/اختلاف ۲۶۵، ۳۷۸
حیدرآباد (دکن) ۱۲، ۲۳۸
حیدرآباد (سندھ) ۶۲، ۳۹۲

خ

خارجہ پالسی ۱۴۰، ۱۸۸، ۱۹۵،
۱۹۹، ۲۱۲، ۲۵۶
خارجہ پالسی (ہندوستان) ۱۳۶
خان، مسٹر (نیزرک: ایوب خان)
۱۶، ۱۷
خان صاحب، ڈاکٹر ۹۳، ۹۴
خان قلات ۹۷
خانیکین ۱۰۹
خروشیف ۲۸۷
خلفائے راشدین ۳۲۸
خلیج بنگال ۲
خلیق الزماں، چودھری ۶۹
خنجراب (وادی) ۲۷۱
خورشید، کرنل ۲۱
خیبر ۳۹۱

د

''داچا'' ۲۸۳
دارالحرب ۳
دارالحکومت (نیا) ۱۶۱
دجلہ ۱۷۸
درویش ۶
درۂ خیبر ۲۴
درۂ سے لا ۲۴۵
دستاویز ۱۹۵۴ء ۱۳۷، ۱۴۲،
۳۰۷، ۳۰۸، ۳۱۷، ۳۶۷
دفاع، مشترک ۲۰۱—۲۰۸
دفاعی امداد ۲۱۵، ۲۲۰
دفاعی تنظیم (معاہدۂ بغداد) ۲۱۵
دفاعی مسائل ۱۰۰
دفعہ ۱۹۳-۹۴، ۱۵۶
دلازک ۴
دلائی لامہ ۲۶۷
دولت مشترکہ ۱۸۶
دولتانہ، میاں ممتاز ۶۸، ۸۲، ۳۱۸
دھلی ۲۳، ۲۸، ۱۲۵، نئی دھلی

۲۰۳، ۲۳۲، ۲۴۱، ۲۴۸-۴۹،
۲۵۲، ۲۹۱، ۳۱۸

ڈ

'ڈان' کراچی ۲۰۹، ۲۱۰
ڈگبوئی ۲۵۰
ڈگبیر سنگھ ۲۶
ڈلس، ایلن ۱۰۰
ڈنکن سینڈیز ۲۴۸، ۲۴۹، ۳۰۴
ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز (مشرق پاکستان) ۵۱
ڈیرہ دون ۲۵، ۳۰
ڈین، میجر ۱۳، ۱۴
''ڈیوائڈ اینڈ کوٹ''، (تصنیف پینڈرل مون) ۲۸
ڈیورنڈ لائن ۲۸۹، ۲۹۱
ڈیوک آف یارک ہوٹل ۱۰
ڈھاکہ ۳۸، ۳۹، ۴۶، ۴۷، ۵۱، ۱۲۱، ۱۵۷، ۳۹۲
ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۶۶،
ڈھلون ۲۱

ذ

ذاکر حسین ۴۷

ر

راج شاہی ۳۹۳
راس مسعود، سر ۱۲
راول بند ۱۶۰، ۲۵۲
راولپنڈی (نیز رک: پنڈی) ۲، ۴، ۴۷، ۶۳، ۶۶، ۶۹، ۷۱، ۱۱۵، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۳۵۶، ۳۷۲، ۳۸۵، ۳۸۶
راولپنڈی، ایس ایس ۱۰
راولپنڈی سازش ۶۰
راوی ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۴
رائے دھی کمیشن ۳۷۸
رب، ایئر کموڈور ۱۲۲
ربوت ۴
رحمت اللہ، حبیب ابراہیم ۶۹
رڈل آف دی شلائفن پلین ۱۰۸
رزمک ۳۰
رش بروک ولیمز، پروفیسر ۳۱۸
رضا، جنرل ۴۴، ۷۸
رنگ پور ۳۸۹
روس ۱۰۱، ۲۷۴، ۲۷۹-۸۰، ۲۹۳، ۲۹۹، ۳۰۲، (نیز رک: سوویٹ یونین)
ری آرگنائزیشن کمیشن ۱۳۶
رومن رسم الخط ۱۴۰، ۱۶۹
رہتاس ۱۸۰
ری پبلکن ۹۲، ۱۱۷، ۱۴۴
ری پبلکن پارٹی ۹۳، ۹۴، ۱۱۴، ۱۱۷
ریحانہ ۲
ریڈیو پاکستان ۳۹۳
ریس، میجر جنرل ۲۶، ۲۷، ۲۹
ریکے (بٹالین) ۱۱۲

ز

زورلو ۱۱۰
زیوربن ۹۰

س

ستلج ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۴
سپریم کمانڈر ۳۱۵، ۳۱۶
سپریم کورٹ ۳۴۶، ۳۵۹
سپیریر سول سروسز ۴۱
سٹاف کالج ۲۳
سٹرائف، ڈاکٹر ایرک ۲۰۸
سجان سنگھ ۷
سدھن ۶۵
سرائے صالح ۶
سردار بہادر خان ۹۶
سرکار، ابو حسین ۹۵

سرگودھا ۶۰
سکاٹ لینڈ یارڈ ۱۷
سکم ۲۶۵
سکھ ۴، ۸، ۲۲، ۲۶، ۲۸
سکھر ۳۸۷
سکین ، جنرل ۱۲، ۱۳
سلامتی کونسل ۲۱۹
سلہٹ ۳۹۲
سندھ (دریا) ۱۷۷—۷۹، ۱۸۴، ۹۸۵، ۲۹۰، ۳۱۸
سندھ (طاس سندھ کا معاہدہ) ۱۷۹، ۱۸۳، ۱۸۵-۸۶، ۲۰۳، ۲۷۰-۷۱، ۳۰۹
سندھ (سابق صوبہ) ۹۱، ۱۳۳-۳۴، ۱۳۹، ۱۵۸، ۱۷۹، ۱۸۶
سنکیانگ ۲۶۷، ۲۷۱
سوڈان ۳۰۱
سوشلزم ۲۷۷
سوشلسٹ ۲۹۳
سول انتظام ۱۱۱، ۱۲۸—۳۰، ۱۳۴
سول حکام ۹۷، ۱۱۹
سول فورس ۱۰۷
سول مسلح تنظیم ۷۴
سوویٹ یونین ۱۹۲، ۱۹۴—۹۸، ۲۱۳، ۲۱۸-۱۹، ۲۲۳-۲۴، ۲۳۱، ۲۵۸-۵۹، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۷۴-۷۵، ۲۷۸—۸۳، ۲۸۵-۸۸، ۲۹۳، ۳۰۲
سوھان تہذیب ۱۶۰
سوئٹزرلینڈ ۱۸، ۱۹، ۲۳۰
سویز ، نہر ۱۹۲، ۲۵۷
سہروردی ، حسین شہید ۳۹، ۴۲، ۶۲-۶۳، ۹۰-۹۱، ۹۴، ۲۷۳، ۳۶۷
سی او پی (کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز/ متحدہ مخالف پارٹی؛ نیز ک : متحدہ محاذ) ۳۸۱، ۳۸۷

سیاستدان ۴۰، ۴۷، ۴۹، ۸۳، ۹۰، ۹۱، ۹۶-۹۷، ۱۰۳-۴، ۱۲۶، ۱۳۳، ۱۴۴-۴۵، ۱۵۰، ۱۶۶، ۱۶۷، ۳۰۹، ۳۱۱، ۳۱۵، ۳۴۴، ۳۴۸، ۳۵۶-۵۷، ۳۸۵
سیالکوٹ ۲۰۶
سیٹو ۱۹۱، ۱۹۴، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۲۹، ۲۵۶، ۲۶۱، ۲۸۳
سید احمد خان ۳۳۴
سیہون ۲۸۴
سیف الملوک ۱۰۶
سینٹو ۱۹۱، ۱۹۴، ۲۱۵، ۲۲۹، ۲۵۶، ۲۶۱-۶۲، ۲۸۳
سینڈہرسٹ ۱۳—۱۹

ش

شاہ ولی اللہ ۳۳۴
شہنشاہ ایران ، محمد رضا شاہ پہلوی ۱۱۰، ۲۶۰
شاہ ، اے۔ایس۔بی ۲۱
شاہ (سربراہ حکومت آزاد کشمیر) ۵۳
شاہد علی ۹۵
شمال مغربی سرحد ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۳۱، ۳۲، ۶۱، ۱۴۳
شمال مغربی صوبہ سرحد (سابق) ۳۱۸
شمشال ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۱
شملہ ۱۳، ۳۰
شنکیاری ۱۱۲
شوگران ۱۰۶
شہاب الدین ۳۴۶
شیخ ، جنرل خالد ۱۲۵
شیخوپورہ ۲۶
شیر بہادر ، میجر جنرل ۱۲۲، ۱۲۳
شیر خان ۵۸
شیر دل (بٹالین) ۲۱

ص

صدیق خان ، بریگیڈیئر ۶۱
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن ۱۳۷، ۳۱۴

ط

طہران رک : تہران

ظ

ظفر اللہ خان ، سر چودھری محمد ۸۶، ۲۶۱

ع

عالمی بینک ۱۸۰، ۱۸۵—۸۷
عائلی قوانین ۱۷۷، ۳۸۰
عبدالالٰہ، پرنس ۱۰۹
عبد الرشید سردار ۹۴
عبدالقیوم خان ۹۶-۹۷، ۳۱۸
عبداللہ، شیخ ۹۴، ۱۷۱، ۲۱۲
عبید اللہ ۹۴
عثمانی سلطنت ۲۳۲، ۲۹۶
عدن ۱۵، ۲۰
عراق ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۹۱، ۲۱۵، ۲۵۹
عرب ۲۵۷، ۲۵۹، ۳۳۲
عرب اقوام ۲۹۶
عرب ، جزیرہ نمائے ۳۰۱
عرب لیگ ۲۵۹
عرب ملک/ممالک ۱۹۲، ۲۵۸
عزیز احمد ۵۲
عصمت انونو ۲۶۰
عطاء الرحمٰن ۹۵
علاقائی تعاون برائے ترقی (آر-سی-ڈی) ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۰۰
علما ۳۲۲، ۳۳۲، ۳۳۰—۳۴، ۳۳۶
سیاسی : ۳۳۳، ۳۳۵، نیشنلسٹ : ۳۳۴
علی خان ، پرنس ۱۰۱
علیگڑھ یونیورسٹی ۹—۱۳
عمر بریڈلے ، جنرل ۹۹-۱۰۰
عوامی لیگ ۱۱۷، ۱۵۰، ۳۸۷—۸۹، ۳۹۲
عید ۱۰۸

غ

غضنفر علی خان ، (راجہ) ۵۴، ۹۶
غلام عباس ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹
غلام محمد ۷۰، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۸۹، ۱۰۳، ۳۰۷، ۳۱۷

ف

فارسی ۶
فاطمہ جناح رک : جناح
فرات ۱۷۸
فرانس ۱۸، ۱۷۸، ۲۱۵، ۲۵۷، ۲۷۲
فرانسس ٹکر ، سر ۲۷، ۳۱
فرنٹیر فورس رجمنٹ ۷۷
فرنٹیر فورس رائفلز ۷۷
فضل الحق ۳۹، ۴۹—۵۱، ۹۱، ۹۵
فضل الرحمٰن ۸۴
فلی پین ۱۶۷، ۲۱۴، ۲۹۴
'فلیڈلفیا انکوائرر' (اخبار) ۲۴۰
فورٹ ولیم ۳۶۶
فیروز پور ۲۵، ۲۶
فیوزیلیئرز ۲۰

ق

قاضی ، کرنل ۱۲۳، ۱۲۴
قانون آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء ۸۲
قاہرہ ۱۶۷، ۲۵۷، ۳۹۳
قائد اعظم (نیز رک : جناح) ۵۷، ۶۷، ۶۹، ۸۲، ۱۱۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۲۰۸، ۳۱۸—۲۰، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۷۷، ۳۸۱، ۳۸۴، ۳۹۳
قبائل ۲۹۰، ۲۹۲
قبائلی ۲۲، ۳۰

قرآن حکیم/۱۷۷، ۳۱۷، ۳۲۸، ۳۳۳، ۳۳۹
قرارداد لاہور ۳۵۰
قربان علی ۶۱
قزلباش، مظفر علی ۹۲، ۱۰۷، ۱۱۲
قومی اقتصادی کونسل ۳۶۸

ک

کابل ۲۹۰، ۲۹۱
کابینہ، انقلابی: پہلا اجلاس ۳۵-۱۳۴، ۱۳۷، ۲۶۸، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۶
کاٹھیاواڑ ۱۵۸
کاسا بلانکا ۲۹۳، ۳۰۱
کاغان ۱۰۶
کاکس بازار ۱، ۳۹۱
کانسٹی ٹیوشن کمیشن رپورٹ ۳۴۹، ۳۵۰
کانگریس پارٹی ۱۹۱، ۳۵۲
کانگریس (امریکی) ۱۰۰، ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۲۷

ک

کراچی ۵۴، ۶۰، ۶۲، ۶۶، ۶۷، ۷۰، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۹۶، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۴-۱۷، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۷۷، ۱۸۵، ۲۴۹، ۳۵۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۹۵
کراچی ائر پورٹ ۱۲۵
کرپلانی، اچاریہ (جے بی) ۱۹۱
کرزن، لارڈ ۲۳۶
کرزن ہال ۴۲
کرمی ٹولہ ۳۸
کری آپا، جنرل ۳۳
کشمیر (جموں و کشمیر) ۴، ۳۵، ۳۹، ۵۲، ۵۷، ۶۴، ۸۱، ۱۳۹، ۱۸۴، ۱۸۷، ۱۹۰، ۲۰۵-۷، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۳، ۱۹-۲۱۶، ۲۲۷-۲۹، ۲۳۰-۳۱، ۲۳۴، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۶، ۲۴۸-۵۰، ۲۵۲-۵۴، ۲۶۹، ۲۸۲، ۲۹۲، ۲۹۹ کانفرنس ۹۰۴ قرارداد ۳۰۳
کلکتہ ۲۳، ۲۷، ۳۱، ۱۹۱، ۳۶۶
کمیونزم (نیز رک: اشتراکیت) ۲۳۶-۳۷، ۲۴۳، ۲۷۶، امریکی: ۲۷۵، سوویت ۲۷۶، ۲۷۹
کمیونسٹ ۱۹۲، ۲۳۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۷۴- بلاک: ۲۹۳، چینی ۳۴۷
کنگ (اردلی) ۱۶
کوتھورن، میجر جنرل ۱۳۵
کورنگی کالونی ۱۵۷
کوریا ۲۱۴، ۲۲۹، ۲۴۲
کواپریٹیو فارمنگ ۱۵۱
کوسی گن ۷۹-۸۳، ۲۸۵، ۲۸۸
کوکا (موضع) ۵
کول، جنرل ۲۴۵
کومیلا ۳۹
کوئٹہ ۲۳، ۱۱۹، ۱۲۵، ۲۰۹
کے، ایل، ایم ۲۷۲، ۲۷۳-
کیانی ۶۱
کیبنٹ لاج ۱۰۱
کیبنٹ کمیٹی ۳۵۱
کے-ٹو ۲۱۷
کیمبل جانسن، ایلن ۲۸
کیمبل پور ۴
کیوبا ۲۸۷
کینیڈا ۸۹، ۸۶، ۲۴۱
کینیڈی ۲۲۹-۳۱، ۲۳۳-۳۵، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۴، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۵۳-
کھلنا ۳۹۲

گ

'گارجین' (روزنامہ) ۲۲۱
گائیڈڈ میزائل ۱۰۰، ۱۰۱
گذدر، ہاشم ۸۴

گردی، بریگیڈ ۳۷
گرسل (صدر ترکی) ۲۶۰
گرومیکو ۲۷۹
گریسی، جنرل ۵۲، ۵۳، ۵۷، ۵۹
گرینڈ ٹرنک روڈ ۳۰
گل ڈھیری ۴
گلگت ۱۱۵
گنتھر، جان ۱۰۸
گندھارا آرٹ ۱۶۰
گوا ۲۳۸، ۲۴۱
گوپس (دریا) ۱۱۴
گوجر ۴
گوجرانوالہ ۲۶
گورداسپور ۲۶
گورمانی، مشتاق احمد ۷۰، ۹۳، ۱۰۱
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۸۵

ل

لاہور ۴، ۲۶، ۲۹، ۶۰، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۹، ۱۸۱، ۲۳۰، ۳۸۵-۸۶، ۳۹۲
لائل پور ۲۶
لبنان ۱۱۰
لداخ ۲۲۱-۲۲، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۵۱، ۲۶۶
لدھیانہ ۲۶
لطیف ۳۴
لندن ۲۰۰، ۶۹، ۸۶، ۸۷، ۱۱۰، ۱۲۵، ۲۳۰، ۲۳۸، ۳۰۷
لوک سبھا ۲۱۰، ۲۳۳، ۲۴۸، ۲۴۹
لیاقت علی خان ۵۷، ۶۰، ۶۷-۷۱، ۸۲-۸۳، ۹۰، ۱۱۶، ۲۸۷، ۳۱۹، ۳۸۱
لیبیا ۳۰۱
لیڈرز پیشنٹ ۱۷۳

م

مارشل لا ۱۱۷-۲۱، ۱۲۳، ۳۰-
۱۲۷، ۱۳۳-۳۴، ۱۳۶-۳۷، ۱۳۲-۳۳، ۱۶۲، ۱۷۷، ۳۴۶، ۳۵۸، ۳۷۱، ۳۷۵ فوری مقاصد: ۱۲۸-۳۰ طویل المیعاد مقاصد: ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۷۳، اصلاحات کا مرکز آغاز: ۱۲۷، ۱۳۲-۳۳، آرڈی ننس: ۱۵۶،
مارکس، کارل ۲۷۴
' مارننگ نیوز ' (روزنامہ) ۲۱۰
ماری پور ۱۲۲، ۱۲۶
ماسکو ۲۸۴
مالا کنڈ: پن بجلی گھر ۳۱۸
مانچسٹر ۳۰۴
مانسہرہ ۳
مانڈلے ۲۳
مانگرول ۲۳۸
ماؤنٹ ایورسٹ ۲۷۱
ماؤنٹ بیٹن ۵۷
متحدہ محاذ ۹۰
متحدہ عرب جمہوریہ ۲۹۴
مٹھا کی تنظیم ۱۱۱
مجلس آئین ساز/دستور ساز ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۹۰، ۳۱۹
مجلس قانون ساز ۱۴۱، ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۱۰-۱۳، ۳۱۵-۱۷
مجیٹھیا ۲۷
محمد علی، چودھری ۵۴، ۶۸، ۷۰، ۸۶-۸۸، ۹۱، ۹۳، ۱۸۳، ۳۱۴، ۳۵۶، ۳۸۸
محمد علی بوگرا (رک: بوگرا)
مراکو ۳۰۱
مردان ۱۱۱
مرگلا پہاڑیاں ۱۶۰
مری ۱، ۱۱۱، ۲۰۵
مسلم لیگ، آل انڈیا ۳۳۳، ۳۵۰
مسلم لیگ پارٹی ۳۶۴
مسلم لیگ، پاکستان ۸۲، ۳۳۹،

۳۶۴، ۳۷۹، ۳۸۵، ۳۹۲
مسلم لیگ نیشنل گارڈز ۹۶
مسلم لیگی ۹۲
مسلم نیشلسٹ ۳۳۳
مشاورتی کونسل ۱۷۶، ۳۳۰
مشترکہ تربیتی ادارہ ۳۴
مشترکہ دفاعی کونسل ۲۸، ۲۹
مشرق وسطیٰ ۱۰۰، ۱۹۰، ۱۹۲، ۲۵۶—۵۸، ۲۹۰، ۲۹۳، ۲۹۶، ۳۳۲
مشرق بنگال ۱۵۰، ۱۳۰، ۳۱۵
مشرق پاکستان ۲۳، ۲۷، ۳۳، ۳۷—۳۹، ۴۱—۴۴، ۴۶-۴۷، ۵۲، ۵۷، ۶۹، ۹۰، ۹۵—۹۳، ۱۰۷، ۱۲۱-۲۲، ۱۵۰-۵۱، ۱۹۳، ۲۲۵، ۲۳۶-۳۷، ۲۶۱، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۳، ۳۱۶، ۳۳۸، ۳۵۰، ۳۶۶—۶۹، ۳۷۶، ۳۸۰، ۳۸۳، ۳۸۵، ۳۸۷—۸۹، ۳۹۲
مشرق پنجاب ۲۷، ۲۸، ۱۸۴
مشرق صوبہ ۱۵۷، ۱۶۸
مشن: امریکی برطانوی
کینڈائی فضائیہ کا مشن ۲۲۲
مشن ود ماؤنٹ بیٹن (تصنیف) ۲۹
مصر ۲۵۷، ۲۵۸، ۳۰۱
معاہدۂ بغداد (رک بغداد)
معاہدۂ جنیوا (رک جنیوا)
مغربی بنگال ۴۷
مغربی پاکستان ۴، ۴۲، ۴۶—۴۴، ۹۱، ۹۵—۹۳، ۱۰۷-۸، ۱۱۳، ۱۴۳-۴۴، ۱۴۸—۵۰، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۸، ایک یونٹ کا قیام ۳۱۰، ۳۱۷، ۱۹۳، ۲۰۶، ۲۹۱، ۳۰۹، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۵—۱۸، ۳۶۶—۶۹، ۳۷۶، ۳۸۰، ۳۸۳، ۳۸۵، ۳۸۷—۹۰
مغربی صوبہ ۱۶۸، ۳۹۳

مغربی جرمنی ۱۸۶
ملایا ۳۵
ملٹری کالج ۴۴
ملکۂ انگلستان ۸۴
ملکی تقسیم کی کونسل ۲۶
ملیشیا ۲۱۴، ۲۹۹
ممدوٹ، نواب ۶۸، ۸۲
منٹگمری ۲۶
مندریس، عدنان ۱۱۰
منظور قادر ۱۷۷، ۲۶۹
منگلا بند ۱۸۰
منیر، چیف جسٹس ۱۲۳، ۱۲۴
موچی دروازہ (لاہور) ۳۸۶، ۳۸۹
مودودی، ابواعلیٰ، ۳۴۴
مورس حیمز، سر ۲۵۱
موسیٰ، جنرل محمد ۱۰۳، ۱۳۰
مونٹ گمری، فیلڈ مارشل ۱۱۲
میر علی ۳۰
میر ناگر ۱۱۵
میکانگ ۲۸۴
میکسول ڈی ٹیلر: جنرل ۲۲۱، ۲۵۴
میک موہن ۲۶۷
میک موہن خط/لائن ۲۲۲، ۲۳۳
میکے، جنرل راس ۵۲، ۵۳
مینزیز، آر-جی ۲۴۴
میمن سنگھ ۴۷
مین ہو رولڈ انڈیا (تصنیف) ۱۰۶
مینن، کرشنا ۱۴۳

ن

ناٹو (شمالی اوقیانوس کا معاہدہ) ۲۶۱
ناران ۱۰۶
نرائن گنج ۲۹
نارتھ ایسٹ فرنٹیر ایجنسی (نیفا) ۲۲۱-۲۲، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۵۰، ۲۶۵
ناساو ۲۲۲-۲۳، ۲۵۱

ناصر ۱۸
ناصر ، صدر متحدہ عرب جمہوریہ ۱۰۹، ۱۹۲، ۲۵۶، ۳۰۰
ناظم الدین ، خواجہ ۳۹، ۴۰، ۴۲-۴۳، ۴۸، ۷۰، ۸۴، ۸۵، ۹۰—۳۸۷
ناظم رائے شماری برائے کشمیر ۲۱۷
ناگا ۲۳
ناگر ۱۸
نتھیا گلی ۱۰۶-۷، ۳۴۵
نظام اسلام پارٹی ۳۸۷
نظام حیدر آباد ۱۲
نعیم ، شہزادہ ۲۹۰—۹۲
نکسن ۲۲۶
نوجوان ترک پارٹی ۶۰
نور الامین ۴۰، ۴۳، ۳۳۸-۳۳۹
نوری السعید ۱۰۹-۱۰
نون ، ملک فیروز خان ۹۳، ۹۶، ۱۰۱، ۱۰۴-۵، ۱۱۷-۱۸، ۱۴۴
نہرو ، پنڈت جواہر لال ۷۱، ۱۸۵، ۱۸۷، ۲۰۳—۸، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۱۵، ۲۱۷-۱۸، ۲۲۱، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲—۳۴، ۲۳۶-۳۷، ۲۴۱—۴۳، ۲۴۵، ۲۴۸—۵۱، ۲۷۰، ۲۹۸-۹۹
نیپال ۲۱۴، ۲۶۵، ۲۷۱
نیروبی ۲۹۳
نیشنل پریس کلب امریکہ ۲۲۸
نیشنل عوامی پارٹی ۹۴، ۹۵، ۳۸۳، ۳۸۸
نیشنل یونین ۲۰۷
نیوریلیا (ایس ایس) ۲۰
نیوزی لینڈ ۱۸۶، ۲۱۵
’ نیوزیورخر زائٹونگ ‘ زیورک (جرمن اخبار) ۲۰۸
نیویارک ۱۰۱، ۲۲۱
’ نیویارک ٹائمز ‘ ۲۲۱، ۲۳۹
’ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون ‘ ۲۲۱

و

وادیٔ ستلج پروجیکٹ ۱۷۸
واشنگٹن ۲۱۶، ۲۲۸
واشنگٹن پوسٹ ۲۴۰
واہ ۱۰۷
واہ آرڈیننس فیکٹری ۳۱۸
وائٹ ہاؤس ۲۳۱، ۲۵۰
وائل میموری سروز (تصنیف) ۲۷
وائنز ، کپتان ۲۰۸
وحدت مغربی پاکستان ۹۱
وزیرستان ۳۰—۳۲، ۳۷
ولی اللہ ، شاہ ۳۳۴
ون یونٹ ۹۱، ۹۳، ۹۴
ون یونٹ بل ۹۱
ویت نام ۲۷۴، ۲۷۷
ویت نام ، شمالی ۲۸۱
ویلر ، جنرل ۱۸۶
ویلر ، سر مورٹمر ۱۶۰

ہانگ کانگ ۲۷۲
ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن ۲۰۶
ہائیکورٹ ۱۷۲—۷۴
ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن ، کراچی ۳۴۹
ہائیکورٹ ، ڈھاکہ ۵۱، مغربی پاکستان ۱۷۳، وفاق ۱۷۰
ہدایت ، جنرل ۱۰۹
ہری پور ۶، ۱۷۰
ہری سنگھ نلوہ ۴
ہزارہ ۴، ۱۷۰
ہماچل پردیش ۱۸۴
ہمالیہ ۲، ۱۷۹، ۲۳۶، ۲۶۵، ۲۶۶
ہندوستان ۳، ۱۰، ۲۳-۲۴، ۲۶، ۲۸، ۳۲—۳۵، ۳۹، ۴۱، ۷۱، ۷۳، ۷۹، ۸۱-۸۲، ۸۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۴، ۱۱۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸،

۱۷۰، ۱۷۷—۸۰، ۱۸۳-۸۵،
۱۹۰—۹۳، ۱۹۸، ۲۰۰—۲۱۳،
۲۱۵—۳۸، ۲۵۰—۵۶، ۲۵۸،
۲۵۹
۲۶۱، ۲۶۳—۶۶، ۲۷۸، ۲۸۰،
۲۸۱، ۲۸۳—۸۶، ۲۸۸، ۲۹۳،
۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۰۸، ۳۲۰،
۳۳۲—۳۴، ۳۵۱-۵۲، ۳۶۶
ہنزہ ۱۱۵
ہوڈسن ہارس ۳
ہوشیار پور ۲۶
ہیری من، ایورل ۲۴۸
ہیگ ۱۰۱

ی

یاکانگ ۲۷۱
یاکی مور ۳۱۹
یحییٰ، جنرل محمد ۷۲، ۱۱۷، ۱۲۲،
۱۵۹
یوپی ۱۴
یوٹو ۲۸۳
یورپ ۱۸، ۲۹۹، ۳۰۵
یوروپین کامن مارکیٹ ۲۱۶
یونانی ۱۶۰
یونیورسٹی ٹریننگ کور ۱۳